۷۸۶

فہرست مضامین

الحمد للہ الذی انزل الینا کتاباً فیہ ھدًی و شفاء للناس، و یسرہ لنا لنذکر بہ، وارسل الینا عبدہ و رسولہ محمدا صلی اللہ علیہ وسلم۔ بالھدی ودین الحق یتلوا علینا ایاتہ ویزکینا ویعلمنا الکتب والحکمۃ، ویخرجنا من الظلمٰت الی النور۔

یہ رسالہ اپنی زندگی کے چھ مہینے پورے کرنے کے بعد آج ایک دوسرے مرحلے میں قدم رکھ رہا ہے جو پہلے مرحلے سے زیادہ کٹھن اور دشوار ہے۔ کٹھن اور دشوار صرف اسی معنی میں نہیں کہ اس کے پیش نظر اب پہلے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ بلکہ اس معنی میں بھی کہ جن ہاتھوں میں وہ منتقل ہو رہا ہے وہ پہلے کام کرنے والے ہاتھوں سے زیادہ کمزور ہیں۔ اب تک اس رسالہ کی تحریر و ترتیب ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جس نے برسوں سے اپنی زندگی کو قرآن اور صرف قرآن کی خدمت کیلئے وقف کر رکھا ہے، جس کے لئے قرآن کے ذکر اور قرآن کی تعلیم و تبلیغ کے سوا دنیا کی کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہے، جس نے قرآن کے کام کو اوڑھنا اور بچھونا بنا لیا ہے اور قرآن کی طرف دعوت دینے میں جس کا انہماک اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ دنیا کے ہر انہماک کو اس پر رشک آتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے سب سے بڑی قوت اس کا خلوص، اس کی تن دہی اور اس کا ایثار ہے جو ہر مشکل سے مشکل امر میں کامیابی کے لئے ضامن ہوتا ہے۔ مگر اب یہ کام اس شخص کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ جو انکسار کے طور پر نہیں اعتراف حقیقت کے طور پر اپنی کمزوری، اپنی بیچارگی، اپنی بے مائگی کو تسلیم کرتا ہے۔ اور ہر شخص سے زیادہ خود اپنے عجز و درماندگی سے واقف ہے۔

ایک طرف یہ ضعف و ناتوانی ہے۔ دوسری طرف پیش نظر کام ہے۔ کہ اسلام کو اس اصلی روشنی میں پیش کیا جائے جس میں قرآن حکیم نے اس کو پیش کیا ہے۔ اور قرآن حکیم کی تعلیمات اور اس کے حقایق و معارف کو اس طریق سے بیان کیا جائے جس طریقہ سے سلف صالح نے ان کو بیان کیا ہے کہنے کو یہ کام بہت آسان ہے۔ صرف دو جملوں میں اس کا ماحصل ادا کر دیا جا سکتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مشکوٰۃ نبوت سے بعد، علم صحیح کی کمی، سلامت قلب و سداد نظر کے فقدان، یونانی تفلسف، عجمی موشگافی، مغربی تشکیک، اور سب سے بڑھ کر خود پرستی، عقلیت کے گھمنڈ اور ہوائے نفس کے اتباع نے ہمارے اور معارف قرآنی کے درمیان ایسے پردے ڈال دئیے ہیں کہ جو قرآن آسان کیا گیا تھا وہ اب سب سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ جو نہ صرف روشن بلکہ روشن گر، نہ صرف نور بلکہ منیر تھا وہ اب خود اپنی اصلی شکل میں نظر نہیں آتا کجا کہ ہم کو سیدھا راستہ دکھائے، جو آنکھوں کو دیکھنے، کانوں کو سننے، دلوں کو سمجھنے کی دعوت دینے آیا تھا وہ اب خود نہ دکھائی دیتا ہے، نہ کانوں میں اترتا ہے، اور نہ دلوں تک پہنچتا ہے۔ قریب قریب ایک ہزار برس سے اس سراج منیر، اس نور مبین، اس شمع ہدایت پر اسرائیلیات، یونانیات، عجمیات، اور فرنگیات کے تو بر تو پردے ڈالے جا رہے ہیں۔ جن کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ میں چاہے تحریف نہ ہوئی ہو، مگر معانی کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں، حقائق چھپ گئے ہیں، تعلیمات مستور ہو گئی ہیں، اور ان فوائد کا حصول کم اور کم تر ہوتا چلا جا رہا ہے جن کے لئے یہ کتاب نازل کی گئی تھی فلسفیوں کے نظریات، منطقیوں کے اصول، طبیعیوں کے قواعد، فلکیوں کی تشریحات، مورخوں کے بیانات قصہ خوانوں کے قصے، غرض ہر وہ چیز جس کو قرآن اس کی تعلیم اور اس کی ہدایت سے دور کا واسطہ بھی نہیں، قرآن کی تفسیر و تاویل میں دخل پا گئی ہے۔ اور اس کے برعکس رسول اللہ کی سنت اور اصحاب و اہل بیت رسول کے اقوال و آثار اور مشکوٰۃ نبوت سے قریب ترین اکتساب کرنے والوں کے بیانات کو جن پر فہم قرآن منحصر ہے اس سے خارج یا قریب قریب بے تعلق کر دیا گیا ہے۔

ان حالات میں قرآن مجید کو اس کی اصلی صورت میں پیش کرنا اس کے حقائق و معارف کو اس سیدھے اور صاف طریقے سے سمجھنا اور سمجھانا جس سے قرآن اول کے سچے مسلمان سمجھتے اور سمجھاتے تھے، ایک بڑا مشکل کام ہے۔ اور اس مشکل کام کے لئے اس رسوخ علم، سلامت قلب، اور طہارت نفس و روح کی ضرورت ہے۔ جس کی قلت میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں، قرآن مجید ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت پاکیزگی کی ہے کہ قرآن ھدی للمتقین ہے۔ جس طرح قرآن کے اوراق کو چھونے کے لئے جسم کی پاکیزگی ضروری ہے اسی طرح اس کے معانی، اس کے معارف، اس کی روح تک رسائی حاصل کرنے کے لئے نفس و روح کی پاکیزگی بھی لازم ہے جس کا دوسرا نام تقوی ہے۔ اس کے بغیر انسان بجائے ہدایت پانے کے الٹا گمراہ ہو جاتا ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ (۲: ۳) خدا اس قرآن سے بہتوں کو ھدایت دیتا ہے۔ اور بہتوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور گمراہ جن کو کرتا ہے وہ دراصل فاسق ہوتے ہیں۔

اس کے ساتھ رسوخ علم بھی ضروری ہے۔ جو متشابہات کو بھی محکمات کے درجہ میں کر دیتا ہے۔ اور جس کے بغیر انسان اتنا کج نظر و کج فہم ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے محکمات بھی متشابہات ہو جاتی ہیں۔

مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳: ۱) قرآن میں سے بعض آیتیں صاف و صریح ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں۔ اور بعض کے معانی مشتبہ ہیں۔ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ قرآن کے مشتبہ اور مبہم حصوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ اس سے فتنہ برپا کریں اور من مانی تاویلیں کیا کریں۔ اور جو علم میں رسوخ اور پختگی رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو قرآن پر ایمان لے آئے اس میں جو کچھ ہے ہمارے رب کی طرف سے ہے اور حق یہ ہے کہ جو عقل رکھتے ہیں نصیحت انہی پر کارگر ہوتی ہے۔

پس سلامتی کی راہ تو درحقیقت اس میں تھی کہ جو شخص رسوخ علم اور طہارت قلب سے نا آشنا ہو وہ "ترجمان القرآن" کی تحریر و ترتیب کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لیتا مگر کام کی دشواری اور اپنی کمزوری کو جاننے کے باوجود محض خدمت کے جذبہ نے مجھ کو اس دعوت کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا جو مجھے اس کام کی جانب دی گئی تھی۔ اور اس بھروسہ نے میری ہمت بڑھائی کہ جس خدا نے میرے دل میں یہ جذبہ پیدا کیا ہے وہی رسوخ علم صحت فکر، سلامت قلب، اور طہارت نفس و روح بھی ارزانی فرمائیگا۔

"ترجمان القرآن" کے مقاصد میں سے ایک اہم اور ضروری مقصد یہ بھی ہے۔ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کو قرآن کے سمجھنے میں مدد دیجائے اس مقصد کے ذیل میں یہ بھی آجاتا ہے۔ کہ ان شکوک وشبہات کو حل کیا جائے جو قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اس کے لئے "ترجمان القرآن" میں ایک مستقل باب رہیگا جس میں ہر شخص کو اپنی مشکلات اور اپنے شبہات پیش کرنیکا حق ہوگا۔ اور حتی الامکان ان کو حل کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ "حتی الامکان" میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا فاضل ہو۔ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ہر مشکل کو حل اور ہر شبہ کو رفع کر دینے پر قادر ہے۔ ایک شخص زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ اپنے علم و فہم کے مطابق لوگوں کے شبہات کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ باقی رہا ان شبہات کو بالفعل دور کر دینا اور ہر شخص کو کلیۃً مطمئن کر دینا تو یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں اس کا مدعی بھی نہیں ہوں کہ مجھ سے غلطی نہیں ہو سکتی ممکن ہے کہ کسی مسئلہ کے سمجھنے اور بیان کرنے میں خود میں غلطی پر ہوں ایسے مواقع پر میں امید کرتا ہوں کہ میری کسی غلطی کو قصد و اختیار پر محمول نہ کیا جائیگا۔ بلکہ ناواقفیت اور قلت فہم کا نتیجہ سمجھا جائیگا۔ اور اہل علم حضرات میری اصلاح کی کوشش فرمائینگے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی شخص مجھے غلطی پر اصرار کرنے والا ہرگز نہ پائیگا۔

ایک بات مجھے "ترجمان القرآن" کے ناظرین سے بھی عرض کرنی ہے۔ اس رسالہ کے اجراء کا مقصد جلب زر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے رسائل نہایت محدود طبقوں میں مقبول ہوتے ہیں۔ اس لئے جو شخص ایسا کوئی رسالہ نکالتا ہے وہ پہلے ہی یہ سمجھ لیتا ہے کہ مالی منفعت کا حصول تو درکنار نقصان سے بچنا بھی مشکل ہے۔ لیکن یہ رسالہ جس دعوت کو پیش کر رہا ہے اس کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اس کا پیغام پہنچے، اور زیادہ سے زیادہ آدمی اس کی تعلیم سے مستفید ہوں۔ لہٰذا رسالہ کے ہر ناظر کو صرف ناظر و قاری ہی نہ ہونا چاہئے، بلکہ مبلغ اور داعی بھی ہونا چاہئے اور اپنے اپنے حلقہ میں اس کی اشاعت کی کوشش کرنی چاہئے۔ میرا کام رسالہ کو مفید اور مفید تر بنانا ہے۔ اور ناظرین کا کام اس کے حلقۂ اشاعت کو وسیع اور وسیع تر کرنا۔

تحریک قرآن اور ترجمان القرآن

از

جناب مولوی ابو محمد مصلح صاحب سابق اڈیٹر ترجمان القرآن

تحریک قرآن سے ملک آشنا ہو چکا ہے۔ اور قریب قریب ہر طبقہ کے افراد عملاً اس میں شرکت فرما چکے ہیں۔ آئندہ اگر خدا کو منظور ہے تو بہت جلد ایک تنظیمی شکل پیدا ہو جائے گی اور پھر وہ جس سے چاہے گا اس سلسلہ میں کام لے گا۔

تحریک قرآن اپنے اندر بڑی وسعت رکھتی ہے اس کے اصول و فروع پر بحث کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ الاصلاح سہسرام، مذہب کلکتہ اور سلسلہ اشاعت قرآن حیدر آباد دکن کے تقریباً پانچ ہزار صفحات تحریک کے متعلقات اور توضیحات سے لبریز ہیں۔

نفس تحریک کوئی نئی چیز نہیں لیکن جس شکل میں اس چودھویں صدی کے اندر اس کو پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً جملہ تحریکاتِ ماضی و حال سے اپنے رنگ میں جدا ہے اور یہی اس کی خصوصیت ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اب تک جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے اس میں پندرہ آنے سے زیادہ محرک کے خیال کی ترجمانی ہوتی رہی ہے لیکن ضرورت اس امر کی تھی کہ دوسرے اہل قلم حضرات کے خیالات سے بھی عوام کو آگاہ کیا جائے اور اس طرح ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے جو صرف قرآن مجید کے متعلق سوچے اور اسی کے متعلق لکھے تاکہ مسلمانوں میں یکرنگی پیدا ہو جائے۔

الحمد للہ ترجمان القرآن کے اجرا نے بہت جلد عملی شکل اختیار کی اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی جیسی شخصیت کے ظاہر و باطن کو مستقل طور پر خدا نے اس کے لئے منتخب فرمالیا۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم ط

شفیق مکرم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات تعارف کی محتاج نہیں۔ جمعیۃ علمائے ہند کا ارگن اخبار الجمعیۃ جس خوبی اور جس قابلیت کے ساتھ آپ کی ادارت میں نکلتا رہا ہے اُسے عوام اور خواص سب ہی واقف ہیں اور خوش قسمتی سے ذاتی طور پر جن سے آپ کی ملاقات ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ الجمعیۃ اور ترجمان القرآن کی اڈیٹری کے لئے کس قدر صحیح انتخاب کا لفظ صادق آتا ہے۔ تصنیف کے اندر مصنف کی روح موجود ہوتی ہے اور قارئین کے اندر ایک حیثیت سے وہ حلول کرجاتی ہے۔ اس لئے اب ترجمان القرآن بھی مولنٰا ابوالاعلیٰ مودودی کے ظاہر و باطن اور قول و فعل کا آئینہ ہوگا اور پھر اس سے وہی مدعا حاصل ہوگا۔ جو اول روز سے نصب العین قرار پاچکا ہے۔ تحریک قرآن کی کامیابی کے سلسلہ میں سب سے پہلے دو کام کرنا طے پایا تھا۔ ایک تو فضا کا قرآنی فضا بنانا۔ دوسرے اشخاص کا پیدا کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہی کر سکتا ہے جو ہمہ قرآن ہو جس کے قول و فعل میں مطابقت ہو اور جس کا وظیفۂ حیات قرآن قرار پاچکا ہو۔

جیسا کہ کہا گیا ترجمان القرآن اسی مقصد عزیز کے حصول کے لئے جاری کیا گیا اور اس کے صفحات پر اسی امر کی کوشش کی گئی اور آیندہ بھی اس کا نصب العین یہی رہے گا اور خواہ اس کیلئے کتنی ہی زیادہ قیمت دینی پڑے سودا مہنگا نہ ہوگا۔ کیونکہ جو مقابلہ بھی کیا جاسکتا ہے جو قلعہ بھی سر کیا جاسکتا ہے جس نئی دنیا کو بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اور جو باغ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ میدان کے صاف کرنے کے بعد زمین کے ہموار کرلینے کے بعد اور جان نثاروں کو صف میں لا کھڑا کرنے کے بعد بس اب یہی قرآنی فضا کا پیدا کرنا اور اشخاص کا مہیا کرنا ہی تحریک کی کامیابی کے لئے وقت کا سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔

"ترجمان القرآن" "مجلس تحریک قرآن مجید ممالک محروسہ سرکار عالی" کا پرچہ ہے۔ اور اس کے سب سے پہلے حامی و مددگار جناب نذیر جنگ بہادر ہیں۔ اور مجلس کے صدر جناب نواب سیف نواز جنگ بہادر

اور معتمد جناب نواب بہادر یار جنگ بہادر ہیں نیز ارکان میں بھی ایسے لوگ شریک ہیں جن کی ہر قسم کی اعانت ترجمان القرآن کے ساتھ رہی ہے اور رہے گی۔ اور جس سلطنت کے مرکز سے یہ شائع ہو رہا ہے اس کا دست اعانت تو معلوم نہیں کس کس گوشہ تک پہونچا ہوا ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ کائنات کے سب سے زیادہ مقدس کام اور دنیا کی سب سے زیادہ اہم اور ضروری تحریک اس سے محروم رہے اگرچہ دوسروں کی طرح اس کو نعوذ باللہ ایک دوسرا خدا نہیں بنا لینا ہے۔ اور جا و بیجا امداد پر ہی منحصر نہیں کر دینا ہے لیکن قرآن کی شان کو برقرار رکھتے ہوئے وقت آجائے تو سب کچھ قرآن کے لئے حاصل کر لیا جا سکتا ہے۔

"اب تک تحریک قرآن" اور ترجمان القرآن وغیرہ کو نہ تو امور مذہبی نے نوازا ہے اور نہ تعلیمات نے اور نہ ہی اس کے لئے کوشش کی گئی لیکن شاید یہ سب کچھ قدرت نے آئندہ کے لئے اٹھا رکھا ہو۔ اور مودودی صاحب اس سے وہ سب کچھ کر دکھائیں جس کے لئے دنیائے اسلام ہی نہیں بلکہ اقوام عالم بھی بے چینی کے ساتھ منتظر ہیں۔

ترجمان القرآن کی پہلی ششماہی ختم ہو چکی اور اب محرم الحرام ۵۲ھ سے نئے قالب اور نئی روح کے ساتھ مولنا ابو الاعلیٰ مودودی اپنی ادارت میں ملک و قوم کے سامنے پیش فرما رہے ہیں اس لئے میری تمنا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ان کو ان کے مقاصد عالیہ میں ہر طرح کامیاب فرمائے۔

ترجمان القرآن میں ہمارا خمیر بھی شریک ہے اس لئے اس درس روحانیت دینے والے رسالہ سے روحانی تعلق ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے جو کچھ کیا جائے گا وہ اپنا ہی عاقبت کا سود ہو گا۔

اشارات

اسلام کے متعلق مسٹر جارج برنارڈ شا کے خیالات جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ حال میں جب انہوں نے مشرق کا سفر کیا تو اس کے دوران میں سنگاپور کے عربی اخبار المدنی کا نامہ نگار ان سے ملا اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے پھر ایک مرتبہ اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آزادی دستوری و ذہنی حریت کا دین ہے، اجتماعی نقطۂ نظر سے بحیثیت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کسی مذہب کا نظام اجتماعی اتنا مکمل نہیں ہے جتنا اسلام کا نظام ہے۔ دنیائے اسلام کا تنزل اسلام سے دور ہٹ جانے کی بدولت ہے مسلمان جب صرف اسلام کی بنیادوں پر جدوجہد کریں گے تو عالم اسلامی کا خواب بیداری سے بدل جائیگا۔

ان خیالات کے سننے کے بعد نامہ نگار نے سوال کیا کہ جب آپ اسلام کو اچھا سمجھتے ہیں تو پھر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو فطری طور پر ان بیانات کے بعد پیدا ہوتا ہی کیونکہ ایک سلیم الطبع آدمی کے لئے کسی چیز کے اعتراف قبح اور اس کے ترک اور کسی چیز کے اعتراف حسن اور اس کے قبول و تسلیم کر لینے میں کوئی حد فاصل نہیں ہے لیکن مسٹر شا نے جو کچھ جواب یا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قبول اسلام کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور ایسا نہ کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ صرف اس چیز کی کمی ہے جس کو شرح صدر کہتے ہیں۔

ایک مسٹر شا ہی پر موقوف نہیں ہے بہت سے اہل فکر و نظر پہلے بھی گذر چکے ہیں، اور اب بھی موجود ہیں جنھوں نے اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اس کے دنیوی یا دینی یا دونوں حیثیتوں سے مفید

ہونے کا اقرار کیا، اس کی تہذیب، اس کے نظام اجتماعی، اس کی علمی صداقت اور اس کی عملی قوت کی برتری تسلیم کی مگر جب ایمان لانے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے کا سوال سامنے آیا تو کسی چیز نے ان کو قدم آگے بڑھانے سے روک دیا، اور وہ اسلام کی سرحد پہنچ کر ٹھیر گئے۔

برعکس اس کے بہت سے ایسے آدمی بھی ہو گذرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسلام کی مخالفت اور اس کی دشمنی میں صرف کر دیا لیکن اسی مخالفت کے سلسلہ میں اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے حقیقت اسلام ان پر منکشف ہو گئی۔ اور اس انکشاف کے بعد کوئی چیز ان کو ایمان لانے سے روک نہ سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا راز بھی ایک عجیب راز ہے ایک ہی بات ہے جو ہزاروں آدمیوں کے سامنے کہی جاتی ہے۔ مگر کوئی تو اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ کوئی توجہ کرتا ہے لیکن وہ اس کے پردہ گوش پر سے اچٹ کر چلی جاتی ہے۔ کوئی اس کو سنتا اور سمجھتا ہے۔ مگر مانتا نہیں۔ کوئی اس کی تعریف و تحسین کرتا ہے مگر قبول و تسلیم نہیں کرتا۔ اور کسی کے دل میں وہ گھر کر جاتی ہے اور وہ اسکی صداقت پر ایمان لے آتا ہے۔

ہمارا شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ ایک شخص کو بازار میں چوٹ لگ کر گرتے ہوئے سینکڑوں آدمی دیکھتے ہیں بہت سے اس کو ایک معمولی واقعہ سمجھ کر دیکھتے ہوئے گذر جاتے ہیں بہتوں کے دل میں رحم آتا ہے۔ مگر وہ افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں بہت سے اس کا تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں اور بعض اللہ کے بندے ایسے نکلتے ہیں جو بڑھ کر اسے اٹھاتے ہیں اس سے ہمدردی کرتے ہیں اور اس کو مدد پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح ایک مجرم کو پابزنجیر لیجاتے ہوئے بہت سے آدمی دیکھتے ہیں۔ کوئی اس کی طرف التفات ہی نہیں کرتا۔ کوئی اس پر حقارت کی نظر ڈالتا ہے کوئی اس پر ترس کھاتا ہے کوئی اس کی ہنسی اڑاتا ہے کوئی اس کے انجام پر خوش ہوتا ہے کوئی کہتا ہے کہ جیسا کیا ویسا بھرا۔ اور کوئی اس کے انجام سے عبرت حاصل کرتا ہے اور جرم سے بچنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ تو مختلف لوگوں کی مختلف نفسی کیفیات و تاثرات ہیں، جن کا اختلاف زیادہ تعجب خیز نہیں اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی شخص کے تاثرات اور اس پر ایک ہی چیز کے اثر کی نوعیت مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ وہی ایک بات ہے جس کو ایک شخص ہزاروں مرتبہ سنتا ہے اور نہیں مانتا، مگر ایک ایسا موقع آتا ہے کہ یکایک اس کے دل کا بند کھل جاتا ہے۔ جو بات کان کے پردہ میں اٹک کر رہ جاتی تھی وہ سیدھی دل تک پہنچ جاتی ہے، اور وہ خود حیران ہوتا ہے کہ یہی بات میں پہلے بھی بارہا سن چکا ہوں، پھر آج یہ کیا ہو گیا کہ یہ خود بخود دل میں اتری چلی جا رہی ہے؟ ایک ہی شخص کو بارہا آفت رسیدہ آدمیوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے اور وہ ان کی طرف التفات بھی نہیں کرتا لیکن ایک موقع پر کسی شخص کی مصیبت دیکھ کر دفعۃً اس کا دل بھر آتا ہے۔ شقاوت کا پردہ چاک چاک ہو جاتا ہے۔ اور وہ سب سے زیادہ ہمدرد، رحیم اور نرم دل بن جاتا ہے۔ ایک شخص کو اپنی عمر میں بے شمار عبرت ناک مناظر دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے کبھی وہ ان کو تماشا سمجھ کر دیکھتا ہے کبھی ایک حسرت و افسوس کی نگاہ ڈالتا ہے، اور کبھی ایک معمولی منظر سے اس پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ دل پر ایک مستقل نقش بیٹھ جاتا ہے۔

یہی حال ہدایت و ضلالت کا بھی ہے۔ وہی ایک قرآن تھا۔ وہی ایک اس کی تعلیم تھی، وہی ایک اس کو سنانے والی زبان تھی۔ ابوجہل اور ابولہب تمام عمر اس کو سنتے رہے مگر کبھی وہ ان کے کانوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خدیجۃ الکبریٰ۔ ابوبکرؓ۔ اور علیؓ ابن ابی طالب نے سنا اور پہلے ہی لمحہ میں اس پر ایمان لے آئے بغیر اس کے کہ ان کے دل میں شک کا شائبہ بھی گذرتا۔ عمرؓ ابن الخطاب نے بیسیوں مرتبہ اس کو سنا اور صرف یہی نہیں کہ تسلیم نہ کیا بلکہ جوں جوں سنتے رہے مخالف اور دشمن ہوتے چلے گئے لیکن ایک مرتبہ انہی کانوں نے اس چیز کو سنا تو کان اور دل کے درمیان جتنی مضبوط دیواریں چنی ہوئی تھیں یکایک

منہدم ہوگئیں اور اس چیز نے ان کے دل میں ایسا اثر کیا کہ ان کی زندگی کی بالکل کایا پلٹ دی۔

ہر چند نفسی نقطۂ نظر سے اس اختلاف کیفیت اور اختلاف اثر و تاثر کی بہت سی توجیہیں کی جا سکتی ہیں، اور وہ سب اپنی اپنی جگہ درست بھی ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو چیز چشم و گوش اور دل و دماغ کے درمیان کہیں ایک مستقل حجاب بن جاتی ہے کہیں ایک مدت تک حجاب رہتی ہے، اور ایک نفسی موقع پر خود بخود چاک ہو جاتی ہے کہیں سرے سے حجاب بنتی ہی نہیں کہیں کسی بات کے لئے حجاب بنتی ہے۔ اور کسی بات کے لئے نہیں بنتی، وہ ہرگز انسان کے ارادہ و اختیار کے تابع نہیں ہے، بلکہ فطری و جبلی طور پر خود بخود انسان میں پیدا ہوتی ہے۔

یہی نکتہ ہے جس کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۶ : ۱۵)۔

اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ رکھنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ کرتا اور ایسا بھینچتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر چڑھا چلا جا رہا ہے۔ یہ طریقہ ہے جس سے ایمان نہ لانے والوں پر اللہ کی طرف سے ناپاکی مسلط کی جاتی ہے۔

ایک اور موقع پر اس کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ:۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۱۶ : ۱۳)۔

اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، مگر وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

پھر اس ہدایت کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے کہ:۔

قُلْ اِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ اَنَابَ (۱۳: ۴)۔ ان سے کہو کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہو۔

اور ضلالت کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے کہ:۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا وَّجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا (۱۷: ۵)۔ جب تم نے قرآن پڑھا تو ہم نے تمہارے اور آخرت کا یقین نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک گاڑھا پردہ ڈال دیا اور ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دئے کہ قرآن کو سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی

ان آیات میں اس فطری کیفیت کو جو ایک حق بات سن کر اسے قبول کر لینے کے لئے اضطراری طور پر دل میں پیدا ہوتی ہے ۔ اور جو آخر کار انسان کو ایمان کی طرف کھینچ لاتی ہے ۔ خدائی ہدایت اور اس کے پیدا ہونے کو "شرح صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ اور اس ہدایت کے برعکس انسان کے دل میں حق سے انکار اور اعراض کرنے پر آمادگی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو اللہ کی طرف سے مسلط کی ہوئی گمراہی قرار دیا گیا ہے اور "شرح صدر" کے مقابل جو انقباضی کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے اسے "ضیق صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ پھر اس "ہدایت" و "ضلالت" اور "شرح صدر" و "ضیق صدر" کے پیدا ہونے کا سبب بتایا ہے کہ انسان جب ایک مرتبہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس کو خود بخود وہ راستہ دکھائی دینے لگتا ہی جو اسے سیدھا خدا کی جانب لے جاتا ہی ۔ اور جو شخص سرے سے یہ احساس ہی نہیں رکھتا کہ مجھے کبھی خدا کے حضور میں حاضر ہونا اور اپنے قلب و جوارح کے افعال کا حساب دینا ہے ۔ اس کو لاکھ کوئی شخص کلمۂ حق سنائے اور وعظ و تلقین کرے کوئی بات اس کے دل میں نہیں اترتی ، اور وہ کسی طرح راہ راست

نہیں آتا۔

یہاں پھر دو باتیں مل گئی ہیں جن کو الگ الگ سمجھ لینے سے قرآن مجید کے وہ مقامات آسانی
سے حل ہو جاتے ہیں جن میں یہ مضمون مختلف پیرایوں سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک طرف ہدایت و شرح صدر اور ضلالت و ضیق صدر کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف
منسوب کیا ہے۔ دوسری طرف اس ہدایت و شرح صدر کے عطا کرنے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ
انسان خدا کی طرف رجوع اور توجہ کرے۔ اور ضلالت و ضیق صدر کے مسلط کر دینے کا سبب یہ بتایا ہے
کہ گمراہ شخص خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اس کے سامنے مسئول و جواب دہ ہونے کا احساس نہیں رکھتا

ان دونوں چیزوں کے باہمی تعلق کو یوں سمجھو کہ انسان کی فطرت میں خدا نے ایک ایسی قوت
رکھ دی ہے جو اس کو حق و باطل کے امتیاز اور صحیح و غلط کا فرق سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے
حق کی طرف بڑھنے اور باطل سے احتراز کرنے پر مائل کرتی ہے یہی قوت وہ فطری ہدایت ہے جسے خدا اپنی طرف
منسوب کرتا ہے اور جس کی طرف ارشاد خداوندی فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا میں اشارہ
کیا گیا ہے اس کے خلاف ایک اور قوت بھی انسان میں کام کر رہی ہے جو اس کو برائی کی طرف کھینچتی غلطی
اور کج روی کی طرف مائل کرتی اور جھوٹ اور باطل کو اس کے سامنے مزین کر کے پیش کرتی ہے ان دونوں
کے ساتھ بہت سی خارجی اور داخلی قوتیں ایسی ہیں جن میں سے بعض ہدایت کی قوت کو مدد پہونچانے والی
ہوتی ہیں اور بعض ضلالت کی قوت کو اکتساب علم اور اس کے مختلف مدارج تربیت اور اس کی مختلف
کیفیات، سوسائٹی اور اس کے مختلف احوال وہ چیزیں ہیں جو باہر سے اس پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ترازو
کے دونوں پلڑوں میں سے کسی ایک میں کم و بیش دونوں میں اپنا وزن ڈالتی رہتی ہیں۔ اور انسان کا اپنے
اختیار تمیزی، اپنی فہم و فراست، اپنی عقل و بصیرت، اپنے ذرائع اکتساب علم سے صحیح یا غلط کام لینا

اور اپنی قوت فیصلہ کو بجا یا بیجا استعمال کرنا، وہ چیز ہے جو خود اس کے ارادہ کے تابع ہے اور جس سے وہ ہدایت وضلالت کی متضاد قوتوں کے مقتضیات کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی ہدایت اور اس کی مسلط کی ہوئی ضلالت دونوں ایک غیر محسوس طور پر اپنا عمل کرتی رہتی ہیں۔ ہدایت کی قوت اسے راہ راست کی طرف لطیف اشارے کیا کرتی ہے۔ اور ضلالت کی قوت اسے باطل کے ملمع پر رجھائے جاتی ہے۔ مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان غلط اثرات سے متاثر ہوکر اور خود اپنی اختیاری قوتوں کو غلط طریقے سے استعمال کرکے ضلالت کے پھندے میں گرفتار ہوجاتا ہے اور ہدایت کی پکار پر کان ہی نہیں دھرتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہوتا ہے، اور اس دوران میں کچھ بیرونی اثرات اور کچھ خود اس کی اپنی عقل وبصیرت دونوں مل جل کر اسے گمراہی سے بیزار کر دیتے ہیں۔ اور اس وقت ہدایت کی وہی روشنی جو پہلے مدہم تھی دفعتاً تیز ہوکر اس کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدت تک انسان ہدایت اور ضلالت کے درمیان مذبذب رہتا ہے۔ کبھی ادھر کھنچتا ہے، کبھی اُدھر، قوت فیصلہ اتنی قوی نہیں ہوتی کہ بالکل کسی ایک طرف کا ہوجائے۔ بعض بدقسمت اسی تذبذب کے عالم میں دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ بعض کا آخری فیصلہ ضلالت کے حق میں ہوتا ہے اور بعض ایک طویل کشمکش کے بعد ہدایت الٰہی سے آخر کار فائدہ اٹھا پالیتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ خوش قسمت وہ سلیم الفطرت صحیح القلب اور سدید النظر لوگ ہوتے ہیں جو خدا کی دی ہوئی عقل، اس کی عطا کی ہوئی آنکھوں، اس کے بخشے ہوئے کانوں اور اس کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے ٹھیک ٹھیک کام لیتے ہیں۔ مشاہدات اور تجربات سے درست نتائج اخذ کرتے ہیں۔ آیات الٰہی کو دیکھ کر ان سے صحیح سبق حاصل کرتے ہیں، باطل کی زینت ان کو رجھانے میں ناکام ہوتی ہے۔ جھوٹ کا فریب ان کو اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتا۔ ضلالت کی کج راہیوں کو دیکھتے ہی وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آدمی کے

چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ پھر جو نہی کہ وہ حق کی طرف رجوع کرتے اور اس کی طلب میں آگے بڑھتے ہیں حق خود ان کے استقبال کو آتا ہے۔ ہدایت کا نور ان کے سامنے چمکنے لگتا ہے، اور حق کو حق سمجھ لینے اور باطل کو باطل جان لینے کے بعد پھر دنیا کی کوئی قوت ان کو راہ راست سے پھیرنے، اور گمراہی کی طرف لگانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

ایک اور بات بھی اس سلسلہ میں قابل بیان ہے، اور ضرورت ہے کہ مسلمان اس کو ذہن نشین کرلیں عام طور پر جب غیر مسلم مشاہیر کی جانب سے اسلام کے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار ہوتا ہے تو مسلمان بڑے فخر سے ان خیالات کو شہرت دیتے ہیں گویا ان کا اسلام کو اچھا سمجھنا اسلام کی خوبی کے لئے کوئی گراں قدر شہادت ہے لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ اسلام کی صداقت وحقانیت اس سے بے نیاز ہے کہ کوئی اس کا اعتراف کرے جس طرح آفتاب کا روشن ہونا اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کو روشن کہے، اور جس طرح آگ کا گرم اور پانی کا سیال ہونا اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کی گرمی اور اس کے سیلان کو تسلیم کرے اسی طرح اسلام کا برحق ہونا بھی اس کا حاجتمند نہیں ہے کہ کوئی اس کے برحق ہونے کو مان لے خصوصاً ایسے لوگوں کی تحسین او رمدح تو کوئی بھی وقعت نہیں رکھتی جن کے دل انکی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے، اور جو خود اپنے اعراض وانکار سے اپنی مدح وتحسین کی تکذیب کرتے ہیں اگر حقیقت میں وہ اسلام کی خوبی کے معترف ہوتے تو اس پر ایمان لے آتے۔ لیکن جب انہوں نے زبانی اعتراف کے باوجود ایمان لانے سے انکار کر دیا تو اہل عقل کی نگاہ میں ان کی حیثیت بالکل اس شخص کی سی ہے جو طبیب کی صداقت کو تسلیم کرے، اس کے تجویز کردہ نسخہ کی صحت کا اعتراف کرے، مگر اپنی بیماری کا علاج کسی عطائی طبیب سے کرائے۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ کسی بڑے سے بڑے غیر مسلم کا اعتراف بھی اسلام کے لئے قابل فخر

نہیں ہے اس کے لئے ایک ہی فخر کافی ہے۔ اور وہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ، اور وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا کا فخر ہے۔

اسی اشاعت میں جناب ذوقی شاہ صاحب کا ایک مضمون "فہم قرآن" کے عنوان سے شایع ہو رہا ہے انہوں نے اس مضمون میں ایک علمی و روحانی تربیت گاہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے جہاں ایسے سچے داعیان اسلام کی ایک مخلص جماعت طیار کی جائے جو نہ صرف علوم و معارف قرآنی کے حامل ہوں بلکہ اس کے ساتھ اخلاق فاضلہ و اعمال صالحہ سے بھی آراستہ ہوں، تاکہ دنیا کے سامنے اسلامی تعلیم کا عملی نمونہ بن کر پیش ہوں اور صداقت اسلام کا سکہ دلوں پر بٹھا دیں۔

کچھ عرصہ ہوا میں نے بھی اس قسم کی ایک تجویز مجلس تحریک قرآن کی ایک ذیلی کمیٹی کے سامنے پیش کی تھی اگرچہ اتنا فرق ضرور ہے کہ وہ صوفی ہیں، انہوں نے اس کو "خانقاہ" سے موسوم کیا ہے اور میں طالب العلم ہوں، میں نے اسے مدرسہ کا نام دیا ہے لیکن اختلاف اسمی کے باوجود مسمّٰی ایک ہی ہے۔

میری تجویز یہ تھی کہ ایک مدرسہ مخصوص طور پر صرف علوم قرآنی کی تعلیم کے لئے قائم کیا جائے اس میں دینیات کے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک منتخب اور مختصر جماعت کو رکھ کر مختلف پہلوؤں سے قرآن مجید پڑھایا جائے مثلاً ایک طرف الفاظ کی تحقیق، جملوں کی ترکیب، بلاغت کے نکات اور اسالیب بیان کا تتبع ہو۔ دوسری طرف قرآن مجید کی اس تفسیر کا مطالعہ کیا جائے جو خود رسول اکرم اور صحابہ کرامؓ اور سلف صالح نے فرمائی ہے تیسری طرف عقائد، عبادات، اور معاملات کے متعلق قرآن مجید کی تعلیم اور اس کے احکام پر نظر کی جائے اور استنباط مسائل کے طریقے معلوم کئے جائیں چوتھی جانب قرآن مجید کا مطالعہ فلسفہ و کلام کے نقطۂ نظر سے کیا جائے اور ابتداء سے اب تک مختلف ادیان و ملل اور مذاہب فلسفہ کی جانب

قرآن مجید پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کی تحقیق کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ان طلباء کو علوم جدیدہ
کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ وہ زمانہ کی رفتار، زندگی کے موجودہ مسائل اور وقت کی ضروریات کو سمجھیں اور
اس زمانہ کے لوگوں کی رہنمائی قرآنی تعلیمات کے مطابق کرنے کے لئے مستعد ہوں پھر ان کو مختلف گروہوں
میں تقسیم کرکے ہندوستان اور یورپ کی مختلف زبانیں سکھائی جائیں تاکہ وہ اس ملک اور بیرونی ممالک
میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کر سکیں۔

میرے نزدیک اس درس گاہ میں چند خصوصیات ضرور ہونی چاہئیں:-

(۱) طالب علم ایسے انتخاب کئے جائیں جو بطیب خاطر اپنی زندگی کو اسلام کی خدمت کے لئے
وقف کرنے پر آمادہ ہوں۔ نیک سیرت ہوں، ذہین و طباع ہوں، اور اس سانچے میں ڈھلنے کی صلاحیت
رکھتے ہوں جس میں ان کو ڈھالنا مقصود ہے۔

(۲) ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جو نہ صرف اپنے اپنے فن میں درجۂ کمال رکھتے ہوں، بلکہ اس کے
ساتھ اخلاق فاضلہ سے بھی متصف ہوں تاکہ وہ اپنے شاگردوں کے سامنے صرف تلاوت آیات ہی
نہ کریں، بلکہ ان کے نفوس کا تزکیہ بھی کریں۔ ان میں حکمت کی روح بھی پھونکیں، ان کے اندر ایمان کی شمع
بھی روشن کریں، اور ان کو عمل صالح کا درس بھی دیں۔

(۳) علمی و روحانی تربیت کے ساتھ ان طلبہ کو مختلف قسم کی صنعتیں بھی سکھائی جائیں تاکہ درس گاہ
سے نکل کر وہ پیشہ ور واعظ، یا کرایہ کے امام، یا دنیا طلب درویش نہ بن جائیں اور نہ دوسرے طریقوں سے
حرام خوری کرکے علم کو ذلیل کریں۔ بلکہ بزرگان سلف کی طرح عزت کے ساتھ اپنے دست و بازو کی کمائی
کھائیں اور جو کچھ وقت کسب معاش سے بچے اس کو دین کی خدمت میں صرف کریں۔

ہندوستان کے ۸کروڑ مسلمانوں میں سے اس قسم کے تیس چالیس نوجوانوں کا فراہم ہو جانا

کچھ مشکل نہیں، چار پانچ ایسے صالح علماء کا میسر آجانا بھی آسان نہیں تو دشوار بھی نہیں، اور اس مدرسے کا خرچ چلانے کے لئے دو ڈھائی ہزار روپے مہینہ کا انتظام کرنا بھی محالات سے نہیں ہے، خصوصاً حیدرآباد میں اس کو محال کہنا تو کفران نعمت ہے، مگر ضرورت صرف ایک چیز کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کام کو ایسے لوگ اپنے ہاتھ میں لیں جن کا خلوص بھی مسلم ہو اور دیانت بھی محل شک میں نہ ہو، اور جو کام کو کام کے لئے کرنا چاہتے ہوں نہ کہ کسی اور چیز کے لئے۔

یہ ایک ایسی تجویز ہے جو اگر اپنی حقیقی شان کے ساتھ عالم واقعہ میں آجائے تو یقیناً مسلمانوں کی قوم پر ایک انقلاب انگیز اثر مترتب ہوگا۔ مسلمانوں کی تمام تحریکیں صرف اس وجہ سے بے جان ہیں کہ ان میں رجال کی قلت ہے۔ کہیں اتفاق سے کوئی بندہ خدا ایک اچھا دل و دماغ اور ایک سچا جذبۂ عمل لے کر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کو حالات کی مساعدت بھی میسر آجاتی ہے، تو اس کے اثر سے کچھ دن کے لئے مسلمانوں میں ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر وہ حرکت صرف اس کی زندگی تک رہتی ہے اور ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی ادھر اس کا کام بھی بند ہوا۔ اس کی اصلی علت یہی ہے کہ ہمارے رہنماؤں کو کام کے آدمی بنانے اور مردان کار مہیا کرنے کی اہمیت کا احساس نہیں ہے۔ وہ اپنی تمام قوت اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں صرف کر دیتے ہیں، اور یہ فکر نہیں کرتے کہ اس کام کو آئندہ بھی چلانے کے لئے آدمی فراہم ہونے چاہئیں تاکہ کام کی زندگی شخص واحد کی زندگی کے ساتھ ختم نہ ہو جائے۔ اس کمی کو پورا کرنے کی سخت ضرورت ہے، اور اس کی تدبیروں میں سے ایک اہم تدبیر وہ ہے جو ابھی اوپر بیان کی گئی ہے۔ اگر ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی درسگاہ اور تربیت گاہ قائم کر دی جائے جس سے صحیح علم، اور بلند سیرت رکھنے والے تیس چالیس نوجوانوں کی ایک جماعت ہر دوسرے تیسرے سال نکلتی رہے، تو ایک قلیل مدت میں مسلمانوں کے اندر وہ قحط الرجال باقی نہ رہے گا جس کی بدولت آج کل ان کی قومی تحریکوں پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔

"ترجمان القرآن" کی پچھلی چند اشاعتوں میں میں نے ایک مضمون تعلیم القرآن کی ضرورت پر لکھا تھا جو غلطی سے "اصول اخلاق و سیاست و قانون" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے اس مسئلہ سے بھی بحث کی تھی کہ اسلام میں جتنے فرقے پیدا ہوئے ہیں وہ سب کتاب و سنت پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں! اس وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کتاب و سنت ہی اختلاف کا سرچشمہ ہے' اور اسی وجہ سے ہماری مذہبی تعلیم میں کتاب و سنت سے اعراض کرکے زیادہ تر زور فقہ اصول اور کلام کی کتابوں پر دیا جاتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتاب و سنت وحدت و اتفاق کا سرچشمہ ہے' اور اختلاف کا سرچشمہ خود ہمارے شرور نفس اور خود ہماری اپنی جہالت میں ہے! اس لئے اختلاف کے فتنے کو مٹانے یا کم از کم ضعیف کر دینے کیلئے کتاب و سنت کی تعلیم سے اعراض کرنا نہیں بلکہ زیادہ تر اُسی پر زور دینا ضروری ہے، اس سلسلہ میں میں نے لکھا تھا کہ :-

> دین میں اصل فتنہ اختلاف کا فتنہ نہیں' تشیّع و تحزّب اور تعصب کا فتنہ ہے۔ ہر گروہ کا صرف اپنے مذہب، اپنے مسلک اور اپنی منہاج کو اصل دین اور ایک ہی صراطِ مستقیم قرار دینا' دوسرے گروہوں کو خارج از دین اور گم کردہ راہ سمجھنا' اسلامی عصبیت کو چھوڑ کر فرقیانہ عصبیت اختیار کرنا' آپس میں عداوت اور ایک دوسرے سے نزاع رکھنا' یہی اصلی فتنہ ہے' اسی کو قرآن نے تفرق فی الدین سے تعبیر کیا ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے بچنے کی قرآن میں بار بار تاکید کی گئی ہے اور اس کے متعلق فرمایا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوا دِیْنَھُمْ وَکَانُوا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (۶ : ۲۰) جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے۔ اے محمدؐ تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں"

آگے چل کر پھر لکھا تھا۔

"طریقوں کے اختلاف سے ذہن کو نفس قرآن کو جو اصل دین ہے چھوڑ بیٹھنا اور اس سے غفلت برتنا کوئی عقلمندی نہیں ہے، قرآن کے مطالعہ سے جزئیات و فروع میں تاویل و تعبیر کے اختلافات تو ضرور پیدا ہوں گے مگر کلیات و اصول جن پر دین کا مدار ہے لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جائیں گے۔ اور وہ جس قدر زیادہ جاگزیں ہوں گے اسی قدر تفرق فی الدین اور تحزب اور تشیع کا قلع قمع ہوگا۔"

بات بالکل صاف تھی، مگر اس سے میرے ایک شیعہ بھائی کو عجیب غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ وہ اپنے ایک عنایت نامہ میں مجھ کو لکھتے ہیں:-

"آپ نے اس مضمون میں (۱) تشیع کو اختلاف سے بڑھ چڑھ کر فتنہ اور قابل عذر ظاہر فرمایا ہے۔ (۲) شیعوں کی تکفیر کے قائل ہوئے ہیں۔ (۳) اور ان کے قلع و قمع کے لئے جمہور کو برانگیختہ کیا ہے۔"

یہ ساری غلط فہمی صرف ایک لفظ تشیع کے معنی اور محل استعمال پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ میرے بھائی نے تشیع سے وہ اصطلاحی شیعیت مراد لے لی ہے جس کا اطلاق شیعان علیؓ کے مذہب پر ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ پوری عبارت کو پڑھ لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ لفظ اس مخصوص اصطلاحی معنی میں نہ وہاں استعمال ہوا ہے اور نہ اس عبارت میں اس کے یہ معنی کسی طرح ہو سکتے ہیں۔ لکھنے والے نے تو اس کو قرآن سے اخذ کیا ہے اور وہ آیت بھی درج کر دی ہے جس سے یہ لفظ ماخوذ ہے، اور اس کے ساتھ دوسرے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو اس کے مطلب و مفہوم پر روشنی ڈالتے ہیں یعنی تحزّب اور تعصّب، اور تفرق فی الدین۔ لغت عرب میں شیعہ کہتے ہیں گروہ اور فرقہ کو اور اسی معنی میں یہ لفظ قرآن مجید میں آیا ہے، چنانچہ سورۂ مریم کے پانچویں رکوع

میں ہے۔ ثُمَّ لننزعن من کُلِّ شیعۃٍ ایُّھم اشدُّ علی الرحمان عتِیّاً۔ پھر ہم ہر گروہ میں سے کچھ لوگوں کو الگ نکال لیں گے۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ کون لوگ خدائے رحمان سے سرکشی کرنے میں زیادہ شدید تھے۔ سورۂ قصص کے دوسرے رکوع میں ہے فوجد فیھا رجلین یقتتلان ھٰذا مِن شیعتہٖ وھٰذا من عدوّہٖ۔ وہاں اس نے دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے پایا ایک اس کے اپنے گروہ سے تھا اور دوسرا دشمن گروہ سے۔ اسی لفظ شیعہ کی جمع شِیَع ہے اور یہ لفظ بھی اسی معنی میں قرآن کے اندر آیا ہے سورۂ الحجر کے پہلے رکوع میں ہے ولقد ارسلنا من قبلك فی شیع الاولین۔ ہم نے تم سے پہلے گذشتہ قوموں میں بھی رسول بھیجے تھے سورۂ انعام کے آٹھویں رکوع میں ہے۔ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بعضکم باس بعض۔ یا تم کو گروہ گروہ کرکے آپس کی لڑائی کا مزا چکھائے سورۂ قصص کے پہلے رکوع میں ہے۔ اِنَّ فرعَونَ علا فی الارض وجعل اھلھا شیعًا۔ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں بانٹ دیا۔ سورۂ روم کے چوتھے رکوع میں ہے ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرّقوا دینھم وکانوا شِیَعًا۔ کُلُّ حزبٍ بما لدیھم فرحون۔ تم ان مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین کے ٹکڑے کرلیے اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔

اسی مادہ سے لفظ تشیُّع نکلا ہے جس کے معنی ہیں متفرق اور پراگندہ ہو جانے کے چنانچہ عرب کا محاورہ ہے قطرت قطرۃ من اللبن فی الماء فتشیّع فیہ ای تفرّق۔ اس تشیُّع کو اس تشیُّع سے کیا واسطہ۔ جو نزول قرآن کے کئی برس بعد ایک مخصوص اصطلاح بنا ہے کم از کم اتنا تو معترض کو بھی معلوم ہے کہ قرآن میں یہ لفظ کہیں بھی اس اصطلاحی معنی میں مستعمل نہیں ہوا ہے۔

پھر میرے بھائی نعمانی تو غور کیا ہوتا کہ ایک شخص جس عبارت میں سرے سے فرقہ وارانہ عصبیت کی مخالفت کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ جزئی و فروعی اختلافات کو اصلی اور بنیادی اختلاف نہ بناؤ، اور آپس کی تکفیر مختلف فرقوں کے ایک دوسرے کو گمراہ اور خارج از دین قرار دینے کو فتنے سے تعبیر کر رہا ہے۔ جو تفرقہ کے فتنہ کا قلع قمع کرنے کی دعوت دے رہا ہے اور قرآن مجید کے پیش کئے ہوئے اصول پر متحد ہو جانے کے لئے بلا رہا ہے آخر اس کی اس عبارت اور ٹھیک اسی عبارت میں اسلام کے ایک بڑے فرقہ کی تکفیر اور اس کے قلع قمع کے لئے جمہور کو برانگیختہ کرنے کا آخر کونسا محل تھا۔ اگر لکھنے والے نے درحقیقت اس مضمون کے ان جملوں میں جو اوپر نقل کئے گئے ہیں کسی گروہ مسلمین کی تکفیر کی ہوتی اور اس کے قلع قمع کے لئے جمہور کو برانگیختہ کیا ہوتا، تو ایک عقلمند کا کام یہ نہ تھا کہ اس کو سمجھانے کی کوشش کرتا، بلکہ اس کا کام تو یہ تھا کہ مقامی پولیس کو ایک خطرناک پاگل کے ظاہر ہونے کی اطلاع دیتا۔

ان عزیز نے مجھے اسلامی فرقوں کے اختلاف کی اصل سمجھانے کی بھی کوشش فرمائی ہے جس کے لئے میں ان کا شکرگذار ہوں۔ میں نے بھی تھوڑا بہت اسلامی فرقوں کے اصول اور اختلاف کی بدایت و نہایت کے متعلق پڑھا ہے مگر کبھی اس نیت سے نہیں پڑھا کہ کسی فرقہ کی تردید اور کسی فرقہ کی تائید کے لئے دلائل حاصل کروں بلکہ محض تحقیق اور ایک کلمۂ سواء کی تلاش کے لئے پڑھا ہے۔ میرے پیش نظر کبھی سنیت اور شیعیت، حنفیت اور وہابیت کا سوال نہیں رہا۔ میں ہمیشہ اصل اسلام کی جستجو میں رہا ہوں اور میری غایت تمنا یہ ہے کہ اللہ اس اصل اسلام کی خدمت میں میری ساری قوت صرف فرما دے اور اس قوت کا کوئی حصہ فرقوں اور گروہوں کی باہمی نزاعات میں صرف ہونے کے لئے باقی نہ رہنے دے۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

مغربی مصنفین اور ان کے اثر سے مشرقی اہل علم کا بھی ایک بڑا گروہ یہ رائے رکھتا ہے کہ اسلام کی تہذیب اپنے ماقبل کی تہذیبوں وخصوصاً یونانی رومی تہذیب سے ماخوذ ہے، اور وہ ایک جداگانہ تہذیب صرف اس وجہ سے بن گئی ہے کہ عربی ذہنیت نے اس پرانے مواد کو ایک نئے اسلوب سے ترکیب دیکر اس کی ظاہری شکل وصورت بدل دی ہے یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر یہ لوگ اسلامی تہذیب کے عناصر ترکیبی، ایرانی، بابلی، سریانی، فینیقی، مصری، یونانی، اور رومی تہذیبوں میں تلاش کرتے ہیں۔ اور پھر عربی خصائص میں اس ذہنی حال کا سراغ لگاتے ہیں جس نے ان تہذیبوں سے اپنے ڈھب کا مسالہ لیکر اسے اپنے ڈھنگ پر ترتیب دیا۔

لیکن یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ ہر زمانہ میں انسان کا حال اس کے ماضی سے ضرور متاثر ہوتا ہے، اور ہر نئی تعمیر میں پچھلی تعمیروں کے مواد سے ضرور کام لیا جاتا ہے مگر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی تہذیب اپنی ذات و جوہر میں خالص اسلامی ہے، اور کسی غیر اسلامی موثر کے اثر کا اس میں ذرہ برابر دخل نہیں ہے، البتہ عرضی امور میں عربی ذہنیت عربی روایات اور ماقبل اور مابعد کی تہذیبوں کے اثرات ضرور داخل ہو گئے ہیں۔ عمارت میں ایک چیز تو اس کا نقشہ، اس کا مخصوص طرز تعمیر، اس کا مقصد اور اس مقصد کے لئے اس کا مناسب ومطابق ہونا ہے اور یہی اصل و اساس ہے۔ دوسری چیز اس کا رنگ روغن، اس کے نقش ونگار، اس کی زینت و آرایش ہے، اور یہ ایک جزئی و فروعی چیز ہے پس جہاں تک اصل و اساس کا تعلق ہے اسلامی تہذیب کا قصر کلیتہً اسلام کی اپنی تعمیر کا نتیجہ ہے، اس کا نقشہ اس کا اپنا ہے کسی

دوسرے نقشے کی مدد اس میں نہیں لی گئی ہے، اس کا طرز تعمیر خود اسی کا ایجاد کردہ ہے، کسی دوسرے نمونہ کی نقل اس میں نہیں کی گئی ہے، اس کا مقصد تعمیر نرالا ہے، کوئی دوسری عمارت اس مقصد کے لئے نہ اس سے پہلے تعمیر کی گئی اور نہ اس کے بعد، اسی طرح اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جس قسم کی عمارت تعمیر ہونی چاہئے تھی اسلامی تہذیب کی عمارت ٹھیک ویسی ہی ہے، اس مقصد کے لئے جو کچھ اس نے تعمیر کر دیا، اس میں کوئی بیرونی مہندس نہ ترمیم کی قدرت رکھتا ہے اور نہ اضافہ کی۔ باقی رہے جزئیات و فروع تو اسلام نے ان میں بھی دوسروں سے بہت کم استفادہ کیا حتیٰ کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی بیشتر اسلام کے اپنے ہیں لیکن مسلمانوں نے دوسروں سے رنگ روغن، نقش و نگار اور زینت و آرائش کے سامان لے کر اس عمارت میں اضافہ کر دئے اور وہی دیکھنے والوں کو اتنے نمایاں نظر آئے کہ انہوں نے پوری عمارت پر نقل کا حکم لگا دیا۔

تہذیب کا مفہوم

اس بحث کا فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے اس سوال کا تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ تہذیب کس چیز کو کہتے ہیں؟ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب نام ہے، اس کے علوم و آداب، فنون لطیفہ، صنائع و بدائع، اطوار معاشرت، انداز تمدن اور طرز سیاست کا مگر حقیقت میں یہ نفس تہذیب نہیں ہیں۔ تہذیب کے نتائج و مظاہر ہیں۔ تہذیب کی اصل نہیں ہیں شجر تہذیب کے برگ و بار ہیں۔ کسی تہذیب کی قدر و قیمت ان ظاہری صورتوں اور نمائشی ملبوسات کی بنیاد پر متعین نہیں کی جا سکتی۔ ان سب کو چھوڑ کر ہمیں اس کی روح تک پہنچنا چاہئے۔ اور اس کے اساس اُصول کا تجسس کرنا چاہئے۔

تہذیب کے عناصر ترکیبی | اس نقطۂ نظر سے سب سے پہلی چیز جس کا کسی تہذیب میں کھوج لگانا ضروری ہے

وہ یہ کہ دنیوی زندگی کے متعلق اس کا تصور کیا ہے؟ وہ اس دنیا میں انسان کی کیا حیثیت قرار دیتی ہے؟ اس کی نگاہ میں دنیا کیا ہے؟ انسان کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے؟ اور انسان اس دنیا کو برتتے تو کیا سمجھ کر برتتے؟ یہ تصور کا سوال ایسا اہم سوال ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے، اور اس تصور کے بدل جانے سے تہذیب کی نوعیت بنیادی طور پر بدل جاتی ہے۔

دوسرا سوال جو تصور حیات کے سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے زندگی کے نصب العین کا سوال ہے، دنیا میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ ساری تگ و دو یہ تمام کشمکش، یہ سب جد وجہد اور محنت و مشقت آخر کس لئے ہے؟ وہ کیا چیز مطلوب ہے جس کی طرف آدمی کو دوڑنا چاہئے؟ وہ کونسا مطمح نظر ہے جس تک پہنچنے کے لئے ابن آدم کو کوشش کرنی چاہئے۔ اور وہ کونسا منتہا ہے جسے انسان کو اپنی ہر سعی اور اپنے ہر عمل میں پیش نظر رکھنا چاہئے؟ یہی مقصود و مطلوب کا سوال انسان کی عملی زندگی کا رُخ اور اس کی رفتار متعین کرتا ہے، اور اِسی کے مطابق عمل کے طریقے اور کامیابی کے وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ زیر بحث تہذیب میں انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی عقائد و افکار پر کیگئی ہے؟ انسان کی ذہنیت کو وہ کس سانچے میں ڈھالتی ہے؟ انسان کے دل و دماغ میں کس قسم کے خیالات جاگزیں کرتی ہے؟ اور اس میں وہ کونسے ذہنی محرکات ہیں جو اس کے نصب العین کے مطابق انسان کو ایک مخصوص قسم کی عملی زندگی کے لئے ابھارتے ہیں؟ یہ بات کسی بحث کی محتاج نہیں ہے کہ انسان کے قوائے عمل اس کے قوائے فکر کے تابع ہیں۔ اس کے دست و پا کو جو روح حرکت دیتی ہے وہ اس کے دل و دماغ سے آتی ہے، دل و دماغ پر جو عقیدہ، جو تخیل، جو مشکورہ پوری قوت کے ساتھ مسلط ہوگا عملی قوتیں اُسی کے زیر اثر حرکت کریں گی۔ ذہن

جس سانچے میں ڈھلا ہوا ہوگا اسی کے مطابق جذبات، حسیات، اور داعیات پیدا ہوں گے، اور انہی کے اتباع میں اعضا و جوارح کام کریں گے۔ پس دنیا کی کوئی تہذیب ایک اساسی عقیدہ اور ایک بنیادی تخیلہ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی، اور اس بنا پر ہر تہذیب کو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے اس عقیدہ او تخیلہ کو سمجھنا اور اس کے حسن و قبح کو جانچنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی عمارت کی مضبوطی و پائداری کا حال معلوم کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کی بنیادیں کتنی گہری اور کتنی مضبوط ہیں۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کو بحیثیت ایک انسان کے کس طرح کا آدمی بناتی ہے؟ یعنی وہ کس قسم کی اخلاقی تربیت ہے جس سے وہ انسان کو اپنے نظریہ کے مطابق کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرتی ہے؟ وہ کونسے خصائل، اوصاف اور نفسی خصائص ہیں جنہیں وہ انسان میں پیدا کرنے اور نشوونما دینے کی کوشش کرتی ہے؟ اور اس کی مخصوص اخلاقی تربیت سے انسان کیسا انسان بنتا ہے؟ گو تہذیب کا اصل مقصود نظام اجتماعی کی تعمیر ہے لیکن افراد ہی وہ مسالہ ہیں جن سے جماعت کا قصر بنتا ہے اور اس قصر کا استحکام اس پر منحصر ہے کہ اس کا ہر پتھر اچھا ترشا ہوا ہو، ہر اینٹ خوب پکی ہوئی ہو، ہر شہتیر مضبوط و پائدار ہو، کوئی کڑی گھن کھائی ہوئی نہ ہو، اور کسی حصہ میں ناکارہ، کچا اور بیجان مسالہ استعمال نہ کیا جائے۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ اس تہذیب میں انسان اور انسان کا تعلق اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے کس طرح قائم کیا گیا ہے؟ اس کے تعلقات اس کے خاندان، اس کے ہمسایوں، اس کے دوستوں، اس کے ساتھ معاملہ کرنے والوں اس کے ساتھ رہنے اور لینے والوں، اس کے ماتحتوں اس کے بالادستوں خود اس کی اپنی تہذیب کے پیرووں، اور اس کی تہذیب کی پیروی نہ کرنے والوں کے ساتھ کس قسم کے رکھے ہیں؟ اس کے حقوق دوسروں پر اور دوسروں کے

حقوق اس پر کیا قرار دیئے ہیں؟ اس کو کن حدود کا پابند کیا ہے؟ اس کو آزادی دی ہے تو کس حد تک؟ اور مقید کیا ہے تو کس حد تک؟ اس سوال کے ضمن میں اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست، اور بین الاقوامی تعلقات کے تمام مسائل آجاتے ہیں۔ اور اسی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زیر بحث تہذیب خاندان، سوسائٹی، اور حکومت کی تنظیم کس ڈھنگ پر کرتی ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کی تکوین پانچ عناصر سے ہوتی ہے۔

(۱)۔ دنیوی زندگی کا تصور۔

(۲) زندگی کا نصب العین۔

(۳) اساسی عقیدہ۔

(۴) انفرادی تربیت۔

(۵) نظام اجتماعی۔

دنیا کی ہر تہذیب انہی پانچ عناصر سے بنی ہے، اور اسی طرح اسلامی تہذیب کی تکوین بھی انہی سے ہوی ہے۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی تہذیب کے یہ پانچوں عناصر کس نوع کے ہیں، اور ان کی ترکیب کس طرح ہوی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اس نوعیت کے عناصر نہ فرداً فرداً اسلام کے سوا کسی اور تہذیب میں موجود ہیں، اور نہ انکی مجموعی ہیئت کی کوئی اور مثال دنیا میں پائی جاتی ہے۔

دنیوی زندگی کا اسلامی تصور

انسان کو ابتدا سے اپنے متعلق بڑی غلط فہمی ہے۔ اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی باقی ہے۔

کبھی وہ افراط پر اترتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ بلند پایہ ہستی سمجھ لیتا ہے، غرور، و تکبر اور سرکشی کی ہوا اس کے دماغ میں بھر جاتی ہے کسی طاقت کو اپنے سے بالاتر کیا معنی اپنا مدمقابل بھی نہیں سمجھتا، مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً اور اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کی صدا بلند کرتا ہے، اور اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ کر جبر و قہر کا دیوتا ظلم و جور اور شر و فساد کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ اور کبھی تفریط کی جانب مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ ذلیل ہستی سمجھ لیتا ہے، درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، جانور، ہوا، آگ، بادل، بجلی، چاند، سورج، تارے، غرض ہر اس چیز کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا منفعت یا مضرت نظر آتی ہے، اور خود اپنے جیسے آدمیوں میں بھی کوئی قوت دیکھتا ہے تو ان کو بھی دیوتا اور معبود مان لینے میں تامل نہیں کرتا۔

انسان کی حقیقت اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل کر کے انسان کی اصلی حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے، وہ کہتا ہے کہ

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ یَّخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ (۸۶) انسان اپنی حقیقت تو دیکھے کہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے۔ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے جو پشت اور سینہ کی ہڈیوں سے کھنچ کر آتا ہے۔

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ (۳۶ : ۵) کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اس کو ایک قطرہ آب سے بنایا ہے، اور اب وہ کھلم کھلا ہمارا حریف بنتا ہے۔ اور ہمارے لئے مثالیں دیتا ہے اور اپنی اصل کو بھول گیا ہے۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۚ ثُمَّ انسان کی ابتدا مٹی سے کی پھر مٹی کے نچوڑ سے جو ایک حقیر پانی ہے اس کی نسل چلائی پھر اس کی بناوٹ ٹھیک کی

سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهٖ (۳۲ : ۱)

اور اس میں اپنی روح پھونکی ۔

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ
ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ
غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِى الْاَرْحَامِ
مَا نَشَاۤءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ
طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ
يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ
لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۔
(۲۲ : ۱)

ہم نے تم کو مٹی سے پھر قطرۂ آب سے پھر خون کے لوتھڑے
سے پھر پوری یا ادھوری بنی ہوئی بوٹی سے پیدا کیا
تاکہ تم کو اپنی قدرت دکھائیں۔ اور ہم جس نطفہ کو
چاہتے ہیں ایک مدت مقررہ تک رحم مادر میں ٹھیرائے
رکھتے ہیں پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں، پھر تم کو بڑھا کر
جوانی کو پہنچاتے ہیں تم میں سے کوئی وفات پا جاتا
ہے۔ اور کوئی بدترین عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ سمجھ بوجھ
حاصل کرنے کے بعد پھر ناسمجھ ہو جائے ۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ
الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ فِىْٓ اَىِّ
صُوْرَةٍ مَّا شَاۤءَ رَكَّبَكَ (۲۲)

اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے مغرور
کر دیا؟ اس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا تیرے اعضا
درست کئے، تیرے قوا میں اعتدال پیدا کیا
اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترکیب دی۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ
لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ
الْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ
(۱۶ : ۱۱)

اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں
سے نکالا جب تم نکلے تو اس حال میں تھے کہ تم کچھ بھی
نہ جانتے تھے۔ اس نے تم کو کان دئے آنکھیں دیں۔
دل دئے ۔ شاید کہ تم شکر کرو ۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ

کیا تم نے اس نطفہ کو دیکھا جسے تم عورتوں کے رحم

أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ۔ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ
الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ عَلَىٰ أَنْ
نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ
وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا
تَذَكَّرُونَ ۔ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ۔
ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ
لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ
تَفَكَّهُونَ ۔ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ۝ بَلْ نَحْنُ
مَحْرُومُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي
تَشْرَبُونَ ۝ ءَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ
الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ ۝ لَوْ نَشَاءُ
جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝
أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝
ءَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ
الْمُنْشِئُونَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً
وَمَتَاعًا لِلْمُقْوِينَ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ
رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝ (۵۶ : ۳)

میں ٹپکاتے ہو؟ اس سے بچہ تم پیدا کرتے ہو یا ہم
اس کے پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے ہی تمہارے درمیان
موت کا اندازہ مقرر کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں
ہیں کہ تمہاری جسمانی شکلیں بدل دیں اور ایک
اور ہستی میں تم کو بنا دیں جس کو تم نہیں جانتے ۔ اور
تم اپنی پہلی پیدائش کو تو جانتے ہی ہو۔ پھر کیوں نہیں
اس سے سبق حاصل کرتے؟ پھر کیا تم نے دیکھا کہ یہ
کھیتی باڑی جو تم کرتے ہو۔ اس کو تم اگاتے ہو یا
اگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھس
بنا دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم نقصان میں
رہے بلکہ محروم رہ گئے پھر کیا تم نے اس پانی کو دیکھا
جسے تم پیتے ہو؟ اس کو تم نے بادلوں سے اتارا ہے یا اتارنے
والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو کھاری بنا دیں
پس کیوں نہیں شکر ادا کرتے پھر کیا تم نے اس آگ کو دیکھا
جسے تم سلگاتے ہو؟ جن درختوں سے یہ جلائی جاتی ہے ان کو
تم نے پیدا کیا ہے یا پیدا کرنے والے ہم ہیں ہم نے اس کو
ایک یاد دلانے والی چیز اور مسافروں کے لئے سامان بنایا ہے
پس اے انسان اپنے خدائے بزرگ کی تسبیح کر۔

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ

جب کبھی سمندر میں تم پر طوفان کی مصیبت آتی ہے تم

تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ، فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ه اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۔ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا تَبِيْعًا (۱۷:۷)۔

اپنے سب معبودان باطل کو بھول گئے اور اس وقت خدا ہی یاد آیا پھر جب اس نے تمکو بچاکر خشکی پر پہنچا دیا تو تم پھر اعراض کی روش پہ اتر آئے انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے کہ خدا تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے اور تم کوئی اپنا مددگار نہ پاؤ؟ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے کہ خدا تم کو دوبارہ اس سمندر میں لیجائے اور تم پر ہوا کا ایسا جھکڑ بھیجدے جو تمہیں تمہاری نافرمانی کے بدلے میں غرقاب کر دے اور پھر تم ہمارا پیچھا کرنے والا کوئی حمایتی نہ پاؤ؟

ان آیات میں انسان کے غرور و تکبر کو توڑا گیا ہے۔ اسے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تو ذرا اپنی حقیقت تو دیکھ۔ ایک نجس اور حقیر پانی کا قطرہ جو رحم مادر میں مختلف قسم کی نجاستوں سے پرورش پاکر گوشت کا ایک لوتھڑا بنتا ہے۔ خدا چاہے تو اس لوتھڑے میں جان ہی نہ ڈالے اور وہ یونہی غیر مکمل حالت میں خارج ہو جائے۔ خدا اپنی قدرت سے اس لوتھڑے میں جان ڈالتا ہے اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور ان آلات اور ان قوتوں سے اس کو مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے اس طرح تو دنیا میں آتا ہے مگر تیری ابتدائی حالت یہ ہوتی ہے کہ تو ایک بے بس بچہ ہوتا ہے جس میں اپنی کوئی حاجت پوری کرنے کی قدرت نہیں ہوتی خدا ہی نے اپنی قدرت سے ایسا سامان کیا ہے کہ تیری پرورش ہوتی ہے، تو بڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے۔ طاقتور اور قادر ہوتا ہے۔ پھر تیری قوتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے۔ تو جوانی سے

بڑھاپے کی طرف جاتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت میں تجھ پر پھر وہی بے بسی کی کیفیت طاری جاتی ہے۔ جو بچپن میں تھی۔ تیرے حواس جواب دیدیتے ہیں۔ تیری قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں۔ تیرا علم نسیاً منسیا ہو جاتا ہے، اور آخرکار تیری شمع حیات بجھ جاتی ہے، مال اولاد، عزیز دوست، اقارب سب کو چھوڑ کر قبر میں جا پہنچتا ہے، اس مختصر عرصۂ حیات میں تو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر قادر نہیں ہے تجھ سے بالاتر ایک قوت ہے جو تجھکو زندہ رکھتی ہے، اور جب چاہتی ہے۔ تجھ کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر جتنی مدت تو زندہ رہتا ہے، تو ان قوانین قدرت سے جکڑا رہتا ہے۔ یہ ہوا، یہ پانی، یہ روشنی، یہ حرارت، یہ زمین کی پیداوار، قدرتی سازوسامان جن پر تیری زندگی کا انحصار ہے ان میں سے کوئی بھی تیرے بس میں نہیں۔ نہ تو ان کو پیدا کرتا ہے، نہ یہ تیرے احکام کی تابع ہیں۔ یہی چیزیں جب تیرے خلاف آمادۂ پیکار ہو جاتی ہیں تو تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بے بس پاتا ہے۔ ایک ہوا کا جھکڑ تیری بستیوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے، ایک پانی کا طوفان تجھے غرقاب کر دیتا ہے۔ ایک زلزلہ کا جھٹکا تجھے پیوند خاک کر دیتا ہے۔ تو خواہ کتنے ہی آلات سے مسلح ہو، اپنے علم سے (جو خود بھی تیرا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے) کیسی ہی تدبیریں ایجاد کرلے، اپنی عقل سے (جو خود بھی تیری اپنی حاصل کردہ نہیں ہے) کیسے ہی سازوسامان مہیا کرلے، قدرت کی طاقتوں کے سامنے یہ سب چیزیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس بل بوتے پر تو اکڑتا ہے، پھولوں نہیں سماتا، کسی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا فرعونیت اور نمرودیت کا دم بھرتا ہے، جبار و قہار بنتا ہے، ظالم و سرکش بنتا ہے، خدا کے مقابلے میں بغاوت کرتا ہے، خدا کے بندوں کا معبود بنتا ہے۔ اور خدا کی زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔

یہ تو تھی تکبر شکنی۔ دوسری طرف اسلام نوع بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنی | کائنات میں انسان کا درجہ

ذلیل بھی نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (۱۷:۷)

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا۔ اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (۲۲:۹)۔

اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے لئے مطیع بنا دیا ہے۔

"اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لئے سردی سے حفاظت کا سامان ہے اور منفعتیں ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ ان میں تمہارے لئے ایک شان جمال ہے، جب کہ تم صبح ان کو لیجاتے ہو اور شام واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں، جہاں تک تم بغیر جانکاہی کے نہیں پہنچ سکتے، تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ گھوڑے اور خچر اور گدھے تمہاری سواری کے لئے ہیں۔ اور سامان زینت ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے........ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، اس میں سے کچھ تمہارے پینے کے لئے ہے، اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کا چارہ حاصل کرتے ہو۔ اس پانی سے خدا تمہارے لئے کھیتی اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے پھل اگاتا ہے، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔ اُسی نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخر کئے ہیں

یہ سب اسی خدا کے حکم سے مسخر ہیں ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل
سے کام لیتے ہیں اور بہت سی وہ مختلف الالوان چیزیں جو اس نے زمین میں
تمہارے لئے پیدا کی ہیں، ان میں سبق حاصل کرنے والوں کے لئے بڑی نشانی ہے
اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی) لیکر
کھاؤ، اور زینت کا سامان (موتی وغیرہ) نکالو جن کو تم پہنتے ہو۔ اور تو دیکھتا ہے
کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں چنانچہ سمندر کو اس لئے
بھی مسخر کیا ہے کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو۔ (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم
شکر بجا لاؤ۔ اس نے زمین میں پہاڑ لگا دیے کہ زمین تم کو لیکر جھک نہ جائے اور
دریا اور راستے بنادئے کہ تم منزل مقصود کی راہ پاؤ، اور بہت سی علامات بنائیں
منجملہ ان کے تارے بھی ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔ . . . . . .
اور اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو بے حساب پاؤ گے" (۱۶: ۱-۲۰)۔

ان آیات میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تیری خدمت اور فائدہ کے لئے مسخر کی گئی ہیں اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت، یہ دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جانور، یہ رات اور دن، یہ تاریکی اور روشنی، یہ چاند یہ سورج، یہ تارے غرض یہ سب چیزیں جن کو تو دیکھ رہا ہے تیری خادم ہیں، تیری منفعت کے لئے ہیں، اور تیرے لئے ان کو کارآمد بنایا گیا ہے تو ان سب پر فضیلت رکھتا ہے، تجھ کو ان سب سے زیادہ عزت دی گئی ہے، تجھ کو ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔ پھر کیا تو اپنے ان خادموں کے سامنے سر جھکاتا ہے؟ ان کو اپنا حاجت روا سمجھتا ہے؟ ان کے آگے دست سوال دراز کرتا ہے؟ ان سے اپنی مدد کی التجائیں کرتا ہے؟ ان سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے؟ ان کی عظمت و بزرگی کے گیت گاتا ہے؟ اس طرح تو

تو اپنے آپ کو خود ذلیل کرتا ہے، اپنا مرتبہ آپ گراتا ہے، خادموں کا خادم، غلاموں کا غلام خود بنتا ہے۔

انسان نائب حق ہے

اس سے معلوم ہوا کہ انسان نہ اتنا عالی مرتبہ ہے جتنا وہ بزعم خود اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور نہ اتنا پست و ذلیل ہے جتنا اس نے خود اپنے آپ کو بنا لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر اس دنیا میں انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟ اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے:

"اور جب کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا تو زمین میں اس کو نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا، اور خونریزیاں کرے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے اسماء سکھا دیے۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ۔ انہوں نے کہا پاک ذات ہے تیری، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے، تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا اے آدم ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا، پس جب آدم نے ان کو ان اشیاء کے نام بتلائے تو خدا نے کہا کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں؟ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا، بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا اور ہم نے آدم سے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور

اس میں جہاں سے چاہو بفراغت کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس بھی دھیکو کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا" (۲ : ۴)

اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے لئے سربسجود گر جانا، چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ بجز ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا ابلیس! تجھے کیا ہو گیا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوتا، ابلیس نے کہا میں ایسا نہیں ہوں کہ اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے بنایا ہے۔ خدا نے کہا تو جنت سے نکل جا کہ تو راندۂ درگاہ ہے اور یوم الجزا تک تجھ پر پھٹکار ہے" (۱۵ : ۳)۔

اس مضمون کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا، اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم دیا، اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی، فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے اس نائب کو سجدہ کرو، فرشتوں نے اس کو سجدہ کر لیا، اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے جھک گئی، مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح شیطانی قوتیں انسان کے آگے نہ جھکیں، حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر پتلا تھا مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اس کو جو علم بخشا تھا اس نے اس کو نیابت خداوندی کا اہل بنایا۔ فرشتوں نے اس کی اس فضیلت کو تسلیم کر لیا، اور اس کے آگے جھک گئے، لیکن شیطان نے اس کو تسلیم نہ کیا، اس جرم میں شیطان پر لعنت بھیجی گئی، مگر اس نے قیامت تک کے لئے مہلت مانگی

کہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے، چنانچہ شیطان نے انسان کو بہکایا، جنت سے نکلوایا، اور اس وقت سے انسان اور شیطان میں کشمکش برپا ہے، خدا نے انسان سے کہدیا کہ جو ہدایت میں تجھے بھیجوں اس کو مانے گا تو جنت میں جائے گا۔ اور اپنے ازلی دشمن شیطان کا حکم مانے گا تو دوزخ تیرا ٹھکانا ہوگا۔

منصب نیابت کی تشریح: اس بیان سے چند امور معلوم ہوتے ہیں:۔

انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ کی ہے خلیفہ کہتے ہیں نائب کو۔ نائب کا کام یہ ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی اطاعت کرے وہ نہ تو اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کرسکتا ہے کہ ایسا کرے تو باغی سمجھا جائے گا، اور نہ وہ اس کا مجاز ہے کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور خادموں اور غلاموں کو خود اپنی رعیت اپنا نوکر اپنا خادم اپنا غلام بنالے کہ ایسا کرے گا تب بھی باغی قرار دیا جائے گا، اور دونوں حالتوں میں سزا کا مستحق ہوگا اس کو جس جگہ نائب بنایا گیا ہے، وہاں وہ اپنے آقا کی املاک میں تصرف کرسکتا ہے، ان کو استعمال کرسکتا ہے۔ اس کی رعیت پر حکومت کرسکتا ہے اس سے خدمت لے سکتا ہے، ان کی نگرانی کرسکتا ہے مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ خود آقا ہے، اور نہ اس حیثیت سے کہ اس آقا کے سوا کسی اور کا ماتحت ہے۔ بلکہ صرف اس حیثیت سے کہ وہ اپنے آقا کا نائب ہے اور جتنی چیزیں اسکے زیر حکم ہیں ان پر اپنے آقا کا امین ہے، اس بنا پر وہ سچا اور پسندیدہ اور مستحق انعام نائب اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے، اس کی ہدایت پر عمل کرے، اس کے احکام سے سرتابی نہ کرے، اس کی املاک اس کی رعیت اس کے نوکروں اس کے خادموں اور اس کے غلاموں پر حکومت کرنے ان سے خدمت لینے ان میں تصرف کرنے اور ان کی نگرانی کرنے میں اس کے بنائے ہوئے قوانین پر کاربند ہو۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نائب نہیں باغی ہوگا۔ پسندیدہ نہیں مردود

ہوگا، مستحق انعام نہیں مستوجب سزا ہوگا۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ـ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲: ۴)	تو جس نے میری ہدایات کی پیروی کی ایسے لوگوں کے لئے کسی سزا کا خوف اور کسی نامرادی کا رنج نہیں ہے اور جنہوں نے نافرمانی کی اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے

نائب اور امین خود مختار نہیں ہوتا کہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرے اپنے آقا کے مال اور اس کی رعیت میں جیسا چاہے تصرف کرے، اور اس سے کوئی پوچھنے والا نہ ہو بلکہ وہ اپنے آقا کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے اس کو پائی پائی کا حساب دینا ہوتا ہے اس کا آقا اس کی ہر حرکت کے متعلق سوال کر سکتا ہے، اور اس کی امانت اس کے مال اور اس کی رعیت میں اس نے جس طرح تصرف کیا ہے اس کے لئے اس کو ذمہ دار قرار دے کر جزا اور سزا دے سکتا ہے،

نائب کا اولین فرض یہ ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی فرمانروائی، اس کی حکومت، اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نہ اپنے نائب ہونے کی حیثیت کو سمجھ سکے گا نہ بے امین ہونے کے منصب کا کوئی صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوگا، نہ اپنے ذمہ دار، اور جواب دہ ہونے کا احساس کر سکے گا، اور نہ اس امانت میں جو اس کے سپرد کی گئی ہے اپنی ذمہ داریاں اور اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ اول تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی دوسرے تخیل کے تحت انسان وہ طرز عمل اختیار کر سکے جو نیابت و امانت کے تخیل کے تحت وہ اختیار کرے گا۔ اور اگر بفرض محال اس کا طرز عمل ویسا ہو بھی تو اس کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ آقا کی فرمانروائی تسلیم کرنے سے انکار کر کے تو وہ پہلے ہی باغی ہو چکا ہے اب اگر اس نے اپنے نفس یا کسی اور کے اتباع میں اچھے عمل کئے بھی تو اس کا اجر اس سے طلب کرے جس کا اس نے اتباع کیا ہے۔ اس کے آقا کے ہاں اس کے وہ اعمال بے کار ہیں۔

انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک حقیر مخلوق ہے مگر اس کو جو عزت حاصل ہوئی ہے وہ اس روح کی بنا پر ہے جو اس میں پھونکی گئی ہے اور اس نیابت الٰہی کی بنا پر ہے جو اسے اس زمین میں عطا کی گئی ہے اب اس عزت کی حفاظت منحصر ہے اس پر کہ وہ شیطان کی پیروی کرکے اپنی روح کو گندہ نہ کر دے اور اپنے آپ کو نیابت کے درجہ سے گرا کر بغاوت کے مرتبے میں نہ لے جائے کیونکہ اس حالت میں وہ پھر وہی ایک حقیر ہستی رہ جائے گا۔

ملکوتی طاقتیں انسان کے نائب خدا ہونے کو تسلیم کر چکی ہیں اور وہ اس کے آگے بحیثیت نائب خدا ہونے کے جھکی ہوئی ہیں، مگر شیطانی طاقتیں اس کی نیابت کو تسلیم نہیں کرتیں اور وہ اسے اپنا تابع بنانا چاہتی ہیں۔ انسان اگر اس دنیا میں نیابت الٰہی کا حق ادا کرے گا اور خدا کی ہدایت پر چلے گا تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ دیں گی۔ ملائکہ کی فوجیں اس کے لئے اتریں گی وہ عالم ملکوت کو کبھی اپنے سے منحرف نہ پائے گا۔ اور اس کی طاقتوں سے شیطان اور اس کے لشکروں کو مغلوب کرے گا لیکن اگر وہ نیابت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا اور خدا کی ہدایت پر نہ چلے گا۔ تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی، کیونکہ اس طرح وہ خود اپنے منصب نیابت سے دست بردار ہو چکا ہوگا۔ اور جب اس کا ساتھ دینے والی کوئی طاقت نہ رہیگی اور وہ محض مٹی کا ایک پتلا رہ جائے گا۔ تو شیطانی قوتیں اس پر غالب آجائیں گی۔ اور پھر شیطان اور اس کے لشکر ہی اس کے حامی اور مددگار رہوں گے، انہی کے احکام کی وہ پیروی کریگا، اور انہی کا سا انجام اس کا بھی ہوگا۔

نائب خدا ہونے کی حیثیت سے انسان کا درجہ دنیا کی تمام چیزوں سے افضل اور اعلیٰ ہے، دنیا کی تمام چیزیں اس کی ماتحت ہیں، اور اس لئے ہیں کہ وہ ان کو استعمال کرے اور اپنے آقا کے بتائے ہوئے طریقہ پر ان سے خدمت لے، ان ماتحتوں کے آگے جھکنا اس کے لئے ذلت ہے

اگر وہ جھکے گا تو اپنے اوپر آپ ظلم کریگا، اور گویا نیابت الٰہی کے منصب سے خود دست بردار ہو جائیگا لیکن ایک ہستی ایسی ہے جس کے سامنے جھکنا اور جس کی اطاعت کرنا اس کا فرض ہے، اور جس کو سجدہ کرنے میں اس کے لئے عزت ہے۔ وہ ہستی کونسی ہے؟ خدا، اس کا آقا، وہ جس نے انسان کو اپنا نائب بنایا ہے/۔

نوع انسانی کا کوئی مخصوص فرد یا مخصوص گروہ نائب خدا نہیں ہے/ بلکہ پوری نوع انسانی نیابت الٰہی کے منصب پر سرفراز کی گئی ہے اور ہر انسان خلیفہ خدا ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسان کے برابر ہے، اس لئے نہ کسی انسان کو دوسرے انسان کے آگے جھکنا چاہئے اور نہ کسی انسان کو یہ حق ہے کہ اپنے آگے جھکنے کا کسی دوسرے انسان سے مطالبہ کرے ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس چیز کا مطالبہ کرسکتا ہے کہ وہ آقا کے حکم اور اس کی ہدایت کی پیروی کرے اس معاملہ میں پیروی کرنے والا آمر ہوگا۔ اور پیروی نہ کرنے والا مامور کیونکہ جو نیابت کا حق ادا کرتا ہے، وہ حق نیابت ادا کرنے والے سے افضل ہے۔ مگر فضیلت کے معنی یہ نہیں کہ وہ خود اس کا آقا ہے

نیابت اور امانت کا منصب ہر انسان کو شخصاً شخصاً حاصل ہے، اس میں کوئی مشترک ذمہ داری نہیں ہے، اس لئے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہ ہے نہ ایک پر دوسرے کے عمل کی جوابدہی عائد ہوتی ہے نہ ایک کو دوسرے کے عمل کا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے نہ کوئی کسی کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کرسکتا ہے اور نہ کسی کی غلط روی کا وبال دوسرے پر پڑسکتا ہے۔

انسان جب تک زمین میں ہے اور جب تک مٹی کے پتلے (جد انسانی) اور خدا کی پھونکی ہوئی روح میں تعلق باقی ہے، اس وقت تک وہ خدا کا نائب ہے۔ یہ تعلق منقطع ہوتے ہی وہ خلافت ارضی کے منصب سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد قدرتی طور پر اس کے زمانہ

نیابت کے افعال و اعمال کی جانچ پڑتال ہونی چاہیئے اس کے سپرد جو امانت کیگئی تھی اس کا حساب کتاب ہونا چاہیئے اس پر نائب ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں اُن کی تحقیقات ہونی چاہیئے کہ اس نے ان کو کس طرح انجام دیا، اگر اس نے غبن، خیانت، نافرمانی بغاوت اور نافرض شناسی کی ہے تو اس کو سزا ملنی چاہیئے۔ اور اگر ایمانداری، فرض شناسی اطاعت گوشی سے کام کیا ہے تو اس کا انعام بھی ملنا ضروری ہے!

(باقی)

از

جناب ذوقی شاہ صاحب

ہر کلام اپنے کلیم کے کمالات معنوی کا آئینہ ہے۔ ہر کلام اپنے کلیم کی رفعتِ شان، فضیلت علمی، وسعت نظر اور خصوصیات ذاتی کی جانب رہنمائی کرتا ہے لیکن اس رہنمائی سے ہر کس و ناکس یکساں طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتا، فائدہ اٹھانے کے لئے انسان میں ایک گونہ اہلیت کی ضرورت ہے کسی فن کی کتاب کا مطالعہ کیجئے، جب تک اس فن سے آپ کو کسی قدر مناسبت نہ ہوگی جبتک اس فن کے مبادیات سے آپ کافی حد تک آگاہ نہ ہوں گے، جبتک ایک اہلیت خاص آپ میں اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کی حاصل نہ ہو جائے گی آپ اس کتاب سے کما حقہ، مستفید نہ ہوسکیں گے، ایک طب کی کتاب کا حق جس خوبی سے ایک طبیب ادا کرسکتا ہے وہ شخص جو طب سے نا آشنا ہے ہرگز نہ ادا کرسکے گا۔ طلب علم کے لئے اگر کتاب کا صرف کتاب ہونا ہی کافی ہوتا تو مبتدیوں کو منتہیوں کی کتابوں کا مطالعہ اتنا ہی مفید ثابت ہوتا جتنا کہ منتہیوں کو۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہر جماعت کے طلبار کے لئے ان کی استعداد کو ملحوظ رکھکر کورس تجویز کیا جاتا ہے اور اس تخصیص و تقسیم کا لحاظ نہ رکھنا نہ صرف غیر مفید بلکہ بسا اوقات مُضر ثابت ہوتا ہے۔ صرف طلب علم ہی پر موقوف نہیں۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کسی چیز کے مفید یا غیر مفید، مُضر یا غیر مُضر ہونے میں اہلیت کو بہت کچھ دخل ہے۔ آپ ایک تلوار کسی نا اہل کے ہاتھ میں دیدیجئے، روپیہ کسی نا اہل کی جیب میں ڈالدیجئے، حکومت کسی نا اہل کے حوالہ کردیجئے۔ پھر دیکھئے کیا تماشہ نظر آتا ہے'۔

اس مناسبت کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو کسی تصنیف کے مضامین و مطالب پر حاوی ہونے میں زیادہ ممد و معاون اور بصیرت مطلوبہ کے حصول میں زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہے، وہ مصنف کی ذات کے متعلق کسی قدر آگاہی ہے۔ اگر آپ مصنف کی طبیعت کی افتاد، اس کے انداز بیان، اس کے ذاتی رجحانات اس کے مزاج کی سنجیدگی و متانت یا شوخی اور چلبلے پن سے واقف ہیں۔ اور جس فن کی تصنیف کا آپ مطالعہ فرما رہے ہیں اس فن سے بھی آپ کچھ مناسبت رکھتے ہیں تو یقیناً اس تصنیف سے آپ زیادہ لطف اور زیادہ نفع اٹھا سکتے ہیں بہ نسبت اس شخص کے جو اس فن سے تو کسیقدر مناسبت رکھتا ہے مگر خصوصیات مصنف کا عارف نہیں۔

یہ سب ملکر تین چیزیں ہوئیں جو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

(۱) مضمون خاص سے مناسبت۔

(۲) مطالعہ کتاب۔

(۳) مصنف کے متعلق قدرے عرفان۔

ان کا ارتباط باہمی اور آپس میں ایک دوسرے پر منحصر ہونا مبتدی کے لئے سخت مشکل پیدا کرتا ہے، مناسبت کے بغیر مطالعہ کتاب بے سود ہے اور مطالعہ کے بغیر مناسبت نہیں پیدا ہوتی۔ تصنیف پر عبور حاصل کئے بغیر مصنف کی ذاتی خصوصیات سمجھ میں نہیں آتیں اور مصنف کی ذاتی خصوصیات سمجھے بغیر کوئی طالب العلم تصنیف کی گہرائیوں میں نہیں اتر سکتا۔ ایسی صورت میں ایک مبتدی جو ان تینوں باتوں سے محروم ہے، جس کے ہاتھ میں زنجیر کی ان تین کڑیوں میں سے ایک بھی نہیں کیونکر اپنے مقصود تک رسائی پا سکتا ہے؟ ایک چوتھی کڑی ایجاد کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ جو ان تین کڑیوں اور طالب العلم کے درمیان بہ آسانی واسطہ بن سکے۔ اس چوتھی

کڑی کا نام استاد ہے جس کے بغیر طالب علم کا حصول مراد تک پہنچنا محال ہے تفہیم قرآن کی بحث میں یہی نکتہ ضرورتِ نبوت کو ظاہر کرتا ہے۔

کلام الٰہی سے بھی سب یکساں طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں بھی ع

بعض را ہادی و بعضے را مُضِل

کا مضمون پیش آتا ہے۔ حق تعالیٰ خود فرماتا ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ۔ (۲: ۲۶)

"گمراہ کرتا ہے ساتھ اس کے بہتوں کو اور راہ دکھاتا ہے ساتھ اس کے بہتوں کو۔ اور نہیں گمراہ کرتا ساتھ اس کے مگر فاسقوں کو۔"

صاف فرما دیا گیا ہے کہ جہاں قرآن سے لوگ بکثرت ہدایت پاتے ہیں وہاں بکثرت ایسے لوگ گمراہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی بھی صراحت فرما دی گئی ہے کہ گمراہ وہی ہوتے ہیں جن کے دل فسق و فجور کی نجاست سے آلودہ ہوں۔ پھر ایک دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَّجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا۔ (۱۷: ۴۵ و ۴۶)

اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے درمیان ایک پردہ مستور حائل کر دیتے ہیں۔ اور ہم ان کے دلوں پر حجاب ڈال دیتے ہیں جس سے وہ اس (قرآن) کو سمجھ نہیں سکتے اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دیتے ہیں۔

بھلا ایسے محجوبین کو قرآن عظیم سے کیا نفع حاصل ہو سکتا ہے اور حقائق و معارف قرآنی پر ان کی نگاہ کیسے جا سکتی ہے اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ:-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْن — یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں فرماتا (۶ : ۱۴۵)

جب ظالم لوگوں کی ہدایت کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا ہے تو قرآن سے وہ کیونکر رہنمائی پا سکتے ہیں، ظالموں کی فہرست میں جو لوگ شامل ہیں ان کی تفصیل بھی قرآن ہی سے دریافت کر لیجئے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (۳۱ : ۱۳) "تحقیق کہ شرک بڑا ظلم ہے"

ثابت ہوا کہ شرک قرآن کے فہم اور اس سے ہدایت کے حصول میں سدّ راہ ہے۔ یہاں شرک جلی یا شرک خفی کی کوئی تخصیص نہیں۔ ہر شرک باعث گمراہی ہے۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۶۵ : ۱) "اور جو شخص اللہ کے (قائم کردہ) حدود سے نکل جائے تحقیق کہ اس نے اپنی جان پر ظلم کیا"

وہ حدود قوانین قدرت سے متعلق ہوں، یا قوانین اخلاق سے، یا قوانین رواج سے یا قوانین شریعت سے جو شخص ان حدود سے تجاوز کرے گا۔ وہ اس اعتدال اور اس اہلیت سے محروم ہے، جو قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (۲ : ۱۴۰) اور ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کا اخفا کرے جو اس کے پاس منجانب اللہ پہونچی ہو"

یورپ و امریکہ کے وہ مستشرقین و مصنفین اور بزعم خود وہ محققین جو قومی ملکی اور ذاتی تعصب کی بنا پر دیدہ و دانستہ اسلام کی صورت کو مسخ کر کے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور آیات اللہ اور ان کی خوبیوں کو چھپاتے ہیں۔ ان کے لئے بھی خزائن قرآنی کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے، لہٰذا جو کچھ وہ اسلام کے متعلق کہتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں اس کو اسلام اور قرآن کی

صحیح تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْہِ شَیْءٌ (۶:۹۴)

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹی تہمت لگائے یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی بھی وحی نہیں آتی۔"

اس آیت کی رو سے جو لوگ پیغمبر ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں اور غلط مشہور کرتے ہیں کہ انہیں الہام ہوتا ہے اور اپنے جھوٹے الہامات کو بڑی آب و تاب سے شائع کرتے ہیں وہ سب کے سب مع اپنے حواریوں اور اپنی جماعت کے لوگوں کے قرآن کے صحیح مفہوم تک پہنچنے سے قاصر ہیں ان لوگوں کی غلط تفسیر اور رکیک تاویلات پر اعتماد کرنا اپنے آپ کو صریح گمراہی میں ڈالنا ہے

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (۶:۱۴۵)

"پس اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے تاکہ لوگوں کو بغیر علم کے گمراہ کرے یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کی ہدایت نہیں فرماتا۔

غلط فتویٰ دینا اور غلط مسائل بیان کرنا اور متنبہ ہو جانے کے بعد بھی اپنی غلطیوں پر اڑ نا بھی اللہ پر تہمت بندی ہے جو لوگ غلط باتیں حق تعالیٰ سے منسوب کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں خواہ گمراہی سیاسیات سے متعلق ہو یا اقتصادیات سے یا تمدنی امور سے عبادات میں ہو یا معاملات میں بہرحال اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو اپنے جہل سے یا تابع نفس ہو کر حلال اور حلال کو حرام قرار دینے والے ان ظالموں میں شمار کئے گئے ہیں جن سے ہدایت چھین لی گئی ہے اور مفہوم قرآن کے متعلق ان کے اقوال مستند نہیں۔

فَقَدْ جَآءَکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَّبَ

پس تحقیق تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک کتاب واضح اور ہدایت اور رحمت آ چکی ہے تو اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو ہماری ان آیتوں کو جھٹلا دے

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا (۶ : ۱۵۸) اور ان سے گریز کرے۔

ثابت یہ ہوا کہ ادیان باطلہ کے متبعین جو کہ قرآن کے کھلم کھلا منکر ہیں معانی قرآن کے حامل اور مفسر قرآن کسی صورت سے نہیں ہو سکتے۔ مزید غور کیجئے کہ حق تعالیٰ کیا فرماتا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۔(۱۸ : ۵۷)

"اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس کو اُس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے پھر وہ اس سے روگردانی کرے اور اپنے ہاتھوں کے کرتوت کو بھی دل سے بھلا دے تحقیق ہمنے ایسے لوگوں کے دلوں پر پردہ ڈالدیا ہے کہ وہ سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے دلوں میں ڈاٹ لگادی ہے (بدیں وجہ) اگران کو راہ راست کی جانب بلاویں تب بھی وہ سیدھے راستہ پر ہرگز ہرگز نہ آویں گے

جس طرح اپنے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق حق تعالیٰ زہر کھانے والے کو ہلاک کر دیتا ہے۔ آگ میں ہاتھ رکھنے والے کا ہاتھ جلا دیتا ہے۔ ٹھنڈے پانی سے پیاسے کی پیاس بجھا دیتا ہے، اسی طرح ضد ہٹ دھرمی کبر و غرور کی وجہ سے حق بات نہ سننے نصیحت قبول نہ کرنے، اور اپنی بد اعمالیوں کی پرواہ نہ کرنے سے حق تعالیٰ انسان کو قبول حق کی صلاحیت اور تفقہ فی الدین کی دولت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کے لئے کوئی روشنی نہیں۔

وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔(۲ : ۱۴۵)

اگر آپ اہل کتاب کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس کچھ علم آچکا ہے تو یقیناً ایسی صورت میں آپ کا بھی شمار ظالموں میں ہوگا

کیسی شدید وعید ہے ان لوگوں کے حق میں جو دیدہ و دانستہ دوسروں کی ناجائز خواہشات کی

پیروی کرنے لگتے ہیں۔ نہ صرف دوسروں کی بلکہ اپنی خواہشات نفس کی پیروی بھی ہدایت سے محروم کر دیتی ہے۔ کیونکہ اپنے نفس کو معبود بنا لینا اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینا بھی شرک ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵:۲۳)

کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا اور (باوجود اسکے) اللہ نے اس کو باوجود علم (رسمی) کے گمراہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی سماعت اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی بینائی پر پردہ ڈال دیا۔ بھلا ایسے شخص کو بعد اس کے کہ اسے خدا نے گمراہ کر دیا ہو کون راہ راست پر لا سکتا ہے پس کیا نصیحت نہیں پکڑتے۔

حرص و ہوا کے بندے مشرک ہیں ظالم ہیں اور ہدایت ربانی سے محروم ہیں قرآن سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت ان لوگوں میں نہیں ہوتی دوسرے موقع پر حق تعالیٰ منکر قرآن و مائل بہ دنیا و مطیع نفس کی بابت فرماتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ (۷:۱۷۶)

اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے لیکن وہ دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے لگا پس اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے یا اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا پس آپ اس حال کو بیان کر دیجئے تاکہ وہ لوگ کچھ غور و فکر کریں

اس نوعیت کے لوگوں کی بابت آگے چلکر اسی سورۂ اعراف میں آیا ہے کہ:۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷: ۱۷۹)	"ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے ہی نہیں اور انکی آنکھیں ہیں جنسے وہ دیکھتے ہی نہیں۔ اور اُن کے کان ہیں جنسے وہ سنتے ہی نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہ لوگ غافل ہیں"

اندھے بہرے خالی الذہن جانور بلکہ جانوروں سے بھی بدتر لوگ بھلا حقائق و معارف قرآنی تک کیسے راہ پا سکتے ہیں۔ دو گروہ ہیں دونوں میں فرق۔ مومن و کافر نیک و بد اہل و نا اہل دونوں میں زمین و آسمان کا فرق، دونوں کی صلاحیت میں فرق۔ دونوں کے فہم میں فرق۔ دونوں کے انجام میں فرق:۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔ (۱۱: ۲۴)	مثال دونوں کی ایسی ہے جیسے کہ ایک تو اندھا بھی ہو اور بہرا بھی اور دوسرا دیکھنے والا بھی اور سننے والا بھی کیا دونوں یکساں ہیں؟ پس کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے۔

حق تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (۴۰-۲۸)	تحقیق اللہ تعالیٰ مسرف کذاب کی رہنمائی نہیں فرماتا

معلوم ہوا کہ جملہ اقسام کی اقتصادی و اخلاقی بے اعتدالیاں صلاحیت ہدایت کے منافی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ہے (۶: ۹۱) بَيَانٌ لِّلنَّاسِ ہے

مگر وَ هُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِيْنَ بھی ہے (۳: ۱۳۷) یعنی دنیا کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھانے کی اپنے میں صلاحیت پیدا کر سکتا ہے مگر فائدہ اٹھاتا وہی ہے جو اپنے میں اس کی صلاحیت پیدا کرے ؛۔

لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶: ۷۹) "نہیں ہاتھ لگاتے اس کو مگر پاک لوگ"

جس طرح نجاست ظاہری کی حالت میں قرآن کے ظاہر کو ہاتھ لگانا منع ہے اسی طرح نجاست باطنی کی حالت میں قرآن کے باطن کو بھی ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔ صاف فرما دیا گیا ہے کہ:۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲ : ۲) "ہدایت ہے متقین کے لئے۔

هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰: ۵۷) ہدایت و رحمت برائے مومنین۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (۱۷: ۸۲) اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیز کہ اس میں شفا و رحمت ہے برائے مومنین اور زیادتی خسارہ برائے ظالمین"

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ (۴۱: ۴۴) آپ کہدیجئے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لئے تو ہدایت و شفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے اور قرآن ان کے حق میں نابینائی ہے اور یہ لوگ (بوجہ نا اہل ہونے کے) ایسی جگہ سے پکارے جاتے ہیں جو ان کے لئے بڑی دور ہے"

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۔ (۶۹: ۴۸ و ۴۹ و ۵۰) اور بلاشبہ یہ قرآن متقیوں کے لئے نصیحت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض اس کی تکذیب کرتے ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ قرآن کافروں کے لئے حسرت ہے"۔

متذکرہ بالا آیات قرآنی پر غور کرنے سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن فہمی کیلئے
بھی صلاحیت کی ضرورت ہے اور اس صلاحیت کے حصول کے لئے صرف عربی دانی ہی کافی نہیں بلکہ
تزکیہ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کی بھی بڑی ضرورت ہے معصیت وفسق و فجور کی جانب دل
میں رغبت، عقیدہ میں ضعف یعنی شک و شبہ کی بیماری کا دل پر تسلط، شرک جسکا مقام اصلی
قلب ہے، طبیعت کی بے اعتدالیاں، اخفاء حق پر آمادہ کرنے والی دل کی شرارتیں کذب و بہتان
نفس امارہ کی غلامی، حب دنیا طلب جاہ و شہرت، یہ تمام باتیں باطنی خرابیوں پر دلالت کرتی
ہیں اور یہ جملہ باطنی خرابیاں قرآن سے محرومی کا باعث قرار دی گئی ہیں۔ برعکس اس کے تقویٰ
اور ایمان وہ باطنی خوبیاں ہیں جنکی بدولت قرآن ہدایت و رحمت ثابت ہوتا ہے، اس میں شک نہیں
کہ قرآن علی الاطلاق ہدایت ہے مگر اس ہدایت کا حصول منحصر کر دیا گیا ہے شرح صدر پر حق تعالیٰ
فرماتا ہے:—

فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (۶ : ۱۲۶)

پس جسکو ارادہ فرماتا ہے اللہ کہ ہدایت فرمائے کسی کو تو شرح صدر عطا فرماتا ہے یعنی کشادہ فرمادیتا ہے اس کے سینہ کو اسلام کے لئے۔

اور جب کسی کو شرح صدر کی دولت سے نوازتا ہے تو اسے اپنے نور خاص سے ممتاز فرما دیتا ہے

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ (۳۹ - ۲۲)

پس جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک نور پر ہوتا ہے یعنی اللہ کی عطا کردہ روشنی میں چلتا ہے۔

اسی سلسلہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جب یہ نور سینہ میں داخل ہوتا ہے تو
سینہ کھل جاتا ہے اصحاب کرام نے جب اس حالت کی شناخت کے لئے آپ سے ظاہری علامات دریافت کیں تو فرمایا

آپ نے فرمایا کہ علامات یہ ہیں کہ دار الغرور یعنی دنیا سے دل ہٹ جاتا ہے اور آخرت کی جانب رجوع ہو جاتا ہے اور ایسا شخص موت کے آنے سے پہلے موت کے لئے تیار رہتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ حدیث بھی روایت کی گئی ہے کہ:۔

"جس وقت دیکھو تم بندہ کو کہ اس کو دنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی عطا کی جاتی ہے تو نزدیکی ڈھونڈو اس سے اس لئے کہ تحقیق اسے تعلیم دی جا رہی ہے حکمت کی" بیہقی فی شعبۃ الایمان

ثابت ہوا کہ وہ علم جو حقیقۃً حکمت ہے اور جسے اللہ و رسول نے بھی حکمت فرمایا ہے تزکیۂ نفس اور طہارت باطن ہی کی صورت میں عطا فرمایا جاتا ہے یہی حکمت وہ حکمت ہے جس سے یکسوئی اور اطمینان قلب کی دولت نصیب ہوتی ہے اور جملہ امور میں بصیرت صحیحہ پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ جس چیز کو غلط طور پر حکمت سمجھ لیا گیا ہے اس سے بجز انتشار و پراگندگی و تاریکی و توہمات و پستی و بربادی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

طہارت باطنی کے حصول کے لئے اُستاد کی ضرورت ہے سنت الٰہی اسی طرح جاری ہوئی ہے۔ ہماری ہدایت کے لئے قرآن ہی پر اکتفا نہ فرمایا گیا بلکہ قرآن کو ہمارے لئے مفید بنانے اور ہماری ہدایت کی تکمیل عمل میں لانے کی غرض سے قرآن کے ساتھ ہمارے پاس رسول بھیجا گیا جو روزمرہ کی زندگی میں رات دن ہمارے ساتھ مل جل کر استاد بن کر ہم میں رہا بسا ہمیں قرآن سنا کر قرآن سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ہم میں صلاحیت پیدا کی اور اس صلاحیت کے پیدا کرنے کے بعد ہمیں قرآن کی تعلیم دی اور قرآن کی گہرائیوں میں ہمیں اتارا یعنی حکمت کی تعلیم دی!۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲:۲)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے بھیجا ان پڑھوں کے درمیان انہیں میں سے ایک پیغمبر جو پڑھتا ہے ان لوگوں کے سامنے آیتیں اللہ کی اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے ان کو کتاب و حکمت"۔

پیغمبر کے فرائض یہاں علی الترتیب بیان فرما دئے گئے ہیں۔

(۱) تلاوت قرآن۔

(۲) تزکیۂ امت۔

(۳) تعلیم قرآن وحکمت۔

تلاوت قرآن کے ضمن میں علم مجمل بھی آگیا عمل کے لئے علم اجمالی کی ضرورت ہے۔ اس لئے سب سے پہلے علم اجمالی کا فیضان ہے پھر عمل ہے جس سے تزکیہ نفس اور تصفیہ بطون کے حصول میں معاونت ہوتی ہے۔ تصفیہ بطون کے بعد علم تفصیلی اور حکمت آموزی کا نمبر آتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا میں نے رسالہ انوار القدس میں جو اس زمانہ میں بمبئی سے شائع ہوتا تھا ایک اور عنوان کے تحت میں مسئلہ کے اس پہلو پر مندرجہ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی تھی کتاب کے ساتھ کتاب سکھانے والا بھی بھیجا جاتا ہے۔ نسخہ کے ساتھ طبیب بھی آتا ہے بلکہ پہلے طبیب مبعوث ہوتا ہے پھر اس طبیب کی وساطت سے نسخہ مرحمت ہوتا ہے پھر وَيُزَكِّيهِمْ وہ طبیب جملہ ظاہری وباطنی بیماریوں کی آلائش سے امت کو پاک کر دیتا ہے پھر وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ وہ طبیب اس نسخہ اور حکمت کی تعلیم کو دوسروں کو بھی دے دیتا ہے تاکہ وہ لوگ بھی اسی طرح دوسروں کی ظاہری وباطنی بیماریوں کو دور کر دیا کریں۔ اور لوگوں کی زندگیوں کو پاک بنا دیں۔

کسی عقلمند شخص کو انکار نہ ہوگا کہ مریض اپنی صحت کے لئے نسخے اور طبیب دونوں کا محتاج ہے۔ بلکہ نسخہ سے زیادہ طبیب کا محتاج ہے اور طبیب کے نہ ہونے کی صورت میں نسخہ اس کے لئے بیکار بلکہ بسا اوقات مضر ثابت ہوتا ہے اس دنیا کے کارخانہ میں عموماً دیکھا گیا ہوگا۔ کہ ایک طبیب جسے طب کی کتابوں پر پورا عبور رہا اور لوگوں کے علاج میں بھی جس کا تجربہ بڑھا ہوا ہو جب کسی پیچیدہ مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو باوجود اپنی طبی معلومات اور اپنے طبی تجربہ کے وہ اپنے لئے ایک دوسرے

طبیب کا محتاج ہوتا ہے تمام دنیا کا طبی ذخیرہ اس کے لئے بیکار ثابت ہوتا ہے تاوقتیکہ کسی ہم جنس کی صورت برزخ بنکر اس کے اور طبی ذخیرہ کے درمیان واسطہ نہ بنے۔ کاغذ کے اوراق اوران پر سیاہ وسفید نقوش ہجنسی کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے روحانیات میں بھی مفیض اور مستفیض کے درمیان مناسبت کی اشد ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَوْ جَعَلْنٰہُ مَلَکًا لَّجَعَلْنٰہُ رَجُلًا یعنے اگر لوگوں کے لئے ہم کسی فرشتہ کو بھیجتے تو اس کو بھی مرد ہی کی صورت بنا کر بھیجتے۔

اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل عبث نہیں۔ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ وہ زبردست حکمت والا ہے، اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ وہ اگر چاہتا تو صرف قرآن مجید بلاواسطۂ رسول نازل فرمادیتا لیکن کیا کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ محض ایک آسمانی کتاب کا کسی عجیب و غریب طریق سے زمین پر نازل ہوجانا دنیا میں وہ انقلاب پیدا کر دیتا جو ایک مظہر اتم انسان کامل کی زبردست شخصیت اور بابرکت ذات سے پیدا ہو گیا کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ ایام جاہلیت کے اپنو عرب اور سادہ لوح بدویوں نے جس قرآن کے ذریعہ ہدایت حاصل کی اور ایک بہترین قوم بن گئے، وہی قرآن بغیر اس کے کہ اس میں ایک زبر یا زیر کا بھی فرق ہوا ہو اب بھی موجود ہے۔ یورپ کا وہ علم دوست طبقہ اسے پڑھتا ہے اس کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں شائع کرتا ہے اس پر حاشیے چڑھاتا ہے بزعم خود اس کی تفسیر کرتا ہے۔ مگر اسے سمجھ نہیں سکتا اس سے ہدایت نہیں پاتا۔ زمانۂ حال کے تعلیمیافتہ لوگ تسخیر برق و دخان میں ذہن رسا رکھنے والے آلات ہلاکت کی ایجاد میں یدطولیٰ رکھنے کے مدعی۔ زمین پر بیٹھے بیٹھے آسمانوں کی پیمایش اور ستاروں کے طول و عرض اور رفتار گردش کا اندازہ کر لینے والے دنیا کے تمام علوم سابقہ کے خزانچی مترجم اور نقاد عرب کے جاہل بدویوں سے بھی کیا عقل و فہم میں بودے نکلے کہ جس قرآن مجید کی بدولت دنیا کی

بدترین قوم بہتریں قوم بن گئی۔ اُس قرآن مجید کے بیش بہا خزانوں تک رسائی پیدا کرنے میں نہ ان کی دوربینیں کسی کام آتی ہیں اور نہ ان کی "ایکس ریز" سے مطلب براری ہوتی ہے۔ اس محرومی کی آخر وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عرب کے لوگوں کو جو مُعلّم الکتاب والحکمہ نصیب ہوا تھا وہ اہل یورپ کو نصیب نہیں ہوا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو امت کے دیگر افراد پر جو فضیلت حاصل ہے اس کا باعث اسی معلم الکتب والحکمت کی صحبت یا فیض ہے۔ قرآن تو جو اصحاب رسول نہیں ان کو بھی ملا۔ اور انہوں نے قرآن کی خدمتیں بھی بڑی بڑی کیں۔ ترجمے کئے، تفسیریں لکھیں، عمل کیا، تعلیم دی۔ مگر صحابہ کے مرتبہ کو نہ پہنچے۔ اصحاب کے بعد تابعین کا مرتبہ ہے کیونکہ انہیں اصحاب کی صحبت نصیب ہوی۔ پھر ان کے بعد تبع تابعین کا رتبہ ہے کیونکہ انہیں تابعین کا فیضان صحبت نصیب ہوا۔ مقربین کی صحبت سے روگردانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغیر اس کے کہ صحیح بصیرت پیدا ہو انسان اپنے فہم ناقص پر بھروسہ کرکے اپنے لئے خود ہی قرآن وحدیث سے مسائل استنباط کرنے لگتا ہے اور بزعم خود مجتہد بن بیٹھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنے پیر میں کلہاڑی مار لیتا ہے اور مثل اس جاہل مریض کے جو کتابیں دیکھ دیکھ کر اپنا علاج خود ہی کرتا ہے اپنی ہی غلط تشخیص اور غلط علاج کی بدولت ہلاک ہو جاتا ہے۔

اسلام میں جو بہتّر فرقے آجکل مسلمانوں کے انتشار و اضمحلال کا باعث ہو رہے ہیں۔ انہیں سے جس فرقے سے جاکر پوچھیے اپنے عقائد کی تائید میں قرآن وحدیث ہی سے سند پیش کرے گا۔ ہر فرقہ کو ایک الگ فرقہ کسی ایسے شخص نے بنایا جسے اپنے علم وفضل کے متعلق انتہا درجہ کا گھمنڈ تھا۔ اور جسے ایک گروہ جید عالم بھی سمجھتا تھا۔ مگر باوجود اس کے وہ صراط مستقیم سے ہٹ گیا اور گمراہ ہو گیا اور دوسروں کی بھی گمراہی کا باعث بنا۔ اس خرابی کا اصلی باعث یہی ہوا کہ قرآن وحدیث کے سمجھنے کے لئے صرف ونحو

اور لغت دانی کو کافی سمجھا گیا اور تاویلات کے لئے اپنی ذہانت پر پورا اعتماد کر لیا گیا فہم صحیح مذاق سلیم
اور بصیرت صادقہ کے حصول کے لئے جن امور کی ضرورت تھی ان سے استغنا برتا گیا فہم قرآن کی چابی
اس وقت تک ہاتھ نہیں آتی جبتک کہ تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن سے بندہ آراستہ نہ ہو جائے۔ جبتک کہ
کفر و شرک و نفسانیت و بغض و حسد و ریا و حب دولت و مال و حب جاہ و حشمت و رغبت دنیا و نظر
بر ماسوائے اللہ کی نجاستوں اور پلیدیوں سے بندہ کا باطن پاک و صاف نہ ہولے حلاوت قرآن اور
قرآن کا صحیح فہم نصیب ہونا محال ہے اور یہ وہ روحانی امراض ہیں جن کے دفعیہ کے لئے مریض کسی
روحانی طبیب کا محتاج ہے۔ روحانی طبیب سے استفادہ کئے بغیر انسان قرآن پاک کی اصلی نعمتوں
سے محروم رہتا ہے"۔

اسی طبیب روحانی کو ابتدائے مضمون میں لفظ استاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اطباء امت جُبہ
و دستار سے نہیں بنتے جبہ پوش علماء کے ہاتھ سے دستار بندی کی سالانہ رسم کی ادائگی سے نہیں پیدا ہوتے
طول طویل تقریروں کی گرج اور تقریروں کے سیلاب سے انکا خمیر نہیں اٹھتا، بلکہ نبی برحق کی متابعت ظاہری
و باطنی اور مشکوٰۃ نبوۃ سے، اقتباس انوار کی برکت سے کمالات نبوی سے وہ علیٰ قدر مراتب مزین ہوتے
ہیں۔ اور نیابت رسول و وراثت نبی کا حق ادا کرتے ہیں۔ جبتک کہ مبلغین کا گروہ ان کمالات ظاہری
و معنوی کو حاصل نہ کریگا تبلیغ کا حق ادا نہ کر سکے گا۔ اگر آپ یورپ، مادہ پرست یورپ خدا کے نام
تک سے برگشتہ یورپ' انا ربکم الاعلیٰ کی صدائے فرعونی لگانے والے یورپ کی کثیف و
تاریک و تباہ کن فضاء میں اللہ کی حیات بخش اور جان پرور آواز کسی با اثر طریقے سے پہونچانے کے
متمنی ہیں۔ اگر آپ ممالک اسلامی کے برائے نام مسلمان باشندوں کو سچا اور پکا مسلمان بنانے کے آرزو مند
ہیں۔ اگر آپ مشرق کے مغرب زدہ لوگوں کو مغربی تاریکی کی روسیاہیوں سے بچانے کے خواہشمند ہیں
اگر آپ اپنے پیارے رسول کی امت مرحومہ میں ہونے کا حق ادا کرنے اور پیروی، رسول کے ذوق میں

بَلِّغ مَا اُنزِلَ اِلَیکَ کی تعمیل کا کوئی جذبہ اپنے دل میں پاتے ہیں۔ تو خدا کے لئے مبلغین کی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو مبلغین کے اوصاف ضروری سے متصف ہو۔ چھاپہ خانہ کی آہنی مشینیں بخدا ان اوصاف سے بالکل خالی ہیں، طباعت رسالت کا فرض انجام دینے سے قاصر ہے۔ ایک جماعت کی ضرورت ہے جیتے جاگتے بیدار متحرک انسانوں کی جماعت نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھکر سچے پکے مسلمانوں کی جماعت مبلغین کی جماعت کی ضرورت ہے جو اللہ کے کلام پاک کی صحیح معنوں میں تبلیغ کرے۔ پھر وہ جماعت ضرورت زمانہ پر نظر ڈالکر خواہ درس تدریس سے، خواہ لکچروں اور تقریروں سے، خواہ کوئی اور صورت پیدا کرے۔ بہر حال یہ سب وقتی عارضی، اور ہنگامی چیزیں ہونگی۔ اصل چیز جو مستقلاً ان کے اور دوسروں کے کام آئیگی اور جو ان تمام ہنگامی صورتوں میں جان ڈالدیگی وہ ان کی ذاتی اخلاقی، روحانی، ایمانی اور صدق و اخلاص وللّٰہیت کی باطل شکن قوت ہوگی۔ جبتک کسی تبلیغی تحریک کے پس پشت یہ ذی روح یہ باطل شکن صدق پرور قوت نہ ہوگی غیر ذی روح کاغذ کے بوجھل بنڈلوں اور پیسہ دو پیسہ میں آنے جانے والے پکٹوں سے مطلب براری ہرگز نہ ہوگی۔

افسوس ہے کہ ہندوستان میں صحیح قسم کے مبلغین کی جماعت تیار کرنے کا کسی معروف تعلیمگاہ میں کوئی معقول انتظام نہیں ہے کہیں کچھ ہوتا بھی ہے تو ظاہری اور رسمی علوم کی تعلیم کسی طرح کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ کسی با اثر شیخ کامل و مکمل کی زیر نگرانی ایک باقاعدہ خانقاہ کا افتتاح کیا جائے جس میں طالب دنیا نہیں، طالب شہرت نہیں، طالب وجاہت نہیں، بلکہ طالب اللہ پیدا کئے جائیں۔ یہ طالب اللہ تزکیہ و تصفیہ کے ضروری مراتب طے کرکے اور اس شیخ کامل سے باقاعدہ تعلیم و تلقین و تربیت حاصل کرکے معانی قرآن کے سچے حامل نہیں، تعلیم قرآن کا چلتا پھرتا نمونہ ہوں، اخلاق نبوی کا صحیح پرتو ہوں، اطوار اُن کے اسلام کا آئینہ ہوں۔ روش ان کی مقبول

خاص و عام ہو پھر دیکھیں کہ قرآن کے انوار یورپ و امریکہ کے تاریک گوشوں اور ممالک تاریک کی اخلاق سوز اور مذہب شکن فضاء میں کیسے روشنی نہیں پھیلاتے۔ یورپ ان انوار کا محتاج ہے ساری دنیا ان انوار کی محتاج ہے جو اضطراب، بربادی، اور خطرات آجکل دنیا کو پریشان کر رہے ہیں وہ صرف قرآن ہی کی شعاعوں سے دور ہو سکتے ہیں، اسی قرآن کی روشنی دنیا کے لئے رحمت ثابت ہوگی۔ ورنہ نجات کی کوئی دوسری صورت امکان میں نہیں۔ لہذا اچھے اور موثر پیرایہ میں قرآن کی تبلیغ صرف اسلام ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے مفید ہے۔ یہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے اور عالمگیر تحریک کا محتاج ہے کسی ایک شخص کے کرنے کا کام نہیں ایک جماعت کا کام ہے اور جماعت بھی سمجھدار، معقول پسند، مخلص، نیک نیت، پاک طینت قوی العزم، اور متوکل باللہ لوگوں کی۔ اس برگزیدہ جماعت کے برگزیدہ حضرات اپنی انفرادی اور مجموعی کوششوں سے منفعت عامہ کے اس کار عظیم کا بیڑا اٹھائیں اور اللہ کی پیدا کی ہوی دنیا میں اللہ کے نام کا بول بالا کریں۔ صدق و خلوص اور توکل و ایمان کی قوت سے اللہ کا نام لیکر ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید غیبی کا ہماری امداد کے لئے بڑھنا بالکل یقینی ہے۔ صرف اٹھ کھڑے ہونا ہمارا فرض ہے۔ کیا ہم اپنے اس فرض کی ادائیگی کے لئے تیار ہیں؟۔

از

مولانا عبداللہ العمادی

(۱)

تورات کی سِفرِ تثنیہ (کتابِ استثناء) میں ہے۔

پروردگار "سینا" سے آیا، اور "سعیر" سے ان پر تاباں ہوا،

اور "جبلِ فاران" سے روشن ہوا، اور "قدس" کے ٹیلوں سے آگیا" (۳۳ : ۲)

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جس میں چار مقامات سے نورِ الٰہی کی تنویر و تابانی کے اشارے ہیں

"سینا" سے جو طورِ سینا کا دوسرا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نورِ نبوت کا افاضہ ہوا اور

بنی اسرائیل کو غلامی سے آزادی دلانے کی تمہید بندھی۔"

کوہ "سعیر" سے جو بنی آدم کا پہلا مسکن تھا، احبارِ یہود اسے "ادوم" بھی کہتے ہیں کہ آدم کی نسبت

نمایاں رہے، عرب اس کو "جودی" یا اس سے متعلق قرار دیتے ہیں جو سفینۂ نوحؑ کی قرارگاہ اور نسلِ آدم کی تجدید کی جائے

"فاران" کے جبالِ مکہ ہونے میں کیا کلام ہے جو دنیا کے لئے آخری شرعِ الٰہی کا محلِ نزول ہے

"قدس" بیت المقدس، یا ہیکلِ سلیمانؑ، فلسطین کا پورا علاقہ ہے جہاں رفعِ مسیحؑ سے چند ساعت پہلے

دنیا کو "فارقلیط" کی بعثت اور دین کا تمام مکمل کئے جانے کی بشارت ہوئی تھی۔

والتین، والزیتون، وطورِ سینین، وھٰذا البلدِ الامین، میں بھی

تنویر کے جلوے ہیں۔

تورات نے جس پہاڑی کو "سعیر" اور مفسرین تورات نے جس کو "ادوم" قرار دیا ہے اسکا قدیم نام "جبل التین" تھا، عکرمہؓ "تین" و "زیتون" دونوں کو دو پہاڑ کہتے ہیں اور عبداللہ بن العباسؓ "تین" کا محل وقوع کوہ جودی کا ایک قلّہ قرار دیتے ہیں جہاں حضرت نوح علیہ السلام عبادت کرتے تھے اور اسی لحاظ سے اس کو "مسجد نوح" بھی کہتے تھے۔ انسانی تاریخ کا یہ عظیم واقعہ پیش آیا تھا جس کی جانب کلام اللہ میں اشارہ ہے۔

قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّن مَّعَكَ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ۔

"زیتون" وہی پہاڑ ہے جس پر مسیح علیہ السلام نے اپنے رفع سے پیشتر "فارقلیط" (نبی آخر الزماں) کی بشارت دی ہے۔ (لوقا ۲۲: ۳۹-۵۲)

"طور سینین" پر قوم موسیٰ کو نعمت حریت عطا ہونے کا مژدہ ملا جس کا نتیجہ یہ تھا۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا، وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ۔

"بلد امین" وہی تورات کا "فاران" ہے جہاں تاریخ کا وہ سب سے بڑا واقعہ پیش آیا کہ خود کلام اللہ نے اس کی تشریح فرمائی۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ

یہ چار مقامات ہیں جہاں نظام عالم میں عظیم ترین تبدل و تغیر کے بڑے سے بڑے واقعات پیش آئے۔ انہی کو دین بھی کہہ سکتے ہیں یعنی جزا یا محل جزا۔ یہ مقامات جو دینی تغیر کے

آنے بڑے مشاہدہ ہو چکے ہیں۔ انہیں کو شہادت بنا پیش کیا ہے کہ ایسے ایسے مشاہدات علمی کے بعد اب کسی کی کیا مجال کہ تکذیب دین کر سکے اور کرے بھی تو کیا اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین نہیں ؟

ایک بڑی جماعت ایسی بھی ہے جو سورۃ التین میں "تین و زیتون" کی تاویل انجیر و زیتون سے کرتی ہے۔ اس فریق کا استدلال یہ ہے :۔

الف۔ انجیر کی خصوصیت اس لئے قابل تذکرہ ہے کہ یہ غذا بھی ہے۔ میوہ بھی۔ اور دوا بھی

ب۔ انجیر بہترین میوہ ہے۔

ج۔ انجیر زود ہضم ہے ملین طبیعت ہے۔ اس سے بلغم کم ہوتا ہے۔ گردہ کے لئے مفید ہے ریگ مثانہ کی دوا ہے۔ بدن فربہ ہوتا ہے جگر و طحال کے مسامات کھل جاتے ہیں۔ بواسیر و نقرس و گنددہنی کو نافع ہے انجیر کھانے والے پر فالج نہیں اثر کرتا۔ بدن کے فضلات خارج ہوتے ہیں بال بڑھتے ہیں

د۔ انجیر کا ظاہر و باطن دونوں یکساں ہے، نہ اخروٹ کی طرح اوپر چھلکا اور اندر مغز ہے اور نہ چھوارے کی طرح اوپر مغز اور اندر گٹھلی ہے؛

ھ)۔ درخت تین طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ جو وعدہ کرے اور وفا نہ کرے۔ مثلاً آم کے وہ درخت جن میں پھول آتے ہیں۔ اور پھل نہیں آتے۔ دوسرے وہ جو وعدہ بھی کرے اور وفا بھی۔ مثلاً سیب کا درخت کہ پھولتا بھی ہے اور پھلتا بھی۔ ایک وہ درخت جو وعدہ (پھول) سے پہلے ہی وفا (پھل) کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ درخت انجیر ہے۔ اور اس کی یہ خصوصیت بینظیر ہے۔

و) انجیر کے پھل سال میں کئی مرتبہ آتے ہیں۔

ز) خواب میں انجیر کا دیکھنا برکت کا سبب ہے۔

ح) حضرت آدم (علیہ السلام) نے جب خدا کی نافرمانی کی اور حلۂ بہشتی اتر گیا۔ تو انجیر کے پتوں سے ستر پوشی کی تھی۔

ط) حضرت آدم جب بہشت سے باہر نکلے ہیں۔ تو انجیر کے چند پتے ساتھ تھے۔ سامنے ہرن نظر آئے آپ نے وہ پتے کھلا دیے اسی کا اثر تھا کہ ہرن میں مشک پیدا ہونے لگا"

اتنے فواید و برکات جس چیز میں ہوں اس کو ترجیح کیوں نہ دی جاتی؟

زیتون کا کیا کہنا قرآن خود اس کو مبارک کہہ چکا ہے (شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ) اس کی قسم کھانے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ظاہرا حاجت تقریر و بیان این ہمہ نیست۔

ان توجیہوں کی ظاہری شکل و شباہت ممکن ہے خوشنما ہو لیکن انجیر کو سب سے بہتر میوہ کہنے کا کوئی علمی ثبوت موجود نہیں۔ متعدد میوے ایسے ہیں جن میں غذائیت بھی ہے۔ اور دوائیت بھی۔ انجیر کے جن افعال و خواص پر زور دیا جاتا ہے طب جدید کی رو سے ان میں تھوڑی ہی باتیں ثابت ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ جتنی توجیہیں ہیں سب شاعرانہ ہیں ظاہر و باطن کا یکساں ہونا اور "دو طلب بنے ویں تو مزا اسمیں سوا ملتا ہے" کے اصول پر عملدرآمد رکھنا انسان کے لئے صفت ہو تو ہو نباتات کی اس سے کیا قدر بڑھ سکتی ہے۔ انار بھی سال میں کئی مرتبہ پھلتا ہے۔ ترنج میں پھل تو پہلے آتے ہیں اور اس کے بعد پھولتا ہے "میوہ دہد پیش پس آرد بہار" مخزن اسرار میں نظامی نے اسی بنا پر ایک نہایت لطیف مضمون پیش کیا ہے لیکن کیا اس مضمون آرائی سے حقیقت بھی آراستہ ہوگئی؟ خواب و خیال کا مسئلہ کوئی علمی مسالہ نہیں ہے کہ اس پر کسی استدلال کی بنیاد نہیں ہے۔

حضرت مسیح سے پیشتر کے دنیاوی واقعات کی تحقیق تو علمی دنیا کر ہی نہ سکی بہشت کی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل معلوم ہونے کا کیا ذریعہ ہے اور ایسے جزئیات کے لئے تاریخی ثبوت

لہ عجیب بات یہ ہے کہ امام رازی جیسے محقق بھی ان تمام دلائل کا تذکرہ جائز سمجھ رہے ہیں۔

(جلد ۸ صفحہ ۷۵۸ و ۷۵۹)

کہاں سے آئے تلمود کو ایسے خلاف عقل دعوے شاید پھبتے ہوں لیکن قرآن ایک صریح غلط بیانی کا کیوں کر حامی ہو سکتا ہے، اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ اہل عرب خود کہہ رہے ہوں کہ:-

فان المسك بعض دم الغزال (مشک بھی ہرن کے خون ہی کا ایک جزو ہے)!

بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے پہلے ان آیتوں کو سن لینا چاہیے جن میں تین و زیتون کا تذکرہ ہے۔ سورۃ التین میں ہے:-

والتین والزیتون و طور سینین و ھذا البلد الامین۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل سافلین الا الذین امنوا وعملوا الصالحات فلھم اجر غیر ممنون فما یکذبك بعد بالدین۔ الیس اللہ باحکم الحاکمین؟

انجیر (میوے) اور زیتون (درخت) اور طور سینین (پہاڑ) اور اس شہر (مکہ) کی قسم جس میں ہر طرح کا امن ہے کہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا۔ پھر ہم اس کو (بوڑھا کرکے) کمتر سے کمتر مخلوق کے درجے میں لوٹا لائے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کئے (ان کو تنزل پیری سے دل تنگ نہ ہونا چاہیئے کیونکہ ان کے لئے تو (آخرت میں) اجر ہے بے انتہا (تو اے پیغمبر اب) کون ہے جو ان سب باتوں کے معلوم کئے پیچھے (روز جزا کے بارے میں) تم کو جھوٹا سمجھے کیا خدا سب حاکموں سے بڑا حاکم (اور قدرت والا) نہیں ہے (تو منکرین قیامت اس سے کیوں نہیں ڈرتے)[1]۔

[1] اس ترجمے نے جو مولوی نذیر احمد صاحب سے ماخوذ ہے آیت کے مفہوم میں اور بھی پیچیدگی پیدا کر دی۔ اب تک تو تین و زیتون ہی کے ساختے تھے اب ایک اور گورکھ دھندا آ پڑا۔ ثم رددناہ اسفل سافلین الا الذین امنوا وعملوا الصالحات فلھم اجر غیر ممنون کا لفظی ترجمہ صرف اتنا ہے کہ پھر ہم اس کو (یعنی انسان کو) کمتر سے کمتر مخلوق کے درجہ میں لوٹا لائے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے تو اجر بے حد ہے۔ مولوی صاحب یہ سمجھے کہ کمتر سے کمتر مخلوق کے درجے میں لوٹا لانے کا مطلب انسان کو بوڑھا بنا دینا ہے لیکن بعد کے منشا نے وقت یہ پیدا کر دی کہ کمتر سے کمتر مخلوق کے درجے میں لوٹا لانے کی صفت اس شخص کی ہونا چاہیئے جو ایماندار

اِن آیات میں اتنی باتیں مذکور ہیں۔

الف- چند خاص چیزیں جن کا تقدس عرب سے نکل کر اہلِ کتاب میں بھی ضرب المثل تھا۔ خدا نے ان کی قسم کھائی ہے یعنی انھیں اپنی خدائی کا شاہد قرار دیا ہے (قرآن کے محاورہ میں قسم سے شہادت ہی مراد بھی ہوا کرتی ہے)۔

(ب) لوگوں کو جزا و سزا میں شک تھا اس لئے اچھی طرح توضیح کر دی کہ انسان خود اپنی حالت کیوں نہیں دیکھتا کتنی اچھی ساخت کی اس کی آفرینش ہوئی تھی اور پھر اپنی بداعمالیوں سے کتنی بُری حالت کو پہنچ جاتا ہے، لوگ ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں۔ سوسائٹی میں خاطر خواہ عزت نہیں ہوتی جو غور کرے تو اپنی نگاہوں میں آپ چھوٹا نظر آتا ہے اس کے مقابلہ میں جن لوگوں کے عقائد و اعمال دونوں اچھے ہوں زمانہ بھی انہیں اچھا سمجھتا ہے، خود ان کا ضمیر ان کی عزت کرتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو اسی عزت میں اجر غیر ممنون (جزاء عمل) مضمر ہے۔ ان کھلم کھلا مثالوں پر جو تقریباً ہر شخص کے لئے پیش آتی ہیں جزا و سزا کا انکار کیوں کر ممکن ہے۔ ذرا ادھر سے حکام تو بدلے لیتے دیتے رہتے ہیں۔ پھر کیا خدا جو سب سے بڑا حاکم ہے وہ اس پر قادر نہیں ہے؟

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵) و نیک کردار نہ ہو بوڑھا ہونا اگر اس آیت کا مطلب ہوتا تو بوڑھے تو مومن و کافر اچھے بُرے سب ہی ہوتے ہیں اس لیے اتنی تمہید آپ نے اور باندھی کہ نیک کردار مومنین کو "تنزل پیری سے دل تنگ نہ ہونا چاہئے" حالانکہ یہ صریح زیادتی ہے ہم مانتے ہیں کہ یہ اضافہ مولوی صاحب کا خود ساختہ نہیں ہے لیکن وہ شخص جو اجتہاد کا مدعی ہو کسی کی کمزوریاں اس کی پردہ پوشی نہیں ہو سکتیں! امام رازی تک کو اس کمزوری کا اعتراف ہے اور وہ بھی اس تاویل کے ساتھ استثناء کو منقطع مانتے ہیں (رازی طبع مصر ۱۳۰۷ جلد ۸ صفحہ ۴۵۹) "اجر غیر ممنون" کا صحیح ترجمہ اجر غیر منقطع ہے جس کو دوسرے مقام پر "عطاء غیر مجذوذ" فرمایا ہے "اجر بے انتہا" کے لئے آخرت کی قید بھی ہم صحیح نہیں سمجھتے کفار تو آخرت کے قائل ہی نہ تھے (ابن جریر جلد ۳۰ صفحہ ۱۳۵) پھر اس ترغیب کو وہ کیوں ماننے لگے" فما یکذبک بعد بالدین" کا ترجمہ "تو اے پیغمبر (کون ہے جو ان باتوں کے بعد) معلوم کرے (کہ) پیچھے (روز) جزا کے بارے میں تم کو جھوٹا سمجھے" بھی درست نہیں قرآن کے محاورہ میں ما کا لفظ جہاں کہیں بھی آیا ہے اس کے معنی کیا۔ کے ہیں۔ کون کے نہیں ہیں ..... کون کا استعمال ذوی العقول کے لئے ہے اور اس کے لئے من کا لفظ آتا ہے۔ صحیح مفہوم یہ ہے کہ " تو اے انسان، اب کیا چیز ہے جو اتنے سارے شواہد کے بعد جزا و سزا کے باب میں تجھے جھٹلا سکتی ہے"۔

شہادت حسینؑ اور قرآن

از
مولوی سید ابوالخیر صاحب مودودی

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ قَالُوا: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ - أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۲: ۱۹)

لابد ہم تمھیں خوف اور بھوک اور مال وجان کے زیان اور پیداواروں کی تباہی میں ڈال کر تمھاری آزمایش کریں گے۔ جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بشارت دیدو کہ انجام کار فلاح وکامرانی انہی کے لئے ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: ہم اللہ ہی کے ہیں اور بالآخر ہمیں اسی کی طرف جانا ہے۔ یقیناً یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی جانب سے صلاۃ ورحمت ہے اور یقیناً یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں

حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعۂ شہادت میں شریعت حقۂ اسلامیہ کے بیشمار حقائق واسرار مضمر ہیں۔ میدان کرب وبلا جس مقدس قربانی کے طیب وطاہر خون سے رنگین ہوا، وہ محض شخصی واقعہ نہیں ہے؛ اور نہ محض عزم واستقلال، صبر وثبات، تحمل مصائب اور مردانہ وار جان سپاری کا قصہ ہے جسے ہم اتباع وپیروی کے لئے اسوہ بنائیں۔ بلکہ اس کا تعلق سرتاسر اسلام کی حقیقت سے ہے، وہ حقیقت جو حضرت ابراہیم واسمعیل علیہما السلام پر طاری ہوئی تھی اور دونوں راہ حق میں قربان کرنے کا

قربان ہونے کے لئے تیار ہو گئے تھے :

يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَى؟ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ، سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ، وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ! قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ - إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ - وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ - وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ، سَلَامٌ عَلَى إِبْرَاهِيمَ - (۳۷: ۹۹-۱۰۴)	بیٹا میں نے خواب میں دیکھا کہ تجھے (اللہ کے نام پر) ذبح کر رہا ہوں - دیکھ تیری کیا رائے ہے - کہا - اے باپ جو حکم دیا گیا ہے اس کو بے تامل کر گذرئیے انشاءاللہ آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے پس جب وہ دونوں اللہ کے آگے جھک گئے اور (باپ نے بیٹے کو) ماتھے کے بل گرا دیا تو ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا محسنین کو ہم ایسی ہی جزا عطا کرتے ہیں بے شک یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی - اس کے فدیہ میں ہم نے ایک بڑی قربانی دیدی - اور آنے والی امتوں میں اس واقعہ عظیم کی یادگار قائم کر دی پس سلام ہو ابراہیم پر -

کہ دونوں نے بے تامل گردنیں جھکا دیں - یہ تھی اسلام کی حقیقت جو مقام خلت پر فائز باپ بیٹوں پر طاری ہوئی - اور اسی انقیادِ حقیقی، اسی اطاعت کامل، اسی ایثار و فدویت نفس و جان کو امۃ وسطٰی کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ -

محبت و رضاء الٰہی اور دعوۃ و تبلیغ حق کی راہ میں انبیاء علیہم السلام نے جو قربانیاں پیش کیں، اور جن مصائب و آلام کی آزمائشوں سے ان کی جانچ کی گئی - اور یہ منزل مردان حق و مجاہدین سبیل اللہ کی راہ میں آتی ہے تا معلوم کیا جائے کہ ان میں کون مجاہد و صابر ہے: -

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَ أَخْبَارَكُمْ -

لیکن خانوادۂ نبوت و رسالت کی پوری تاریخ میں کوئی قربانی کوئی مصیبت کوئی ابتلا کوئی آزمائش بجز ملت حنیف کے مورث اعلیٰ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے واقعۂ اسلام کے شہید کربلا کی آزمائش سے زیادہ سخت و جان گداز نہیں تھی اسی بنا پر مفسرین امامیہ اس طرف گئے ہیں کہ وفدیناہُ بذبحٍ عظیم سے مراد امام حسین علیہ السلام کا واقعۂ شہادت ہے، اور اس باب میں انہوں نے ائمہ اہل بیت کرام علیہم السلام کے آثار بھی نقل کئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کی جس حقیقت کا ظہور زمین خشک سال میں اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات سے ہوا تھا، امام حسین علیہ السلام نے کربلا کے ہولناک بیابان میں اس کی تکمیل کردی ظہور، رضائے الٰہی کے آگے جھک جانے میں ہوا تھا، اور تکمیل رضا برضائے الٰہی کے ساتھ حراست ادنیٰ سے ادنیٰ مقاصد بھی سعی و جہد چاہتے ہیں اور جو مقصد جتنا زیادہ اعلیٰ و اہم و اکبر ہوتا ہے اتنے ہی بڑے جہاد کا طالب ہوتا ہے۔ ولذالک قال الاعرابی۔

لاتحسب المجد تمراً انت اٰکلہ　　　لن تبلغ المجد حتیٰ تلعق الصبرا

پھر وہ مجد و شرف عزیز جس سے زیادہ کوئی مجد و شرف نہیں، اور وہ مقصد عظیم و جلیل جو تمام مقاصد میں اقصیٰ الغایات ہو اس کا حصول کتنا پر تعب اور کس قدر صبر آزما ہوگا:۔

لن تنالوا ما تحبون الا بالصبر علی ما تکرھون ولا تبغون ما تھوون الا بترک ما تشتھون

جس کو تم محبوب رکھتے ہو وہ تمہیں کبھی حاصل نہ ہوگا جبتک خوشی اور خندہ پیشانی کے ساتھ مکروہات کو برداشت نہ کرو۔ اور جس کو تم چاہتے ہو اس تک تمہاری رسائی نہیں ہوگی۔ جب تک کہ تم اپنی نفسانی خواہشیں ترک نہ کردو۔

حضرت ابراہیم کا سر جب اتنے بتوں کے آگے نہ جھکا جن کی پرستش ان کی قوم کرتی تھی، اور ان کا قلب سلیم اجرام سماوی کی درخشاں سطوت سے بھی مرعوب نہ ہوا، اور انہوں نے کہا:۔

انی لا احب الافلین.... انی وجہت وجہی للذی فطر السموٰت والارض وما انا من المشرکین ؛ میں فنا پذیر ہستیوں کو دوست نہیں رکھتا..... میں نے اپنا منہ اس کی طرف کر لیا ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

تو لازم ہوا کہ ان کے اس دعوی کی آزمائش کیجائے۔ کہا گیا پہلے اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھو کہ شرک صرف ماسوی اللہ کی پرستش ہی نہیں ہے بلکہ ما دون اللہ میں الجھاؤ اور محبوبات اور مالوفات میں مشغولی بھی شرک ہے۔ مسیح نے کہا ہے :- ایک نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا" پھر ایک قلب میں ہزار دل محبتیں کیسے پرورش پا سکتی ہیں۔ اور وہ جس کی سمائی ارض و سما کی وسعتوں میں نہیں ہو سکتی اس قلب کو اپنا کاشانہ کیسے بنا سکتا ہے جس میں زن و فرزند کی محبت اور زر و جواہر کے قناطر مقنطرہ کی الفت بھی حکومت فرما ہو۔ وہ بے تامل بڑھے اور انہوں نے بیٹے کے گلے پر چھری رکھدی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام پر نسبت ابراہیمی کا غلبہ تھا۔ جیسا کہ بعض ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے ماثور ہے۔ انہوں نے کہا: وامرت ان اسلم لرب العالمین. مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس کے آگے جھک جاؤں جو تمام جہان کا پروردگار ہے میں اپنا سر اللہ کے آگے جھکا چکا ہوں اور جو سر اللہ کے آگے جھک گیا وہ غیر اللہ کے آگے نہیں جھک سکتا حکم ہوا اپنی رگ جان کے خون سے اپنے اس ایمان کی شہادت دو۔ ایمان سچا ایمان تھا نہ صرف اپنی رگ جان کے خون سے شہادت دی بلکہ اپنے اہل بیت اور اصحابؓ کے خون سے بھی اس پر مہریں لگائیں۔ فرمایا :" ہم سے صرف یہی نہیں کہا گیا ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہوں تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم جو کچھ ہو اس کے ساتھ اس کی طرف پھر جاؤ۔ وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم۔ تو اس کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کے ساتھ قلوب کا اس حقیقت اسلامی کی طرف متوجہ ہونا بھی ضروری ہے

جو اس مرکز عبادت کے بنانے والے پر طاری ہوئی تھی۔ اور اس حقیقت کو صبر و ثبات کیساتھ اپنے
اندر قائم کر لینے کے لئے کہا گیا کہ قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ
تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی ذات میں بہترین نمونہ ہے اور وہ نمونہ یہی الٰہی قربانی تھی
جس کی بنا پر کہا گیا کہ بیشک وہ مشرکین میں سے نہیں ہے اور اپنی ذات سے پوری ایک اطاعت
شعار امت ہے، اور اس نے اپنے تئیں اللہ کی رضا میں اسطرح فنا کر دیا ہے کہ خود اس کی اپنی کوئی ہستی
باقی نہیں رہی۔ یعنی اس نے نہ صرف یہ کہ راہ الٰہی میں اپنی قوم کو چھوڑا اور کہا: وبدا بیننا و
بینکم العداوۃ والبغضاء ابدًا حتیٰ تومنوا باللہ وحدہٗ ہمارے اور تمہارے
درمیان کھلی کھلی عداوت اور دشمنی ہے ہمیشہ کے لئے حتی کہ تم خدائے واحد پر ایمان لاؤ، بلکہ
اپنے بیٹے کو بھی جو بڑھاپے کی دعاؤں کا نتیجہ تھا، رضاء الٰہی میں قربان کرنے سے دریغ نہ کیا۔ انّ
ابراھیم کان امۃ قانتاً للہ حنیفا ولم یک من المشرکین۔ اور جو کچھ کہا گیا مطلب کو
واضح تر کرنے کے لئے کہا گیا، ورنہ استقبال وجوہ الی المسجد الحرام کے اختصاص میں یہ سب کچھ موجود
ہے اگر مسجد حرام کی بنا میں کوئی خصوصیت نہ ہوتی تو کیوں کہا جاتا ومن حیث خرجت
فول وجھک شطر المسجد الحرام۔ حالانکہ انفس و آفاق کا کوئی گوشہ نہیں جس میں اس کا
نور حیات بخش نہو۔ مگر یاد رکھو کہ مسجد حرام کی طرف متوجہ ہونا ارکان صلوٰۃ میں سے صرف ایک رکن
ہے لیکن اس کے کہن سال بنانے والے کی اس الٰہی قربانی کو اپنے اندر قائم کر لینا شرط اسلام ہے
اور ہمارے نزدیک نماز درست نہیں ہوتی جبتک یہ شرط پوری نہ ہو۔ کیا نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں بوجہ قیام وقعود پھول کر پھٹ پھٹ جاتے تھے اور آپ کو خبر نہوتی
تھی اور ابو تراب کے جسم سے حالت نماز میں تیر نکالا گیا اور اذیت محسوس نہ ہوئی۔ یہی حقیقت اسلامی
ہے جس کی اقامت و دوامت کا حکم دیا گیا ہے اور جو ہر مومن و مسلم سے دن میں کم از کم پانچ مرتبہ چود

اپنے نفس کے مقابلہ میں اور ان لوگوں کے مقابلہ میں جو اللہ کی زمین پر فساد بپا کرتے ہیں اسکے مقررہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ جہاد و قربانی چاہتی ہے پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ان لوگوں کا ساتھ دوں جو اسلام میں فتنہ کی تخم ریزی کر رہے ہیں۔ اللہ کی زمین پر فساد پھیلانا چاہتے ہیں اور وہ باتیں کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں ہوئیں۔ اللہ کہتا ہے۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ مگر وہ مال جمع کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں تو اپنے استقرار امر کے لئے رشوتوں میں۔ اللہ کہتا ہے وامرھم شوریٰ بینھم۔ مگر وہ شوریٰ ترک کرتے ہیں، اور جبراً اپنی بات منوانی چاہتے ہیں۔ امامت و خلافت امت کی صلاح و فلاح کے لئے ہے ضلالت و ہلاکت کے لئے نہیں۔ ایسے امام سے امت کیا فلاح پا سکتی ہے جس کا شیوہ ہوا نفس کی غلامی ہے، جو علانیہ معصیت کرتا ہے جو سکیرو خمیر ہے، جو حدود اللہ سے تجاوز کر چکا ہے یزید کی خلافت دراصل اسی بات کا اعلان ہے کہ اب امت مسلمہ میں کوئی صالح و متقی انسان باقی نہیں رہ گیا ہے الاقوہ الاودی شاعر جاہلی نے کہا ہے۔

لا یصلح الناس فوضیٰ لاسراۃ لھم ولا سراۃ اذا جھالھم سادوا

لیکن میں خاموش رہوں گا حتی کہ وہ وقت آئے جو اس لئے مقرر ہو چکا ہے، اور ہوگا جو کچھ کہ ہونا ہے"

یہ وہ کلام ہے جو حضرت امام حسین علیہ السلام نے محمد بن حنفیہ سے اس وقت کہا جبکہ امیر معاویہ نے مدینۂ مبارکہ آکر یزید کی ولایت عہد کے لئے بیعت طلب کی، اور علی بن الحسین، زین العابدین علیہ السلام سے بروایت حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا ماثور ہے اور امالی شیخ مفید کے ذریعہ ہم تک پہونچا ہے۔

باقی۔

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوا کریگا
مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے
ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینہ کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول
ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی صاحب
رعایت کا مطالبہ نہ فرمائیں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ اپنے نمبر خریداری کا حوالہ
ضرور دینا چاہیئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں
لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر مضمون شائع کرے۔

منیجر

جلد (۲) عدد (۱)

محرم سنہ ۱۳۵۲ ہجری

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم و معارف قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مُرتب

سید ابوالاعلیٰ مودودی

باہتمام

مولوی ابو محمد صاحب مصلح

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا

قیمت سالانہ صہ

قیمت فی پرچہ ۸ر

۷۸۶

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فاتحہ

الحمد للہ الذی انزل الینا کتاباً فیہ ھدیً و شفاء للناس، و یسرہ لنا لنذکربہٖ وارسل الینا عبدہ و رسولہ محمداً صلی اللہ علیہ وسلم۔ بالھدیٰ و دین الحق یتلوا علینا اٰیاتہ ویزکینا ویعلمنا الکتٰب والحکمۃ، ویخرجنا من الظلمٰت الی النور۔

یہ رسالہ اپنی زندگی کے چھ مہینے پورے کرنے کے بعد آج ایک دوسرے مرحلے میں قدم رکھ رہا ہے جو پہلے مرحلے سے زیادہ کٹھن اور دشوار ہے۔ کٹھن اور دشوار صرف اسی معنی میں نہیں کہ اس کے پیش نظر اب پہلے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ بلکہ اس معنی میں بھی کہ جن ہاتھوں میں وہ منتقل ہو رہا ہے وہ پہلے کام کرنے والے ہاتھوں سے زیادہ کمزور ہیں۔ اب تک اس رسالہ کی تحریر و ترتیب ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جس نے برسوں سے اپنی زندگی کو قرآن اور صرف قرآن کی خدمت کیلئے وقف کر رکھا ہے، جس کے لئے قرآن کے ذکر اور قرآن کی تعلیم و تبلیغ کے سوا دنیا کی کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہے، جس نے قرآن کے کام کو اوڑھنا اور بچھونا بنا لیا ہے اور قرآن کی طرف دعوت دینے میں جس کا انہماک اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ دنیا کے ہر انہماک کو اس پر رشک آتا ہے ایسے شخص کے لیے سب سے بڑی قوت اس کا خلوص، اس کی تن دہی اور اس کا ایثار ہے جو ہر مشکل سے مشکل امر میں کامیابی کے لئے ضامن ہوتا ہے۔ مگر اب یہ کام اس شخص کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ جو انکسار کے طور پر نہیں اعتراف حقیقت کے طور پر اپنی کمزوری، اپنی بیچارگی، اپنی بے مایگی کو تسلیم کرتا ہے۔ اور ہر شخص سے زیادہ خود اپنے عجز و درماندگی سے واقف ہے۔

ایک طرف یہ ضعف و ناتوانی ہے۔ دوسری طرف پیش نظر کام ہے۔ کہ اسلام کو اس اصلی روشنی میں پیش کیا جائے جس میں قرآن حکیم نے اس کو پیش کیا ہے۔ اور قرآن حکیم کی تعلیمات اور اس کے حقایق و معارف کو اُس طریق سے بیان کیا جائے جس طریقہ سے سلف صالح نے ان کو بیان کیا ہے۔ کہنے کو یہ کام بہت آسان ہے۔ صرف دو جملوں میں اس کا ماحصل ادا کر دیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مشکوٰۃ نبوت سے بعد علم صحیح کی کمی، سلامت قلب و سداد نظر کے فقدان، یونانی تفلسف، عجمی موشگافی، مغربی تشکیک، اور سب سے بڑھ کر خود پرستی، عقلیت کے گھمنڈ اور ہوائے نفس کے اتباع نے ہمارے اور معارف قرآنی کے درمیان ایسے پردے ڈالدئیے ہیں کہ جو قرآن آسان کیا گیا تھا وہ اب سب سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ جو نہ صرف روشن بلکہ روشن گر، نہ صرف نور بلکہ نیر تھا وہ اب خود اپنی اصلی شکل میں نظر نہیں آتا۔ جو اس لئے آیا تھا کہ ہم کو سیدھا راستہ دکھائے، جو آنکھوں کو دیکھنے، کانوں کو سننے، دلوں کو سمجھنے کی دعوت دینے آیا تھا وہ اب خود نہ دکھائی دیتا ہے، نہ کانوں میں اترتا ہے، اور نہ دلوں تک پہنچتا ہے۔ قریب قریب ایک ہزار برس سے اس سراج منیر، اس نور مبین، اس شمع ہدایت پر اسرائیلیات، یونانیات، عجمیات، اور فرنگیات کے توبرتو پردے ڈالے جا رہے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ میں چاہے تحریف نہ ہوئی ہو، مگر معانی کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں، حقائق چھپ گئے ہیں، تعلیمات مستور ہو گئی ہیں، اور ان فوائد کا حصول کم اور کم تر ہوتا چلا جا رہا ہے جن کے لئے یہ کتاب نازل کی گئی تھی۔ فلسفیوں کے نظریات، منطقیوں کے اصول، طبیعیوں کے قواعد، فلکیوں کی تشریحات، مورخوں کے بیانات، قصہ خوانوں کے قصے، غرض ہر وہ چیز جس کو قرآن اس کی تعلیم، اور اس کی ہدایت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے قرآن کی تفسیر و تاویل میں دخل پاگئی ہے۔ اور اس کے برعکس رسول اللہ کی سنت اور اصحاب و اہل بیت کے اقوال و آثار اور مشکوٰۃ نبوت سے قریب ترین اکتساب کرنے والوں کے بیانات کو جن پر فہم قرآن منحصر ہے اس سے خارج یا قریب قریب بے تعلق کر دیا گیا ہے۔

ان حالات میں قرآن مجید کو اس کی اصلی صورت میں پیش کرنا اس کے حقائق و معارف کو اس سیدھے اور صاف طریقے سے سمجھنا اور سمجھانا جس سے قرآن اول کے سچے مسلمان سمجھتے اور سمجھاتے تھے، ایک بڑا مشکل کام ہے۔ اور اس مشکل کام کے لئے اس رسوخ علم، سلامت قلب، اور طہارت نفس و روح کی ضرورت ہے جس کی قلت میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں، قرآن مجید ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت پاکیزگی کی ہے کہ قرآن ھدی للمتقین ہے۔ جس طرح قرآن کے اوراق کو چھونے کے لئے جسم کی پاکیزگی ضروری ہے اسی طرح اس کے معانی، اس کے معارف، اس کی روح تک رسائی حاصل کرنے کے لئے نفس و روح کی پاکیزگی بھی لازم ہے جس کا دوسرا نام تقوی ہے۔ اس کے بغیر انسان بجائے ہدایت پانے کے الٹا گمراہ ہو جاتا ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَّمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (۲:۲۶) خدا اس قرآن سے بہتوں کو ھدایت دیتا ہے۔ اور بہتوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور گمراہ جن کو کرتا ہے وہ دراصل فاسق ہوتے ہیں۔

اس کے ساتھ رسوخ علم بھی ضروری ہے۔ جو متشابہات کو بھی محکمات کے درجے میں کر دیتا ہے۔ اور جس کے بغیر انسان اتنا کج نظر و کج فہم ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے محکمات بھی متشابہات ہو جاتی ہیں۔

مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳:۱) قرآن میں سے بعض آیتیں صاف و صریح ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں۔ اور بعض کے معانی مشتبہ ہیں۔ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ قرآن کے مشتبہ اور مبہم حصوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ اس سے فتنہ بپا کریں اور من مانی تاویلیں کیا کریں۔ اور جو علم میں رسوخ اور پختگی رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو قرآن پر ایمان لے آئے اس میں جو کچھ ہے ہمارے رب کی طرف سے ہے اور حق یہ ہے کہ جو عقل رکھتے ہیں نصیحت انہی پر کارگر ہوتی ہے۔

پس سلامتی کی راہ تو درحقیقت اس میں تھی کہ جو شخص رسوخ علم اور طہارت قلب کا مالک نہیں ہے۔ وہ "ترجمان القرآن" کی تحریر و ترتیب کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لیتا مگر کام کی دشواری اور اپنی کمزوری کو جاننے کے باوجود محض خدمت کے جذبہ نے مجھ کو اس دعوت کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا جو مجھے اس کام کی جانب دیگئی تھی۔ اور اس بھروسہ نے میری ہمت بڑھائی کہ جس خدا نے میرے دل میں یہ جذبہ پیدا کیا ہے وہی رسوخ علم، صحت فکر، سلامت قلب، اور طہارت نفس و روح بھی ارزانی فرمائیگا۔

"ترجمان القرآن" کے مقاصد میں سے ایک اہم اور ضروری مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کو قرآن کے سمجھنے میں مدد دیجائے اس مقصد کے ذیل میں یہ بھی آجاتا ہے۔ کہ ان شکوک و شبہات کو حل کیا جائے جو قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اس کے لئے "ترجمان القرآن" میں ایک مستقل باب رہیگا جس میں ہر شخص کو اپنی مشکلات اور اپنے شبہات پیش کرنیکا حق ہوگا۔ اور حتی الامکان ان کو حل کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ "حتی الامکان" میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا فاضل ہو۔ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ہر مشکل کو حل اور ہر شبہ کو رفع کر دینے پر قادر ہے۔ ایک شخص زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ اپنے علم و فہم کے مطابق لوگوں کے شبہات کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ باقی رہا ان شبہات کو بالفعل دور کر دینا اور ہر شخص کو کلیۃً مطمئن کر دینا تو یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں اس کا مدعی بھی نہیں ہوں کہ مجھ سے غلطی نہیں ہوسکتی ممکن ہے کہ کسی مسئلہ کے سمجھنے اور بیان کرنے میں خود میں غلطی پر ہوں ایسے مواقع پر میں امید کرتا ہوں کہ میری کسی غلطی کو قصد و اختیار پر محمول نہ کیا جائیگا۔ بلکہ ناواقفیت اور قلت فہم کا نتیجہ سمجھا جائیگا۔ اور اہل علم حضرات میری اصلاح کی کوشش فرمائینگے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی شخص مجھے غلطی پر اصرار کرنے والا نہ پائیگا۔

ایک بات مجھے "ترجمان القرآن" کے ناظرین سے بھی عرض کرنی ہے۔ اس رسالہ کے اجرا کا مقصد جلبِ زر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے رسائل نہایت محدود طبقوں میں مقبول ہوتے ہیں۔ اس لیے جو شخص ایسا کوئی رسالہ نکالتا ہے وہ پہلے ہی یہ سمجھ لیتا ہے کہ مالی منفعت کا حصول تو درکنار نقصان سے بچنا بھی مشکل ہے۔ لیکن یہ رسالہ جس دعوت کو پیش کر رہا ہے اس کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اس کا پیغام پہنچے، اور زیادہ سے زیادہ آدمی اس کی تعلیم سے مستفید ہوں۔ لہذا رسالہ کے ہر ناظر کو صرف ناظر و قاری ہی نہ ہونا چاہئے، بلکہ مبلغ اور داعی بھی ہونا چاہئے اور اپنے اپنے حلقہ میں اس کی اشاعت کی کوشش کرنی چاہئے۔ میرا کام رسالہ کو مفید اور مفید تر بنانا ہے۔ اور ناظرین کا کام اس کے حلقۂ اشاعت کو وسیع اور وسیع تر کرنا۔

تحریک قرآن اور ترجمان القرآن

از

جناب مولوی ابو محمد مصلح صاحب سابق ایڈیٹر ترجمان القرآن

تحریک قرآن سے ملک آشنا ہو چکا ہے۔ اور قریب قریب ہر طبقہ کے افراد عملاً اس میں شرکت فرما چکے ہیں۔ آیندہ اگر خدا کو منظور ہے تو بہت جلد ایک تنظیمی شکل پیدا ہو جائے گی اور پھر وہ جس سے چاہے گا اس سلسلہ میں کام لے گا۔

تحریک قرآن اپنے اندر بڑی وسعت رکھتی ہے اس کے اصول و فروع پر بحث کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ الاصلاح سہسرام، مذہب کلکتہ اور سلسلہ اشاعت قرآن حیدر آباد دکن کے تقریباً پانچ ہزار صفحات تحریک کے متعلقات اور توضیحات سے لبریز ہیں۔

نفس تحریک کوئی نئی چیز نہیں لیکن جس شکل میں اس چودھویں صدی کے اندر اس کو پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً جملہ تحریکاتِ ماضی و حال سے اپنے رنگ میں جدا ہے اور یہی اس کی خصوصیت ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اب تک جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے اس میں پندرہ آنے سے زیادہ محرک کے خیال کی ترجمانی ہوتی رہی ہے لیکن ضرورت اس امر کی تھی کہ دوسرے اہل قلم حضرات کے خیالات سے بھی عوام کو آگاہ کیا جائے۔ اور اس طرح ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے جو صرف قرآن مجید کے متعلق سوچے اور اسی کے متعلق لکھے تاکہ مسلمانوں میں یکرنگی پیدا ہو جائے۔

الحمد للہ ترجمان القرآن کے اجراء نے بہت جلد عملی شکل اختیار کی اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی جیسی شخصیت کے ظاہر و باطن کو مستقل طور پر خدا نے اس کے لئے منتخب فرما لیا۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

شفیق محترم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات تعارف کی محتاج نہیں۔ جمعیۃ علمائے ہند کا ارگن اخبار الجمعیۃ جس خوبی اور جس قابلیت کے ساتھ آپ کی ادارت میں نکلتا رہا ہے اسے عوام اور خواص سب ہی واقف ہیں اور خوش قسمتی سے ذاتی طور پر جن سے آپ کی ملاقات ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ الجمعیۃ اور ترجمان القرآن کی اڈیٹری کے لئے کس قدر صحیح انتخاب کا لفظ صادق آتا ہے۔ تصنیف کے اندر مصنف کی روح موجود ہوتی ہے اور قارئین کے اندر ایک حیثیت سے وہ حلول کر جاتی ہے۔ اس لئے اب ترجمان القرآن بھی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ظاہر و باطن اور قول و فعل کا آئینہ ہوگا اور پھر اس سے وہی مدعا حاصل ہوگا۔ جو اول روز سے نصب العین قرار پا چکا ہے۔

تحریک قرآن کی کامیابی کے سلسلہ میں سب سے پہلے دو کام کرنا طے پایا تھا۔ ایک تو فضا کا قرآنی فضا بنانا۔ دوسرے اشخاص کا پیدا کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہی کر سکتا ہے جو ہمہ قرآن ہو جس کے قول و فعل میں مطابقت ہو اور جس کا وظیفۂ حیات قرآن قرار پا چکا ہو۔

جیسا کہ کہا گیا ترجمان القرآن اسی مقصد عزیز کے حصول کے لئے جاری کیا گیا اور اس کے صفحات پر اسی امر کی کوشش کی گئی اور آیندہ بھی اس کا نصب العین یہی رہے گا اور خواہ اس کیلئے کتنی ہی زیادہ قیمت دینی پڑے سودا مہنگا نہ ہوگا۔ کیونکہ جو مقابلہ بھی کیا جا سکتا ہے جو قلعہ بھی سر کیا جا سکتا ہے جس نئی دنیا کو بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور جو باغ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ میدان کے صاف کرنے کے بعد زمین کے ہموار کر لینے کے بعد اور جان نثاروں کو صف میں لاکھڑا کرنے کے بعد پس اب یہی قرآنی فضا کا پیدا کرنا اور اشخاص کا مہیا کرنا ہی تحریک کی کامیابی کے لئے وقت کا سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔

"ترجمان القرآن" "مجلس تحریک قرآن مجید ممالک محروسہ سرکار عالی" کا پرچہ ہے۔ اور اس کے سب سے پہلے حامی و مددگار جناب نذیر جنگ بہادر ہیں۔ اور مجلس کے صدر جناب نواب سیف نواز جنگ

اور معتمد جناب نواب بہادر یار جنگ بہادر ہیں نیز ارکان میں بھی ایسے لوگ شریک ہیں جن کی ہر قسم کی اعانت ترجمان القرآن کے ساتھ رہی ہے اور رہے گی۔ اور جس سلطنت کے مرکز سے یہ شائع ہو رہا ہے اس کا دست اعانت تو معلوم نہیں کس کس گوشہ تک پہونچا ہوا ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ کائنات کے سب سے زیادہ مقدس کام اور دنیا کی سب سے زیادہ اہم اور ضروری تحریک اس سے محروم رہے اگرچہ دوسروں کی طرح اس کو نعوذ باللہ ایک دوسرا خدا انہیں بنا لینا ہے۔ اور جا و بیجا امداد پر ہی منحصر نہیں کر دینا ہے لیکن قرآن کی شان کو برقرار رکھتے ہوئے وقت آجائے تو سب کچھ قرآن کے لئے حاصل کر لیا جا سکتا ہے۔

"اب تک تحریک قرآن" اور ترجمان القرآن وغیرہ کو نہ تو امور مذہبی نے نوازا ہے اور نہ تعلیمات نے اور نہ ہی اس کے لئے کوشش کی گئی لیکن شاید یہ سب کچھ قدرت نے آئندہ کے لئے اٹھا رکھا ہو۔ اور مودودی صاحب اس سے وہ سب کچھ کر دکھائیں جس کے لئے دنیائے اسلام ہی نہیں بلکہ اقوام عالم بھی بے چینی کے ساتھ منتظر ہیں۔

ترجمان القرآن کی پہلی ششماہی ختم ہو چکی اور اب محرم الحرام ۱۳۵۲ھ سے نئے قالب اور نئی روح کے ساتھ مولنا ابو الاعلیٰ مودودی اپنی ادارت میں ملک و قوم کے سامنے پیش فرما رہے ہیں اس لئے میری تمنا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ان کو ان کے مقاصد عالیہ میں ہر طرح کامیاب فرمائے۔

ترجمان القرآن میں ہمارا خمیر بھی شریک ہے اس لئے اس درس روحانیت دینے والے رسالہ سے روحانی تعلق ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے جو کچھ کیا جائے گا وہ اپنا ہی عاقبت کا سود ہو گا۔

اسلام کے متعلق مسٹر جارج برنارڈ شا کے خیالات جرائد میں شایع ہو چکے ہیں حال میں جب انہوں نے مشرق کا سفر کیا تو اس کے دوران میں سنگاپور کے عربی اخبار الھدیٰ کا نامہ نگار ان سے ملا اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے پھر ایک مرتبہ اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آزادی دستوری و ذہنی حریت کا دین ہے، اجتماعی نقطہ نظر سے مسیحیت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کسی مذہب کا نظام اجتماعی اتنا مکمل نہیں ہے جتنا اسلام کا نظام ہے۔ دنیائے اسلام کا تنزل اسلام سے دور ہٹ جانے کی بدولت ہے مسلمان جب صرف اسلام کی بنیادوں پر جد وجہد کریں گے تو عالم اسلامی کا خواب بیداری سے بدل جائیگا۔

ان خیالات کے سننے کے بعد نامہ نگار نے سوال کیا کہ جب آپ اسلام کو اچھا سمجھتے ہیں تو پھر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو فطری طور پر ان بیانات کے بعد پیدا ہوتا ہے کیونکہ ایک سلیم الطبع آدمی کے لئے کسی چیز کے اعتراف قبح اور اس کے ترک اور کسی چیز کے اعتراف حسن اور اس کے قبول و تسلیم کر لینے میں کوئی حد فاصل نہیں ہے لیکن مسٹر شا نے جو کچھ جواب یا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قبول اسلام کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور ایسا نہ کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ صرف اس چیز کی کمی ہے جس کو شرح صدر کہتے ہیں۔

ایک مسٹر شا ہی پر موقوف نہیں ہے بہت سے اہل فکر و نظر پہلے بھی گذر چکے ہیں، اور اب بھی موجود ہیں جنہوں نے اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اس کے دنیوی یا دینی یا دونوں حیثیتوں سے مفید

ہونے کا اقرار کیا، اس کی تہذیب، اس کے نظام اجتماعی، اس کی علمی صداقت اور اس کی عملی قوت کی برتری تسلیم کی مگر جب ایمان لانے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے کا سوال سامنے آیا تو کسی چیز نے ان کو قدم آگے بڑھانے سے روک دیا، اور وہ اسلام کی سرحد پہنچ کر ٹھیر گئے۔

برعکس اس کے بہت سے ایسے آدمی بھی ہو گذرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسلام کی مخالفت اور اس کی دشمنی میں صرف کر دیا لیکن اسی مخالفت کے سلسلہ میں اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے حقیقت اسلام ان پر منکشف ہو گئی۔ اور اس انکشاف کے بعد کوئی چیز ان کو ایمان لانے سے روک نہ سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا راز بھی ایک عجیب راز ہے ایک ہی بات ہے جو ہزاروں آدمیوں کے سامنے کہی جاتی ہے۔ مگر کوئی تو اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ کوئی توجہ کرتا ہے لیکن وہ اس کے پردہ گوش پر سے اچٹ کر چلی جاتی ہے۔ کوئی اس کو سنتا اور سمجھتا ہے۔ مگر مانتا نہیں۔ کوئی اس کی تعریف و تحسین کرتا ہے مگر قبول و تسلیم نہیں کرتا۔ اور کسی کے دل میں وہ گھر کر جاتی ہے اور وہ اس کی صداقت پر ایمان لے آتا ہے۔

ہمارا شب و روز کا مشاہدہ ہے کہ ایک شخص کو بازار میں چوٹ لگ کر گرتے ہوئے سینکڑوں آدمی دیکھتے ہیں بہت سے اس کو ایک معمولی واقعہ سمجھ کر دیکھتے ہوئے گذر جاتے ہیں بہتوں کے دل میں رحم آتا ہے۔ مگر وہ افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں بہت سے اس کا تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اللہ کے بندے ایسے نکلتے ہیں جو بڑھ کر اسے اٹھاتے ہیں۔ اس سے ہمدردی کرتے ہیں اور اس کو مدد پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک مجرم کو پابزنجیر لیجاتے ہوئے بہت سے آدمی دیکھتے ہیں۔ کوئی اس کی طرف التفات ہی نہیں کرتا۔ کوئی اس پر حقارت کی نظر ڈالتا ہے کوئی اس پر ترس کھاتا ہے کوئی اس کی ہنسی اڑاتا ہے کوئی اس کے انجام پر خوش ہوتا ہے کوئی کہتا ہے کہ جیسا کیا ویسا بھرا۔ اور کوئی اس کے انجام سے عبرت حاصل کرتا ہے اور جرم سے بچنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ تو مختلف لوگوں کی مختلف نفسی کیفیات و تاثرات ہیں، جن کا اختلاف زیادہ تعجب خیز نہیں اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی شخص کے تاثرات اور اس پر ایک ہی چیز کے اثر کی نوعیت مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ وہی ایک بات ہے جس کو ایک شخص ہزاروں مرتبہ سنتا ہے اور نہیں مانتا، مگر ایک ایسا موقع آتا ہے کہ یکایک اس کے دل کا بند کھل جاتا ہے۔ جو بات کان کے پردہ میں اٹک کر رہ جاتی تھی وہ سیدھی دل تک پہنچ جاتی ہے۔ اور وہ خود حیران ہوتا ہے کہ یہی بات میں پہلے بھی بارہا سُن چکا ہوں، پھر آج یہ کیا ہوگیا کہ یہ خود بخود دل میں اتری چلی جارہی ہے۔ ایک ہی شخص کو بارہا آفت رسیدہ آدمیوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے اور وہ ان کی طرف التفات بھی نہیں کرتا لیکن ایک موقع پر کسی شخص کی مصیبت دیکھکر دفعتہً اس کا دل بھر آتا ہے۔ شقاوت کا پردہ چاک چاک ہوجاتا ہے۔ اور وہ سب سے زیادہ ہمدرد، رحیم اور نرم دل بن جاتا ہے۔ ایک شخص کو اپنی عمر میں بے شمار عبرت ناک مناظر دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ کبھی وہ ان کو تماشا سمجھ کر دیکھتا ہے کبھی ایک حسرت و افسوس کی نگاہ ڈالتا ہے، اور کبھی ایک معمولی منظر سے اس پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ دل پر ایک مستقل نقش بیٹھ جاتا ہے۔

یہی حال ہدایت و ضلالت کا بھی ہے۔ وہی ایک قرآن تھا۔ وہی ایک اس کی تعلیم تھی، وہی ایک اس کو سنانے والی زبان تھی۔ ابوجہل اور ابولہب تمام عمر اس کو سنتے رہے مگر کبھی وہ ان کے کانوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خدیجۃ الکبریٰؓ۔ ابوبکرؓ۔ اور علیؓ ابن ابی طالب نے سنا اور پہلے ہی لمحہ میں اس پر ایمان لے آئے، بغیر اس کے کہ ان کے دل میں شک کا شائبہ بھی گذرتا۔ عمرؓ ابن الخطاب نے بیسیوں مرتبہ اس کو سنا اور صرف یہی نہیں کہ تسلیم نہ کیا بلکہ جوں جوں سنتے رہے مخالف اور دشمن ہوتے چلے گئے لیکن ایک مرتبہ انہی کانوں نے اس چیز کو سنا تو کان اور دل کے درمیان جتنی مضبوط دیواریں چنی ہوئی تھیں یکایک

منہدم ہوگئیں اور اس چیز نے ان کے دل میں ایسا اثر کیا کہ ان کی زندگی کی بالکل کایا پلٹ دی۔

ہر چند نفسی نقطۂ نظر سے اس اختلاف کیفیت اور اختلاف اثر و تاثر کی بہت سی توجیہیں کی جاسکتی ہیں۔ اور وہ سب اپنی اپنی جگہ درست بھی ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو چیز چشم و گوش اور دل و دماغ کے درمیان کہیں ایک مستقل حجاب بن جاتی ہے کہیں ایک مدت تک حجاب رہتی ہے، اور ایک نفسی موقع پر خود بخود چاک ہو جاتی ہے کہیں سرے سے حجاب بنتی ہی نہیں کہیں کسی بات کے لئے حجاب بنتی ہے۔ اور کسی بات کے لئے نہیں بنتی، وہ ہرگز انسان کے ارادہ و اختیار کے تابع نہیں ہے، بلکہ فطری و جبلی طور پر خود بخود انسان میں پیدا ہوتی ہے۔

یہی نکتہ ہے جس کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:۔

فَمَن يُرِدِ اللهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۶ : ۱۵)۔

اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ رکھنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ کرتا اور ایسا بھینچتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر چڑھا چلا جارہا ہے۔ یہ طریقہ ہے جس سے ایمان نہ لانے والوں پر اللہ کی طرف سے ناپاکی مسلط کی جاتی ہے۔

ایک اور موقع پر اس کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ:۔

وَلَوْ شَآءَ اللهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (۱۶ : ۱۳)۔

اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، مگر وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

پھر اس ہدایت کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے کہ:۔

قُلْ إِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۱۳: ۲۷)۔ ان سے کہو کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔

اور ضلالت کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے کہ:۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (۱۷: ۴۵)۔ جب تم نے قرآن پڑھا تو ہم نے تمہارے اور آخرت کا یقین نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک گاڑھا پردہ ڈال دیا اور ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دئے کہ قرآن نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی

ان آیات میں اس فطری کیفیت کو جو ایک حق بات سن کر اسے قبول کر لینے کے لئے اضطراری طور پر دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور جو آخر کار انسان کو ایمان کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ خدائی ہدایت اور اس کے پیدا ہونے کو "شرح صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس ہدایت کے برعکس انسان کے دل میں حق سے انکار اور اعراض کرنے پر آمادگی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس کو اللہ کی طرف سے مسلط کی ہوئی گمراہی قرار دیا گیا ہے اور "شرح صدر" کے مقابل جو انقباضی کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے اسے "ضیق صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر اس "ہدایت" و "ضلالت" اور "شرح صدر" و "ضیق صدر" کے پیدا ہونے کا سبب یہ بتایا ہے کہ انسان جب ایک مرتبہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس کو خود بخود وہ راستہ دکھائی دینے لگتا ہے جو اسے سیدھا خدا کی جانب لے جاتا ہے۔ اور جو شخص سرے سے یہ احساس ہی نہیں رکھتا کہ مجھے کبھی خدا کے حضور میں حاضر ہونا اور اپنے قلب و جوارح کے افعال کا حساب دینا ہے۔ اس کو لاکھ کوئی شخص کلمۂ حق سنائے اور وعظ و تلقین کرے، کوئی بات اس کے دل میں نہیں اترتی، اور وہ کسی طرح راہ راست

نہیں آتا۔

یہاں پھر دو باتیں لگئی ہیں جن کو الگ الگ سمجھ لینے سے قرآن مجید کے وہ مقامات آسانی
حل ہو جاتے ہیں جن میں یہ مضمون مختلف پیرایوں سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک طرف ہدایت و شرح صدر اور ضلالت و ضیق صدر کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف
منسوب کیا ہے۔ دوسری طرف اس ہدایت و شرح صدر کے عطا کرنے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ
انسان خدا کی طرف رجوع اور توجہ کرے۔ اور ضلالت و ضیق صدر کے مسلط کر دینے کا سبب یہ بتایا ہے
کہ گمراہ شخص خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اس کے سامنے مسئول و جواب دہ ہونے کا احساس نہیں رکھتا

ان دونوں چیزوں کے باہمی تعلق کو یوں سمجھو کہ انسان کی فطرت میں خدا نے ایک ایسی قوت
رکھ دی ہے جو اس کو حق و باطل کے امتیاز اور صحیح و غلط کا فرق سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے
حق کی طرف بڑھنے اور باطل سے احتراز کرنے پر مائل کرتی ہے یہی قوت وہ فطری ہدایت ہے جسے خدا اپنی طرف
منسوب کرتا ہے اور جس کی طرف ارشاد خداوندی فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا میں اشارہ
کیا گیا ہے اس کے خلاف ایک اور قوت بھی انسان میں کام کر رہی ہے جو اس کو برائی کی طرف کھینچتی غلطی
اور کج روی کی طرف مائل کرتی اور جھوٹ اور باطل کو اس کے سامنے مزین کر کے پیش کرتی ہے ان دونوں
کے ساتھ بہت سی خارجی اور داخلی قوتیں ایسی ہیں جن میں سے بعض ہدایت کی قوت کو مدد پہونچانے والی
ہوتی ہیں۔ اور بعض ضلالت کی قوت کو اکتساب علم اور اس کے مختلف مدارج تربیت اور اس کی مختلف
کیفیات، سوسائٹی اور اس کے مختلف احوال وہ چیزیں ہیں جو باہر سے اس پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ترازو
کے دونوں پلڑوں میں سے کسی ایک میں کم و بیش دونوں میں اپنا وزن ڈالتی رہتی ہیں۔ اور انسان کا اپنے
اختیار تمیزی، اپنی فہم و فراست، اپنی عقل و بصیرت، اپنے ذرائع اکتساب علم سے صحیح یا غلط کام لینا کی

اور اپنی قوت فیصلہ کو بجا یا بیجا استعمال کرنا، وہ چیز ہے جو خود اس کے ارادہ کے تابع ہے اور جس سے وہ ہدایت وضلالت کی متضاد قوتوں کے مقتضیات کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ خدا کی بخشی ہوی ہدایت اور اس کی مسلط کی ہوی ضلالت دونوں ایک غیر محسوس طور پر اپنا عمل کرتی رہتی ہیں۔ ہدایت کی قوت اسے راہ راست کی طرف لطیف اشارے کیا کرتی ہے۔ اور ضلالت کی قوت اسے باطل کے ملمع پر رجھائے جاتی ہے مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان غلط اثرات سے متاثر ہوکر اور خود اپنی اختیاری قوتوں کو غلط طریقے سے استعمال کرکے ضلالت کے پھندے میں گرفتار ہوجاتا ہے اور ہدایت کی پکار پر کان ہی نہیں دھرتا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہوتا ہے، اور اس دوران میں کچھ بیرونی اثرات اور کچھ خود اس کی اپنی عقل و بصیرت دونوں مل جل کر اسے گمراہی سے بیزار کردیتے ہیں۔ اور اس وقت ہدایت کی وہی روشنی جو پہلے مدھم تھی دفعتاً تیز ہوکر اس کی آنکھیں کھول دیتی ہی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدت تک انسان ہدایت اور ضلالت کے درمیان مذبذب رہتا ہی کبھی ادھر کھینچتا ہے، کبھی اُدھر، قوت فیصلہ اتنی قوی نہیں ہوتی کہ بالکل کسی ایک طرف کا ہوجائے بعض بدقسمت اسی تذبذب کے عالم میں دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ بعض کا آخری فیصلہ ضلالت کے حق میں ہوتا ہے اور بعض ایک طویل کشمکش کے بعد ہدایت الٰہی سے وافر حصہ پالیتے ہیں مگر سب سے زیادہ خوش قسمت وہ سلیم الفطرت صحیح القلب اور سدید النظر لوگ ہوتے ہیں جو خدا کی دی ہوی عقل، اس کی عطا کی ہوی آنکھوں، اس کے بخشے ہوے کانوں اور اس کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے ٹھیک ٹھیک کام لیتے ہیں مشاہدات اور تجربات سے درست نتائج اخذ کرتے ہیں۔ آیات الٰہی کو دیکھ کر ان سے صحیح سبق حاصل کرتے ہیں، باطل کی زینت ان کو رجھانے میں ناکام ہوتی ہی جھوٹ کا فریب ان کو اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتا ضلالت کی کج راہیوں کو دیکھتے ہی وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آدمی کے

چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ پھر جو بھی کہ وہ حق کی طرف رجوع کرتے اور اس کی طلب میں آگے بڑھتے ہیں حق خود ان کے استقبال کو آتا ہے۔ ہدایت کا نور ان کے سامنے چمکنے لگتا ہے، اور حق کو حق سمجھ لینے، اور باطل کو باطل جان لینے کے بعد پھر دنیا کی کوئی قوت ان کو راہ راست سے پھیرنے، اور گمراہی کی طرف لگانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

ایک اور بات بھی اس سلسلے میں قابل بیان ہے، اور ضرورت ہے کہ مسلمان اس کو ذہن نشین کرلیں عام طور پر جب غیر مسلم مشاہیر کی جانب سے اسلام کے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار ہوتا ہے تو مسلمان بڑے فخر سے ان خیالات کو شہرت دیتے ہیں گویا ان کا اسلام کو اچھا سمجھنا اسلام کی خوبی کے لئے کوئی گراں قدر شہادت ہے لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ اسلام کی صداقت و حقانیت اس سے بے نیاز ہے کہ کوئی اس کا اعتراف کرے جس طرح آفتاب کا روشن ہونا اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کو روشن کہے، اور جس طرح آگ کا گرم اور پانی کا سیال ہونا اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کی گرمی اور اس کے سیلان کو تسلیم کرے اسی طرح اسلام کا برحق ہونا بھی اس کا حاجتمند نہیں ہے کہ کوئی اس کے برحق ہونے کو مان لے خصوصاً ایسے لوگوں کی تحسین او رمدح تو کوئی بھی وقعت نہیں رکھتی جن کے دل انکی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے، اور جو خود اپنے اعراض و انکار سے اپنی مدح و تحسین کی تکذیب کرتے ہیں اگر حقیقت میں وہ اسلام کی خوبی کے معترف ہوتے تو اس پر ایمان لے آتے لیکن جب انہوں نے زبانی اعتراف کے باوجود ایمان لانے سے انکار کر دیا تو اہل عقل کی نگاہ میں ان کی حیثیت بالکل اس شخص کی سی ہے جو طبیب کی صداقت کو تسلیم کرے، اس کے تجویز کردہ نسخہ کی صحت کا اعتراف کرے، اگر اپنی بیماری کا علاج کسی عطائی طبیب سے کرائے۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی بڑے سے بڑے غیر مسلم کا اعتراف بھی اسلام کے لئے قابل فخر

نہیں ہے ، اس کے لئے ایک ہی فخر کافی ہے ۔ اور وہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ، اور وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا کا فخر ہے ۔

اسی اشاعت میں جناب ذوقی شاہ صاحب کا ایک مضمون "فہم قرآن" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے انہوں نے اس مضمون میں ایک علمی و روحانی تربیت گاہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے جہاں ایسے سچے داعیان اسلام کی ایک مخلص جماعت طیار کی جائے جو نہ صرف علوم و معارف قرآنی کے حامل ہوں بلکہ اس کے ساتھ اخلاق فاضلہ و اعمال صالحہ سے بھی آراستہ ہوں ، تاکہ دنیا کے سامنے اسلامی تعلیم کا عملی نمونہ بن کر پیش ہوں اور صداقت اسلام کا سکہ دلوں پر بٹھا دیں ۔

کچھ عرصہ ہوا میں نے بھی اس قسم کی ایک تجویز مجلس تحریک قرآن کی ایک ذیلی کمیٹی کے سامنے پیش کی تھی اگرچہ اتنا فرق ضرور ہے کہ وہ صوفی ہیں ، انہوں نے اس کو "خانقاہ" سے موسوم کیا ہے اور میں طالب العلم ہوں ، میں نے اسے مدرسہ کا نام دیا ہے لیکن اختلاف اسمی کے باوجود مسمٰی ایک ہی ہے ،

میری تجویز یہ تھی کہ ایک مدرسہ مخصوص طور پر صرف علوم قرآنی کی تعلیم کے لئے قائم کیا جائے اس میں دینیات کے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک منتخب اور مختصر جماعت کو رکھ کر مختلف پہلوؤں سے قرآن مجید پڑھایا جائے مثلاً ایک طرف الفاظ کی تحقیق ، جملوں کی ترکیب ، بلاغت کے نکات ، اور اسالیب بیان کا تتبع ہو ۔ دوسری طرف قرآن مجید کی اس تفسیر کا مطالعہ کیا جائے جو خود رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ اور سلف صالح نے فرمائی ہے تیسری طرف عقائد ، عبادات ، اور معاملات کے متعلق قرآن مجید کی تعلیم اور اس کے احکام پر نظر کی جائے اور استنباط مسائل کے طریقے معلوم کئے جائیں چوتھی جانب قرآن مجید کا مطالعہ فلسفہ و کلام کے نقطۂ نظر سے کیا جائے اور ابتداء سے اب تک مختلف ادیان و ملل اور مذاہب فلسفہ کی جانب سے

قرآن مجید پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کی تحقیق کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ان طلباء کو علوم جدیدہ کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ وہ زمانہ کی رفتار، زندگی کے موجودہ مسائل اور وقت کی ضروریات کو سمجھیں اور اس زمانہ کے لوگوں کی رہنمائی قرآنی تعلیمات کے مطابق کرنے کے لئے مستعد ہوں۔ پھر ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے ہندوستان اور یورپ کی مختلف زبانیں سکھائی جائیں تاکہ وہ اس ملک اور بیرونی ممالک میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کرسکیں۔

میرے نزدیک اس درسگاہ میں چند خصوصیات ضرور ہونی چاہئیں :-

(۱) طالب علم ایسے انتخاب کئے جائیں جو بطیب خاطر اپنی زندگی کو اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے پر آمادہ ہوں، نیک سیرت ہوں، ذہین و طباع ہوں، اور اس سانچے میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتے ہوں جس میں ان کو ڈھالنا مقصود ہے۔

(۲) ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جو نہ صرف اپنے اپنے فن میں درجۂ کمال رکھتے ہوں، بلکہ اس کے ساتھ اخلاق فاضلہ سے بھی متصف ہوں۔ تاکہ وہ اپنے شاگردوں کے سامنے صرف تلاوت آیات ہی نہ کریں، بلکہ ان کے نفوس کا تزکیہ بھی کریں۔ ان میں حکمت کی روح بھی پھونکیں، ان کے اندر ایمان کی شمع بھی روشن کریں، اور ان کو عمل صالح کا درس بھی دیں۔

(۳) علمی و روحانی تربیت کے ساتھ ان طلبہ کو مختلف قسم کی صنعتیں بھی سکھائی جائیں تاکہ درسگاہ سے نکل کر وہ پیشہ ور واعظ، یا کرایہ کے امام، یا دنیا طلب درویش نہ بن جائیں اور نہ دوسرے طریقوں سے حرام خوری کرکے علم کو ذلیل کریں۔ بلکہ بزرگان سلف کی طرح عزت کے ساتھ اپنے دست و بازو کی کمائی کھائیں اور جو کچھ وقت کسب معاش سے بچے اس کو دین کی خدمت میں صرف کریں۔

ہندوستان کے ۷ کروڑ مسلمانوں میں سے اس قسم کے تیس چالیس نوجوانوں کا فراہم ہوجانا

کچھ مشکل نہیں، چار پانچ ایسے صالح علماء کا میسر آجانا بھی آسان نہیں تو دشوار بھی نہیں، اور اس مدرسے کا خرچ چلانے کے لئے دو ڈھائی ہزار روپے مہینہ کا انتظام کرنا بھی محالات سے نہیں ہے، خصوصاً حیدرآباد میں اس کو محال کہنا تو کفران نعمت ہے، مگر ضرورت صرف ایک چیز کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کام کو ایسے لوگ اپنے ہاتھ میں لیں جن کا خلوص بھی مسلّم ہو اور دیانت بھی محل شک میں نہ ہو، اور جو کام کو کام کے لئے کرنا چاہتے ہوں نہ کہ کسی اور چیز کے لئے۔

یہ ایک ایسی تجویز ہے جو اگر اپنی حقیقی شان کے ساتھ عالم واقعہ میں آجائے تو یقیناً مسلمانوں کی قوم پر ایک انقلاب انگیز اثر مترتب ہوگا۔ مسلمانوں کی تمام تحریکیں صرف اس وجہ سے بے جان ہیں کہ ان میں رجال کی قلت ہے۔ کہیں اتفاق سے کوئی بندہ خدا ایک اچھا دل و دماغ اور ایک سچا جذبۂ عمل لے کر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کو حالات کی مساعدت بھی میسر آجاتی ہے، تو اس کے اثر سے کچھ دن کے لئے مسلمانوں میں ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر وہ حرکت صرف اس کی زندگی تک رہتی ہے ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی ادھر اس کا کام بھی بند ہوا۔ اس کی اصلی علت یہی ہے کہ ہمارے رہنماؤں کو کام کے آدمی بنانے اور مردان کار مہیا کرنے کی اہمیت کا احساس نہیں ہے۔ وہ اپنی تمام قوت اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں صرف کر دیتے ہیں، اور یہ فکر نہیں کرتے کہ اس کام کو آئندہ بھی چلانے کے لئے آدمی فراہم ہونے چاہئیں تاکہ کام کی زندگی شخص واحد کی زندگی کے ساتھ ختم نہ ہو جائے اس کمی کو پورا کرنے کی سخت ضرورت ہے، اور اس کی تدبیروں میں سے ایک اہم تدبیر وہ ہے جو ابھی اوپر بیان کی گئی ہے اگر ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی درس گاہ اور تربیت گاہ قائم کر دی جائے جس سے صحیح علم، اور بلند سیرت رکھنے والے تیس چالیس نوجوانوں کی ایک جماعت ہر دوسرے تیسرے سال نکلتی رہے، تو ایک قلیل مدت میں مسلمانوں کے اندر وہ قحط الرجال باقی نہ رہے گا جس کی بدولت آج کل ان کی قومی تحریکوں پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔

"ترجمان القرآن" کی پچھلی چند اشاعتوں میں میں نے ایک مضمون تعلیم القرآن کی ضرورت پر لکھا تھا جو غلطی سے "اصول اخلاق و سیاست و قانون" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے اس مسئلہ سے بھی بحث کی تھی کہ اسلام میں جتنے فرقے پیدا ہوئے ہیں وہ سب کتاب و سنت پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں! اس وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کتاب و سنت ہی اختلاف کا سرچشمہ ہے، اور اسی وجہ سے ہماری مذہبی تعلیم میں کتاب و سنت سے اعراض کر کے زیادہ تر زور فقہ اصول اور کلام کی کتابوں پر دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتاب و سنت وحدت و اتفاق کا سرچشمہ ہے، اور اختلاف کا سرچشمہ خود ہمارے شرور نفس اور خود ہماری اپنی جہالت میں ہے! اس لئے اختلاف کے فتنے کو مٹانے یا کم از کم ضعیف کر دینے کیلئے کتاب و سنت کی تعلیم سے اعراض کرنا نہیں، بلکہ زیادہ تر اُسی پر زور دینا ضروری ہے، اس سلسلہ میں میں نے لکھا تھا کہ:-

دین میں اصل فتنہ اختلاف کا فتنہ نہیں تشیع و تحزب اور تعصب کا فتنہ ہے۔ ہر گروہ کا صرف اپنے مذہب، اپنے مسلک اور اپنی منہاج کو اصل دین اور ایک ہی صراط مستقیم قرار دینا، دوسرے گروہوں کو خارج از دین اور گم کردہ راہ سمجھنا، اسلامی عصبیت کو چھوڑ کر فرقہ وارانہ عصبیت اختیار کرنا، آپس میں عداوت اور ایک دوسرے سے نزاع رکھنا یہی اصلی فتنہ ہے، اسی کو قرآن نے تفرق فی الدین سے تعبیر کیا ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے بچنے کی قرآن میں بار بار تاکید کی گئی ہے اور اس کے متعلق فرمایا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوا دِیْنَھُمْ وَکَانُوا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِی شَیْءٍ (۶: ۲۰) جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور گروہ گروہ بن گئے۔ اے محمدؐ تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں"

آگے چل کر پھر لکھا تھا۔

"طریقوں کے اختلاف سے ڈر کر نفس قرآن کو جو اصل دین ہے چھوڑ بیٹھنا اور اس سے غفلت برتنا کوئی عقلمندی نہیں ہے، قرآن کے مطالعہ سے جزئیات و فروع میں تاویل وتعبیر کے اختلافات تو ضرور پیدا ہوں گے مگر کلیات واصول جن پر دین کا مدار ہے لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جائیں گے۔ اور وہ جس قدر زیادہ جاگزیں ہوں گے اسی قدر تفرق فی الدین اور تحزب اور تشیّع کا قلع قمع ہو گا۔"

بات بالکل صاف تھی، مگر اس سے میرے ایک شیعہ بھائی کو عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے ایک عنایت نامہ میں مجھ کو لکھتے ہیں:-

"آپ نے اس مضمون میں (۱) تشیّع کو اختلاف سے بڑھ چڑھ کر فتنہ اور قابل حذر ظاہر فرمایا ہے۔ (۲) شیعوں کی تکفیر کے قائل ہوئے ہیں۔ (۳) اور ان کے قلع وقمع کے لئے جمہور کو برانگیختہ کیا ہے۔"

یہ ساری غلط فہمی صرف ایک لفظ تشیّع کے معنی اور محل استعمال پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ میرے بھائی نے تشیّع سے وہ اصطلاحی شیعیت مراد لے لی ہے جس کا اطلاق شیعان علی کے مذہب پر ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ پوری عبارت کو پڑھ لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ لفظ اس مخصوص اصطلاحی معنی میں نہ وہاں استعمال ہوا ہے اور نہ اس عبارت میں اس کے یہ معنی کسی طرح ہو سکتے ہیں۔ لکھنے والے نے تو اس کو قرآن سے اخذ کیا ہے اور وہ آیت بھی درج کر دی ہے جس سے یہ لفظ ماخوذ ہے، اور اس کے ساتھ دوسرے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو اس کے مطلب ومفہوم پر روشنی ڈالتے ہیں یعنی تحزّب اور تعصّب، اور تفرق فی الدین۔ لغت عرب میں شیعہ کہتے ہیں گروہ اور فرقہ کو اور اسی معنی میں یہ لفظ قرآن مجید میں آیا ہے، چنانچہ سورۂ مریم کے پانچویں رکوع

میں ہے۔ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا۔ پھر ہم ہر گروہ میں سے کچھ لوگوں کو الگ نکال لیں گے۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ کون لوگ خدائے رحمان سے سرکشی کرنے میں زیادہ شدید تھے۔ سورہ قصص کے دوسرے رکوع میں ہے فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هٰذَا مِنْ شِيعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ۔ وہاں اس نے دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے پایا ایک اس کے اپنے گروہ سے تھا اور دوسرا دشمن گروہ سے۔ اسی لفظ شیعہ کی جمع شیع ہے اور یہ لفظ بھی اسی معنی میں قرآن کے اندر آیا ہے سورۂ الحجر کے پہلے رکوع میں ہے وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ۔ ہم نے تم سے پہلے گذشتہ قوموں میں بھی رسول بھیجے تھے۔ سورۂ انعام کے آٹھویں رکوع میں ہے۔ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ۔ یا تم کو گروہ گروہ کرکے آپس کی لڑائی کا مزا چکھادے سورۂ قصص کے پہلے رکوع میں ہے۔ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا۔ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں بانٹ دیا۔ سورۂ روم کے چوتھے رکوع میں ہے وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ تم ان مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین کے ٹکڑے کر دیے اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔

اسی مادہ سے لفظ تشیّع نکلا ہے جس کے معنی ہیں متفرق اور پراگندہ ہو جانے کے۔ چنانچہ عرب کا محاورہ ہے قطرت قطرة من اللبن فی الماء فتشیّع فیه ای تفرّق۔ اس تشیّع کو اس تشیّع سے کیا واسطہ۔ جو نزول قرآن کے کئی برس بعد ایک مخصوص اصطلاح بنا ہے۔ کم از کم اتنا تو معترض کو بھی معلوم ہے کہ قرآن میں یہ لفظ کہیں بھی اس اصطلاحی معنی میں مستعمل نہیں ہوا ہے۔

پھر میرے بھائی نے اتنا تو غور کیا ہوتا کہ ایک شخص جس عبارت میں سرے سے فریقانہ عصبیت کی مخالفت کر رہا ہے، کہتا ہے کہ جزئی و فروعی اختلافات کو اصلی اور بنیادی اختلاف نہ بناؤ، آپس کی تکفیر اور مختلف فرقوں کے ایک دوسرے کو گمراہ اور خارج از دین قرار دینے کو فتنے سے تعبیر کر رہا ہے۔ جو تفرقہ کے فتنہ کا قلع قمع کرنے کی دعوت دے رہا ہے، اور قرآن مجید کے پیش کئے ہوئے اصول پر متحد ہو جانے کے لئے بلا رہا ہے اُسکی اس عبارت اور ٹھیک اسی عبارت میں اسلام کے ایک بڑے فرقہ کی تکفیر اور اس کے قلع قمع کے لئے جمہور کو برانگیختہ کرنیکا آخر کونسا محل تھا۔ اگر لکھنے والے نے درحقیقت اس مضمون کے ان جملوں میں جو اوپر نقل کئے گئے ہیں کسی گروہ مسلمین کی تکفیر کی ہوتی اور اس کے قلع قمع کے لئے جمہور کو برانگیختہ کیا ہوتا، تو ایک عقلمند کا کام یہ نہ تھا کہ اس کو سمجھانے کی کوشش کرتا، بلکہ اس کا کام تو یہ تھا کہ مقامی پولیس کو ایک خطرناک پاگل کے ظاہر ہونے کی اطلاع دیتا۔

ان عزیز نے مجھے اسلامی فرقوں کے اختلاف کی اصل سمجھانے کی بھی کوشش فرمائی ہے جس کے لئے میں ان کا شکرگذار ہوں۔ میں نے بھی تھوڑا بہت اسلامی فرقوں کے اصول اور اختلاف کی بدایت و نہایت کے متعلق پڑھا ہے مگر کبھی اس نیت سے نہیں پڑھا کہ کسی فرقہ کی تردید اور کسی فرقہ کی تائید کے لئے دلائل حاصل کروں بلکہ محض تحقیق اور ایک کلمۂ سواء کی تلاش کے لئے پڑھا ہے۔ میرے پیش نظر کبھی سنیت اور شیعیت، حنفیت اور وہابیت کا سوال نہیں رہا۔ میں ہمیشہ اصل اسلام کی جستجو میں رہا ہوں اور میری غایت تمنا یہ ہے کہ اللہ اس اصل اسلام کی خدمت میں میری ساری قوت صرف فرما دے اور اس قوت کا کوئی حصہ فرقوں اور گروہوں کی باہمی نزاعات میں صرف ہونے کے لئے باقی نہ رہنے دے۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

مغربی مصنفین اور ان کے اثر سے مشرقی اہل علم کا بھی ایک بڑا گروہ یہ رائے رکھتا ہے کہ اسلام کی تہذیب اپنے ماقبل کی تہذیبوں وخصوصاً یونانی رومی تہذیب سے ماخوذ ہے، اور وہ ایک جداگانہ تہذیب صرف اس وجہ سے بن گئی ہے کہ عربی ذہنیت نے اس پرانے مواد کو ایک نئے اسلوب سے ترکیب دیکر اس کی ظاہری شکل وصورت بدل دی ہے یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر یہ لوگ اسلامی تہذیب کے عناصر ترکیبی، ایرانی، بابلی، سریانی، فینیقی، مصری، یونانی، اور رومی تہذیبوں میں تلاش کرتے ہیں۔ اور پھر عربی خصائص میں اس ذہنی عامل کا سراغ لگاتے ہیں جس نے ان تہذیبوں سے اپنے ڈھب کا مسالہ لیکر اسے اپنے ڈھنگ پر ترتیب دیا۔

لیکن یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ ہر زمانہ میں انسان کا حال اس کے ماضی سے ضرور متاثر ہوتا ہے، اور ہر نئی تعمیر میں پچھلی تعمیروں کے مواد سے ضرور کام لیا جاتا ہے مگر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی تہذیب اپنی ذات وجوہر میں خالص اسلامی ہے، اور کسی غیر اسلامی موثر کے اثر کا اس میں ذرہ برابر دخل نہیں ہے، البتہ عرضی امور میں عربی ذہنیت، عربی روایات اور ماقبل اور مابعد کی تہذیبوں کے اثرات ضرور داخل ہو گئے ہیں۔ عمارت میں ایک چیز تو اس کا نقشہ، اس کا مخصوص طرز تعمیر، اس کا مقصد اور اس مقصد کے لئے اس کا مناسب ومطابق ہونا ہے اور یہی اصل واساس ہے۔ دوسری چیز اس کا رنگ و روغن، اس کے نقش ونگار، اس کی زینت وآرایش ہے، اور یہ ایک جزئی وفروعی چیز ہے پس جہاں تک اصل واساس کا تعلق ہے اسلامی تہذیب کا قصر کلیۃً اسلام کی اپنی تعمیر کا نتیجہ ہے اس کا نقشہ اس کا اپنا ہے کسی

دوسرے نقشے کی مدد اس میں نہیں لی گئی ہے۔ اس کا طرزِ تعمیر خود اسی کا ایجاد کردہ ہے کسی دوسرے نمونہ کی نقل اس میں نہیں کی گئی ہے، اس کا مقصد تعمیر نرالا ہے، کوئی دوسری عمارت اس مقصد کے لئے نہ اس سے پہلے تعمیر کی گئی اور نہ اس کے بعد، اسی طرح اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جس قسم کی عمارت تعمیر ہونی چاہئے تھی اسلامی تہذیب کی عمارت ٹھیک ویسی ہی ہے، اس مقصد کے لئے جو کچھ اس نے تعمیر کر دیا، اس میں کوئی بیرونی مہندس نہ ترمیم کی قدرت رکھتا ہے اور نہ اضافہ کی۔ باقی رہے جزئیات و فروع تو اسلام نے ان میں بھی دوسروں سے بہت کم استفادہ کیا حتیٰ کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی بیشتر اسلام کے اپنے ہیں لیکن مسلمانوں نے دوسروں سے رنگ روغن، نقش و نگار اور زینت و آرایش کے سامان لے کر اس عمارت میں اضافہ کر دئے اور وہی دیکھنے والوں کو اتنے نمایاں نظر آئے کہ انہوں نے پوری عمارت پر نقل کا حکم لگا دیا۔

تہذیب کا مفہوم

اس بحث کا فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے اس سوال کا تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ تہذیب کس چیز کو کہتے ہیں؟ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب نام ہے، اس کے علوم و آداب، فنونِ لطیفہ، صنائع و بدائع، اطوارِ معاشرت، اندازِ تمدن اور طرزِ سیاست کا مگر حقیقت میں یہ نفسِ تہذیب نہیں ہیں۔ تہذیب کے نتائج و مظاہر ہیں۔ تہذیب کی اصل نہیں ہیں شجرِ تہذیب کے برگ و بار ہیں۔ کسی تہذیب کی قدر و قیمت ان ظاہری صورتوں اور نمایشی ملبوسات کی بنیاد پر متعین نہیں کی جاسکتی۔ ان سب کو چھوڑ کر ہمیں اس کی روح تک پہنچنا چاہئے۔ اور اس کے اساس اُصول کا تجسس کرنا چاہئے۔

تہذیب کے عناصرِ ترکیبی | اس نقطۂ نظر سے سب سے پہلی چیز جس کا کسی تہذیب میں کھوج لگانا ضروری ہے

وہ یہ کہ دنیوی زندگی کے متعلق اس کا تصور کیا ہے؟ وہ اس دنیا میں انسان کی کیا حیثیت قرار دیتی ہے؟ اس کی نگاہ میں دنیا کیا ہے؟ انسان کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے؟ اور انسان اس دنیا کو برتتے تو کیا سمجھ کر برتتے؟ یہ تصور کا سوال ایسا اہم سوال ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے، اور اس تصور کے بدل جانے سے تہذیب کی نوعیت بنیادی طور پر بدل جاتی ہے۔

دوسرا سوال جو تصور حیات کے سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے زندگی کے نصب العین کا سوال ہے، دنیا میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ ساری تگ و دو یہ تمام کشمکش، یہ سب جد وجہد اور محنت ومشقت آخر کس لئے ہے؟ وہ کیا چیز مطلوب ہے جس کی طرف آدمی کو دوڑنا چاہئے؟ وہ کونسا مطمح نظر ہے جس تک پہنچنے کے لئے ابن آدم کو کوشش کرنی چاہئے۔ اور وہ کونسا منتہا ہے جسے انسان کو اپنی ہر سعی اور اپنے ہر عمل میں پیش نظر رکھنا چاہئے؟ یہی مقصود و مطلوب کا سوال انسان کی عملی زندگی کا رُخ اور اس کی رفتار متعین کرتا ہے، اور اسی کے مطابق عمل کے طریقے اور کامیابی کے وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ زیر بحث تہذیب میں انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی عقائد و افکار پر کیگئی ہے؟ انسان کی ذہنیت کو وہ کس سانچے میں ڈھالتی ہے؟ انسان کے دل و دماغ میں کس قسم کے خیالات جاگزیں کرتی ہے؟ اور اس میں وہ کونسے ذہنی محرکات ہیں جو اس کے نصب العین کے مطابق انسان کو ایک مخصوص قسم کی عملی زندگی کے لئے ابھارتے ہیں؟ یہ بات کسی بحث کی محتاج نہیں ہے کہ انسان کے قوائے عمل اس کے قوائے فکر کے تابع ہیں۔ اس کے دست و پا کو جو روح حرکت دیتی ہے وہ اس کے دل و دماغ سے آتی ہے، دل و دماغ پر جو عقیدہ، جو تخیل، جو منکورہ پوری قوت کے ساتھ مسلط ہوگا عملی قوتیں اُسی کے زیر اثر حرکت کریں گی۔ ذہن

جس سانچے میں ڈھلا ہوا ہوگا اسی کے مطابق جذبات، حسیات، اور داعیات پیدا ہوں گے، اور انہی کے اتباع میں اعضا و جوارح کام کریں گے۔ پس دنیا کی کوئی تہذیب ایک اساسی عقیدہ اور ایک بنیادی متخیلہ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی، اور اس بنا پر ہر تہذیب کو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے اس عقیدہ و متخیلہ کو سمجھنا اور اس کے حسن و قبح کو جانچنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی عمارت کی مضبوطی و پائداری کا حال معلوم کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کی بنیادیں کتنی گہری اور کتنی مضبوط ہیں۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کو بحیثیت ایک انسان کے کس طرح کا آدمی بناتی ہے؟ یعنی وہ کس قسم کی اخلاقی تربیت ہے جس سے وہ انسان کو اپنے نظریہ کے مطابق کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے طیار کرتی ہے؟ وہ کونسے خصائل، اوصاف اور نفسی خصائص ہیں جنہیں وہ انسان میں پیدا کرنے اور نشوونما دینے کی کوشش کرتی ہے؟ اور اس کی مخصوص اخلاقی تربیت سے انسان کیسا انسان بنتا ہے؟ گو تہذیب کا اصل مقصود نظام اجتماعی کی تعمیر ہے لیکن افراد ہی وہ مسالہ ہیں جن سے جماعت کا قصر بنتا ہے اور اس قصر کا استحکام اس پر منحصر ہے کہ اس کا ہر پتھر اچھا ترشا ہوا ہو، ہر اینٹ خوب پکی ہوئی ہو، ہر شہتیر مضبوط و پائدار ہو، کوئی کڑی گھن کھائی ہوئی نہ ہو، اور کسی حصہ میں ناکارہ، کچا اور بیجان مسالہ استعمال نہ کیا جائے۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ اس تہذیب میں انسان اور انسان کا تعلق اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے کس طرح قائم کیا گیا ہے؟ اس کے تعلقات اس کے خاندان، اس کے ہمسایوں، اس کے دوستوں، اس کے ساتھ معاملہ کرنے والوں اس کے ساتھ رہنے اور بسنے والوں، اس کے ماتحتوں اس کے بالادستوں خود اس کی اپنی تہذیب کے پیرووں، اور اس کی تہذیب کی پیروی نہ کرنے والوں کے ساتھ کس قسم کے رکھے ہیں؟ اس کے حقوق دوسروں پر اور دوسروں کے

حقوق اس پر کیا قرار دیئے ہیں؟ اس کو کن حدود کا پابند کیا ہے؟ اس کو آزادی دی ہے تو کس حد تک اور مقید کیا ہے تو کس حد تک اس سوال کے ضمن میں اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست، اور بین الاقوامی تعلقات کے تمام مسائل آجاتے ہیں۔ اور اسی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زیر بحث تہذیب خاندان، سوسائٹی، اور حکومت کی تنظیم کس ڈھنگ پر کرتی ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کی تکوین پانچ عناصر سے ہوتی ہے۔

(۱)۔ دنیوی زندگی کا تصور۔

(۲)۔ زندگی کا نصب العین۔

(۳)۔ اساسی عقیدہ۔

(۴)۔ انفرادی تربیت۔

(۵)۔ نظام اجتماعی۔

دنیا کی ہر تہذیب انہی پانچ عناصر سے بنی ہے، اور اسی طرح اسلامی تہذیب کی تکوین بھی انہی سے ہوئی ہے۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی تہذیب کے یہ پانچوں عناصر کس نوع کے ہیں، اور ان کی ترکیب کس طرح ہوئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اس نوعیت کے عناصر نہ فرداً فرداً اسلام کے سوا کسی اور تہذیب میں موجود ہیں، اور نہ انکی مجموعی ہیئت کی کوئی اور مثال دنیا میں پائی جاتی ہے۔

دنیوی زندگی کا اسلامی تصور

انسان کو ابتدا سے اپنے متعلق بڑی غلط فہمی ہے۔ اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی باقی ہے۔

کبھی وہ افراط پر اترتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ بلند پایہ ہستی سمجھ لیتا ہے، غرور و تکبر اور سرکشی کی ہوا اس کے دماغ میں بھر جاتی ہے کسی طاقت کو اپنے سے بالاتر کیا معنی اپنا مدِ مقابل بھی نہیں سمجھتا، مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً اور اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کی صدا بلند کرتا ہے، اور اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ کر جبر و قہر کا دیوتا ظلم و جور اور شر و فساد کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ اور کبھی تفریط کی جانب مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ ذلیل ہستی سمجھ لیتا ہے، درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، جانور، ہوا، آگ، بادل، بجلی، چاند، سورج، تارے، غرض ہر اس چیز کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا مضرت یا منفعت نظر آتی ہے، اور خود اپنے جیسے آدمیوں میں بھی کوئی قوت دیکھتا ہے تو ان کو بھی دیوتا اور معبود مان لینے میں تامل نہیں کرتا۔

انسان کی حقیقت اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل کر کے انسان کی اصلی حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے، وہ کہتا ہے کہ

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؞ خُلِقَ مِنْ مَّاۗءٍ انسان اپنی حقیقت تو دیکھے کہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے دَافِقٍ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَاۗىِٕبِ (۸۶) ایک اچھلتے ہوئے پانی سے جو پشت اور سینہ کی ہڈیوں سے کھنچ کر آتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ (۳۶ : ۵) کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اس کو ایک قطرۂ آب سے بنایا ہے، اور اب وہ کھلم کھلا ہمارا حریف بنتا ہے۔ اور ہمارے لئے مثالیں دیتا ہے اور اپنی اصل کو بھول گیا ہے۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ انسان کی ابتدا مٹی سے کی پھر مٹی کے نچوڑ سے جو ایک حقیر پانی ہے اس کی نسل چلائی پھر اس کی بناوٹ کی

سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهٖ (۳۲ : ۱)

اور اس میں اپنی روح پھونکی۔

فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا۔ (۲۲ : ۱)

ہم نے تم کو مٹی سے پھر قطرۂ آب سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر پوری یا ادھوری بنی ہوئی بوٹی سے پیدا کیا تاکہ تم کو اپنی قدرت دکھائیں۔ اور ہم جس نطفہ کو چاہتے ہیں ایک مدت مقررہ تک رحم مادر میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں، پھر تم کو بڑھا کر جوانی کو پہنچاتے ہیں۔ تم میں سے کوئی وفات پا جاتا ہے۔ اور کوئی بدترین عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے بعد پھر ناسمجھ ہو جائے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ (۸۲)

اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے مغرور کر دیا؟ اس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا تیرے اعضا درست کئے، تیرے قوا میں اعتدال پیدا کیا اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترکیب دی۔

وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۶ : ۱۱)

اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا جب تم نکلے تو اس حال میں تھے کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس نے تم کو کان دئے آنکھیں دیں۔ دل دئے۔ شاید کہ تم شکر کرو۔

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُمْنُونَ ۝ أَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهٗ

کیا تم نے اس نطفہ کو دیکھا جسے تم عورتوں کے رحم

أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ۔ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ
الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ عَلَىٰ أَنْ
نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ
وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا
تَذَكَّرُونَ ۔ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۔
ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ
لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ
تَفَكَّهُونَ ۔ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ۝ بَلْ نَحْنُ
مَحْرُومُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي
تَشْرَبُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ
الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝ لَوْ نَشَاءُ
جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝
أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝
ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ
الْمُنشِئُونَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً
وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ
رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝ (۵۶ : ۳)

میں ٹپکاتے ہو ؟ اس سے بچہ تم پیدا کرتے ہو یا ہم
اس کے پیدا کرنے والے ہیں ؟ ہم نے ہی تمہارے درمیان
موت کا اندازہ مقرر کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں
ہیں کہ تمہاری جسمانی شکلیں بدل دیں اور ایک
اور ہستی میں تم کو بنا دیں جس کو تم نہیں جانتے ۔ اور
تم اپنی پہلی پیدائش کو تو جانتے ہی ہو ۔ پھر کیوں نہیں
اس سے سبق حاصل کرتے ؟ پھر کیا تم نے دیکھا کہ یہ
کھیتی باڑی جو تم کرتے ہو ۔ اس کو تم اگاتے ہو یا
اگانے والے ہم ہیں ؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھس
بنا دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم نقصان میں
رہے بلکہ محروم رہ گئے ۔ پھر کیا تم نے اس پانی کو دیکھا
جسے تم پیتے ہو ؟ اس کو تم نے بادلوں سے اتارا ہے یا اتارنے
والے ہم ہیں ؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو کھاری بنا دیں
پس کیوں نہیں شکر ادا کرتے ۔ پھر کیا تم نے اس آگ کو دیکھا
جسے تم سلگاتے ہو ؟ جن درختوں سے یہ جلائی جاتی ہے ان کو
تم نے پیدا کیا ہے یا پیدا کرنے والے ہم ہیں ۔ ہم نے اس کو
ایک یاد دلانے والی چیز اور مسافروں کے لئے سامان بنایا ہے
پس اے انسان اپنے خدائے بزرگ کی تسبیح کر ۔

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ

جب کبھی سمندر میں تم پر طوفان کی مصیبت آتی ہے تو تم

تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِیَّاہُ، فَلَمَّا نَجّٰکُمْ اِلَی الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَکَانَ الْاِنْسَانُ کَفُوْرًا ہ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَکُمْ وَکِیْلًا ـ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَکُمْ فِیْہِ تَارَۃً اُخْرٰی فَیُرْسِلَ عَلَیْکُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَکُمْ بِمَا کَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَکُمْ عَلَیْنَا تَبِیْعًا (۱۷:۷)۔

اپنے سب معبودان باطل کو بھول گئے اور اس وقت خدا ہی یاد آیا پھر جب اس نے تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیا تو تم پھر اعراض کی روش پر اتر آئے۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے کہ خدا تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے اور تم کوئی اپنا مددگار نہ پاؤ؟ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے کہ خدا تم کو دوبارہ اس سمندر میں لیجائے اور تم پر ہوا کا ایسا جھکڑ بھیجدے جو تمھیں تمہاری نافرمانی کے بدلے میں غرقاب کردے اور پھر تم ہمارا پیچھا کرنے والا کوئی حامی نہ پاؤ؟

ان آیات میں انسان کے غرور و تکبر کو توڑا گیا ہے۔ اسے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تو ذرا اپنی حقیقت تو دیکھ۔ ایک نجس اور حقیر پانی کا قطرہ جو رحم مادر میں مختلف قسم کی نجاستوں سے پرورش پا کر گوشت کا ایک لوتھڑا بنتا ہے۔ خدا چاہے تو اس لوتھڑے میں جان ہی نہ ڈالے اور وہ یونہی غیر مکمل حالت میں خارج ہو جائے۔ خدا اپنی قدرت سے اس لوتھڑے میں جان ڈالتا ہے اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور ان آلات اور ان قوتوں سے اس کو مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے اس طرح تو دنیا میں آتا ہے مگر تیری ابتدائی حالت یہ ہوتی ہے کہ تو ایک بے بس بچہ ہوتا ہے جس میں اپنی کوئی حاجت پوری کرنے کی قدرت نہیں ہوتی خدا ہی نے اپنی قدرت سے ایسا سامان کیا ہے کہ تیری پرورش ہوتی ہے، تو بڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے۔ طاقت ور اور قادر ہوتا ہے۔ پھر تیری قوتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے۔ تو جوانی سے

بڑھاپے کی طرف جاتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت میں تجھ پر پھر وہی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بچپن میں تھی۔ تیرے حواس جواب دیدیتے ہیں۔ تیری قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں۔ تیرا علم نسیاً منسیا ہو جاتا ہے، اور آخرکار تیری شمع حیات بجھ جاتی ہے، مال اولاد، عزیز، دوست، اقارب سب کو چھوڑ کر قبر میں جا پہنچتا ہے، اس مختصر عرصۂ حیات میں تو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر قادر نہیں ہے تجھ سے بالاتر ایک قوت ہے جو تجھکو زندہ رکھتی ہے، اور جب چاہتی ہے۔ تجھ کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر جتنی مدت تو زندہ رہتا ہے، تو قوانین قدرت سے جکڑا رہتا ہے۔ یہ ہوا، یہ پانی، یہ روشنی، یہ حرارت، یہ زمین کی پیداوار، قدرتی سازوسامان جن پر تیری زندگی کا انحصار ہے ان میں سے کوئی بھی تیرے بس میں نہیں۔ نہ تو ان کو پیدا کرتا ہے، نہ یہ تیرے احکام کی تابع ہیں۔ یہی چیزیں جب تیرے خلاف آمادۂ پیکار ہو جاتی ہیں تو تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بے بس پاتا ہے۔ ایک ہوا کا جھکڑ تیری بستیوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے، ایک پانی کا طوفان تجھے غرقاب کر دیتا ہے۔ ایک زلزلہ کا جھٹکا تجھے پیوند خاک کر دیتا ہے۔ تو خواہ کتنے ہی آلات سے مسلح ہو، اپنے علم سے (جو خود بھی تیرا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے) کیسی ہی تدبیریں ایجاد کرے، اپنی عقل سے (جو خود بھی تیری اپنی حاصل کردہ نہیں ہے) کیسے ہی سازوسامان مہیا کر لے، قدرت کی طاقتوں کے سامنے یہ سب چیزیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس بل بوتے پر تو اکڑتا ہے، پھولوں نہیں سماتا، کسی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا فرعونیت اور نمرودیت کا دم بھرتا ہے، جبار و قہار بنتا ہے، ظالم و سرکش بنتا ہے، خدا کے مقابلے میں بغاوت کرتا ہے، خدا کے بندوں کا معبود بنتا ہے۔ اور خدا کی زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔

کائنات میں انسان کا درجہ | یہ تو تھی تجبر شکنی۔ دوسری طرف اسلام نوع بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنی

دلیل بھی نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے۔ وہ کہتا ہے :۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (۱۷:۷)

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا۔ اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (۲۲:۹)۔

اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے لئے مطیع بنا دیا ہے۔

"اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لئے سردی سے حفاظت کا سامان ہے اور منفعتیں ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ ان میں تمہارے لئے ایک شان جمال ہے، جب کہ تم صبح ان کو لیجاتے ہو اور شام واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں، جہاں تک تم بغیر جانکاہی کے نہیں پہنچ سکتے، تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ گھوڑے اور خچر اور گدھے تمہاری سواری کے لئے ہیں۔ اور سامان زینت ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے......... وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، اس میں سے کچھ تمہارے پینے کے لئے ہے، اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کا چارہ حاصل کرتے ہو۔ اس پانی سے خدا تمہارے لئے کھیتی اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے پھل اگاتا ہے، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اسی نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخر کئے ہیں

یہ سب اسی خدا کے حکم سے مسخر ہیں ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل
سے کام لیتے ہیں اور بہت سی وہ مختلف الالوان چیزیں جو اس نے زمین میں
تمہارے لئے پیدا کی ہیں، ان میں سبق حاصل کرنے والوں کے لئے بڑی نشانی ہے
اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی) لیکر
کھاؤ، اور زینت کا سامان (موتی وغیرہ) نکالو جن کو تم پہنتے ہو۔ اور تو دیکھتا ہے
کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ سمندر کو اس لئے
بھی مسخر کیا ہے کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو۔ (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم
شکر بجا لاؤ۔ اس نے زمین میں پہاڑ لگا دیے کہ زمین تم کو لیکر جھک نہ جائے اور
دریا اور راستے بنا دئے کہ تم منزل مقصود کی راہ پاؤ، اور بہت سی علامات بنائیں
منجملہ ان کے تارے بھی ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔ . . . . . .
اور اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو بے حساب پاؤ گے" (۱۶: ۱-۲)۔

ان آیات میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تیری خدمت
اور فائدہ کے لئے مسخر کی گئی ہیں اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت، یہ
دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جانور، یہ رات اور دن، یہ تاریکی اور روشنی، یہ چاند یہ سورج، یہ تارے
غرض یہ سب چیزیں جن کو تو دیکھ رہا ہے، تیری خادم ہیں، تیری منفعت کے لئے ہیں، اور تیرے
لئے ان کو کار آمد بنایا گیا ہے تو ان سب پر فضیلت رکھتا ہے، تجھ کو ان سب سے زیادہ عزت دی گئی
ہے، تجھ کو ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔ پھر کیا تو اپنے ان خادموں کے سامنے سر جھکاتا ہے؟ ان کو
اپنا حاجت روا سمجھتا ہے؟ ان کے آگے دست سوال دراز کرتا ہے؟ ان سے اپنی مدد کی التجائیں
کرتا ہے؟ ان سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے؟ ان کی عظمت و بزرگی کے گیت گاتا ہے؟ اس طرح تو

تو اپنے آپ کو خود ذلیل کرتا ہے، اپنا مرتبہ آپ گراتا ہے، خادموں کا خادم، غلاموں کا غلام خود بنتا ہے۔

انسان نائب خدا ہے اس سے معلوم ہوا کہ انسان نہ اتنا عالی مرتبہ ہے جتنا وہ بزعم خود اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور نہ اتنا پست و ذلیل ہے جتنا اس نے خود اپنے آپ کو بنا لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر اس دنیا میں انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟ اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے:

"اور جب کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا تو زمین میں اس کو نائب بناتا ہے جو جو وہاں فساد پھیلائے گا، اور خونریزیاں کرے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے اسمار سکھا دیے۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ۔ انہوں نے کہا پاک ذات ہے تیری، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے، تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا اے آدم ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا، پس جب آدم نے ان کو ان اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا، کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں؟ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا، بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا اور ہم نے آدم سے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور

اس میں جہاں سے چاہو بفراغت کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس بھی د پھٹکو کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا" (۲ : ۴)

اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں پھر جب میں اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے لئے سربسجود گر جانا، چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ بجز ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا ابلیس! تجھے کیا ہو گیا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوتا، ابلیس نے کہا میں ایسا نہیں ہوں کہ اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے بنایا ہے۔ خدا نے کہا تو جنت سے نکل جا کہ تو راندۂ درگاہ ہے اور یوم الجزا تک تجھ پر پھٹکار ہے" (۱۵ : ۳)۔

اس مضمون کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا، اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم دیا، اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی، فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے اس نائب کو سجدہ کرو، فرشتوں نے اس کو سجدہ کر لیا، اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے جھک گئی، مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح شیطانی قوتیں انسان کے آگے نہ جھکیں، حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر پتلا تھا مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اس کو جو علم بخشا تھا اس نے اس کو نیابت خداوندی کا اہل بنایا۔ فرشتوں نے اس کی اس فضیلت کو تسلیم کر لیا، اور اس کے آگے جھک گئے، لیکن شیطان نے اس کو تسلیم نہ کیا، اس جرم میں شیطان پر لعنت بھیجی گئی، مگر اس نے قیامت تک کے لئے مہلت مانگی

کہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے، چنانچہ شیطان نے انسان کو بہکایا، جنت سے نکلوا لیا اور اس وقت سے انسان اور شیطان میں کشمکش برپا ہے، خدا نے انسان سے کہدیا کہ جو ہدایت میں تجھے بھیجوں اس کو مانے گا تو جنت میں جائے گا۔ اور اپنے ازلی دشمن شیطان کا حکم مانے گا تو دوزخ تیرا ٹھکانا ہو گا۔

منصب نیابت کی تشریح اس بیان سے چند امور معلوم ہوتے ہیں:۔

انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ کی ہے خلیفہ کہتے ہیں نائب کو۔ نائب کا کام یہ ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی اطاعت کرے وہ نہ تو اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کر سکتا ہے کہ ایسا کرے تو باغی سمجھا جائے گا، اور نہ وہ اس کا مجاز ہے کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور خادموں اور غلاموں کو خود اپنی رعیت اپنا نوکر اپنا خادم اپنا غلام بنا لے کہ ایسا کرے گا تب بھی باغی قرار دیا جائے گا، اور دونوں حالتوں میں سزا کا مستحق ہو گا اس کو جس جگہ نائب بنایا گیا ہے، وہاں وہ اپنے آقا کی املاک میں تصرف کر سکتا ہے، ان کو استعمال کر سکتا ہے۔ اس کی رعیت پر حکومت کر سکتا ہے اس سے خدمت لے سکتا ہے، ان کی نگرانی کر سکتا ہے مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ خود آقا ہے، اور نہ اس حیثیت سے کہ اس آقا کے سوا کسی اور کا ماتحت ہے۔ بلکہ صرف اس حیثیت سے کہ وہ اپنے آقا کا نائب ہے اور جتنی چیزیں اس کی زیر حکم ہیں ان پر اپنے آقا کا امین ہے، اس بنا پر وہ سچا اور پسندیدہ اور مستحق انعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے، اس کی ہدایت پر عمل کرے، اس کے احکام سے سرتابی نہ کرے، اس کی املاک اس کی رعیت اس کے نوکروں اس کے خادموں اور اس کے غلاموں پر حکومت کرنے ان سے خدمت لینے ان میں تصرف کرنے اور ان کی نگرانی کرنے میں اس کے بنائے ہوئے قوانین پر کاربند ہو۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نائب نہیں باغی ہو گا۔ پسندیدہ نہیں مردود

ہوگا، مستحق انعام نہیں مستوجب سزا ہوگا۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲: ۴)

توجس نے میری ہدایات کی پیروی کی ایسے لوگوں کے لئے کسی سزا کا خوف اور کسی نامرادی کا رنج نہیں ہے اور جنہوں نے نافرمانی کی اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے

نائب اور امین خود مختار نہیں ہوتا، کہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرے اپنے آقا کے مال اور اس کی رعیت میں جیسا چاہے تصرف کرے، اور اس سے کوئی پوچھنے والا نہ ہو بلکہ وہ اپنے آقا کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے اس کو پائی پائی کا حساب دینا ہوتا ہے اس کا آقا اس کی ہر حرکت کے متعلق سوال کر سکتا ہے، اور اس کی امانت اس کے مال اور اس کی رعیت میں اس نے جس طرح تصرف کیا ہے اس کے لئے اس کو ذمہ دار قرار دے کر جزا اور سزا دے سکتا ہے،

نائب کا اولین فرض یہ ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی فرمانروائی، اس کی حکومت، اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نہ اپنے نائب ہونے کی حیثیت کو سمجھ سکے گا نہ دیانتدار امین ہونے کے منصب کا کوئی صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوگا، نہ اپنے ذمہ دار، اور جواب دہ ہونے کا احساس کر سکے گا، اور نہ اس امانت میں جو اس کے سپرد کی گئی ہے اپنی ذمہ داریاں اور اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ اول تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی دوسرے تخیل کے تحت انسان وہ طرز عمل اختیار کر سکے جو نیابت وامانت کے تخیل کے تحت وہ اختیار کرے گا۔ اور اگر بفرض محال اس کا طرز عمل ویسا ہو بھی تو اس کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ آقا کی فرمانروائی تسلیم کرنے سے انکار کر کے تو وہ پہلے ہی باغی ہو چکا ہے اب اگر اس نے اپنے نفس یا کسی اور کے اتباع میں اچھے عمل کئے بھی تو اس کا اجر اس سے طلب کرے جس کا اس نے اتباع کیا ہے۔ اس کے آقا کے ہاں اس کے وہ اعمال بے کار ہیں۔

انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک حقیر مخلوق ہے مگر اس کو جو عزت حاصل ہوئی ہے وہ
اس روح کی بنا پر ہے جو اس میں پھونکی گئی ہے اور اس نیابت الٰہی کی بنا پر ہے جو اسے اس زمین
میں عطا کی گئی ہے اب اس عزت کی حفاظت منحصر ہے اس پر کہ وہ شیطان کی پیروی کرکے اپنی روح
کو گندہ نہ کر دے اور اپنے آپ کو نیابت کے درجہ سے گرا کر بغاوت کے مرتبے میں نہ لے جائے کیونکہ
اس حالت میں وہ پھر وہی ایک حقیر ہستی رہ جائے گا۔

ملکوتی طاقتیں انسان کے نائب خدا ہونے کو تسلیم کر چکی ہیں اور وہ اس کے آگے بحیثیت
نائب خدا ہونے کے جھکی ہوئی ہیں، مگر شیطانی طاقتیں اس کی نیابت کو تسلیم نہیں کرتیں اور وہ اسے
اپنا تابع بنانا چاہتی ہیں۔ انسان اگر اس دنیا میں نیابت الٰہی کا حق ادا کرے گا اور خدا کی ہدایت
پر چلے گا تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ دیں گی۔ ملائکہ کی فوجیں اس کے لئے اتریں گی وہ عالم ملکوت
کو کبھی اپنے سے منحرف نہ پائے گا۔ اور اس کی طاقتوں سے شیطان اور اس کے لشکروں کو مغلوب
کرے گا لیکن اگر وہ نیابت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا اور خدا کی ہدایت پر نہ چلے گا۔ تو
ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی، کیونکہ اس طرح وہ خود اپنے منصب نیابت سے دست
بردار ہو چکا ہوگا۔ اور جب اس کا ساتھ دینے والی کوئی طاقت نہ رہیگی اور وہ محض مٹی کا ایک
پتلا رہ جائے گا۔ تو شیطانی قوتیں اس پر غالب آجائیں گی۔ اور پھر شیطان اور اس کے لشکر ہی
اس کے حمایتی اور مددگار رہوں گے، انہی کے احکام کی وہ پیروی کریگا، اور انہی کا سا انجام اس کا
بھی ہوگا۔

نائب خدا ہونے کی حیثیت سے انسان کا درجہ دنیا کی تمام چیزوں سے افضل اور
اعلیٰ ہے، دنیا کی تمام چیزیں اس کی ماتحت ہیں، اور اس لئے ہیں کہ وہ ان کو استعمال کرے اور
اپنے آقا کے بتائے ہوئے طریقہ پر ان سے خدمت لے، ان ماتحتوں کے آگے جھکنا اس کے لئے ذلت

اگر وہ جھکے گا تو اپنے اوپر آپ ظلم کریگا، اور گویا نیابت الٰہی کے منصب سے خود دست بردار ہو جائیگا
لیکن ایک ہستی ایسی ہے جس کے سامنے جھکنا اور جس کی اطاعت کرنا اس کا فرض ہے، اور جس کو سجدہ
کرنے میں اس کے لئے عزت ہے۔ وہ ہستی کونسی ہے؟ خدا، اس کا آقا، وہ جس نے انسان کو اپنا
نائب بنایا ہے۔

نوع انسانی کا کوئی مخصوص فرد یا مخصوص گروہ نائب خدا نہیں ہے، بلکہ پوری نوع انسانی
نیابت الٰہی کے منصب پر سرفراز کی گئی ہے اور ہر انسان خلیفہ خدا ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسان
کے برابر ہے، اس لئے نہ کسی انسان کو دوسرے انسان کے آگے جھکنا چاہئے اور نہ کسی انسان
کو یہ حق ہے کہ اپنے آگے جھکنے کا کسی دوسرے انسان سے مطالبہ کرے ایک انسان دوسرے انسان
سے صرف اس چیز کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ آقا کے حکم اور اس کی ہدایت کی پیروی کرے اس
معاملہ میں پیروی کرنے والا آمر ہوگا۔ اور پیروی نہ کرنے والا مامور کیونکہ جو نیابت کا حق ادا کرتا
ہے، وہ حق نیابت ادا کرنے والے سے افضل ہے۔ مگر فضیلت کے معنی یہ نہیں کہ وہ خود اس کا آقا ہے

نیابت اور امانت کا منصب ہر انسان کو شخصاً شخصاً حاصل ہے، اس میں کوئی مشترک ذمہ داری
نہیں ہے، اس لئے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہ ہے
نہ ایک پر دوسرے کے عمل کی جوابدہی عائد ہوتی ہے نہ ایک کو دوسرے کے عمل کا فائدہ حاصل ہو سکتا
ہے نہ کوئی کسی کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر سکتا ہے اور نہ کسی کی غلط روی کا وبال
دوسرے پر پڑ سکتا ہے۔

انسان جب تک زمین میں ہے اور جب تک مٹی کے پتلے (جد انسانی) اور خدا کی
پھونکی ہوئی روح میں تعلق باقی ہے، اس وقت تک وہ خدا کا نائب ہے۔ یہ تعلق منقطع ہوتے
ہی وہ خلافت ارضی کے منصب سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد قدرتی طور پر اس کے زمانۂ

نیابت کے افعال و اعمال کی جانچ پڑتال ہونی چاہیئے اس کے سپرد جو امانت کیگئی تھی اس کا حساب کتاب ہونا چاہیئے اس پر نائب ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں اُن کی تحقیقات ہونی چاہیئے کہ اس نے ان کو کس طرح انجام دیا، اگر اس نے غبن، خیانت، نافرمانی بغاوت اور نافرض شناسی کی ہے تو اس کو سزا ملنی چاہیئے۔ اور اگر ایمانداری، فرض شناسی اطاعت کوششی سے کام کیا ہے تو اس کا انعام بھی ملنا ضروری ہے!

(باقی)

فہم قرآن

از

جناب ذوقی شاہ صاحب

ہر کلام اپنے کلیم کے کمالات معنوی کا آئینہ ہے۔ ہر کلام اپنے کلیم کی رفعتِ شان، فضیلتِ علمی، وسعتِ نظر اور خصوصیات ذاتی کی جانب رہنمائی کرتا ہے لیکن اس رہنمائی سے ہر کس و ناکس یکساں طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتا، فائدہ اٹھانے کے لئے انسان میں ایک گونہ اہلیت کی ضرورت ہے، کسی فن کی کتاب کا مطالعہ کیجئے، جب تک اس فن سے آپ کو کسی قدر مناسبت نہ ہوگی جبتک اس فن کے مبادیات سے آپ کافی حد تک آگاہ نہ ہوں گے، جبتک ایک اہلیت خاص آپ میں اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کی حاصل نہ ہو جائے گی آپ اس کتاب سے کما حقہٗ مستفید نہ ہو سکیں گے، ایک طب کی کتاب کا حق جس خوبی سے ایک طبیب ادا کر سکتا ہے وہ شخص جو طب سے ناآشنا ہے ہرگز نہ ادا کر سکے گا۔ طلب علم کے لئے اگر کتاب کا صرف کتاب ہونا ہی کافی ہوتا تو مبتدیوں کو منتہیوں کی کتابوں کا مطالعہ اتنا ہی مفید ثابت ہوتا جتنا کہ منتہیوں کو۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہر جماعت کے طلبا کے لئے ان کی استعداد کو ملحوظ رکھکر کورس تجویز کیا جاتا ہے اور اس تخصیص و تقسیم کا لحاظ نہ رکھنا نہ صرف غیر مفید بلکہ بااوقات مُضر ثابت ہوتا ہے۔ صرف طلب علم ہی پر موقوف نہیں۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کسی چیز کے مفید یا غیر مفید، مُضر یا غیر مُضر ہونے میں اہلیت کو بہت کچھ دخل ہے۔ آپ ایک تلوار کسی نااہل کے ہاتھ میں دیدیجئے، روپیہ کسی نااہل کی جیب میں ڈالدیجئے، حکومت کسی نااہل کے حوالہ کر دیجئے۔ پھر دیکھئے کیا تماشہ نظر آتا ہے۔

اس مناسبت کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو کسی تصنیف کے مضامین ومطالب پر حاوی ہونے میں زیادہ ممدو معاون اور بصیرت مطلوبہ کے حصول میں زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہے، وہ مصنف کی ذات کے متعلق کسی قدر آگاہی ہے، اگر آپ مصنف کی طبیعت کی افتاد، اس کے انداز بیان، اس کے ذاتی رجحانات اس کے مزاج کی سنجیدگی ومتانت یا شوخی اور چلبلے پن سے واقف ہیں۔ اور جس فن کی تصنیف کا آپ مطالعہ فرما رہے ہیں اس فن سے بھی آپ کچھ مناسبت رکھتے ہیں تو یقیناً اس تصنیف سے آپ زیادہ لطف اور زیادہ نفع اٹھا سکتے ہیں بہ نسبت اس شخص کے جو اس فن سے تو کسیقدر مناسبت رکھتا ہے مگر خصوصیات مصنف کا عارف نہیں۔

یہ سب ملکر تین چیزیں ہوئیں جو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

(۱) مضمون خاص سے مناسبت۔

(۲) مطالعہ کتاب۔

(۳) مصنف کے متعلق قدرے عرفان۔

ان کا **ارتباط** باہمی اور آپس میں ایک دوسرے پر منحصر ہونا مبتدی کے لئے سخت مشکل پیدا کرتا ہے، مناسبت کے بغیر مطالعہ کتاب بے سود ہے اور مطالعہ کے بغیر مناسبت نہیں پیدا ہوتی تصنیف پر عبور حاصل کئے بغیر مصنف کی ذاتی خصوصیات سمجھ میں نہیں آتیں اور مصنف کی ذاتی خصوصیات سمجھے بغیر کوئی طالب العلم تصنیف کی گہرائیوں میں نہیں اتر سکتا۔ ایسی صورت میں ایک مبتدی جو ان تینوں باتوں سے محروم ہے، جس کے ہاتھ میں زنجیر کی ان تین کڑیوں میں سے ایک بھی نہیں کیونکر اپنے مقصود تک رسائی پا سکتا ہے؟ ایک چوتھی کڑی ایجاد کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ جو ان تین کڑیوں اور طالب العلم کے درمیان بہ آسانی واسطہ بن سکے۔ اس چوتھی

کڑی کا نام استاد ہے، جس کے بغیر طالب علم کا حصول مراد تک پہنچنا محال ہے۔ تفہیم قرآن کی بحث میں بھی یہی نکتہ ضرورتِ نبوت کو ظاہر کرتا ہے۔

کلامِ الٰہی سے بھی سب یکساں طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں بھی ع

بعض را ہادی و بعضے را مُضِل

کا مضمون پیش آتا ہے حق تعالیٰ خود فرماتا ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۗ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ۔ (۲: ۲۶)

"وہ گمراہ کرتا ہے ساتھ اس کے بہتوں کو اور راہ دکھاتا ہے ساتھ اس کے بہتوں کو۔ اور نہیں گمراہ کرتا ساتھ اس کے مگر فاسقوں کو۔"

صاف فرما دیا گیا ہے کہ جہاں قرآن سے لوگ بکثرت ہدایت پاتے ہیں وہاں بکثرت ایسے لوگ گمراہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی بھی صراحت فرما دی گئی ہے کہ گمراہ وہی ہوتے ہیں جن کے دل فسق و فجور کی نجاست سے آلودہ ہوں۔ پھر ایک دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَّجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا۔

(۱۷: ۴۵ و ۴۶)

اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے درمیان ایک پردہ مستور حائل کر دیتے ہیں۔ اور ہم ان کے دلوں پر حجاب ڈال دیتے ہیں جس سے وہ اس (قرآن) کو سمجھ نہیں سکتے اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دیتے ہیں۔

بھلا ایسے محجوبین کو قرآن عظیم سے کیا نفع حاصل ہو سکتا ہے اور حقائق و معارف قرآنی پر ان کی نگاہ کیسے جا سکتی ہے اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِ الْقَوْمَ الظَّالِمِين (۶: ۴۵) یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں فرماتا۔

جب ظالم لوگوں کی ہدایت کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا ہے تو قرآن سے وہ کیونکر رہنمائی پا سکتے ہیں، ظالموں کی فہرست میں جو لوگ شامل ہیں ان کی تفصیل بھی قرآن ہی سے دریافت کریجئے۔

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (۳۱: ۱۳) "تحقیق کہ شرک بڑا ظلم ہے۔"

ثابت ہوا کہ شرک قرآن کے فہم اور اس سے ہدایت کے حصول میں سد راہ ہے۔ یہاں شرک جلی یا شرک خفی کی کوئی تخصیص نہیں۔ ہر شرک باعث گمراہی ہے۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (۶۵: ۱) "اور جو شخص اللہ کے (قائم کردہ) حدود سے نکل جائے تحقیق کہ اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔"

وہ حدود قوانین قدرت سے متعلق ہوں، یا قوانین اخلاق سے، یا قوانین ازدواج سے یا قوانین شریعت سے جو شخص ان حدود سے تجاوز کرے گا۔ وہ اس اعتدال اور اس اہلیت سے محروم ہے، جو قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ (۲: ۱۴۰) اور ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کا اخفا کرے جو اس کے پاس منجانب اللہ پہونچی ہو۔

یورپ وامریکہ کے وہ مستشرقین ومصنفین اور بزعم خود وہ محققین جو قومی ملکی اور ذاتی تعصب کی بنا پر دیدہ ودانستہ اسلام کی صورت کو مسخ کر کے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور آیات اللہ اور ان کی خوبیوں کو چھپاتے ہیں۔ ان کے لئے بھی خزائن قرآنی کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے، لہٰذا جو کچھ وہ اسلام کے متعلق کہتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں اس کو اسلام اور قرآن کی

صحیح تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ (۶:۹۴)

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹی تہمت لگائے یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی بھی وحی نہیں آتی۔"

اس آیت کی رو سے جو لوگ پیغمبر ہونے کا جھوٹا دعوی کرتے ہیں اور غلط مشہور کرتے ہیں کہ انہیں الہام ہوتا ہے اور اپنے جھوٹے الہامات کو بڑی آب و تاب سے شائع کرتے ہیں وہ سب کے سب مع اپنے حواریوں اور اپنی جماعت کے لوگوں کے قرآن کے صحیح مفہوم تک پہنچنے سے قاصر ہیں ان لوگوں کی غلط تفسیر اور رکیک تاویلات پر اعتماد کرنا اپنے آپ کو صریح گمراہی میں ڈالنا ہے

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ - (۶:۱۴۵)

"پس اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے تاکہ لوگوں کو بغیر علم کے گمراہ کرے یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کی ہدایت نہیں فرماتا۔

غلط فتوی دینا اور غلط مسائل بیان کرنا اور متنبہ ہو جانے کے بعد بھی اپنی غلطیوں پر اڑ نا بھی اللہ پر تہمت بندی ہے جو لوگ غلط باتیں حق تعالیٰ سے منسوب کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ خواہ گمراہی سیاسیات سے متعلق ہو یا اقتصادیات سے یا تمدنی امور سے عبادات میں ہو یا معاملات میں بہرحال اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو اپنے جہل سے یا تابع نفس ہو کر حلال اور حلال کو حرام قرار دینے والے ان ظالموں میں شمار کئے گئے ہیں جن سے ہدایت چھین لی گئی ہے اور مفہوم قرآن کے متعلق ان کے اقوال مستند نہیں۔

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ

پس تحقیق تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک کتاب واضح اور ہدایت اور رحمت آچکی ہے۔ تو اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو ہماری ان آیتوں کو جھٹلا دے

بِاٰیٰتِ اللہِ وَصَدَفَ عَنْھَا (۶:۱۵۸) اور ان سے گریز کرے۔

ثابت یہ ہوا کہ ادیان باطلہ کے متبعین جو کہ قرآن کے کھلم کھلا منکر ہیں معانی قرآن کے حامل اور مفسر قرآن کسی صورت سے نہیں ہو سکتے۔ مزید غور کیجئے کہ حق تعالیٰ کیا فرماتا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُکِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّہٖ فَاَعْرَضَ عَنْھَا وَنَسِیَ مَا قَدَّمَتْ یَدٰہُ ط اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا ط وَاِنْ تَدْعُھُمْ اِلَی الْھُدٰی فَلَنْ یَّھْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا۔ (۱۸:۵۷)

"اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے پھر وہ اس سے روگردانی کرے اور اپنے ہاتھوں کے کرتوت کو بھی دل سے بھلادے تحقیق ہم نے ایسے لوگوں کے دلوں پر پردہ ڈالدیا ہے کہ وہ سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے دلوں میں ڈاٹ لگادی ہے (بدیں وجہ) اگر ان کو راہ راست کی جانب بلاویں تب بھی وہ سیدھے راستہ پر ہرگز ہرگز نہ آویں گے"

جس طرح اپنے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق حق تعالیٰ زہر کھانے والے کو ہلاک کر دیتا ہے۔ آگ میں ہاتھ رکھنے والے کا ہاتھ جلا دیتا ہے۔ ٹھنڈے پانی سے پیاسے کی پیاس بجھا دیتا ہے۔ اسی طرح ضد ہٹ دھرمی کبر و غرور کی وجہ سے حق بات نہ سننے نصیحت قبول نہ کرنے اور اپنی بداعمالیوں کی پرواہ نہ کرنے سے حق تعالیٰ انسان کو قبول حق کی صلاحیت اور تفقہ فی الدین کی دولت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کے لئے کوئی روشنی نہیں۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّکَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (۲:۱۴۵)

اگر آپ اہل کتاب کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس کچھ علم آچکا ہے تو یقیناً ایسی صورت میں آپ کا بھی شمار ظالموں میں ہوگا۔

کیسی شدید وعید ہے ان لوگوں کے حق میں جو دیدہ و دانستہ دوسروں کی ناجائز خواہشات کی

پیروی کرنے لگتے ہیں۔ نہ صرف دوسروں کی بلکہ اپنی خواہشات نفس کی پیروی بھی ہدایت سے محروم کر دیتی ہے کیونکہ اپنے نفس کو معبود بنا لینا اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا بھی شرک ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵:۲۳)

کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا اور (بوجہ اسکے) اللہ نے اس کو باوجود علم (رسمی) کے گمراہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی سماعت اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی بینائی پر پردہ ڈال دیا۔ بھلا ایسے شخص کو بعد اس کے کہ اسے خدا نے گمراہ کر دیا ہو کون راہ راست پر لا سکتا ہے پس کیا نصیحت نہیں پکڑتے۔

حرص و ہوا کے بندے مشرک ہیں ظالم ہیں اور ہدایت ربانی سے محروم ہیں قرآن سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت ان لوگوں میں نہیں ہوتی دوسرے موقع پر حق تعالیٰ منکر قرآن و مائل بہ دنیا و مطیع نفس کی بابت فرماتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۷:۱۷۶)

اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے لیکن وہ دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے لگا پس اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے یا اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا پس آپ اس حال کو بیان کر دیجئے تاکہ وہ لوگ کچھ غور کریں

اس نوعیت کے لوگوں کی بابت آگے چلکر اسی سورۂ اعراف میں آیا ہے کہ:۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷: ۱۷۹)

"ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے ہی نہیں اور انکی آنکھیں ہیں جنسے وہ دیکھتے ہی نہیں۔ اور اُن کے کان ہیں جنسے وہ سنتے ہی نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ یہ لوگ غافل ہیں"

اندھے بہرے خالی الذہن جانور بلکہ جانوروں سے بھی بدتر لوگ بھلا حقائق و معارف قرآنی تک کیسے راہ پا سکتے ہیں۔ دو گروہ ہیں دونوں میں فرق۔ مومن و کافر نیک و بد اہل و نااہل دونوں میں زمین و آسمان کا فرق، دونوں کی صلاحیت میں فرق۔ دونوں کے فہم میں فرق۔ دونوں کے انجام میں فرق:۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔ (۱۱: ۲۴)

مثال دونوں کی ایسی ہے جیسے کہ ایک تو اندھا بھی ہو اور بہرا بھی اور دوسرا دیکھنے والا بھی اور سننے والا بھی کیا دونوں یکساں ہیں؟ پس کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے۔

حق تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (۴۰۔ ۲۸)

تحقیق اللہ تعالیٰ مسرف کذاب کی رہنمائی نہیں فرماتا

معلوم ہوا کہ جملہ اقسام کی اقتصادی و اخلاقی بے اعتدالیاں صلاحیت ہدایت کے منافی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ہے (۶: ۹۱) بَيَانٌ لِّلنَّاسِ ہے

اَمْر وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ بھی ہے (۳: ۱۳۷) یعنی دنیا کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھانے کی اپنے میں صلاحیت پیدا کر سکتا ہے مگر فائدہ اٹھاتا وہی ہے جو اپنے میں اس کی صلاحیت پیدا کرے:۔

لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶: ۷۹) "نہیں ہاتھ لگاتے اس کو مگر پاک لوگ"۔

جس طرح نجاست ظاہری کی حالت میں قرآن کے ظاہر کو ہاتھ لگانا منع ہے اسی طرح نجاست باطنی کی حالت میں قرآن کے باطن کو بھی ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔ صاف فرما دیا گیا ہے کہ:۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲: ۲) "ہدایت ہے متقین کے لئے۔

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰: ۵۷) ہدایت و رحمت برائے مومنین۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (۱۷: ۸۲) اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیز کہ اس میں شفا و رحمت ہے برائے مومنین اور زیادتی نقصان برای ظالمین"۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ (۴۱: ۴۴) آپ کہدیجئے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لئے تو ہدایت و شفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے اور قرآن ان کے حق میں نابینائی ہے اور یہ لوگ (بوجہ نااہل ہونے کے) ایسی جگہ سے پکارے جاتے ہیں جو ان کے لئے بڑی دور ہے"۔

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔ (۶۹: ۴۸ و ۴۹ و ۵۰) اور بلاشبہ یہ قرآن متقیوں کے لئے نصیحت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض اس کی تکذیب کرتے ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ قرآن کافروں کے لئے حسرت ہے"۔

متذکرہ بالا آیات قرآنی پر غور کرنے سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن فہمی کیلئے بھی صلاحیت کی ضرورت ہے اور اس صلاحیت کے حصول کے لئے صرف عربی دانی ہی کافی نہیں بلکہ تزکیہ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کی بھی بڑی ضرورت ہے معصیت وفسق و فجور کی جانب دل میں رغبت، عقیدہ میں ضعف یعنی شک وشبہ کی بیماری کا دل پر تسلط، شرک جسکا مقام اصلی قلب ہے طبیعت کی بے اعتدالیاں اخفاء حق پر آمادہ کرنے والی دل کی شرارتیں کذب و بہتان نفس امارہ کی غلامی حب دنیا طلب جاہ و شہرت، یہ تمام باتیں باطنی خرابیوں پر دلالت کرتی ہیں اور یہ جملہ باطنی خرابیاں قرآن سے محرومی کا باعث قرار دی گئی ہیں۔ برعکس اس کے تقویٰ اور ایمان وہ باطنی خوبیاں ہیں جنکی بدولت قرآن ہدایت ورحمت ثابت ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ قرآن علی الاطلاق ہدایت ہے مگر اس ہدایت کا حصول منحصر کر دیا گیا ہے شرح صدر پر حق تعالیٰ فرماتا ہے :-

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (۶ : ۱۲۶)

پس جسکو ارادہ فرماتا ہے اللہ کہ ہدایت فرمائے کسی کو شرح صدر عطا فرماتا ہے یعنی کشادہ فرما دیتا ہے اس کے سینہ کو اسلام کے لئے۔

اور جب کسی کو شرح صدر کی دولت سے نوازتا ہے تو اسے اپنے نور خاص سے ممتاز فرمالیتا ہے

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔ (۳۹ - ۲۲)

پس جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک نور پر ہوتا ہے یعنی اللہ کی عطا کردہ روشنی میں چلتا ہے۔

اسی سلسلہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جب یہ نور سینہ میں داخل ہوتا ہے تو سینہ کھل جاتا ہے اصحاب کرام نے جب اس حالت کی شناخت کے لئے آپ سے ظاہری علامات دریافت کیں تو

آپ نے فرمایا کہ علامات یہ ہیں کہ دار الغرور یعنی دنیا سے دل ہٹ جاتا ہے اور آخرت کی جانب رجوع ہو جاتا ہے اور ایسا شخص موت کے آنے سے پہلے موت کے لئے تیار رہتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ حدیث بھی روایت کی گئی ہے کہ:۔

"جس وقت دیکھو تم بندہ کو کہ اس کو دنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی عطا کی جاتی ہے تو نزدیکی ڈھونڈو اس سے اس لئے کہ تحقیق اسے تعلیم دی جا رہی ہے حکمت کی" (بیہقی فی شعب الایمان)

ثابت ہوا کہ وہ علم جو حقیقۃً حکمت ہے اور جسے اللہ و رسول نے بھی حکمت فرمایا ہے تزکیۂ نفس اور طہارت باطن ہی کی صورت میں عطا فرمایا جاتا ہے یہی حکمت وہ حکمت ہے جس سے یکسوئی اور اطمینان قلب کی دولت نصیب ہوتی ہے اور جملہ امور میں بصیرت صحیحہ پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ جس چیز کو غلط طور پر حکمت سمجھ لیا گیا ہے اس سے بجز انتشار و پراگندگی و تاریکی و توہمات و پستی و بربادی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

طہارت باطنی کے حصول کے لئے اُستاد کی ضرورت ہے سنت الٰہی اسی طرح جاری ہوئی ہے۔ ہماری ہدایت کے لئے قرآن ہی پر اکتفا نہ فرمایا گیا بلکہ قرآن کو ہمارے لئے مفید بنانے اور ہماری ہدایت کی تکمیل عمل میں لانے کی غرض سے قرآن کے ساتھ ہمارے پاس رسول بھی بھیجا گیا جو روزمرہ کی زندگی میں ہمارا رہبر اور ہمارے ساتھ عمل کر کے دستاویز بن کر ہم میں رہا بسا ہمیں قرآن پڑھایا۔ قرآن سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ہم میں صلاحیت پیدا کی اور اس صلاحیت کے پیدا کرنے کے بعد ہمیں قرآن کی تعلیم دی اور قرآن کی گہرائیوں میں ہمیں اتارا یعنی حکمت کی تعلیم دی!۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ	"وہ اللہ ہی ہے جس نے بھیجا ان پڑھوں کے درمیان
یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ	انہیں میں سے ایک پیغمبر (جو) پڑھتا ہے ان لوگوں کے سامنے
الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (۶۲: ۲)	آیتیں اللہ کی اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے
	ان کو کتاب و حکمت"۔

پیغمبر کے فرائض یہاں علی الترتیب بیان فرما دئے گئے ہیں۔

(۱) تلاوت قرآن۔

(۲) تزکیۂ امت۔

(۳) تعلیم قرآن و حکمت۔

تلاوت قرآن کے ضمن میں علم مجمل بھی آگیا عمل کے لئے علم اجمالی کی ضرورت ہے۔ اس لئے سب سے پہلے علم اجمالی کا فیضان ہے پھر عمل ہے جس سے تزکیہ نفس اور تصفیہ بطون کے حصول میں معاونت ہوتی ہے۔ تصفیہ بطون کے بعد علم تفصیلی اور حکمت آموزی کا نمبر آتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا میں نے رسالہ انوار القدس میں جو اس زمانہ میں بمبئی سے شایع ہوتا تھا ایک اور عنوان کے تحت میں مسئلہ کے اس پہلو پر مندرجہ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی تھی

کتاب کے ساتھ کتاب سکھانے والا بھی بھیجا جاتا ہے نسخہ کے ساتھ طبیب بھی آتا ہے بلکہ پہلے طبیب مبعوث ہوتا ہے پھر اس طبیب کی وساطت سے نسخہ مرحمت ہوتا ہے پھر وَيُزَكِّيهِمْ وہ طبیب جملہ ظاہری و باطنی بیماریوں کی آلایش سے امت کو پاک کر دیتا ہے پھر وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ وہ طبیب اُس نسخہ اور حکمت کی تعلیم کو دوسروں کو بھی دے دیتا ہے تاکہ وہ لوگ بھی اسی طرح دوسروں کی ظاہری و باطنی بیماریوں کو دور کر دیا کریں۔ اور لوگوں کی زندگیوں کو پاک بنا دیں

کسی عقلمند شخص کو انکار نہ ہوگا کہ مریض اپنی صحت کے لئے نسخے اور طبیب دونوں کا محتاج ہے۔ بلکہ نسخہ سے زایدہ طبیب کا محتاج ہے اور طبیب کے نہ ہونے کی صورت میں نسخہ اس کے لئے بیکار بلکہ بسا اوقات مضر ثابت ہوتا ہے اس دنیا کے کارخانہ میں عموماً دیکھا گیا ہوگا۔ کہ ایک طبیب جسے طب کی کتابوں پر پورا عبور رہا اور لوگوں کے علاج میں بھی جس کا تجربہ بڑھا ہوا ہو جب کسی پیچیدہ مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو باوجود اپنی طبی معلومات اور اپنے طبی تجربے کے وہ اپنے لئے ایک دوسرے

طبیب کا محتاج ہوتا ہے تمام دنیا کا طبی ذخیرہ اس کے لئے بیکار ثابت ہوتا ہے تا وقتیکہ کسی ہم جنس کی صورت برزخ بنکر اِس کے اور طبی ذخیرہ کے درمیان واسطہ نہ بنے ۔ کاغذ کے اوراق اور ان پر سیاہ وسفید نقوش ہم جنسی کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے روحانیات میں بھی مفیض اور مستفیض کے درمیان مناسبت کی اشد ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا یعنے اگر لوگوں کے لئے ہم کسی فرشتہ کو بھیجتے تو اس کو بھی مرد ہی کی صورت بنا کر بھیجتے ۔

اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل عبث نہیں ۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ وہ زبردست حکمت والا ہے، اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ۔ وہ اگر چاہتا تو صرف قرآن مجید بلا وساطت رسول نازل فرما دیتا لیکن کیا کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ محض ایک آسمانی کتاب کا کسی عجیب و غریب طریق سے زمین پر نازل ہو جانا دنیا میں وہ انقلاب پیدا کر دیتا جو ایک مظہر اتم انسان کامل کی زبردست شخصیت اور بابرکت ذات سے پیدا ہو گیا کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ ایام جاہلیت کے اَن پڑھ عرب اور سادہ لوح بدویوں نے جس قرآن کے ذریعہ ہدایت حاصل کی اور ایک بہترین قوم بن گئے ، وہی قرآن بغیر اس کے کہ اس میں ایک زبر یا زیر کا بھی فرق ہوا ہو اب بھی موجود ہے۔ یورپ کا وہ علم دوست طبقہ اسے پڑھتا ہے اس کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں شائع کرتا ہے اس پر حاشیے چڑھاتا ہے بزعم خود اس کی تفسیر کرتا ہے۔ مگر اسے سمجھ نہیں سکتا اس سے ہدایت نہیں پاتا۔ زمانۂ حال کے تعلیمیافتہ لوگ تسخیر برق و دخان میں ذہن رسا رکھنے والے آلات ہلاکت کی ایجاد میں یدطولیٰ رکھنے کے مدعی ۔ زمین پر بیٹھے بیٹھے آسمانوں کی پیمایش اور ستاروں کے طول و عرض اور رفتار گردش کا اندازہ کر لینے والے دنیا کے تمام علوم سابقہ کے خزانچی مترجم اور نقاد عرب کے جاہل بدویوں سے بھی کیا عقل و فہم میں بودے نکلے کہ جس قرآن مجید کی بدولت دنیا کی

بدترین قوم بہتریں قوم بن گئی۔ اُس قرآن مجید کے بیش بہا خزانوں تک رسائی پیدا کرنے میں نہ ان کی دوربینیں کسی کام آئی ہیں اور نہ ان کی "ایکس ریز" سے مطلب براری ہوتی ہے۔ اس محرومی کی آخر وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عرب کے لوگوں کو جو معلم الکتاب والحکمہ نصیب ہوا تھا وہ اہل یورپ کو نصیب نہیں ہوا۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو امت کے دیگر افراد پر جو فضیلت حاصل ہے اس کا باعث اسی معلم الکتب والحکمت کی صحبت یا فیض ہے۔ قرآن تو جو اصحاب رسول نہیں ان کو بھی ملا۔ اور انہوں نے قرآن کی خدمتیں بھی بڑی بڑی کیں۔ ترجمے کئے۔ تفسیریں لکھیں۔ عمل کیا۔ تعلیم دی۔ مگر صحابہ کے مرتبہ کو نہ پہنچے۔ اصحاب کے بعد تابعین کا مرتبہ ہے کیونکہ انہیں اصحاب کی صحبت نصیب ہوئی۔ پھر ان کے بعد تبع تابعین کا رتبہ ہے کیونکہ انہیں تابعین کا فیضان صحبت نصیب ہوا۔ مقربین کی صحبت سے روگردانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغیر اس کے کہ صحیح بصیرت پیدا ہو انسان اپنے فہم ناقص پر بھروسہ کر کے اپنے لئے خود ہی قرآن و حدیث سے مسائل استنباط کرنے لگتا ہے اور بزعم خود مجتہد بن بیٹھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنے پیر میں کلہاڑی مار لیتا ہے اور مثل اس جاہل مریض کے جو کتابیں دیکھ دیکھ کر اپنا علاج خود ہی کرتا ہے اپنی ہی غلط تشخیص اور غلط علاج کی بدولت ہلاک ہو جاتا ہے۔

اسلام میں جو بہتّر فرقے آجکل مسلمانوں کے انتشار و اضمحلال کا باعث ہو رہے ہیں ان میں سے جس فرقے سے جا کر پوچھیے اپنے عقائد کی تائید میں قرآن و حدیث ہی سے سند پیش کرے گا۔ ہر فرقہ کو ایک الگ فرقہ کسی ایسے شخص نے بنایا جسے اپنے علم و فضل کے متعلق انتہا درجہ کا گھمنڈ تھا۔ اور جسے ایک گروہ عالم بھی سمجھتا تھا۔ مگر باوجود اس کے وہ صراط مستقیم سے ہٹ گیا اور گمراہ ہو گیا اور دوسروں کی بھی گمراہی کا باعث بنا۔ اس خرابی کا اصلی باعث یہی ہوا کہ قرآن و حدیث کے سمجھنے کے لئے صرف و نحو

اور لغت دانی کو کافی سمجھا گیا اور تاویلات کے لئے اپنی ذہانت پر پورا اعتماد کر لیا گیا فہم صحیح مذاق سلیم اور بصیرت صادقہ کے حصول کے لئے جن امور کی ضرورت تھی ان سے استغنا برتا گیا فہم قرآن کی چابی اس وقت تک ہاتھ نہیں آتی جبتک کہ تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن سے بندہ آراستہ نہ ہو جائے۔ جبتک کفر و شرک و نفسانیت و بغض و حسد و ریا و حب دولت و مال و حب جاہ و حشمت و رغبت دنیا و نظر بر ماسوائے اللہ کی نجاستوں اور پلیدیوں سے بندہ کا باطن پاک و صاف نہ ہو لے حلاوت قرآن اور قرآن کا صحیح فہم نصیب ہونا محال ہے اور یہ وہ روحانی امراض ہیں جن کے دفعیہ کے لئے مریض کسی روحانی طبیب کا محتاج ہے۔ روحانی طبیب سے استفادہ کئے بغیر انسان قرآن پاک کی اصلی نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔"

اسی طبیب روحانی کو ابتدائے مضمون میں لفظ استاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اطبائے امت جبہ و دستار سے نہیں بنتے ہیں جبہ پوش علماء کے ہاتھ سے دستار بندی کی سالانہ رسم کی ادائیگی سے نہیں پیدا ہوتے طول طویل تقریروں کی گونج اور تحریروں کے سیلاب سے انکا خمیر نہیں اٹھتا، بلکہ نبی برحق کی متابعت ظاہری و باطنی اور مشکوٰۃ نبوۃ سے اقتباس انوار کی برکت سے کمالات نبوی سے وہ علیٰ قدر مراتب مزین ہوتے ہیں۔ اور نیابت رسول و وراثت نبی کا حق ادا کرتے ہیں جبتک کہ مبلغین کا گروہ ان کمالات ظاہری و معنوی کو حاصل نہ کریگا تبلیغ کا حق ادا نہ کر سکے گا۔ اگر آپ یورپ، مادہ پرست یورپ، خدا کے نام تک سے برگشتہ یورپ' انا ربکم الاعلیٰ کی صدائے فرعونی لگانے والے یورپ کی کثیف و تاریک و تباہ کن فضا میں اللہ کی حیات بخش اور جان پرور آواز کسی با اثر طریقے سے پہونچانے کے متمنی ہیں۔ اگر آپ ممالک اسلامی کے برائے نام مسلمان باشندوں کو سچا اور پکا مسلمان بنانے کے آرزو مند ہیں۔ اگر آپ مشرق کے مغرب زدہ لوگوں کو مغربی تاریکی کی روسیاہیوں سے بچانے کے خواہشمند ہیں اگر آپ اپنے پیارے رسول کی امت مرحومہ میں ہونے کا حق ادا کرنے اور پیروی، رسول کے ذوق میں

بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ کی تعمیل کا کوئی جذبہ اپنے دل میں پاتے ہیں۔ تو خدا کے لئے مبلغین کی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو مبلغین کے اوصاف ضروری سے متصف ہو۔ چھاپہ خانہ کی آہنی مشینیں بخدا ان اوصاف سے بالکل خالی ہیں، طباعت رسالت کا فرض انجام دینے سے قاصر ہے۔ ایک جماعت کی ضرورت ہے جیتے جاگتے بیدار متحرک انسانوں کی جماعت نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھکر سچے پکے مسلمانوں کی جماعت مبلغین کی جماعت کی ضرورت ہے جو اللہ کے کلام پاک کی صحیح معنوں میں تبلیغ کرے۔ پھر وہ جماعت ضرورت زمانہ پر نظر ڈالکر خواہ درس تدریس سے، خواہ لکچروں اور تقریروں سے، خواہ کوئی اور صورت پیدا کرے۔ بہر حال یہ سب وقتی عارضی اور ہنگامی چیزیں ہونگی۔ اصل چیز جو مستقلاً ان کے اور دوسروں کے کام آئیگی اور جو ان تمام ہنگامی صورتوں میں جان ڈالدیگی وہ ان کی ذاتی اخلاقی، روحانی، ایمانی اور صدق و اخلاص و للہیت کی باطل شکن قوت ہوگی۔ جبتک کسی تبلیغی تحریک کے پس پشت یہ ذی روح یہ باطل شکن صدق پرور قوت نہ ہوگی غیر ذی روح کاغذ کے بوجھل بنڈلوں اور پیسہ دو پیسہ میں آنے جانے والے پمفلٹوں سے مطلب براری ہرگز نہ ہوگی۔

افسوس ہے کہ ہندوستان میں صحیح قسم کے مبلغین کی جماعت تیار کرنے کا کسی معروف تعلیمگاہ میں کوئی معقول انتظام نہیں ہیں کچھ ہوتا بھی ہے تو ظاہری اور رسمی علوم کی تعلیم کسی طرح کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ کسی با اثر شیخ کامل و مکمل کی زیر نگرانی ایک باقاعدہ خانقاہ کا افتتاح کیا جائے جس میں طالب دنیا نہیں، طالب شہرت نہیں، طالب وجاہت نہیں۔ بلکہ طالب اللہ پیدا کئے جائیں۔ یہ طالب اللہ تزکیہ و تصفیہ کے ضروری مراتب طے کرکے اور اس شیخ کامل سے باقاعدہ تعلیم و تلقین و تربیت حاصل کرکے معانی، قرآن کے سچے حامل نہیں۔ تعلیم قرآن کا چلتا پھرتا نمونہ ہوں، اخلاق نبوی کا صحیح پرتو ہوں، اطوار اُن کے اسلام کا آئینہ ہوں۔ روش ان کی مقبول

خاص و عام ہو پھر دیکھیں کہ قرآن کے انوار یورپ و امریکہ کے تاریک گوشوں اور ممالک تاریک کی اخلاق سوز اور مذہب شکن فضا میں کیسے روشنی نہیں پھیلاتے۔ یورپ ان انوار کا محتاج ہے ساری دنیا ان انوار کی محتاج ہے جو اضطراب، بربادی، اور خطرات آجکل دنیا کو پریشان کر رہے ہیں وہ صرف قرآن ہی کی شعاعوں سے دور ہو سکتے ہیں، اسی قرآن کی روشنی دنیا کے لئے رحمت ثابت ہوگی۔ ورنہ نجات کی کوئی دوسری صورت امکان میں نہیں۔ لہذا اچھے اور موثر پیرایہ میں قرآن کی تبلیغ صرف اسلام ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے مفید ہے۔ یہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے اور عالمگیر تحریک کا محتاج ہے۔ کسی ایک شخص کے کرنے کا کام نہیں ایک جماعت کا کام ہے اور جماعت بھی سمجھدار، معقول پسند، مخلص، نیک نیت، پاک طینت قوی العزم، اور متوکل باللہ لوگوں کی۔ اس برگزیدہ جماعت کے برگزیدہ حضرات اپنی انفرادی اور مجموعی کوششوں سے منفعت عامہ کے اس کار عظیم کا بیڑا اٹھائیں اور اللہ کی پیدا کی ہوئی دنیا میں اللہ کے نام کا بول بالا کریں۔ صدق و خلوص اور توکل و ایمان کی قوت سے اللہ کا نام لیکر ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید غیبی کا ہماری امداد کے لئے بڑھنا بالکل یقینی ہے۔ صرف اٹھ کھڑے ہونا ہمارا فرض ہے۔ کیا ہم اپنے اس فرض کی ادائیگی کے لئے تیار ہیں؟۔

سورۃ التین کی شرح و تفسیر

از

مولانا عبداللہ العمادی

(۱)

تورات کی سفر تثنیہ (کتاب استثنا) میں ہے۔

پروردگار "سینا" سے آیا، اور "سعیر" سے ان پر تاباں ہوا،

اور جبل فاران" سے روشن ہوا، اور قدس" کے ٹیلوں سے آگیا" (۲ : ۳۳)

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جس میں چار مقامات سے نور الٰہی کی تنویر و تابانی کے اشارے ہیں

"سینا" سے جو طور سینا کا دوسرا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نور نبوت کا افاضہ ہوا اور

بنی اسرائیل کو غلامی سے آزادی دلانے کی تمہید بندھی۔"

کوہ "سعیر" سے جو بنی آدم کا پہلا مسکن تھا، احبار یہود اسے "ادوم" بھی کہتے ہیں کہ آدم کی نسبت

نمایاں رہے، عرب اس کو "جودی" یا اس سے متعلق قرار دیتے ہیں جو سفینہ نوحؑ کی قرارگاہ اور نسل آدم کی تجدید ہے

"فاران" کے جبال مکہ ہونے میں کیا کلام ہے جو دنیا کے لئے آخری شرع الٰہی کا محل نزول ہے

"قدس" بیت المقدس، یا ہیکل سلیمانؑ فلسطین کا پورا علاقہ ہے جہاں رفع مسیحؑ سے چند ساعت پہلے

دنیا کو "فارقلیط" کی بعثت اور دین کا تمام مکمل کئے جانے کی بشارت ہوئی تھی۔

والتین، والزیتون، وطور سینین، وھٰذا البلد الامین، میں بھی

تنویر کے جلوے ہیں۔

توراۃ نے جس پہاڑی کو "سعیر" اور مفسرین توراۃ نے جس کو "ادوم" قرار دیا ہے اُسکا قدیم نام "جبل التین" تھا، عکرمہؓ "تین" و "زیتون" دونوں کو دو پہاڑ کہتے ہیں اور عبداللہ بن العباسؓ "تین" کا محل وقوع کوہ جودی کا ایک قلّہ قرار دیتے ہیں جہاں حضرت نوح علیہ السلام عبادت کرتے تھے اور اسی لحاظ سے اس کو "مسجد نوح" بھی کہتے تھے۔ انسانی تاریخ کا یہ عظیم واقعہ یہیں پیش آیا تھا جس کی جانب کلام اللہ میں اشارہ ہے۔

قِیلَ یا نوح اھبط بسلامٍ منّا وبرکاتٍ علیک وعلیٰ اُممٍ ممّن معک وامم سنمتعھم ثم یمسّھم منّا عذابٌ الیمٌ۔

"زیتون" وہی پہاڑ ہے جس پر مسیح علیہ السلام نے اپنے رفع سے پیشتر "فارقلیط" (نبی آخر الزماں) کی بشارت دی ہے۔ (لوقا۔ ۲۲: ۳۹-۵۲)

"طور سینین" پر قوم موسیٰؑ کو نعمت حرّیت عطا ہونے کا مژدہ ملا جس کا نتیجہ یہ تھا۔

وتمت کلمۃ ربک الحسنیٰ علیٰ بنی اسرائیل بما صبروا، ودمرنا ما کان یصنع فرعون وقومہ وما کانوا یعرشون۔

"بلد امین" وہی توراۃ کا "فاران" ہے جہاں تاریخ کا وہ سب سے بڑا واقعہ پیش آیا کہ خود کلام اللہ نے اس کی تشریح فرمائی۔

واذ قال ابراھیم رب اجعل ھٰذا بلداً امناوارزق اھلہ من الثمرات ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم

یہ چار مقامات ہیں جہاں نظام عالم میں عظیم ترین تبدل و تغیر کے بڑے سے بڑے واقعات پیش آئے۔ انہی کو دین بھی کہہ سکتے ہیں یعنی جزا یا محل جزا۔ یہ مقامات جو دینی تغیر کے

آنے بڑے مشاہدہ کر چکے ہیں۔ انہیں کو شہادت بنا پیش کیا ہے کہ ایسے ایسے مشاہدات عظمیٰ کے بعد اب
کسی کی کیا مجال کہ تکذیب دین کرسکے اور کرے بھی تو کیا اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین نہیں ؟

ایک بڑی جماعت ایسی بھی ہے جو سورۃ التین میں "تین و زیتون" کی تاویل انجیر و زیتون سے
کرتی ہے۔ اس فریق کا استدلال یہ ہے :۔

الف۔ انجیر کی خصوصیت اس لئے قابل تذکرہ ہے کہ یہ غذا بھی ہے۔ میوہ بھی۔ اور دوا بھی۔

ب۔ انجیر بہترین میوہ ہے۔

ج۔ انجیر زود ہضم ہے ملین طبیعت ہے۔ اس سے بلغم کم ہوتا ہے۔ گردہ کے لئے مفید ہے
ریگ مثانہ کی دوا ہے۔ بدن فربہ ہوتا ہے جگر و طحال کے مسامات کھل جاتے ہیں۔ بواسیر و نقرس کو گنٹھیا
دہنی کو نافع ہے انجیر کھانے والے پر فالج نہیں اثر کرتا۔ بدن کے فضلات خارج ہوتے ہیں بلکہ بڑھتے ہیں

د۔ انجیر کا ظاہر و باطن دونوں یکساں ہے، نہ اخروٹ کی طرح اوپر چھلکا اور اندر مغز ہے
اور نہ چھوارے کی طرح اوپر مغز اور اندر گٹھلی ہے!

ھ)۔ درخت تین طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ جو وعدہ کرے اور وفا نہ کرے۔ مثلاً آم کے
وہ درخت جن میں پھول آتے ہیں۔ اور پھل نہیں آتے۔ دوسرے وہ جو وعدہ بھی کرے اور وفا بھی۔ مثلاً
سیب کا درخت کہ پھولتا بھی ہے اور پھلتا بھی۔ ایک وہ درخت جو وعدے (پھول) سے پہلے ہی
وفا (پھل) کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ درخت انجیر ہے۔ اور اس کی یہ خصوصیت بے نظیر ہے۔

و) انجیر کے پھل سال میں کئی مرتبہ آتے ہیں۔

ز) خواب میں انجیر کا دیکھنا برکت کا سبب ہے۔

ح) حضرت آدم (علیہ السلام) نے جب خدا کی نافرمانی کی اور حلۂ بہشتی اتر گیا۔ تو انجیر کے
پتوں سے ستر پوشی کی تھی۔

ط) حضرت آدم جب بہشت سے باہر نکلے ہیں۔ تو انجیر کے چند پتے ساتھ تھے۔ سامنے ہرن نظر آئے آپ نے وہ پتے کھلا دیے اسی کا اثر تھا کہ ہرن میں مشک پیدا ہونے لگا۔"

اتنے فواید و برکات جس چیز میں ہوں اس کو ترجیح کیوں نہ دی جاتی ؟

زیتون کا کیا کہنا قرآن خود اس کو مبارک کہہ چکا ہے (شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ) اس کی قسم کھانے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا حاجت تقریر و بیان این ہمہ نیست۔

ان توجیہوں کی ظاہری شکل و شباہت ممکن ہے خوشنما ہو لیکن انجیر کو سب سے بہتر میوہ کہنے کا کوئی علمی ثبوت موجود نہیں۔ متعدد میوے ایسے ہیں جن میں غذائیت بھی ہے۔ اور دوائیت بھی۔ انجیر کے جن افعال و خواص پر زور دیا جاتا ہے طب جدید کی رو سے ان میں تھوڑی ہی باتیں ثابت ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ جتنی توجیہیں ہیں سب شاعرانہ ہیں ظاہر و باطن کا یکساں ہونا اور وہ طلب و بے وہیں تو مزا انہیں سوا ملتا ہے"؛ کے اصول پر عملدر آمد رکھنا انسان کے لئے صفت ہو تو ہو نباتات کی اس سے کیا قدر بڑھ سکتی ہے۔ انار بھی سال میں کئی مرتبہ پھلتا ہے۔ ترنج میں پھل تو پہلے آتے ہیں اور اس کے بعد پھولتا ہے میوہ دہد پیش پس آرد بہار۔" مخزن اسرار میں نظامی نے اسی بنا پر ایک نہایت لطیف مضمون پیش کیا ہے لیکن کیا اس مضمون آرائی سے حقیقت بھی آشکارا ہو گئی؟ خواب و خیال کا مسئلہ کوئی علمی مسئلہ نہیں ہے۔ کہ اس پر کسی استدلال کی بنیاد نہیں ہے۔

حضرت مسیح سے پیشتر کے دنیاوی واقعات کی تحقیق تو علمی دنیا کر ہی نہ سکی بہشت کی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل معلوم ہونے کا کیا ذریعہ ہے اور ایسے جزئیات کے لئے تاریخی ثبوت

---

۵ عجیب بات یہ ہے کہ امام رازی جیسے محقق بھی ان تمام دلائل کا تذکرہ جائز سمجھ رہے ہیں۔
(جلد ۸ صفحہ ۵۰۷ و ۵۰۸)

کہاں سے آئے تلمود کو ایسے خلاف عقل دعوے شاید پھبتے ہوں لیکن قرآن ایک صریح غلط بیانی کا کیوں کر حامی ہو سکتا ہے، اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ اہل عرب خود کہہ رہے ہوں کہ :-

فَاِن المسك بعض دم الغزال (مشک بھی ہرن کے خون ہی کا ایک جزو ہے)؛

بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے پہلے ان آیتوں کو سن لینا چاہیے جن میں تین و زیتون کا تذکرہ ہے۔ سورۃ التین میں ہے:-

والتین وَالزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل سافلین اِلّا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات فلھم اجرٌ غیر ممنون فما یکذبك بعد بالدِّین۔ الیس اللہ باحکم الحاکمین؟

انجیر (میوے) اور زیتون (درخت) اور طور سینین (پہاڑ) اور اس شہر (مکہ) کی قسم جس میں ہر طرح کا امن ہے کہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت کا پیدا کیا پھر ہم اس کو (بوڑھا کر کے) کمتر سے کمتر مخلوق کے درجے میں لوٹا لائے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کئے (ان کو تنزل پیری سے دل تنگ نہ ہونا چاہئے کیونکہ ان کے لئے تو (آخرت میں) اجر ہے بے انتہا تو اے پیغمبر اب کون ہے جو ان سب باتوں کے معلوم کئے پیچھے (روز جزا کے بارے میں تم کو) جھوٹا سمجھے کیا خدا سب حاکموں سے بڑا حاکم (اور قدرت والا) نہیں ہے (تو منکرین قیامت اس سے کیوں نہیں ڈرتے)[1]؛

---

[1] اس ترجمے نے جو مولوی نذیر احمد صاحب سے ماخوذ ہے آیت کے مفہوم میں اور بھی پیچیدگی پیدا کر دی۔ اب تک تو تین و زیتون ہی کے شاخسانے تھے اب ایک اور گورکھ دھندا پیدا ہو گیا ہے۔ ثم رددناہ اسفل سافلین الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات فلھم اجر غیر ممنون کا لفظی ترجمہ صرف اتنا ہے کہ "پھر ہم اس کو (یعنی انسان کو) کمتر سے کمتر مخلوق کے درجہ میں لوٹا لائے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے تو اجر بے حد ہے" مولوی صاحب یہ سمجھے کہ کمتر سے کمتر مخلوق کے درجے میں لوٹا لانے کا مطلب انسان کو بوڑھا بنا کے لیکن بعد کے انتشار نے وقت یہ پیدا کر دی کہ کمتر سے کمتر مخلوق کے درجے میں لوٹا لانے کی صفت اس شخص کی ہونا چاہئے جو ایمان دار

ان آیات میں اتنی باتیں مذکور ہیں۔

الف۔ چند خاص چیزیں جن کا تقدس عرب کے کل کر اہل کتاب میں بھی ضرب المثل تھا۔ خدا نے ان کی قسم کھائی ہے یعنی انہیں اپنی خدائی کا شاہد قرار دیا ہے (قرآن کے محاورہ میں قسم سے شہادت ہی مراد بھی ہوا کرتی ہے)۔

(ب) لوگوں کو جزا و سزا میں شک تھا اس لئے اچھی طرح توضیح کر دی کہ انسان خود اپنی حالت کیوں نہیں دیکھتا کتنی اچھی ساخت کی اس کی آفرینش ہوئی تھی اور پھر اپنی بد اعمالیوں سے کتنی بُری حالت کو پہنچ جاتا ہے۔ لوگ ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں۔ سوسائٹی میں خاطر خواہ عزت نہیں ہوتی۔ غور کرے تو اپنی نگاہوں میں آپ چھوٹا نظر آتا ہے اس کے مقابلہ میں جن لوگوں کے عقائد و اعمال دونوں اچھے ہوں زمانہ بھی انہیں اچھا سمجھتا ہے خود ان کا ضمیر ان کی عزت کرتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو اسی عزت میں اجر غیر ممنون (جزائے جدا) مضمر ہے۔ ان کھلم کھلا مثالوں پر جو تقریباً ہر شخص کے لئے پیش آتی ہیں جزا و سزا کا انکار کیوں کر ممکن ہے۔ خدا دور ہے حکام تو بدلہ لیتے دیتے رہتے ہیں۔ پھر کیا خدا جو سب سے بڑا حاکم ہے وہ اس پر قادر نہیں ہے؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵) و نیک کردار نہ ہو بوڑھا ہونا اگر اس آیت کا مطلب ہوتا تو بوڑھے تو مومن و کافر اچھے بُرے سب ہی ہوتے ہیں اس لیے اتنی تمہید اچھے اور باندھی کہ نیک کردار مومنین کو "تنزل پیری سے دل تنگ نہ ہونا چاہئے" حالانکہ یہ صریح زیادتی ہے ہم مانتے ہیں کہ یہ اضافہ مولوی صاحب کا خود ساختہ نہیں ہے لیکن وہ شخص جو اجتہاد کا مصنف ہو کسی کی کمزوریاں اس کی پردہ پوشی نہیں ہو سکتیں! امام رازی تک کو اس کمزوری کا اعتراف ہے اور وہ بھی اس تاویل کے ساتھ استثنا کو منقطع مانتے ہیں (رازی طبع مصر سنہ ۱۳۰۸ جلد ۸ صفحہ ۴۵۹) "اجراً غیر ممنون" کا صحیح ترجمہ اجر غیر منقطع ہے جس کو دوسرے مقام پر "عطاء غیر مجذوذ" فرمایا ہے "اجر بے انتہا" کے لئے آخرت کی قید بھی ہم صحیح نہیں سمجھتے کفار تو آخرت کے قائل ہی نہ تھے (ابن جریر جلد ۳۰ صفحہ ۱۳۵) پھر اس ترغیب کو وہ کیوں ماننے لگے" فمایکذبک بعد بالدین" کا ترجمہ "تو اے پیغمبر اب کون ہے جو ان سب باتوں کے معلوم کئے پیچھے (روز) جزا کے بارے میں تم کو جھوٹا سمجھے" بھی درست نہیں قرآن کے محاورہ میں ما کا لفظ جہاں کہیں بھی آیا ہے اس کے معنی کیا۔ کے ہیں۔ کون کے نہیں ہیں ۔ . . . کون کا استعمال ذوی العقول کے لئے ہے اور اس کے لئے من کا لفظ آتا ہے۔ صحیح مفہوم یہ ہے کہ "تو اے انسان، اب کیا چیز ہے جو اتنے سارے شواہد کے بعد جزا و سزا کے باب میں تجھے جھٹلا سکتی ہے!!"

شہادت حسینؑ اور قرآن

از
مولوی سید ابو الخیر صاحب مودودی

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا: إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ - أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۲: ۱۹)

لابد ہم تمھیں خوف اور بھوک اور مال و جان کے زیان اور پیداواروں کی تباہی میں ڈال کر تمھاری آزمایش کریں گے۔ جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بشارت دیدو (کہ انجام کار فلاح و کامرانی انہی کے لئے ہے)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: ہم اللہ ہی کے ہیں اور بالآخر ہمیں اسی کی طرف جانا ہے۔ یقیناً یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی جانب سے صلاۃ و رحمت ہے اور یقیناً یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعۂ شہادت میں شریعت حقۂ اسلامیہ کے بیشمار حقایق و اسرار مضمر ہیں۔ میدان کرب و بلا جس مقدس قربانی کے طیب و طاہر خون سے رنگین ہوا، وہ محض شخصی واقعہ نہیں ہے، اور نہ محض عزم و استقلال، صبر و ثبات، تحمل مصائب اور مردانہ وار جان سپاری کا قصہ ہے جسے ہم اتباع و پیروی کے لئے اسوہ بنائیں۔ بلکہ اس کا تعلق سرتا سر اسلام کی حقیقت سے ہے۔ وہ حقیقت جو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام پر طاری ہوئی تھی اور دونوں راہ حق میں قربان کرنے کے

قربان ہونے کے لئے تیار ہوگئے تھے:

يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ؟ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ، سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ، وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ! قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ۔ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ۔ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ، سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ۔ (٣٧: ٩٩-١٠٤)

بیٹا میں نے خواب میں دیکھا کہ تجھے (اللہ کے نام پر) ذبح کر رہا ہوں۔ دیکھ تیری کیا رائے ہے۔ کہا۔ اے باپ جو حکم دیا گیا ہے اس کو بے تامل کر گزرئیے انشاء اللہ آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے پس جب دونوں اللہ کے آگے جھک گئے اور (باپ بیٹے کو) ماتھے کے بل گرا دیا تو ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا محسنین کو ہم ایسی ہی جزا عطا کرتے ہیں بے شک یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ اس کے فدیہ میں ہم نے ایک بڑی قربانی دیدی۔ اور آنے والی امتوں میں اس واقعۂ عظیم کی یادگار قائم کردی پس سلام ہو ابراہیم پر۔

کہ دونوں نے بے تامل گردنیں جھکا دیں۔ یہ تھی اسلام کی حقیقت جو مقام خلت پر فائز باپ بیٹوں پر طاری ہوئی۔ اور اسی انقیادِ حقیقی، اسی اطاعت کاملہ، اسی ایثار و فدویت نفس و جان کو امتہ وسط کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ۔

محبت و رضاء الٰہی اور دعوۃ و تبلیغ حق کی راہ میں انبیاء علیہم السلام نے جو قربانیاں پیش کیں، اور جن مصائب و آلام کی آزمائشوں سے ان کی جانچ کی گئی۔ اور یہ منزل مرد داعی حق و مجاہد فی سبیل اللہ کی راہ میں آتی ہے تا معلوم کیا جائے کہ ان میں کون مجاہد و صابر ہے: —
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَ أَخْبَارَكُمْ۔

لیکن خانوادۂ نبوت و رسالت کی پوری تاریخ میں کوئی قربانی کوئی مصیبت کوئی ابتلا کوئی آزمائش بجز ملت حنیف کے مورث اعلیٰ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے واقعۂ اسلام کے شہید کربلا کی آزمائش سے زیادہ سخت و جان گداز نہیں تھی اسی بنا پر مفسرین امامیہ اس طرف گئے ہیں کہ و فدیناہ بذبح عظیم سے مراد امام حسین علیہ السلام کا واقعہ شہادت ہے، اور اس باب میں انہوں نے ائمہ اہل بیت کرام علیہم السلام کے آثار بھی نقل کئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کی جس حقیقت کا ظہور ریگزار خشک سال میں اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات سے ہوا تھا، امام حسین علیہ السلام نے کربلا کے ہولناک بیابان میں اس کی تکمیل کر دی ظہور رضائے الٰہی کے آگے جھک جانے میں ہوا تھا، اور تکمیل رضا برضا ر الٰہی کے ساتھ جراءت ادنیٰ سے ادنیٰ مقاصد بھی سعی و جہد چاہتے ہیں اور جو مقصد جتنا زیادہ اعلیٰ و اہم و اکبر ہوتا ہے اتنے ہی بڑے جہاد کا طالب ہوتا ہے۔ ولذالک قال الاعرابی۔

لاتحسب المجد تمرًا انت آکلہ　　　لن تبلغ المجد حتیٰ تلعق الصبرا

پھر وہ مجد و شرف عزیز جس سے زیادہ کوئی مجد و شرف نہیں، اور وہ مقصد عظیم و جلیل جو تمام مقاصد میں اقصی الغایات ہو اس کا حصول کتنا پر تعب اور کس قدر صبر و آزما ہوگا:۔

لن تنالوا ما تحبون الا بالصبر علی ما　　　جس کو تم محبوب رکھتے ہو وہ تمہیں کبھی حاصل نہ ہوگا

تکرھون ولا تبغون ما تھوون　　　جبتک خوشی اور خندہ پیشانی کے ساتھ مکروہات

الا تبرک ما تشتھون　　　کو برداشت نہ کرو۔ اور جس کو تم چاہتے ہو اس تک

تمہاری رسائی نہیں ہوگی۔ جب تک کہ تم اپنی نفسانی خواہشیں ترک نہ کر دو۔

حضرت ابراہیم کا سر جب اتنے بتوں کے آگے نہ جھکا جن کی پرستش ان کی قوم کرتی تھی، اور ان کا قلب سلیم اجرام سماوی کی درخشاں سطوت سے بھی مرغوب نہوا۔ اور انہوں نے کہا:۔

انی لا احب الافلین ..... انی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوٰت والارض وما انا من المشرکین ؛ "میں فنا پذیر ہستیوں کو دوست نہیں رکھتا ..... میں نے اپنا منہ اس کی طرف کرلیا ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

تو لابد ہوا کہ ان کے اس دعوی کی آزمائش کیجائے۔ کہا گیا پہلے اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھو کہ شرک صرف ماسوی اللہ کی پرستش ہی نہیں ہے بلکہ مادون اللہ میں الجھاؤ اور محبوبات اور مالوفات میں مشغولی بھی شرک ہے۔ مسیح نے کہا ہے :۔ ایک نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا" پھر ایک قلب میں ہزاروں محبتیں کیسے پرورش پا سکتی ہیں۔ اور وہ جس کی سمائی ارض و سما کی وسعتوں میں نہیں ہو سکتی اس قلب کو اپنا کاشانہ کیسے بنا سکتا ہے جس میں زن و فرزند کی محبت اور زر و جواہر کے قناطر مقنطرہ کی الفت بھی حکومت فرما ہو۔ وہ بے تامل بڑھے اور انہوں نے بیٹے کے گلے پر چھری رکھدی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام پر نسبت ابراہیمی کا غلبہ تھا۔ جیسا کہ بعض ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے ماثور ہے۔ انہوں نے کہا: وامرت ان اسلم لرب العالمین. مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس کے آگے جھک جاؤں جو تمام جہان کا پروردگار ہے میں اپنا سر اللہ کے آگے جھکا چکا ہوں اور جو سر اللہ کے آگے جھک چکا ہو غیر اللہ کے آگے نہیں جھک سکتا حکم ہوا اپنی رگ جان کے خوں سے اپنے اس ایقان کی شہادت دو۔ ایقان سچا ایقان تھا نہ صرف اپنی رگ جان کے خون سے شہادت دی بلکہ اپنے اہل بیت اور اصحابؓ کے خون سے بھی اس پر مہریں لگائیں۔ فرمایا" ہم سے صرف یہی نہیں کہا گیا ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہوں تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم جو کچھ ہو اس کے ساتھ اس کی طرف پھر جاؤ۔ وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم۔ تو اس کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کے ساتھ قلوب کا اس حقیقت اسلامی کی طرف متوجہ ہونا بھی ضروری ہے

جو اس مرکز عبادت کے بنانے والے پر طاری ہوئی تھی)۔ اور اس حقیقت کو صبر و ثبات کیا تھ اپنے
اندر قائم کر لینے کے لئے کہا گیا کہ قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ
تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی ذات میں بہترین نمونہ ہے اور وہ نمونہ یہی الٰہی قربانی تھی
جس کی بنا پر کہا گیا کہ بیشک وہ مشرکین میں سے نہیں ہے اور اپنی ذات سے پوری ایک اطاعت
شعار امت ہے، اور اس نے اپنے تئیں اللہ کی رضا میں اسطرح فنا کر دیا ہے کہ خود اس کی اپنی کوئی ہستی
باقی نہیں رہی ۔ یعنی اس نے نہ صرف یہ کہ راہ الٰہی میں اپنی قوم کو چھوڑا اور کہا : وبدا بیننا و
بینکم العداوۃ والبغضاء ابدًا حتی تومنوا باللہ وحدہٗ ہمارے اور تمہارے
درمیان کھلی کھلی عداوت اور دشمنی ہے ہمیشہ کے لئے حتی کہ تم خدائے واحد پر ایمان لاؤ، بلکہ
اپنے بیٹے کو بھی جو بڑھاپے کی دعاؤں کا نتیجہ تھا، رضاء الٰہی میں قربان کرنے سے دریغ نہ کیا ۔ انّ
ابراھیم کان امۃ قانتًا للہ حنیفا ولم یك من المشرکین ۔ اور جو کچھ کہا گیا مطلب کو
واضح تر کرنے کے لئے کہا گیا، ورنہ استقبال وجوہ الی المسجد الحرام کے اختصاص میں یہ سب کچھ موجود
ہے اگر مسجد حرام کی بناء میں کوئی خصوصیت نہ ہوتی تو کیوں کہا جاتا ومن حیث خرجت
فول وجھك شطر المسجد الحرام ۔ حالانکہ انفس و آفاق کا کوئی گوشہ نہیں جس میں اس کا
نور حیات بخش نہ ہو ۔ مگر یاد رکھو کہ مسجد حرام کی طرف متوجہ ہونا ارکان صلوٰۃ میں سے صرف ایک رکن
ہے لیکن اس کے کہن سال بنانے والے کی اس الٰہی قربانی کو اپنے اندر قائم کر لینا شرط اسلام ہے
اور ہمارے نزدیک نماز درست نہیں ہوتی جبتک یہ شرط پوری نہ ہو ۔ کیا نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں بوجہ قیام وقعود پھول کر پھٹ پھٹ جاتے تھے اور آپ کو خبر نہ ہوتی
تھی اور ابو تراب کے جسم سے حالت نماز میں تیر نکالا گیا اور اذیت محسوس نہ ہوئی ۔ یہی حقیقت اسلامی
ہے جس کی اقامت و ادامت کا حکم دیا گیا ہے اور جو ہر مومن و مسلم سے دن میں کم از کم پانچ مرتبہ وجود

اپنے نفس کے مقابلہ میں اور ان لوگوں کے مقابلہ میں جو اللہ کی زمین پر فساد برپا کرتے ہیں اس کے مقررہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ جہاد و قربانی چاہتی ہے پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ میں ان لوگوں کا ساتھ دوں جو اسلام میں فتنہ کی تخم ریزی کر رہے ہیں۔ اللہ کی زمین پر فساد پھیلانا چاہتے ہیں اور وہ باتیں کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں ہوئیں۔ اللہ کہتا ہے۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ مگر وہ مال جمع کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں تو اپنے استقرار امر کے لئے رشوتوں میں۔ اللہ کہتا ہے وامرھم شوریٰ بینھم۔ مگر وہ شوریٰ ترک کرتے ہیں، اور بجبر اپنی بات منوانی چاہتے ہیں۔ امامت و خلافت امت کی صلاح و فلاح کے لئے ہے ضلالت و ہلاکت کے لئے نہیں۔ ایسے امام سے امت کیا فلاح پا سکتی ہے جس کا شیوہ ہوا نفس کی غلامی ہے، جو علانیہ معصیت کرتا ہے جو سکیر و خمیر ہے، جو حدود اللہ سے تجاوز کر چکا ہے یزید کی خلافت دراصل اسی بات کا اعلان ہے کہ اب امت مسلمہ میں کوئی صالح و متقی انسان باقی نہیں رہ گیا ہے الاقوہ الاودی شاعر جاہلی نے کہا ہے۔

لا یصلح الناس فوضی لا سراۃ لھم ولا سراۃ اذا جھالھم سادوا

لیکن میں خاموش رہوں گا حتی کہ وہ وقت آئے جو اس لئے مقرر ہو چکا ہے، اور ہوگا جو کچھ کہ ہونا ہے۔"

یہ وہ کلام ہے جو حضرت امام حسین علیہ السلام نے محمد بن حنفیہ سے اس وقت کہا جبکہ امیر معاویہ نے مدینۂ مبارکہ آکر یزید کی ولایت عہد کے لئے بیعت طلب کی، اور علی بن الحسین، زین العابدین علیہ السلام سے بروایت حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا ماثور ہے اور امالی شیخ مفید کے ذریعہ ہم تک پہونچا ہے۔

باقی۔

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کریگا
مہینہ کی ۲۵ر تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے
ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینہ کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول
ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے۔ لہذا کوئی صاحب
رعایت کا مطالبہ نہ فرمائیں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ اپنے نمبر خریداری کا حوالہ
ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں
لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر مضمون شائع کرے۔

منیجر

جلد (۲) عدد (۲)

صفر سنہ ۱۳۵۲ ہجری

ماہنامہ

علوم و معارف قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مُرتبہ

سیّد ابو الاعلیٰ مودُودی

باھتمام

مولوی ابو محمد صاحب مصلح

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا

قیمت سالانہ صہ

قیمت فی پرچہ مہ

فہرست مضامین

قرآن مجید میں جگہ جگہ ان قوموں کا ذکر آیا ہے جن پر گذشتہ زمانہ میں خدا کا عذاب نازل ہوا ہے۔ ہر قوم پر نزول عذاب کی صورت مختلف رہی ہے۔ عاد پر کسی طرح کا عذاب اترا، ثمود پر کسی اور طرح کا، اہل مدین پر کسی دوسری صورت میں، اور آل فرعون پر ایک نئے انداز میں۔ مگر عذاب کی شکلیں اور صورتیں خواہ کتنی ہی مختلف ہوں، وہ قانون جس کے تحت یہ عذاب نازل ہوا کرتا ہے ایک ہی ہے، اور ہرگز بدلنے والا نہیں ہے سُنَّةَ اللهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا (۳۳-۸)

نزول عذاب کے اس قانون کی تمام دفعات پوری تشریح کے ساتھ قرآن مجید میں درج کی گئی ہیں۔ اس کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ جب کسی قوم کی خوش حالی بڑھ جاتی ہے تو وہ غلط کاری اور گمراہی کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور فطرۃً اس کی عملی قوتوں کا رخ صلاح کے بجائے فساد کی طرف پھر جایا کرتا ہے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا (۱۷: ۲)	اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں پھر وہ لوگ اس بستی میں نافرمانیاں کرتے ہیں

پھر وہ بستی عذاب کے حکم کی مستحق ہو جاتی ہے پھر ہم اس کو تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں۔

دوسرا قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ خدا کسی قوم پر ظلم نہیں کرتا، بدکار قوم خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتی ہے، خدا کسی قوم کو نعمت دیکر اس سے کبھی نہیں چھینتا، ظالم قوم خود اپنی نعمت کے در پے ہو جاتی ہے اور اس کے مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۸: ۵۳)

یہ اس لئے کہ اللہ کبھی اس نعمت کو بدلنے والا نہیں ہے جو اس نے کسی قوم کو بخشی ہو، تا وقتیکہ وہ قوم خود اپنے آپ کو نہ بدل دے اور اس وجہ سے کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۹: ۷۰)

اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان پر ظلم کرتا، وہ تو خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

پھر یہ بھی اسی قانون کی ایک دفعہ ہے کہ خدا ظلم (ظلم بر نفس خود) پر مواخذہ کرنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے۔ اور تنبیہیں کرتا رہتا ہے کہ نصیحت حاصل کریں اور سنبھل جائیں۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۱۶: ۶۱)

اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کے بدلے میں پکڑتا تو روئے زمین پر کوئی متنفس باقی نہ رہتا۔ مگر وہ لوگوں کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دیا کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ

ہم نے تم سے پہلے کی قوموں میں بھی اسی طرح پیغمبر بھیجے ان کو سختی اور تکلیف میں گرفتار کیا تاکہ شاید

لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ - فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶: ۵)

وہ ہماری طرف عاجزانہ جھکیں پس جب ان پر ہماری طرف سے مصیبت آئی تو کیوں نہ وہ ہمارے آگے گڑگڑائے؟ مگر ان کے دل سخت ہو چکے تھے اور شیطان نے ان کی نگاہوں میں ان کے اعمال کو مزین بنا دیا تھا۔

اس ڈھیل کی مدت میں اکثر ظالم قوموں کو خوش حالی کے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ وہ اس سے دھوکہ کھا جاتی ہیں۔ اور واقعی یہ سمجھ بیٹھتی ہیں کہ ہم ضرور نیکوکار ہیں۔ ورنہ ہم پر نعمتوں کی بارش کیوں ہوتی؟

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ، نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (۲۳: ۴)

کیا یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جو مال اولاد سے انکی امداد کئے چلے جا رہے ہیں (تو اس کے معنی یہ ہیں کہ) ہم ان کو فائدہ پہونچانے میں جلدی کر رہے ہیں (حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے اصلی بات جو کچھ ہے) اسے یہ نہیں سمجھتے۔

آخر کار جب وہ قوم کسی طرح کی تنبیہ سے نہیں سنبھلتی اور ظلم کئے جاتی ہے تو خدا اس کے حق میں نزول عذاب کا فیصلہ کر دیتا ہے اور جب اس پر عذاب کا حکم ہو جاتا ہے تو پھر کوئی قوت اس کو نہیں بچا سکتی۔

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا (۱۸: ۸)

یہ بستیاں (جن کے آثار تم دیکھ رہے ہو) ان کو ہم نے اس وقت تباہ کیا جب انہوں نے ظلم کیا اور ہم نے انکے ہلاک ہونے کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا تھا

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ

اور جب تیرا رب ظالم بستیوں کو پکڑتا ہے تو وہ ایسی ہی

ظَالِمَةٌ ، اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۱۱: ۹)	بری طرح پکڑتا ہے اور اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوا کرتی ہے۔
وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۳: ۲)	اور جب خدا کسی قوم کے حق میں برائی کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی قوت اس کی شامت کو دفع کرنے والی نہیں ہوتی، اور پھر خدا کے مقابلہ میں ان کا کوئی مددگار نہیں نکلتا

یہ عذاب الٰہی کا اٹل قانون جس طرح پچھلی قوموں پر جاری ہوتا رہا ہے اسی طرح آج بھی اس کا عمل جاری ہے اور اگر بصیرت رکھتے ہوں تو اپنی آنکھوں سے اس کے نفاذ کی کیفیت مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مغرب کی وہ عظیم الشان قومیں جن کی دولت مندی و خوشحالی، طاقت و جبروت، شان و شوکت، عقل و ہنر کو دیکھ دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور جن پر انعامات خداوندی کی پیہم بارشوں کے مشاہدے سے یہ دہوکا ہوتا ہے کہ شاید یہ خدا کے بڑے ہی مقبول اور چہیتے بندے اور خیر و صلاح کے مجسمے ہیں؛ ان کی اندرونی حالت پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اس عذاب الٰہی کے قانون کی گرفت میں آ چکی ہیں۔ اور انہوں نے اپنے آپ کو خود اپنے انتخاب و اختیار سے اس دیوِ ظلم (ظلم بر نفس خود) کے چنگل میں پوری طرح پھنسا دیا ہے جو تیزی کے ساتھ انہیں تباہی و ہلاکت کی طرف لیے چلا جا رہا ہے۔

وہی صنعت و حرفت کی فراوانی، وہی تجارت کی گرم بازاری وہی دہائے سیاسی کی کامیابی، وہی علوم حکمیہ و فنون عقلیہ کی ترقی، وہی نظام معاشرت کی فلک پیما بلندی، جس نے ان قوموں کو تمام دنیا پر غالب کیا، اور روئے زمین پر ان کی دھاک بٹھائی آج ایک ایسا خطرناک جال بن کر

ان کو لپٹ گئی ہے جس کے ہزاروں پھندے ہیں۔ اور ہر پھندے میں ہزاروں مصیبتیں ہیں۔ وہ اپنی عقلی تدبیروں سے جس پھندے کو کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا ہر تار کٹ کر ایک نیا پھندا بن جاتا ہے۔ اور رہائی کی ہر تدبیر مزید گرفتاری کا سبب ہو جاتی ہے۔

یہاں ان تمام معاشی اور سیاسی اور تمدنی مصائب کی تفصیل کا موقع نہیں ہے جن میں مغربی قومیں اس وقت گرفتار ہیں۔ بیان مدعا کے لئے اس تصویر کا صرف ایک پہلو پیش کیا جاتا ہے، جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ قومیں کس طرح اپنے اوپر آپ ظلم کر رہی ہیں۔ اور کس طرح اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان مہیا کئے جا رہی ہیں۔

اپنے معاشی تمدنی اور سیاسی احوال کی خرابی کے اسباب تشخیص کرنے اور ان کا علاج تجویز کرنے میں اہل فرنگ سے عجیب عجیب غلطیاں ہو رہی ہیں منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی مشکلات کا بڑا اصلی سبب آبادی کی کثرت کو سمجھتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ افزائش نسل کو روکا جائے۔ معاشی مشکلات کے ساتھ ساتھ یہ خیال نہایت تیزی کے ساتھ مغربی ممالک میں پھیلنا شروع ہو گیا ہے اور دلوں میں کچھ اس طرح بیٹھا ہے کہ لوگ اپنی نسل کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر اپنی نسل کے سب سے بڑے دشمن بن گئے ہیں۔ ضبط ولادت کے نئے نئے طریقے جو پہلے کسی کے ذہن میں بھی نہ آتے تھے اب عام طور پر رائج ہو رہے ہیں۔ اس تحریک کو ترقی دینے کے لئے نہایت وسیع پیمانے پر تبلیغ و اشاعت ہو رہی ہے، کتابیں، پمفلٹ، رسائل اور جرائد خاص اسی موضوع پر شائع کئے جا رہے ہیں۔ انجمنیں اور جمعیتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ ہر عورت اور مرد کو اس کے متعلق معلومات بہم پہونچانے، اور عملی آسانیاں فراہم کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ غرض کئی سال سے یورپ اور امریکہ کے عمرانی "مُصلحین" نے اپنی نسلوں کے خلاف ایک زبردست جنگ چھیڑ دی ہے اور جوش

اصلاح میں ان کو یہ سوچنے کا ہوش بھی نہیں ہے کہ آخر یہ جنگ کہاں جا کر رکے گی۔

توالد و تناسل سے مغربی قوموں کی نفرت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ضبط ولادت کے متعدد طریقوں سے بچ بچا کر جو حمل ٹھیر جاتے ہیں۔ ان کو بھی اکثر و بیشتر گرا دیا جاتا ہے، روس میں تو یہ فعل قانوناً جائز قرار دیدیا گیا ہے۔ اور ہر عورت کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہے کہ تین مہینے تک کا حمل ساقط کر دے لیکن انگلستان اور دوسرے فرنگی ممالک میں جہاں اسقاط حمل قانوناً ممنوع ہے خفیہ طور پر اسقاط کی کثرت وبا کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ فرانس میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جتنے بچے ہر سال پیدا ہوتے ہیں قریب قریب اتنے ہی حمل ہر سال ساقط کئے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض ڈاکٹروں کا خیال یہ ہے کہ اسقاط کی تعداد پیدائش سے زیادہ ہے تیس اور چالیس برس کے درمیان شاید ہی کوئی عورت ہو جس نے اسقاط کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ گو قانوناً یہ فعل جرم ہے لیکن دوا خانوں میں علانیہ اس کا ارتکاب ہوتا ہے اور فرضی بیماریاں رجسٹروں میں درج کر دی جاتی ہیں۔ انگلستان میں بہت سی دائیاں ہیں جن کا کاروبار اسقاط ہی سے چلتا ہے۔ ایک ڈاکٹر کا اندازہ ہے کہ ہر پانچ عورتوں میں سے چار ایسی ضرور نکلیں گی جنھوں نے کبھی نہ کبھی اسقاط کیا ہوگا۔ جرمنی میں تقریباً دس لاکھ حمل ہر سال ساقط کئے جاتے ہیں، اور اتنی ہی تعداد زندہ پیدا ہونے والے بچوں کی ہے۔ بعض جرمن شہروں میں تو اندازہ کیا گیا ہے کہ گذشتہ بیس سال کے اندر جتنے بچے پیدا ہوئے اس سے دوگنے حمل ساقط کر دیے گئے

عورت جس کے اندر فطرت نے ایک زبردست جذبۂ مادری رکھا تھا، مغربی ممالک میں اب اتنی شقی القلب ہو گئی ہے کہ وہ اپنے پیٹ کی اولاد کو ہلاک کرنے کے لئے خود اپنی جان تک کو

خطرہ میں ڈالنے سے نہیں چوکتی۔ ڈاکٹر نارمن ھیر (Norman Haire) اپنی ایک تقریر میں بیان کرتا ہے کہ ایک حاملہ عورت اس کے اں آئی اور اس نے اسقاط کی خواہش ظاہر کی جب قانونی مجبوری کی بنا پر عذر کیا گیا تو اس نے طرح طرح کی زہریلی دوائیں کھا کر پیٹ گرانے کی کوشش کی سیڑھیوں پر سے قصداً اپنے آپ کو لڑھکایا اونچے اونچے مقامات سے کود گئی بھاری بھاری بوجھ اٹھائے اور جب اس سے بھی اسقاط نہ ہوا تو آخر کار ایک اناڑی قابلہ کی دوا استعمال کرکے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ مادام البریشت (Madamme Albrecht) کا بیان ہے کہ عورتیں حمل ساقط کرنے کے لئے وہ وہ حرکتیں کر گذرتی ہیں جو بیان نہیں کیجا سکتیں۔ مثلاً پیٹ پر سخت آلات سے ضربیں لگانا، رحم کو مختلف آلات سے صدمہ پہنچانا، وحشیانہ طریقوں سے ناچنا، اپنے آپ کو قصداً اونچی جگہوں سے گرا دینا۔ سخت سے سخت زہریلی چیزیں حتیٰ کہ بارود تک کھا جانا۔ وہ ایک فرانسیسی عورت کا قصہ بیان کرتی ہے کہ اس نے حمل سے تنگ آکر ایک لمبی پن لی اور رحم میں چبھو چبھو کر اس کو اتنا زخمی کیا کہ خون جاری ہوگیا۔ اس قسم کی بدولت کثرت عورتیں ہر سال اپنی جان دیدیتی ہیں۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ انگلستان کے شفاخانہائے نسوان میں جتنی عورتیں ہر سال مرتی ہیں۔ ان میں سے نصف کا سبب اسقاط حمل ہے۔ اور یہی کیفیت دوسرے ممالک کی بھی ہے

اس زبردست نسل کشی کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کی شرح پیدائش میں بہت کمی واقع ہوگئی ہے۔ ۱۸۷۶ء اور ۱۹۲۳ء کے اعداد کا مقابلہ کیجئے انگلستان اور ویلز میں شرح پیدائش ۲ء۳۶ فی ہزار سے گھٹ کر ۲ء۱۶۳ (اور ۱۹۲۱ء میں ۸ء۱۵) رہ گئی ہے۔ جرمنی میں ۹ء۴۰ سے ۵ء۱۶ اٹلی میں ۲ء۳۹ سے ۷ء۲۶، سویڈن میں ۸ء۳۰ سے ۴ء۱۵، نیوزی لینڈ میں ۱ء۴۱ سے ۸ء۱۸ تک گھٹ گئی ہے۔ سردست چونکہ ان ممالک میں شرح اموات بھی قریب قریب اسی نسبت سے

کم ہوگئی ہے اس لئے آبادی ایک حالت پر ٹھیری ہوی ہے لیکن اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر شرح پیدائش اسی رفتار سے گھٹتی رہی تو دس سال گذرنے کے بعد یہ ٹھیری ہوی حالت قائم نہیں رہیگی بلکہ آبادی گھٹنی شروع ہو جائے گی۔

سب سے زیادہ خطرناک حالت فرانس کی ہے۔ تمام دنیا کے ممالک میں صرف یہی ملک ایسا ہے جہاں کی آبادی روز بروز گھٹتی چلی جارہی ہے۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں وہاں کی شرح پیدائش ۳۲،۹ فی ہزار تھی سنہ ۱۹۳۱ء میں ۱۷،۱ رہ گئی مگر شرح اموات میں اس تناسب سے کمی نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں شرح اموات ۲۶،۲ تھی سنہ ۱۹۳۱ء میں صرف ۱۶،۳ تک اتری۔ فرانس کے ہمسایہ اور حریف ممالک جرمنی، اور اٹلی میں ۱۳۵ اور ۱۳۰ آدمی فی مربع کیلومیٹر آباد ہیں۔ مگر فرانس میں صرف ۷۴ فی مربع کیلومیٹر آبادی کا اوسط ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں فرانس کی سرزمین پر ۷۳۰۲۴۹ بچے پیدا ہوئے اور اس کے حریف جرمنی میں پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد ۱۰۳۱۵۰۸ تھی۔

مس سسلی ہیملٹن اپنی کتاب (ماڈرن فر   ) میں لکھتی ہے کہ اس حالت نے فرانس کے مدبرین سیاست میں ایک گہری پریشانی پیدا کر رکھی ہے جس کا برا اثر نہ صرف فرانس بلکہ تمام دنیا کی سیاست پر مترتب ہو رہا ہے۔ فرانس کی عیش پسند آبادی دیہات کو چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہو رہی ہے۔ اٹلی و پولینڈ وغیرہ ممالک کے باشندے ہجرت کر کے فرانس میں آرہے ہیں۔ اور زمینوں پر قبضہ کرتے چلے جارہے ہیں۔ فی ہفتہ ۶ ہزار مہاجرین کا اوسط اندازہ لگایا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں فرانسیسی سرزمین پر جتنے بچے پیدا ہوئے ان میں تقریباً ۹ فی صدی غیر قوموں کے تھے۔ اس سے فرانسیسی سیاسیین کو اندیشہ ہے کہ آگے چل کر ایک وقت ایسا آئے گا جب فرانسیسی قوم خود اپنے گھر میں غیر قوموں کی اکثریت سے مغلوب ہو جائے گی تاہم یہ خطرہ بعید ہے۔ بالکل قریبی خطرہ

یہ ہے کہ فرانس کے حریف اٹلی اور جرمنی کی آبادی اس سے بہت زیادہ ہے۔ اگر تخفیف اسلحہ کی تجاویز منظور کر کے فرانس اپنے آلات جنگ کم کر دے تو آیندہ لڑائی میں کامیابی کا انحصار فوج کی کثرت پر ہوگا اور اس میدان میں اکیلا جرمنی اور اکیلا اٹلی، فرانس پر حاوی رہے گا۔ یہی خطرات ہیں جن کی وجہ سے فرانس کا طرز عمل بین الملی مسائل میں دوسری اقوام کے خلاف ہے۔

یہ نتائج ہیں اس عاقلانہ تدبیر کے جو یورپ نے اپنی معاشی اور تمدنی مشکلات کو دور کرنے کے لئے اختیار کی ہے۔ اس وقت فرانس کے سوا تمام فرنگی ممالک کی آبادی صرف اس وجہ سے ایک ٹھیری ہوی حالت پر قائم ہے کہ شرح اموات سے شرح پیدائش ابھی تک زیادہ ہے۔ ابن لئے شرح پیدائش کے گھٹنے کا اثر آبادی پر مترتب نہیں ہوا ہے لیکن اہل فرنگ کے پاس یہ یقین کرنے کی کونسی معقول وجہ ہے کہ شرح اموات اور شرح پیدائش کا یہی تناسب ہمیشہ برقرار رہے گا؟ کیا انہوں نے اسکا اطمینان کرلیا ہے کہ کسی روز مغربی افریقہ کے مچھر زرد بخار کے جراثیم لئے ہوئے خود انہی کے ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر یورپ نہ پہنچ جائیں گے؟ کیا انہوں نے اس کی کوئی ضمانت لے لی ہے کہ کبھی یورپ میں اچانک انفلوئنزا، طاعون، ہیضہ اور ایسے ہی دوسرے وبائی امراض میں سے کوئی مرض نہ پھیل جائے گا؟ کیا وہ اس سے بے خوف ہوچکے ہیں کہ ایک دن یکایک فرنگی سیاست کے بارود خانوں میں سے کسی ایک میں ویسی ہی کوئی چنگاری نہ آپڑے گی جیسی ۱۹۱۴ء میں سراجیفو میں گری تھی، اور پھر فرنگی قومیں خود اپنے ہاتھوں سے وہ سب کچھ نہ کر گذریں گی جو کوئی وبا اور کوئی بیماری نہیں کر سکتی؟ اگر ان میں سے کوئی صورت بھی پیش آگئی اور دفعتہً یورپ کی آبادی میں سے چند کروڑ آدمی قتل یا ہلاک یا ناکارہ ہوگئے، تو اس وقت یورپ کے باشندوں کو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اپنے آپ کو خود کس طرح تباہ کیا۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰی اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ... کیا بستیوں کے لوگ مطمئن ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر تو نہ آئے

بِاٰیٰتِنَا وَھُمْ نَائِمُوْنَ اَوَ اَمِنَ اَھْلُ الْقُرٰیٓ اَنْ یَّاْتِیَھُمْ بَاْسُنَا ضُحًی وَّھُمْ یَلْعَبُوْنَ اَفَاَمِنُوْا مَکْرَ اللّٰہِ فَلَا یَاْمَنُ مَکْرَ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (۷: ۱۲)

تہ آجائے گا جب کہ وہ سوتے ہوں گے؟ اور کیا ان بستیوں کے لوگوں نے اس کا اطمینان کرلیا ہے، کہ ہمارا عذاب کبھی دن دہاڑے ان کو نہ آلے گا جبکہ وہ کھیلتے ہوں گے؟ اور کیا وہ اللہ کی چال سے بے خوف ہو گئے ہیں؟ سو اللہ کی چال سے تو وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جن کو برباد ہونا ہے۔

ایسی ہی ایک قوم اب سے تین ہزار برس پہلے عرب کے جنوبی ساحل پر آباد تھی جس کا ذکر قرآن میں سبا کے نام سے آیا ہے۔ اس قوم کی گھنی آبادی کا سلسلہ سواحل بحر ہند سے سواحل بحر احمر تک پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان اور یورپ کے درمیان جتنی تجارت اس زمانہ میں ہوتی تھی، وہ سب اسی قوم کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کے تجارتی قافلے جنوبی ساحل سے مال لے کر چلتے تو مغربی ساحل تک مسلسل بستیوں اور باغوں کی چھاؤں میں چلے جاتے تھے۔ وَجَعَلْنَا بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ الْقُرَی الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا قُرًی ظَاھِرَۃً وَّقَدَّرْنَا فِیْھَا السَّیْرَ سِیْرُوْا فِیْھَا لَیَالِیَ وَاَیَّامًا اٰمِنِیْنَ (۳۴: ۲) مگر انہوں نے اللہ کی اس نعمت کو مصیبت سمجھا اور چاہا کہ ان کی یہ گھنی متصل مسلسل بستیاں ختم ہو جائیں اور ان کا باہمی فصل بڑھ جائے فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یہاں لفظ بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا سے پتہ چلتا ہے کہ تجارتی خوشحالی کی وجہ سے جب آبادی بڑھی اور بستیاں گنجان ہو گئیں تو وہاں بھی یہی سوال پیدا ہوا تھا جو آج یورپ میں پیدا ہوا ہے۔ اور ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ سے اشارہ ملتا ہے کہ شاید انہوں نے بھی ایسی کچھ تدبیریں اختیار کی ہوں گی جن سے ان کی بستیوں کا درمیانی فصل بڑھ جائے یا بالفاظ دیگر آبادی کم ہو جائے۔ پھر ان کا حشر کیا ہوا؟ فَجَعَلْنٰھُمْ اَحَادِیْثَ وَمَزَّقْنٰھُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ (۳۴: ۲) خدا نے انکو منتشر اور پارہ پارہ کر کے ایسا تباہ و برباد کیا کہ بس وجود انکا افسانوں میں رہ گیا۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۲)
زندگی کا اسلامی تصوّر

اسی لفظ خلافت و نیابت سے ایک اور اہم نکتہ کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے۔ نائب کا اصلی کمال یہ ہو کہ وہ اپنے آقا کی املاک میں اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اسی شان کا تصرف کرے جس شان کا تصرف خود حقیقی مالک کرتا ہے۔ بادشاہ اگر اپنی رعیت پر کسی شخص کو اپنا نائب بنائے تو اس کے لئے اپنے منصب نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ رعیت کی خبر گیری، شفقت، مہربانی، حفاظت، عدل اور حسب موقع سختی کرنے میں وہی سیرت اختیار کرے جو خود بادشاہ کی سیرت ہے اور بادشاہ کی املاک اور اس کے اموال میں ویسی ہی حکمت، تدبر، دانائی اور احتیاط سے تصرف کرے جس سے خود بادشاہ ان میں تصرف کرتا ہے۔

پس جب انسان کو خدا کا خلیفہ اور نائب قرار دیا گیا، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان خدا کی نیابت و خلافت کا پورا حق اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب خدا کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اس کی روش بھی ویسی ہی ہو جیسی خود خدا کی روش ہے یعنی جس شان ربوبیت کے ساتھ خدا اپنی مخلوق کی خبر گیری اور پرورش کرتا ہے ویسی ہی شان کے ساتھ انسان بھی اپنے محدود دائرۂ عمل میں ان چیزوں کی خبر گیری اور پرورش کرے جو اللہ نے اس کے قبضۂ قدرت میں دی ہیں۔ اسی طرح جس شان رحمانی و رحیمی کے ساتھ خدا اپنی مخلوق پر مہربان ہے جس شان حکمت و دانائی کے ساتھ خدا اپنی ملکیت میں تصرف کرتا ہے، جس شان عدل کے ساتھ خدا اپنی مخلوقات

پر قائم کرتا ہے جس شان رحم و کرم کے ساتھ خدا اپنی صفت قہر و جبر کا اظہار کرتا ہے چھوٹے پیمانہ پر اسی شان کے ساتھ انسان بھی خدا کی اس مخلوق کے ساتھ معاملہ کرے جس پر اللہ نے اس کو حکومت بخشی ہے، اور جسے اس کے لئے مسخر کیا ہے یہی مفہوم ہے جو تخلقوا باخلاق اللہ کے حکیمانہ جملہ میں ادا کیا گیا ہے۔ مگر یہ اعلیٰ اخلاقی مرتبہ صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اس بات کو اچھی طرح سمجھے کہ وہ اس دنیا میں کوئی خود مختار فرماں روا نہیں ہے بلکہ اس عالم کے حقیقی فرمانروا کا نائب ہے، اور یہی نیابت کا منصب ہے جو دنیا کی تمام اشیا حتی کہ خود اپنے جسم اور جسمانی و نفسانی قوتوں کے ساتھ اس کے تعلق کی حیثیت اور حدود متعین کرتا ہے

منصب نیابت کی تشریح میں یہ جتنے نکات بیان ہوئے ہیں ان سب کی تفصیل قرآن مجید میں موجود ہے جس سے دنیا اور انسان کے باہمی تعلق کا ہر پہلو روشن اور واضح ہو جاتا ہے۔

انسان نائب ہے نہ کہ مالک کہا گیا کہ:۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ (۶: ۲)	وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا۔ اور تم میں سے بعض کو بعض سے اونچے درجے دئے تاکہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمایش کرے۔
قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۷: ۱۴)	موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تمھیں زمین کی خلافت دے تاکہ دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔
يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ	اے داؤد! ہم نے تجھ کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (۳۸: ۲۶)

پس تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ یہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیگی۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں ان کیلئے اس بنا پر سخت عذاب ہے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ (۹۵: ۸)

کیا خدا تمام حاکموں کا حاکم نہیں ہے؟

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶: ۵۷)

حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ (۳: ۲)

کہو کہ اے خدا! ملک کے مالک تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے معزز کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءَ (۷: ۱)

جو کچھ تمہاری طرف خدا کی جانب سے ہدایت بھیجی گئی ہے صرف اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے بناوٹی فرمانرواؤں کی پیروی نہ کرو۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (۶: ۲۰)

کہو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میری زندگی اور میری موت سب خدا کیلئے ہے جو رب العالمین ہے۔

یہ آیات بتاتی ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں انسان کے زیر تصرف اور زیر حکم ہیں حتیٰ کہ خود اس کا نفس بھی اس کی ملک نہیں ہے۔ اصلی مالک اور حاکم اور فرمانروا خدا ہے۔ انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان چیزوں میں مالکانہ تصرف کرے اور من مانے طریقوں سے ان کو استعمال کرے

اس کی حیثیت دنیا میں صرف نائب کی ہے اور اس کے اختیارات کی حد بس اتنی ہے کہ خدا کی ہدایت پر چلے اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق ان چیزوں میں تصرف کرے۔ اس حد سے تجاوز کر کے اپنے نفس کی پیروی کرنا، یا فرمانروائے حقیقی کے سوا کسی اور فرمانروا کی پیروی کرنا بغاوت اور گمراہی ہے۔

دنیا میں کامیابی کی اولین شرط

کہا گیا کہ:-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۹ : ۶)

اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور انہوں نے خدا سے کفر کیا وہی دراصل نقصان میں ہیں۔

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۲ : ۲۷)

تم میں سے جو کوئی خدا کی اطاعت سے پھر گیا اور اس حالت میں مرا کہ وہ کافر تھا تو ایسے تمام لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۵ : ۱)

اور جو کوئی ایمان لانے سے انکار کرے اس کا عمل ضائع ہو گیا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہے

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے دنیوی زندگی میں انسان کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی فرمانروائی تسلیم کرے، اور دنیا میں جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ میں خدا کا نائب اور اس کا امین ہوں۔ اس حیثیت کو تسلیم کئے بغیر خدا کی ملکیت میں وہ جس قدر تصرف کرے گا وہ محض باغیانہ تصرف ہوگا اور یہ قاعدے کی بات ہے کہ باغی اگر کسی ملک پر متصرف ہو کر بہتر کارگزاری بھی دکھلائے، تب بھی ملک کی اصلی حکومت اس کے حسن عمل کو تسلیم نہ کرے گی اور بادشاہ کی نگاہ میں باغی بہرحال باغی ہوگا، خواہ اس کی ذاتی سیرت اچھی ہو یا بری، خواہ بغاوت کر کے اس نے ملک میں اچھی طرح تصرف کیا ہو یا بری طرح

دنیا برتنے کے لئے ہے کہا گیا کہ :-

يٰاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ـ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲ : ۲۱)

اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاک ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں بدی اور بے حیائی اور خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہنے کا حکم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ـ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۵ : ۱۲)

اے ایمان لانے والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں ان کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، اور حد سے بھی نہ گذرو کہ اللہ حد سے گذرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان پاک اور حلال چیزوں میں سے کھاؤ جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں، اور اس خدا کے غضب سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷ : ۴)

کہو کہ کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کیا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالی ہے اور کس نے پاک رزق کو حرام کر دیا ہے۔

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷ : ۱۹)

ہمارا پیغمبر ان کو نیکی کا حکم کرتا، اور بدی سے روکتا ہے، اور ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان سے ان کے بوجھ اور بندشوں کو دور کرتا ہے جو ان پر تھیں۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (۲: ۲۵)

تمہارے لئے اس میں کوئی حرج نہیں کہ اپنے رب کا فضل (یعنی کاروبار کے ذریعہ سے روزی) تلاش کرو

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ (۵۷: ۴)۔

اور رہبانیت کا طریقہ جو مسیح کے پیروؤں نے خود نکال لیا تھا۔ انہوں نے محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا تھا۔ وہ ہم نے ان پر نہیں لکھا تھا

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷: ۲۲)

ہم نے جہنم کے لئے ایسے بہتیرے جن اور انسان پیدا کئے ہیں جن کے پاس دل ہیں مگر ان سے سوچتے سمجھتے نہیں اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے یہی لوگ غفلت میں ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کا کام دنیا کو چھوڑ دینا نہیں ہے، نہ دنیا کوئی ایسی چیز ہے کہ اس سے پرہیز اور حذر کیا جائے۔ اس سے دور بھاگا جائے، اس کے کاروبار، اس کے معاملات اس کی نعمتوں، اور اس کی لذتوں اور زینتوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا جائے۔ یہ دنیا انسان ہی کے لئے بنائی گئی ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ اس کو برتے اور خوب برتے۔ مگر برے اور بھلے، پاک اور ناپاک، مناسب اور نامناسب کے فرق کو ملحوظ رکھ کر برتے۔ خدا نے اس کو آنکھیں دی ہیں اس لئے کہ وہ ان سے دیکھے۔ کان دیئے ہیں کہ ان سے سنے عقل دی ہے کہ اس سے کام لے اگر وہ اپنے حواس، اپنے اعضاء اور اپنے قوائے ذہنی کو استعمال نہ کرے، یا استعمال کرے مگر غلط طریقہ سے تو اس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں۔

دنیوی زندگی کا مآل کہا گیا۔

إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللّٰهِ الْغَرُورُ (٣١:٣٣)

آخرت کے متعلق اللہ کا وعدہ سچا ہے پس دنیا کی زندگی تم کو دھوکہ میں نہ ڈالے اور نہ کوئی فریب تم کو خدا سے بہکا کر

وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ (١١:١٠)

جن لوگوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا وہ ان دنیوی لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جو ان کو دی گئی تھیں اور وہ مجرم تھے

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيٰحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا (١٨:٦)

ان کے سامنے دنیوی زندگی کی مثال پیش کر۔ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا اور وہ زمین کے برگ و بار کے ساتھ مل گیا پھر آخر کار یہ سب نباتات بھوسہ ہو کر رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے مال اور اولاد محض دنیوی زندگی کی زینت ہیں مگر تیرے رب کے نزدیک ثواب آئندہ کی توقع کے اعتبار سے باقی رہنے والی نیکیاں زیادہ بہتر ہیں۔

يٰأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَن ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ (٦٣:٩)

اے ایمان لانے والو! تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تم کو خدا کی یاد سے غافل نہ کر دیں جو لوگ ایسا کریں گے دراصل وہی ٹوٹے میں ہیں۔

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُم بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفٰى إِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا (٣٤:٥)

تمہارے اموال اور تمہاری اولاد وہ چیزیں نہیں ہیں جو تم کو ہم سے قریب کرنے والی ہوں ہم سے قریب صرف وہ ہے جو ایمان لایا اور جس نے نیک عمل کیا

اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَكُوْنُ حُطَامًا ۔ (۵۷ : ۲)

جان رکھو کہ دنیا کی زندگی ایک کھیل ایک تماشا ایک ظاہری شان ہے اور آپس میں تمہارا ایک دوسرے پر فخر کرنا، اور مال اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بارش ہوئی، اس کی روئیدگی نے نافرمانوں کو خوش کر دیا۔ پھر وہ پک گئی اور تو نے دیکھا کہ وہ زرد پڑگئی، پھر آخر کار وہ بھوسہ ہوکر رہ گئی۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (۲۶ : ۷)

کیا تم ہر اونچی جگہ بے نتیجہ یادگاریں بناتے اور عمارتیں کھڑی کرتے ہو، شاید کہ تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔

اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَا اٰمِنِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ (۲۶ : ۸)۔

کیا تم ان چیزوں میں جو یہاں ہیں اطمینان سے چھوڑ دئے جاؤ گے؟ ان باغوں ان چشموں ان کھیتوں، ان نخلستانوں میں جن کے خوشے ٹوٹے پڑتے ہیں، تم پہاڑ کاٹ کاٹ کر گھر بنا رہے ہو اور خوش ہو۔

اَیْنَمَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ (۴ : ۱۱)

تم جہاں کہیں بھی ہوگے موت تم کو آئے گی، خواہ تم بڑے مضبوط برجوں ہی میں کیوں نہ ہو

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ (۲۹ : ۶)

ہر جی کو موت آنی ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف واپس لائے جاؤ گے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (۲۳: ۶)	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے نتیجہ پیدا کیا ہے۔ اور تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤگے

پہلے کہا گیا تھا کہ دنیا تمہارے لئے ہے، اور اسی لئے بنائی گئی ہے کہ تم اس کو خوب اچھی طرح برتو۔ اب معاملہ کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ مگر تم دنیا کے لئے نہیں ہو نہ اس لئے بنائے گئے ہو کہ یہ دنیا تمہیں برتے اور تم اسی میں اپنے آپ کو گم کردو۔ دنیا کی زندگی سے دھوکا کھا کر کبھی یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ ہمیں دائماً یہیں رہنا ہے۔ خوب یاد رکھو کہ یہ مال یہ دولت، یہ جائداد یہ عمارتیں یہ اولاد، یہ عزیز، یہ اقارب، یہ دولت، یہ شان و شوکت کے سامان، سب ناپائدار ہیں سب کچھ دیر کا بہلاوا ہیں، سب کا انجام موت ہے۔ اور تمہاری طرح یہ سب بھی خاک میں مل جانے والے ہیں۔ اس ناپائدار عالم میں سے اگر کوئی چیز باقی رہنے والی ہے تو وہ صرف نیکی ہے۔ دل اور روح کی نیکی عمل اور فعل کی نیکی۔

اعمال کی ذمہ داری اور جواب دہی پھر کہا گیا:۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (۲۰: ۱)	فیصلہ کی گھڑی جس کو ہم چھپانے کا ارادہ رکھتے ہیں آنے والی ہے تاکہ ہر نفس کو اس کی سعی کے مطابق بدلہ ملے
هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۷: ۷)	کیا تم کو تمہارے عملوں کے سوا کسی اور چیز کے لحاظ سے جزا دی جائے گی؟
وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (۵۳: ۳)۔	اور یہ کہ انسان کو اتنا ہی ملیگا جتنی اس نے کوشش کی ہے اور اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کو پورا پورا بدلہ ملے گا۔ اور یہ کہ آخر کار سب کو تیرے پروردگار کے پاس پہنچنا ہے۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۷: ۸)

جو اس دنیا میں اندھا تھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اور راستے سے بہت ہٹا ہوا

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲: ۱۳)

تم اپنے لئے جو نیکیاں اس دنیا سے بھیجو گے انہیں اللہ کے ہاں پاؤ گے، تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲: ۳۸)

اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کے پاس واپس کئے جاؤ گے پھر ہر نفس کو اس کے کئے کا بدلہ ملیگا اور ان پر ہرگز ظلم نہ کیا جائے گا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمِنْ سُوْٓءٍ (۳: ۱۳)

وہ دن جبکہ ہر نفس اپنی کی ہوئی نیکی اور اپنی کی ہوئی بدی کو حاضر پائیگا۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (۷: ۱)

اس دن وزن ہی حق ہوگا۔ جن کے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا وہی لوگ اپنے آپ کو نقصان پہونچانے والے ہونگے کیونکہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے

مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹)

جو شخص ذرہ برابر نیک عمل کریگا اس کا نتیجہ دیکھ لیگا اور جو ذرہ برابر برا عمل کریگا اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیگا۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (۳: ۲۰)

اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور کہا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہ کرونگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا (۲:۶۳)	ہمنے تم کو جو کچھ بخشا ہے وہ خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے اور وہ کہے کہ میرے رب کاش تو مجھے تھوڑی مہلت او ردیتا تو میں تیرے پیغام کی تصدیق کرتا اور نیکو کاروں میں سے ہوتا مگر اللہ کسی نفس کی مدت مقررہ آن پہنچنے کے بعد پھر اس کو مہلت ہرگز نہیں دیتا۔
وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ...... فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲:۳۲)	کاش تم وہ وقت دیکھتے جب مجرم اپنے رب کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور کہیں گے کہ پروردگار ہم نے اب دیکھ لیا اور سن لیا اب تو ہمیں واپس کردے ہم اچھے عمل کریں گے۔ اب ہم کو ایقان حاصل ہوگیا ہے..... مگر کہا جائیگا کہ اب اس کوتاہی کا مزا چکھو کہ تم نے اس دن ہمارے پاس حاضر ہونیکو بھلا دیا تھا ہم نے بھی تم کو بھلا دیا اب ہمیشگی کے عذاب کا مزہ چکھو ان اعمال کے بدلہ میں جو تم کرتے تھے

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا دار العمل ہے سعی اور کوشش کی جگہ ہے اور آخرت کی زندگی دار الجزا ہے نیکی اور بدی کے پھل اور اعمال کے بدلے کا گھر ہے۔ انسان کو موت کی گھڑی تک دنیا میں عمل کرنے کی مہلت ملی ہوئی ہے اس کے بعد اسے پھر عمل کی مہلت ہرگز نہ ملے گی لہذا اس عرصۂ حیات میں اس کو یہ سمجھکر سعی کرنی چاہئے کہ میرا ہر کام، میری ہر حرکت، میری ہر برائی اور بھلائی اپنا ایک اثر رکھتی ہے۔ ایک وزن رکھتی ہے، اور اس اثر اور وزن کے مطابق مجھے بعد کی زندگی میں اچھا

یا بُرا نتیجہ ملنے والا ہے مجھے جو کچھ ملے گا وہ میری یہاں کی کوشش اور میرے یہاں کے عمل کا بدلہ ہوگا۔ نہ میری کوئی نیکی ضایع ہوگی اور نہ کوئی بدی سزا سے بچے گی۔

انفرادی ذمہ داری اس ذمہ داری کے احساس کو مزید تقویت دینے کے لئے یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ ہر شخص خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ نہ کوئی دوسرا اس کی ذمہ داری میں شریک ہے، اور نہ کوئی شخص کسی کو اس کے نتائج عمل سے بچا سکتا ہے :۔

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔ (۵:۱۴)

تم پر تمہارے اپنے نفس کی ذمہ داری ہے، اگر تم ہدایت پاؤ تو دوسرا گمراہ ہونے والا تم کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶:۲۰)

ہر نفس جو کچھ کماتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۶۰:۱)

قیامت کے دن تمہارے رشتے اور تمہاری اولاد ہرگز کام نہ آئے گی تمہارے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا۔ اور اس کی نظر تمہارے عملوں پر ہے

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷:۱)

اگر تم نیک کام کروگے تو اپنے نفس کے لئے کروگے اور اگر بُرے کام کروگے تو اسی کے لئے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (۳۵:۳)

کوئی شخص کسی دوسرے کا بارگناہ اپنے سر نہ لے گا اور اگر کسی پر گناہوں کا بڑا بار ہو۔ اور وہ اپنا بار بٹانے کے لئے کسی کو بلائے تو وہ اس کے بوجھ کا کوئی حصہ اپنے اوپر نہ لیگا خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا	اے لوگو اپنے رب سے ڈرو اور اس دن کا خوف
لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ	کرو جب کہ نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام
هُوَ جَازٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا (۲۱:۴)	آئے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا
مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَمَنْ عَمِلَ	جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال اس کے سر ہے
صَالِحًا فَلِأَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ	اور جس نے نیک عمل کیا تو ایسے لوگ خود اپنی بہتری
(۵:۳۰)	کے لئے راستہ صاف کر رہے ہیں۔

یہاں ہر انسان پر فرداً فرداً اس کے تمام اچھے اور برے اعمال کی کامل ذمہ داری کا بوجھ ڈالدیا گیا ہے نہ یہ امید باقی رہنے دی گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کریگا نہ اس توقع کے لئے کوئی گنجایش چھوڑی گئی ہے کہ کسی کے تعلق اور کسی کے واسطہ سے ہم اپنے جرائم کی پاداش سے بچ جائینگے۔ اور نہ اس خطرہ کا کوئی موقع باقی رکھا گیا ہے کہ کسی کا جرم ہمارے حسن عمل پر اثر انداز ہوگا یا خدا کے سوا کسی کی خوشی کو ہمارے اعمال کی مقبولیت و نامقبولیت میں کوئی دخل ہے جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے والے کو جلنے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی اور شہد کھانے والے کو شیرینی کے احساس سے کوئی شئے نہیں روک سکتی نہ جلنے کی مضرت میں کوئی دوسرا شخص اس کا شریک و سہیم ہو سکتا ہے، اور نہ شیرینی کی لذت سے کوئی دوسرا اس کو محروم کر سکتا ہے اسی طرح بدکاری کے نتیجہ بد اور نیکوکاری کے انجام نیک میں بھی ہر شخص بجائے خود منفرد ہے۔ لہذا دنیا کو برتنے میں ہر شخص کو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے۔ اور دنیا و مافیہا سے قطع نظر کرکے یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہئے کہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار میں خود ہوں، برائی کا وبال بھی تنہا میرے اوپر ہے، اور بھلائی کا فائدہ بھی اکیلا میں اٹھانے والا ہوں۔

باقی

باغ جنت

(از مولانا عبداللہ العمادی)

(۱)

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔ جنت تو وہ ہے جو مومنین کو بعد موت نصیب ہوگی اس پر ہم سب کا ایمان ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور جنت بھی ہے جس کا اسی دنیا سے تعلق ہے۔

سورۂ بقر کے دوسرے رکوع آیت نمبر ۱۲ میں نیک کردار ایماندار وں کو بشارت دیگئی ہے کہ ان کے لئے باغ ہوں گے۔ جاری نہریں ہونگی۔ پاکیزہ بیویاں ہوں گی جب کوئی میوہ ملیگا تو عام رواج کے مطابق اس کو نیا دیکھکر طبیعت رک نہ جائے گی کہ نہ معلوم کیسا ہو کیسانہ ہو۔ جتنے میوے ہوں گے صورت میں سب یکساں ہوں گے اور مزے میں ہر ایک کے ذائقے جدا جدا نکلیں گے کہ یکسان ہونے سے طبیعت مانوس رہیگی اور ذائقہ میں تفاوت سے سب میں نیا مزہ آئے گا۔ یہ حالت پائدار ہوگی اور یہ نیک بندے اسی حالت میں ہمیشہ رہیں گے مفسرین نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔

الف۔ باغ سے مراد باغ بہشت ہے[۱]

ب۔ بہشت کے جتنے درخت ہوں گے جڑ سے شاخ تک برابر و باترتیب یکساں ہوں گے۔[۲]

---

[۱] روی ابن جریر قال حدثنا کریب عن الاشجعی عن سفیان عن عمرو بن مرۃ عن مسروق قال نخل الجنۃ نضید من اصلھا الی فرعھا وثمرھا امثال القلال کلما نزعت ثمرۃ عادت مکانھا اخری ھما وماءھا یجری فی غیر اخدود

[۲] عن مجاھد قال حدثنا یزید قال اخبرنا مسعر بن کدام عن عمرو بن مرۃ عن ابی عبیدۃ۔ نحوہ

ج۔ درختوں کے میوے مٹکے برابر ہوں گے۔[1]

د۔ جہاں کوئی میوہ توڑا گیا کہ فوراً دوسرا میوہ وہاں لگ جائیگا۔[2]

ھ۔ باغ بہشت میں بغیر نالیوں کے پانی رواں رہیگا۔[3]

و۔ باغ بہشت کے خوشے بارہ بارہ گز کے ہوں گے۔[4]

ز۔ درخت ایسے ہوں گے کہ ان کے سایہ میں مسافر سو برس تک چلا جائے اور پھر بھی سایہ طے نہ ہو۔[5]

ح۔ باغ بہشت میں جب کوئی میوہ لے کر کھانا چاہے گا تو وہ میوہ اس کے منہ تک نہ پہنچنے پائیگا۔ کہ خدا ویسا ہی دوسرا میوہ بجائے اس کے لا دیگا۔[6]

ان کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سن لینے کی بات ہے:۔

لا یشبہ شی مما فی الجنۃ ما فی الدنیا الا الاسماء — بہشت کی چیزوں میں سے کوئی چیز دنیا کی چیزوں سے اگر مشابہ ہوگی تو برائے نام مشابہ ہوگی[7]

دوسری روایت میں ہے:۔

لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء[8] — بہشت کی چیزوں میں سے دنیا میں کچھ نہیں ہے اگر ہے تو نام ہی نام ہے

ایک اور حدیث میں ہے۔

لیس فی الدنیا من الجنۃ شی الا الاسماء — نام کے سوا دنیا میں بہشت کی اور کوئی چیز نہیں ہے[9]

---

[1] عن محمد بن بشار قال حدثنا ابن محمد قال حدثنا سفیان قال سمعت عمرو بن مرۃ یحدث عن ابی عبیدۃ فذکر مثلہ۔

[2] عن مسروق وابی عبیدہ۔ [3] عن مسروق وابی عبیدہ۔

[4] اورد النیسابوری والخطیب الشربینی غیرھما حدیثا فی صفۃ ثمار الجنۃ دعنا قیدھا فقالا العنقود اثنا عشر ذراعا

[5] قال النیسابوری یرون الشجرۃ یسیر الراکب فی ظلھا مائۃ عام لا یقطعہ

[6] زعم الخطیب الشربینی فی تفسیرہ المسمی بالسراج المنیر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال والذی نفس محمد بیدہ ان الرجل من اھل الجنۃ یتناول الثمرۃ لیاکلھا فماھی واصلۃ الی فیہ یبدل اللہ مکانھا مثلھا۔

[7] ابن جریر عن محمد بن بشار قال حدثنا مومل قال جمیعا حدثنا سفیان عن الاعمش عن ابن عباس الخ

[8] ابن بشار فی حدیثہ عن مومل [9] ابن جریر عن عباس بن محمد قال حدثنا محمد بن عبید عن الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس الخ۔

بہر حال اصل آیت یوں ہے :-

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۔ وَلَهُمْ فِیْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ سورہ بقرہ آیت ۲۴ رکوع ۲

اے پیغمبر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کئے ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لئے (بہشت کے) باغ ہیں جن کے تلے نہریں (پڑی) بہ رہی ہوں گی جب ان کو ان میں کا کوئی میوہ کھانے کو دیا جائیگا تو کہیں گے یہ تو ہم کو پہلے بھی (کھانے کے لئے) مل چکا ہے اور (یہ اس لئے کہیں گے کہ) ان کو ایک ہی صورت و شکل کے میوے ملا کریں گے اور وہاں ان کے لئے بیویاں ہوں گی پاک و صاف اور وہ ان باغوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے [1]

اس آیت میں کئی باتیں قابل تنقیح ہیں۔ [2]

الف۔ جنت (باغ) سے کیا مراد ہے ؟

ب۔ هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے نصیب ہو چکا ہے) سے کیا مراد ہے ؟

ج۔ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (میوہ ان کو یکساں دیا جائیگا) سے کیا مراد ہے ؟

د۔ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے) سے کیا مراد ہے ؟

الف۔ تمام مفسرین نے جنت سے بہشت مراد لی ہے حتی کہ سید احمد خان نے بھی اسی کو

---

[1] یہ ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم سے ماخوذ ہے مولوی صاحب نے جنت کا ترجمہ باغ کیا ہے مگر اس کے ساتھ بہشت کا لفظ بھی اضافہ کر دیا ہے آیۃ میں میوہ کھانے نہ کھانے کا کچھ تذکرہ نہیں ہے اور اس کے لئے کوئی لفظ وارد نہیں ہے لیکن مطلب سمجھانے کے لئے جناب مصنف نے اس کو بڑھا دیا ہے۔ خلدون کا ترجمہ محض لطف کلام کے لئے "ہمیشہ ہمیشہ" کیا ہے حالانکہ یہ ترجمہ اگر ہو سکتا ہے تو خٰلِدُوْنَ اَبَدًا کا ہو سکتا ہے

صحیح مان کر آیت کے مفہوم کو واقعات بعد الموت سے وابستہ کیا ہے یعنے نیک کردار ایمان والوں کو یہ نعمتیں جیتے جی نہ ملیں گی مرنے کے بعد ملیں گی خاتمۂ آیت (ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ) سے یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا کیونکہ بظاہر خلود کے معنی ہمیشگی کے ہیں۔ اور دنیا کی زندگی میں کوئی ایسی نعمت موجود نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے جس کے لئے ہمیشگی وبقائے دوام ممکن ہو مطلب یہ ہوا کہ خدا کے فضل سے جن کو بہشت ملیگی وہ ہمیشہ پر لطف زندگی بسر کریں گے اور جو نعمتیں انہیں ملیں گی وہ بھی دوامی ہوں گی البتہ سید صاحب نے اتنی بات بڑھائی ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتوں کی حقیقت وماہیت کچھ اور ہے۔ ان کی رائے بہشت اور اس کی نعمتوں کے بیان کرنے سے" صرف اعلیٰ درجہ کی راحت کا بقدر فہم انسانی خیال پیدا کرنا مقصود تھا۔ نہ واقعی ان دونوں چیزوں کا دوزخ وبہشت میں موجود ہونا" اس لئے کہ "یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا کی ہوئی ہے۔ اس میں سنگ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں۔ باغ میں سرسبز شاداب درخت ہیں۔ دودھ اور شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے ساقی اور ساقنین نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں شراب پلا رہی ہیں۔ ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہات ڈالے پڑا ہے۔ ایک نے ران پر سر دھرا ہے۔ ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے ایک نے لب جان بخش کا بوسہ لیا ہے۔ کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں۔ کچھ ایسا بیہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہو تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں[2]"

ب۔ ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ کی تاویل میں سب نے یہی لکھا ہے کہ جب کبھی کوئی نیا پھل کھانے کو دیا جائے جو اس نے کبھی نہ دیکھا ہو تو اس کے کھانے سے رکتا ہے کہ نہیں

[1] تفسیر القرآن (طبع لاہور) جلد ۱ صفحہ ۴۳ [2] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۳۳ ۔

معلوم کیا ہے۔ جنتیوں کو جو ایک ہی صورت کے پھل ملیں گے تو وہ ان کے کھانے میں تامل نہیں کرتے۔ جانتے ہیں کہ ایسا تو ہم پہلے بھی کھا چکے ہیں۔ ہاں شاید صورت کے دھوکہ میں آکر چند لقمے بھی نہ آئے۔ کہ حلوا چوں یکبار خوردند بس۔ تو چکھنے کے بعد دوسرا ذائقہ ملے گا۔ اور ان کے دل زیادہ خوش ہوں گے کہ خلاف توقع مزہ ملا ہے۔ تو جسمانیت اور مادیت کی باتیں ہوئیں لیکن امام رازی کی رائے میں ان تمام باتوں کا تعلق روحانیت سے ہے جسمانیت کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

فی الآیۃ قول ثالث علی لسان اهل المعرفة وهو ان کمال السعادة لیس الا فی معرفة ذات الله تعالی و معرفة صفاته و معرفة افعاله من الملائکة الکروبیة والملائکة الروحانیة وطبقات الارواح وعالم السموٰت و بالجملة یجب ان یصیر روح الانسان کالمرآة المحاذیة العالم القدس ثم ان هذه المعارف تحصل فی الدنیا ولا یحصل بها کمال الالتذاذ والابتهاج لما ان العلائق البدنیة تعوق عن ظهور تلك السعادة فاذا زال هذا العائق حصلت السعادة العظیمة والغبطة

آیت میں اہل معرفت کی زبان سے ایک تیسری بات بھی مذکور ہے اور وہ یہ کہ کمال نعمت اور سعادت صرف خدا کی ذات وصفات وافعال کے پہچاننے میں ہے کہ کروبیان عالم بالا و فرشتگان روحانی وطبقات ارواح وعالم سموات کے متعلق انسان کو شناسائی حاصل ہو۔ اور لازم ہے کہ اس کی روح ایک ایسے آئینہ کے مماثل ہوجائے۔ جو عالم قدس کے ٹھیک سامنے ہو۔ یہ معرفت دنیا میں بھی حاصل ہوتی ہے لیکن اس میں پوری لذت اور کافی خوشی نہیں ہوتی اس لئے کہ جسمانی تعلقات اس لذت وسعادت کے ظاہر ہونے میں سنگ راہ بن جاتے ہیں اور اگر یہ روک اٹھ جائے تو اصلی و حقیقی لطف حاصل ہو۔ ماحصل یہ ہے کہ جو روحانی نعمتیں اور لذتیں

الکبریٰ۔ فالحاصل ان کل سعادة روحانیة | انسان کو مرنے کے بعد حاصل ہوگی تو وہ کہیگا کہ یہ
یجدھا الانسان بعد الموت فانہ یقول | وہی نعمتیں ہیں جو دنیا میں بھی حاصل تھیں۔ مگر دنیا
ھذہ ھی التی کانت حاصلة فی الدنیا | میں یہ بات نہ تھی کہ ان کی وجہ سے عزہ و دلچسپی
الا انھا فی الدنیا ما افادت اللذة و البھجة | و خوشی ہوتی ہو۔ آخرت میں یہ سب باتیں حاصل
والسرور و فی الآخرة افادت ھذہ الاشیاء لزوال | ہوگئیں اس لئے کہ جو روک تھی وہ مٹ گئی[1]
العایق[1]

ج۔ واوتوا بہ مُتَشَابِھًا کے معنی تو یہی لئے گئے ہیں۔ کہ اہل جنت کو جو میوے ملیں گے وہ سب کے سب شکل و صورت میں یکساں ہوں گے اور دنیا کے میووں سے انکی شکلیں ملتی جلتی ہوں گی لیکن حسن بن الحسن البصری وقتادہ و ابن جریج سے متعدد حدیثیں اس مفہوم کی بھی روایت کیگئی ہیں کہ بہشت کے میووں کا ہر ایک حصہ اور ہر ایک جزو دوسرے جز کے تشابہ (تماثل) ہوگا۔ یعنے جنت کے میوے چھلکے سے لیکر مغز تک بے داغ و بے عیب ہوں گے دنیاوی میوں کی سی کیفیت نہ ہوگی کہ میوے کا کچھ حصہ تو اچھا ہوتا ہے اور کچھ ناقص رہتا ہے[2]
قاضی بیضاوی نے اس جسمانی کیفیت کو بھی روحانیت پر محمول کیا ہے لکھتے ہیں۔

ان للآیة الکریمة محملا آخر وھو ان | آیت کریمہ کا ایک اور مطلب بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے
مستلذات اھل الجنة فی مقابلة ما | کہ معرفت و عبادت کے ضمن میں جو مزے دنیا میں
رزقوا فی الدنیا من المعارف والطاعات | حاصل تھے ان کے مقابلہ میں بہشت کے
متفاوتة فی اللذة بحسب تفاوتھا | مزوں اور لذتوں میں فرق ہوگا ہو سکتا ہے کہ آیت
فیحتمل ان یکون المراد من ھذا الذی رزقنا انہ | "یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے نصیب ہو چکا ہے" سے مراد
ثوابہ ومن تشابھما تماثلھما فی الشرف | دنیاوی عبادت و معرفت کا ثواب ہو (یعنی جو

[1] تفسیر کبیر (طبع خیریہ مصر ۱۳۰۸ھ) جلد ۱ صفحہ ۲۳۔ [2] تفسیر ابن جریر (طبع میمنیہ مصر) جلد ۱ صفحہ ۱۲۲ و ۱۲۳

والمزية وعلو الطبقة فيكون هٰذا في الوعد نظير قوله ذوقوا ما كنتم تعملون۔ في الوعيد ؎

لذت دنیا میں خدا کی عبادت ومعرفت میں چکھی تھی بہشت کی لذت اس سے بڑھ کر ہوگی) اور ان کو میوہ یکساں دیا جائیگا" میں یکساں ہونے بزرگی وبرتری وعلو مدارج میں یکساں ہونا مقصود ہو۔ اس صورت میں یہ وعدہ اس وعید کی نظیر ہوگا جس میں دھمکی دی گئی ہے کہ اب اپنے کئے کو چکھو" ؎

اور خطیب شربینی بھی اس قول میں قاضی بیضاوی کے ہم زبان ہیں۔ ؎

د۔ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ کا مطلب بالاتفاق یہی بیان کیا گیا ہے کہ اہل بہشت کی ہمیشہ انہیں نعمتوں میں بسر ہوگی اور اس حالت میں کوئی تغیر وتبدل نہ ہونے پائے گا۔

(۳)

اس باب میں تحقیقات کا دائرہ صرف پہلی اور آخری تنقیح تک وسیع ہے جس کے ضمن میں آیت کا مفہوم ومدعا بھی واضح ہو جائے گا۔ پہلی تنقیح کا انحصار لفظ جنت کی تشریح پر ہے۔ اور دوسری تنقیح پر دوسری فرصت میں بحث ہوگی۔

لغت میں جنت کے معنی اس باغ کے ہیں جس کے درخت کثیر ہوں شاخ در شاخ و پیچ در پیچ ہوں اور آپس میں لپٹے نظر آئیں۔ اصطلاح میں جنت کو صرف باغ آخرت سے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے اور اصل میں حقیقی جنت وہی ہے بھی لیکن کلام اللہ نے آخرت کے باغوں کو بھی جنت کہا ہے اور دنیا کے باغوں کے لئے بھی جنت ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورہ انعام میں ہے۔

؎ تفسیر البیضاوی (علی ہامش الخطیب الشربینی) جلد ا صفحہ ۴۲۔ ؎ تفسیر الخطیب الشربینی جلد ا صفحہ ۳۱۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُکُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ۔ کُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۔ (سورۃ الانعام ۔ رکوع ، آیت ۱۴۲)

اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے باغ پیدا کیے (بعض تو ٹٹیوں پر) چڑھائے ہوئے (جیسے انگور کی بیلیں) اور بعض نہیں چڑھائے ہوئے اور کھجور کے درخت اور کھیتی جن کے پھل مختلف (قسموں کے) ہوتے ہیں اور زیتون و انار (کہ بعض تو صورت و شکل و مزہ میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض نہیں بھی ملتے جلتے (لوگو!) یہ سب چیزیں جب پھلیں تو انکے پھل (بے تامل) کھاؤ اور (ان نعمتوں کے شکریہ میں) ان کے کاٹنے (اور توڑنے) کے دن حق اللہ (یعنی زکوٰۃ ان میں سے) دیدیا کرو ۔ اور فضول خرچی نہ کرو کیونکہ فضول خرچی کرنے والوں کو خدا پسند نہیں کرتا

ایک اور مقام پر ہے:۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ کُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاکِبًا ۔ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ۔ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (سورۃ ۶ ۔ آیت ۹۹ (رکوع ۱۲)

اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے پانی اُتارا پھر (اسکے بعد) ہم (ہی) نے اس سے ہر قسم (کی روئیدگی) اگائے نکالے پھر کونپلوں سے ہم نے ہری بھری ٹہنیاں نکال کھڑی کیں کہ اُن سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں گچھے جو (مارے بوجھ کے) جھکے پڑتے ہیں اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار (ظاہر میں ایک دوسرے سے) ملتے جلتے اور (مزے کے اعتبار) سے ملتے جلتے نہیں (لوگو!) ان میں سے ہر ایک چیز جب پکتی ہے تو اس کا پھل اور پھل کا پکنا (قابل) دید ہے ۔ اور

اور اس کو نظر غور سے دیکھو بیشک جو لوگ (خدا پر) ایمان رکھتے ہیں ان کے لئے ان سب چیزوں میں (قدرت خدا کی بہتیری) نشانیاں (موجود) ہیں۔

سورہ یٰسٓ میں ہے۔

وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ اَحْیَیْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ یَاْكُلُوْنَ وَجَعَلْنَا فِیْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِیْهَا مِنَ الْعُیُوْنِ لِیَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَیْدِیْهِمْ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ۔ (سورۂ ۳۶ ۔ رکوع ۳ آیت ۳۵ و ۳۶)

اور ان لوگوں کے (سمجھنے کے لئے ہماری (قدرت کی) ایک نشانی مری ہوئی (یعنی پڑتی پڑی ہوئی) زمین ہے کہ ہم نے اس کو (پانی برسا کر) جلا اٹھایا اور اس سے اناج نکالا اسی میں سے یہ (لوگ بھی اپنی قسمت کا) کھاتے ہیں۔ اور زمین میں ہم نے کھجوروں کے اور انگوروں کے باغ لگائے اور ان میں (پانی کے) چشمے بہائے تاکہ باغ کے پھلوں میں سے یہ (لوگ اپنی قسمت کا) کھائیں اور (معلوم ہے کہ) یہ (پھل) ان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے نہیں۔ تو کیا یہ (لوگ اس نعمت کا) شکر نہیں کرتے۔

سورہ قٓ میں ہے:۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِیْدِ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۔ وَاَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۔ (سورۂ ۵۰ رکوع آیت ۱۰)

اور ہم نے آسمان سے برکت کا پانی اتارا (اپنے بندوں) کو روزی دینے کے لئے اس (پانی) کے ذریعہ سے باغ اگائے اور کھیتی کا اناج اور لانبی لانبی کھجوریں جن کی گیلیں خوب گتھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور (نیز) ہم نے مینہ کے ذریعہ سے مری ہوئی (یعنی پڑتی پڑی ہوئی) بستی کو جلا اٹھایا۔ اسی طرح (لوگوں کو) نکلنا ہوگا

سورۂ نوح میں ہے۔

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۔	گناہوں کی اپنے پروردگار سے معافی مانگو کہ وہ
يُّرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ	بڑا بخشنے والا ہے تم پر موسلادھار مینہ برسائیگا اور
يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ	مال اور اولاد سے تمہاری مدد کریگا اور تمہارے
لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا	لئے نہریں بنائے گا۔

(سورہ ۷۱، رکوع اول۔ آیت ۵)

سورہ مؤمنون میں ہے:۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ	ہمیں نے ایک انداز کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا
فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى	پھر اس کو زمین میں جمع کرکے (ٹھیرائے رکھا) اور ہم
ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ فَاَنْشَاْنَا	اس (پانی) کے (اڑا) لے جانے پر (بھی) قادر ہیں پھر
لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ	اس (پانی) کے ذریعہ سے ہم نے تمہارے لئے کھجوروں
لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا	اور انگوروں کے باغ بنا کھڑے کئے تمہارے لئے ان میں بہت سے میوے پیدا ہوتے ہیں اور
تَاْكُلُوْنَ۔ (سورہ ۲۳۔ رکوع اول آیت ۱۹)	ان میں سے (بعض کو) تم کھاتے (بھی) ہو۔

سورہ شعرا میں ہے:۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ	غرض ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو) باغوں سے
وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ (سورہ ۲۶ رکوع ۴)	اور چشموں (سے) اور خزانوں (سے) اور عزت کی
آیت (۱۳)	جگہ (سے) نکال باہر کیا۔

سورہ دخان میں ہے:۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّ	یہ لوگ کتنے ہی باغ اور (کتنی ہی) نہریں اور (کتنی ہی
زُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا	کھیتیاں) اور (کتنے ہی) عمدہ عمدہ مکانات اور (کتنے ہی

فِیْھَا فٰکِھِیْنَ۔ کَذٰلِکَ وَاَوْرَثْنٰھَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ۔ فَمَا بَکَتْ عَلَیْھِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا کَانُوْا مُنْظَرِیْنَ۔ (سورہ ۴۴۔ رکوع اول آیت ۱۳ و ۱۴)

آرام و آسائش کے ساما ن چھوڑ مرے جن میں مزے اڑایا کرتے تھے (واقع میں) ایسا ہی (ہوا) اور ہم نے دوسرے لوگوں کو اس (تمام ساز و سامان) کا وارث بنا دیا تو ان لوگوں پر آسمان و زمین (کسی) کو (بھی تو) رقت نہ آئی اور نہ ان کو توبہ و ندامت (ہی) کی مہلت ملی۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے:۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْبُوْعًا اَوْ تَکُوْنَ لَکَ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْھٰرَ خِلٰلَھَا تَفْجِیْرًا (سورہ ۱۷ رکوع ۱۰ آیت ۹۳)

اور انہوں نے کہا کہ ہم تو اس وقت تک تم پر ایمان لانے والے نہیں کہ (یا تو ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ (بہا) نکالو یا کھجوروں اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اور اس کے بیچ بیچ میں تم (بہت سی نہریں جاری کر دکھاؤ۔

سورہ فرقان میں ہے:۔

وَقَالُوْا مَالِ ھٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مَلَکٌ فَیَکُوْنَ مَعَہٗ نَذِیْرًا۔ اَوْ یُلْقٰٓی اِلَیْہِ کَنْزٌ اَوْ تَکُوْنُ لَہٗ جَنَّۃٌ یَّاْکُلُ مِنْھَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ (سورہ ۲۵۔ رکوع اول آیت ۸)

اور انہوں نے (یعنی کافروں نے) کہا کہ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا اور بازاروں میں پھرتا ہے۔ اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ اس کے ساتھ ہو کر (وہ بھی لوگوں کو عذاب خدا سے) ڈراتا۔ یا اس پر کوئی خزانہ ڈالا ہوتا۔ (یا زیادہ نہیں تو) اس کے پاس ایک باغ (ہی) ہوتا کہ اس سے کھاتا (پیتا) اور یہ ظالم (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم بس ایسے آدمی کے پیچھے ہو لئے جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

سورہ کہف میں ہے:-

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا
لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ ×××
كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا ××××
وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ
××× وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ
قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ
××× فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا
مِّنْ جَنَّتِكَ ×××××× (سورہ ۱۸
رکوع ۵ آیت ۲۵ و ۲۶ و ۲۷ و ۳۰)

اور ان لوگوں سے ان دو شخصوں کی مثال بیان
کرو جن میں سے ایک کو ہم نے دو باغ دے رکھے تھے
××××××× دونوں باغ اپنے اپنے پھل لائے ××
×××× وہ باغ میں ایسی حالت میں داخل ہوا کہ
اپنے نفس پر آپ ہی ظلم کر رہا تھا ××××× اور
جب تو اپنے باغ میں آیا تو تو نے (یوں) کیوں
نہ کہا کہ یہ (سب) تو خدا کے چاہے سے ہوا ہے (قوت
مجھ میں تو) بے مدد خدا کچھ بھی طاقت نہیں ××××
تو عجب نہیں میرا پروردگار تیرے باغ سے (بھی) بہتر
باغ مجھکو عطا فرمائے۔

سورہٴ سبا میں ہے:-

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ
جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ××××
وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ
اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ
قَلِيْلٍ۔ (سورہ ۳۴۔ رکوع ۲۔ آیت ۱۳ و ۱۴)

قوم سبا کے لئے ان کے داہنے ہی گھروں میں (قدرت
خدا کی) البتہ ایک بڑی نشانی (موجود تھی۔ کہ ان کے داہنے
ہات اور بائیں ہات دو دو باغ تھے ××××)
اور ہمنے ان کے دو باغوں کے بدلے میں دو باغ (ان کو)
دئے مگر ایسے کہ ان کے پھل بدمزہ تھے اور ان میں (کچھ)
جھاؤ تھا اور قدر قلیل بیری۔

باغ بہشت کے حق ہونے میں کلام نہیں جس کا وعدہ موت کے
بعد ہے یہاں کہنے کی بات صرف اتنی ہی ہے کہ ان آیتوں میں جنت سے مراد باغ دنیا ہے۔ اور اگر

اسی ضمن میں وہ آیتیں بھی شامل کرلی جائیں جن میں حضرت آدم وحوا (علیہما السلام) کے جنت میں داخل ہونے اور نکلنے کا تذکرہ ہے تو نظیروں کا شمار نہایت وسیع ہو جاتا ہے اسی لئے کہ بعض نامور محققین نے حضرت آدم کی جنت کو بھی باغ دنیا قرار دیا ہے۔ اس معنے کے تسلیم کرنے پر خدا کے مطیع بندوں (مسلمانوں) کو آیت مذکورۂ بالا میں جس جنت کی بشارت دی گئی ہے وہ ایماندار و نیک کردار ہونے کی شرط پر دنیا میں بھی انھیں مل سکتی ہے اور اگر چاہیں تو سچے مسلمان بن کر اسی دنیا میں اپنے آپ کو بہشت کا مستحق بنا سکتے ہیں جس کے بعد بشرط ایمان وعمل صالح اُس بہشت موعود (جنت آخرت) کے ملنے میں کیا کلام ہے ؎

من کہ در کعبۂ حق منزل ماوٰی دارم　　گرد ہر جا بفردوس بریم چہ شود

لیکن جہاں "آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا" کی دشواریاں درپیش ہوں وہاں کیا یہ ممکن ہے کہ۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (اے ایمان والو اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ) کا خطاب دائرۂ عمل میں آجائیگا اور مسلمان بھی کسی دن مسلمان بن جائیں گے ؎

خواہم از زلف بتاں نافہ کشائی کردن　　فکر دور است ہمانا کہ خطا می بینم (باقی)

دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھئے

القاء۔ الہام۔ وحی

از

جناب ذوقی شاہ صاحب

ہر وہ چیز جو بطریق استدلال حاصل نہ کی گئی ہو بلکہ قلب سالک پر حق تعالیٰ کی جانب سے یقین کامل کے ساتھ وارد ہوئی ہو القاء ہے یا الہام ہے یا وحی ہے۔

ابتداءً سالک کے قلب پر خطرات رحمانی وارد ہوتے ہیں۔ انتہا میں جا کر حق تعالیٰ سے مکالمت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ابتدائی حالت کو القاء اور انتہائی حالت کو الہام اور وحی کہتے ہیں۔ وحی چونکہ القاء و الہام کی انتہائی اور کامل ترین صورت کا نام ہے اس لئے اس لفظ کا استعمال کبھی کبھی القاء و الہام کے معنوں میں بھی ہوتا ہے بلکہ دل میں وسوسہ ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال کر دیا جاتا ہے وسوسہ ڈالنے والا خواہ کوئی بھی ہو۔ مثلاً حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ۔ (۶ : ۱۴)	اور اسی طرح ہمنے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیاطین پیدا کئے کچھ آدمی اور کچھ جن جن میں سے بعض بعض کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔

لیکن اس مضمون میں وساوس شیطانی سے بحث نہیں بلکہ اس القاء و الہام اور ان خطرات رحمانی سے بحث ہے جو حق تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں پر وارد ہوتے ہیں۔

اولیاء اللہ کو الہام ہوتا ہے۔ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہوتی ہے۔ الہام

حق تعالیٰ کی جانب سے بندہ پر بلا کسی فرشتہ کی وساطت کے اس جہت سے فائز ہوتا ہے جو حق تعالیٰ کو ہر موجود کے ساتھ ہے وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا (اور ہر ایک کے لئے ایک جہت ہے کہ وہ منہ پھیرتا ہے اس کی طرف (۲: ۱۴۸) سے اسی جہت کی جانب اشارہ فرمایا گیا ہے۔ وحی فرشتہ کے واسطے سے ہوتی ہے۔ اسی بنار پر حدیث قدسی کو وحی و قرآن نہیں کہتے۔ وحی کشف شہودی و معنوی دونوں ہے۔ الہام صرف کشف معنوی ہے۔ وحی مخصوص بہ نبوت ہے ظاہر سے متعلق ہے اور تبلیغ کے ساتھ مشروط ہے۔ الہام ولایت کے ساتھ مخصوص ہے اور تبلیغ کے ساتھ مشروط نہیں

یہ اجمال کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے جو حسب ذیل ہے:۔

حق تعالیٰ کا تعلق کائنات کیساتھ اس نوع کا نہیں جس نوع کا تعلق کہ ایک گھڑی ساز یا گھڑی رکھنے والے کا گھڑی کے ساتھ ہوتا ہے۔ گھڑی ساز گھڑی کے کل پرزوں کو بناتا ہے درست کرتا ہے اور انہیں ترتیب دیکر گھڑی کو چلا دیتا ہے یا گھڑی رکھنے والا رات دن میں ایک بار گھڑی کو کوک دیتا ہے اور چوبیس گھنٹے کے لئے اس سے فراغت پالیتا ہے۔ گھڑی خود بخود چلتی رہتی ہے اور دوسرے دن تک اپنی رفتار قائم رکھنے کے لئے اپنے مالک کے چابی دینے یا گھڑی ساز کی نگرانی کی محتاج نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ کو کائنات کے ساتھ اس قسم کا تعلق نہیں بلکہ کائنات اپنے ابداع اور اپنی تخلیق کے بعد بھی اپنے قیام کے لئے ہر لمحہ اور ہر ساعت حق تعالیٰ کی توجہ کی محتاج رہتی ہے ایک لمحہ کے لئے نظر حق اس کی جانب سے ہٹ جائے تو ساری کائنات نیست و نابود ہو جائے۔ حق تعالیٰ ہر وقت کائنات کی جانب متوجہ رہتا ہے۔ اس متوجہ رہنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی ذات و صفات سے کائنات پر متوجہ رہتا ہے صفات میں ایک بہت بڑی صفت صفت کلام بھی ہے جس سے حق تعالیٰ اپنی مخلوق کی جانب ہر وقت متوجہ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت کسی وقت بھی معطل نہیں رہتی۔ وہ اپنی مخلوق کے ہر فرد سے اس فرد کی استعداد کے مطابق ہمکلام ہوتا رہتا ہے

کسی کو براہ راست ہمکلامی کا شرف عطا فرماتا ہے جیسے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا یعنے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے خوب گفتگو کی کسی سے وحی کے ذریعہ کلام فرماتا ہے کسی سے ہمکلامی کی یہ شان ظاہر فرماتا ہے کہ فرشتے کے ذریعہ اس کے دل میں جو چاہتا ہے القار فرماتا ہے۔ جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں القار فرمایا تھا۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں القار فرمایا تھا۔ کسی سے مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ یعنے پردہ کے پیچھے سے کلام فرماتا ہے کسی کے دل میں براہ راست یعنے بلاواسطت فرشتہ جو چاہتا ہے القار فرماتا ہے جیسے شہد کی مکھی کو القار ہوتا ہے اور اس القار کو بھی وحی سے تعبیر فرمایا جاتا ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (اور وحی فرمائی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف) کسی سے بذریعہ خواب و رویائے صالحہ باتیں ہوتی ہیں غرض کہ ہمکلامی کی جتنی شانیں اور جتنے ذرائع ہیں خواہ وہ القار کے نام سے موسوم ہوں خواہ الہام کے نام سے خواہ کسی اور نام سے وہ سب حقیقت وحی ہی کی مختلف اقسام یا مختلف فروع ہیں۔ صرف قوت اور کمزوری یا کثرت و حجاب کے اختلافات سے مختلف اسمار سے وہ مختلف فروع موسوم ہیں۔ اور سب سے زیادہ واضح طریقہ ہمکلامی کا وحی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے تو اس وحی اصطلاحی کی صحیح تعریف حسب ذیل ہوگی۔

"وحی کلام الٰہی ہے جو عالم غیب سے عالم شہادت کی جانب بذریعہ ایک مقرب فرشتہ کے جنھیں جبرئیل (علیہ السلام) کہتے ہیں رسولوں کے پاس پہونچایا جاتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا	اور نہیں طاقت کسی بشر میں یہ کہ کلام کرے (بالمشافہ)
وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ	اس سے اللہ مگر بذریعہ وحی کے یا پردہ کے پیچھے سے
فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاءُ ؕ اِنَّهٗ	یا کسی (فرشتہ) کو پیغامبر بنا کر بھیجے پس وہ اس کے حکم

عَلِیٌّ حَکِیْمٌ ○ وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ	سے وہ چاہتا ہے جی میں ڈالدے تحقیق وہ بلند مرتبہ
اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا کُنْتَ	حکمت والا ہے اور اسی طرح وحی کی ہم نے طرف
تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ	آپکے (اے محمدؐ) روح کو ساتھ حکم اپنے کے نہ جانتے
وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ	تھے آپ کہ کیا ہی کتاب اور نہ ایمان ولیکن کیا ہے
مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّکَ	ہم نے اس کو نور۔ ہدایت کرتے ہیں ہم ساتھ اس کے
لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○	جس کو چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے۔ اور تحقیق آپ
الشوریٰ رکوع ۵	البتہ ہدایت کرتے ہیں۔ طرف سیدھی راہ کے۔

بلحاظ ضعف و قوت اور بلحاظ زیادہ واضح اور کم واضح ہونے کے وحی کے تین مراتب ہیں۔

پہلا مرتبہ سب سے زیادہ قوی اور اکمل ہے اس مرتبہ میں علوم غیب اللہ کی طرف سے رسول کی عقل پر ظاہر کئے جاتے ہیں اور رسول کے نفس میں ان علوم کو اس طرح منقش کیا جاتا ہے کہ رسول انھیں اپنے دل میں یاد رکھ سکے اور دوسروں کے سامنے بیان بھی کر سکے۔

اسکی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ بلا واسطہ کلام کرے جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق حق تعالیٰ فرماتا ہے وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا (اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے خوب گفتگو کی) اور ہمارے حضور کے متعلق فرماتا ہے فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی (اپنے بندے کی طرف جو کچھ وحی کرنی تھی وہ کر دی) اسے وحی صریح کہتے ہیں۔

وحی کے پہلے مرتبہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کلمات مقررہ اور عبارات معینہ کے ساتھ نازل ہوں اور حروف وصوت رسول کے کانوں تک پہنچا دیں اور معانی ان کے قلب میں القا کریں۔

یہ دونوں صورتیں انبیاء کے لئے مخصوص ہیں۔

دوسرا مرتبہ جو پہلے مرتبہ کے مقابلہ میں کمزور اور کمتر درجہ کا ہے یہ ہے کہ کلام الٰہی اس نفس تک پہنچ جائے جو اس کلام کے قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد رکھتا ہو جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈالدی کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلاکر صندوق میں بند کرکے دریا میں ڈالدیں۔ اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّكَ مَا یُوْحٰٓی ۝ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ ۝ (جس وقت کہ وحی ڈالی ہمنے طرف ماں تیری کے وہ چیز کہ وحی کی جاتی ہے اب یہ کہ ڈالدے اس کو بیچ صندوق کے پس ڈالدے اس کو بیچ دریا کے (طٰہٰ۔ ع۲) اس وحی خفی اور تعلیم سِرّی کے القا رنے ان کی والدہ کے نفس کو خواب جہالت سے بیدار کردیا اور ان کا دل اپنے بیٹے کے متعلق تردد اور دشمنوں کے خوف سے مامون ہوگیا اسی نوع کی وحی عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم کو بھی ہوئی تھی جبکہ درخت کے نیچے سے ان کو آواز آئی کہ غمگین مت ہو۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا (پس پکارا اس کو (یعنی مریم کو) اس (درخت) کے نیچے سے کہ غم مت کھا تحقیق تیرے پروردگار نے تیرے نیچے چشمہ کردیا ہے (مریم ع۲)

یقینی امر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پیغمبر نہ تھیں اس سے معلوم ہوا کہ وحی کا یہ مرتبہ جسے القاء اور الہام کہتے ہیں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے بھی رکھا ہے جو نبی یا رسول نہیں خضر علیہ السلام کو علم لدنی کی تعلیم ہوئی جن کی بابت حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ (اور ہم نے ان کو اپنے خاص علم میں سے تعلیم کیا (الکہف ع۹) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔ اِنَّ لِلّٰهِ فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ عِبَادٌ مُحَدَّثُوْنَ واشار الی بعض اصحابہ یعنی بیشک ہر امت کے اندر اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوتا ہے پھر آپ نے اپنے بعض اصحاب کی جانب اشارہ فرمایا یعنی

روایات کی رو سے حضرت عمرؓ کی جانب اشارہ فرمایا۔

تیسرا مرتبہ وحی کا جو دوسرے مرتبہ سے بھی ضعیف تر ہے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نفوس کو ان کاموں کی تعلیم فرماتا ہے جو ان نفوس کے مقاصد سے متعلق ہیں۔ اور وہ نفوس اس وحی کے سبب ان صنائع و بدائع کا استخراج کرتے ہیں جو ان کی قوت اور استعداد کے اندر ہیں۔ جیسے کڑی کا جالا بُنا۔ ریشم کے کیڑے کا ریشم تیار کرنا شہد کی مکھی کا چھتہ بنانا۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَاَوحیٰ رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا۔ (وحی کی تیرے رب نے طرف شہد کی مکھی کے کہ پہاڑوں میں اپنا گھر بنا (النحل۔ ع ۹) مکھی پر کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوا اور نہ اللہ تعالیٰ نے حروف و صوت سے اسے خطاب فرمایا۔ بلکہ اس میں ایک بات کی استعداد پیدا کر کے اس کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اپنی استعداد کو جنبش میں لائے اور اپنا کام کرے۔

نفوس ناطقہ جب ایک حد تک کمالاتِ معنوی حاصل کر لیتے ہیں، طبیعت کی کدورتوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔ خواہشات کی قیود سے آزاد اور بشریت کے مقتضیات سے برتر ہو جاتے ہیں۔ تو فطرۃً ان کی توجہ عالم سفلی سے ہٹ کر عالم علوی کی جانب مائل ہوتی ہے خصائل ملکوتی کا ان پر غلبہ اور علوم آسمانی کی تحصیل کا شوق انہیں دامنگیر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ملائکہ کی ہمنشینی کا انہیں شرف حاصل ہوتا ہے اور اس ہمنشینی سے وہ راحت پاتے ہیں۔ ان ہی ملائکہ کے واسطہ سے خوش قسمت نفوس کو کلام الٰہی سننے کی دولت نصیب ہوتی ہے اور صحبت ملائکہ کے اثرات سے متاثر ہو کر وحی کی مختلف شاخوں اور عالم قدس کے مختلف پھول پتوں اور علوم غیب کے مختلف پھلوں سے وہ شکم سیر ہوتے ہیں۔

علم کے حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔ ظاہری طریقہ تو وہی معمولی طالب علم کا طریقہ ہے جو بہت عام ہے۔ اور باطنی طریقہ مراقبہ اور تفکر کا ہے۔ مراقبہ اسے کہتے ہیں

کہ دل کو دوسرے خیالات سے ہٹا کر ایک ہی خیال پر جا دیا جائے۔ اور اسی خیال کے اندر فکر میں منہمک ہو جائے۔ اور تفکر یہ ہے کہ نفس ان علوم کو جو کہ اپنے سے مخفی ہیں۔ مدت اور حیلہ اور آلہ کے ساتھ تلاش کرے۔ ایک تیسری چیز اور ہے۔ جسے حدس کہتے ہیں۔ تفکر اور حدس میں یہ فرق ہے کہ تفکر میں تو غور و خوض سے اور طبیعت پر زور ڈالکر کوئی بات معلوم کیجاتی ہے لیکن حدس میں بغیر سوچے سمجھے اور بلا غور و خوض اور بغیر آلہ یا حیلہ کے دفعتہً ایک بات قلب میں القاء ہو جاتی ہے۔ صاحب حدس یک بیک غیب کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور یکبارگی علم مطلوبہ اس پر منکشف ہونے لگتا ہے بغیر اس کے کہ عرصہ گذرے اور بغیر اس کے کہ وہ ریاضت میں مشغول ہو۔ حدس بمقابلہ فکر کے نفوس کاملہ سے اقرب ہے حدس سے فراست پیدا ہوتی ہے۔ اور فکر سے کیاست۔ کیاست اس زیرکی و دانائی کو کہتے ہیں جس کا تعلق دماغ سے ہے۔ اور فراست اللہ کا اک نور ہے جس سے مومن دیکھتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "تم مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔" یہی فراست ہے جو حدس سے پیدا ہوتی ہے۔ حدس ہی الہام کا زینہ ہے۔ اور نبوت زینہ ہے وحی کا۔

جب نفس انسانی حدس کی قوت سے عالم بالا کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور علوم غیبیہ کے انوار اس پر کھلنا شروع ہوتے ہیں۔ تو ان علوم کا اظہار اس پر رمز کے حجاب اور اخفاء و ابہام کے پردوں کی آڑ میں ہوتا ہے پھر اگر نفس میں اتنی قوت نہیں کہ حالت بیداری میں اس ظہور کا متحمل ہو سکے تو یہ جلوے اسے خواب میں دکھلائے جاتے ہیں۔ اور غیب کے اسرار عالم رویا، کی صورتوں اور شکلوں اور مثالوں میں متمثل کر کے اس پر منکشف کئے جاتے ہیں۔

عالم رویا کے ذریعہ انکشاف حاصل کرنے کا مرتبہ الہام سے بھی کمتر ہے الہام کا

مرتبہ فرشتہ کے نازل ہونے سے جسے وحی کہتے ہیں۔ اور وحی کا مرتبہ صریح مکالمہ سے جسے وحی صریح کہتے ہیں بکثرت ہے۔ اسرار غیب کے ظہور کی انتہائی شان صریح مکالمہ کی شکل میں اولوالعزم رسولوں کے لئے مختص ہے وحی انبیاء میں سے رسولوں کے لئے مختص ہے۔ وحی فی المنام یعنی خواب میں وحی ہونا محض انبیاء کے لئے ہے۔ الہام کی دولت سے اولیاء اللہ نوازے جاتے ہیں۔ ان اولیاء اللہ کے نفوس ظاہرہ جب اپنے عنصری قالبوں کی قید سے رہائی پاکر آسمانِ مکاشفہ کی بلندیوں کی پرواز فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے ان کے مقام معاد میں خطاب صریح کے ساتھ کلام فرماتا ہے جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و الہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔ مامن عبد الا وسیکلمہ ربہ لیس بین العبد والرب ترجمان ولا واسطۃ (متفق علیہ) یعنی ہر ایک مومن بندے سے خداوند تعالیٰ کلام فرمادیگا۔ اور اس وقت خدا اور مومن بندے کے درمیان نہ کوئی ترجمان ہوگا نہ کوئی واسطہ۔

القاء اور الہام میں کسب کو کسی قدر دخل ہے۔ مگر وحی میں کسب کو مطلق دخل نہیں ریاضت اور مجاہدہ سے یہ دولت ہاتھ نہیں آتی جس طرح نبوت محنت و مجاہدہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ وحی بھی کوشش انسانی سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ الہام کے ذریعہ صرف معانی کا انکشاف ہوتا ہے۔ وحی کے ذریعہ معانی کا بھی انکشاف ہوتا ہے اور کشف تنزلات کا بھی اور نزول روح القدس یعنی جبرئیل کا بھی۔ روح القدس اور جبرئیل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں جبرئیل میں لطافت کا جب غلبہ ہوتا ہے تو وہ روح القدس ہو جاتے ہیں اور جب ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ مکشوف ہوسکیں تو وہ جبرئیل ہو جاتے ہیں۔ جب وحی نازل ہوتی ہے تو روح القدس یا روح الامین معانی کو رسول کے قلب میں منقش کرتے ہیں۔ اور الفاظ و عبارت کو جبرئیل رسول کے کان میں القاء کرتے ہیں۔ پھر مسموع او معقول کان اور دل کی راہ سے ذات رسول

میں مجتمع ہوجاتے ہیں اور رسول کی زبان و توجہ ان دونوں کے فیضان میں مصروف ہوجاتی ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ (اشعراء ع)

"روح الامین نے (یعنی جبرئیل نے اپنی شانِ الفت سے) اس کو تمہارے قلب پر نازل کیا ہے تاکہ تم عذاب الٰہی سے ڈرانے والوں میں سے ہو اور اس کو عربی زبان میں جو سب زبانوں میں روشن اور مبین ہے نازل کیا ہے۔

انبیا وحی کی قوت سے ان چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں جن چیزوں کو اولیاء اللہ الہام کی قوت سے نہیں دیکھ سکتے انبیاء کلمات وحی کو اپنے کانوں سے سنتے ہیں۔ معانی کو دل میں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ الہام میں سوائے انکشافِ معنی مجردۂ مخفیہ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

قرآن مجید اور جرمنی

ترجمہ تقریر بیرن عمر رالف ایہرن فلس

آسٹریا کے نومسلم امیر عمر رالف ایہرن فلس حال میں ہندوستان تشریف لاچکے ہیں۔ اس سیاحت کے دوران میں چند روز ان کا قیام حیدرآباد میں بھی رہا۔ یہاں انہوں نے مجلس تحریک قرآنی کی استدعا پر ایک تقریر عنوان مندرجہ بالا پر کی تھی جسے عموماً پسند کیا گیا مولوی سید شریف الحسن صاحب بی۔ اے نے اس کا ترجمہ ہمارے پاس بھیجا ہے اور اس کے ساتھ جناب ذوقی شاہ صاحب کے حواشی بھی ہیں جن میں انہوں نے بیرن عمر کے بعض خیالات کی اصلاح فرمائی ہے۔ ذیل میں وہ تقریر مع حواشی درج کیجاتی ہے۔

جرمنی اپنی اصلاح کے لئے سرگرم عمل ہے یہی نہیں بلکہ وہ اپنی زندگی میں ایک نئی روح پھونکنے والا ہے۔ موجودہ سیاسی اور ذہنی حالات سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں جرمنی کو جو مصیبتیں اور تمدنی شکستیں اٹھانی پڑیں ان سے جرمنی کی قوتوں کو بالکل نقصان نہ پہنچ سکا فنا کرنا تو درکنار یہ مشکلات ان قوتوں کو کمزور تک نہ کرسکیں۔

جرمنی میں سرعت کے ساتھ جو تغیرات واقع ہورہے ہیں ان سے ایک اجنبی شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ جرمن قوم کی اخلاقی اور قومی قوتیں بالکل زایل ہوچکی ہیں لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اس قوم کی ذہنیت زندگی کی نئی حالتوں اور نئے نئے نصب العین تلاش کرنے میں

بہت مضبوط ہے دیانت دار اور اخلاص پسند واقع ہوئی ہے کیونکہ زندگی کے پیمانے اصول اور نصب العین ایک ایسی یورپین قوم کو ہرگز مطمئن نہیں کرسکتے جو حقیقتہً متمدن ہے اور ہمیشہ نئے اصولوں کی تلاش میں منہمک رہتی ہے۔(۱)

آج کل جرمنی میں دو جماعتیں ہیں جو ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ ان میں سے ایک تو بالکل بین الاقوامی خیال کی ہے اور وہ اس خیال کی بھی تائید کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ فوجی قوت سے اپنی حفاظت کی جائے دوسری جماعت خالص قومیت کی حامی ہے اور وہ فوجی قوت اور جنگ کی مخالف نہیں ہے اگرچہ یہ امر یقینی ہے کہ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد یہ دونوں فریق اپنے اپنے خیالات میں ترمیم کرلیں گے لیکن ان دونوں میں سے کسی میں بھی روحانیت نہیں ہے کہ اس کی روشنی میں وہ انسان کے ذاتی اور ذہنی نصب العین متعین کرسکیں۔ ہاں البتہ چند اصول ایسے ہیں جو پوری قوم کی بھلائی یا متفرق جماعتوں کی بہبود میں ممد و معاون ہوتے ہیں تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انفرادی اور قومی قوتوں کا ارتقا کسی نہ کسی نئے نصب العین یا مدار حیات کی بنا پر ہوا ہے

اس لئے یہ امر غالب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید جیسی البریز ہدایت کتاب جس میں تمام مشکلات کے حل کے ساتھ ساتھ انفرادی قومی اور بین الاقوامی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہدایات بھی موجود ہیں جرمنی کے لئے موجودہ حالت میں بے نظیر مددگار ثابت ہوگی۔ میرا یہ خیال بالکل قرین قیاس معلوم ہوگا اگر ہم اس واقعہ پر غور کریں کہ مسلمانوں کا موجودہ زوال قرآنی تعلیمات سے بے خبری کی وجہ سے ہے نہ کہ قرآنی تعلیمات کی وجہ سے جیسا کہ کسی زمانہ میں باور کیا جاتا تھا

اپنے اس خیال کی تائید میں میں حیدرآباد کی مثال پیش کرتا ہوں جہاں ۹۵ فیصدی ہندو آبادی اور ایک بہت ہی مختصر سی مسلمان آبادی کے درمیان پورا پورا اتحاد اور رواداری کا تعلق قائم ہے یہاں قرآن شریف کے دو بنیادی قواعد پر عمل ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ ملک

اس قدر خوش و خرم ہے سب سے پہلے تعلیم و تعلم کا چرچا ہے جس میں اس ملک کی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ مجھے سر اکبر حیدری کے اس لیکچر کو جو انہوں نے جامعہ عثمانیہ کے طلبہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر دیا تھا سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ قرآن کی ہدایات کے مطابق تعلیم و تعلم میں منہمک رہنے کا جذبہ تھا جس اس خوبصورت جامعہ کے قیام میں رہنمائی کی صرف یہی نہیں بلکہ میں نے اس مشہور سیاسی مدبر سے گفتگو کر کے یہ محسوس کیا ہے کہ قرآن کے اصول رواداری پر عمل پیرا ہونے اور پیغمبر صلعم کی تعلیم کی خوبیوں کو سمجھنے کا شوق اس ملک کے لوگوں پر اسقدر غالب ہے کہ وہ سب سے پہلے بنی نوع انسان کی فلاح اور ریاست کی بہبود مدنظر رکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنی اپنی قوم کی بھلائی دیکھتے ہیں
میں نے اعلیحضرت نظام دکن سے شرف ملاقات حاصل کیا وہ اسلامی سادگی اور نیت اخلاق کی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ملاقات سے میرے اوپر ایک ایسا اثر ہوا جو کبھی نہ مٹے گا میں اعلیحضرت کے سب سے بڑے صاحبزادے سے بھی ملا جو ولیعہد ہیں اور صدر اعظم سے بھی ملاقات کی جو ایک سچے ہندو کی طرح اسی اخلاص و انہماک سے تمام ملک کی خدمت کرتے ان سب سے ملکر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرا مذکورہ بالا خیال بالکل صحیح ہے۔

آج ممالک اسلامیہ محض اس بنا پر مبتلائے ادبار ہیں کہ ان میں تعلیم کی کمی ہے جہاں جہاں اور جن جن ممالک میں قرآن کے ان دو بنیادی قواعد تعلیم اور رواداری پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا ہے۔ وہ ممالک ترقی کر رہے ہیں پس میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جرمنی کا جوش تجسس ان خزائن حکمت کو نظر انداز نہیں کرے گا جنسے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔

لیکن مشرقیوں نے اب تک قرآن کو جس طور سے سمجھا ہے جرمنی اس سے بالکل مختلف طور پر فیضیاب ہو گا۔

ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ جرمنی میں قرآن مجید کا رسمی کوئی احترام نہیں

بلکہ اس کی حیثیت بالکل تاریخی ہے اور وہ علم الالسنہ میں مدد دینے والی ایک کتاب سمجھی جاتی ہے
قطع نظر اس کے اگر ہم اس کی مذہبی حیثیت معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اگر کوئی انقلابی
کتاب نہیں سمجھی جاتی تو ایک بالکل نرالی کتاب ضرور سمجھی جاتی ہے صرف یہی واقعہ اس امر پر کافی
روشنی ڈالتا ہے کہ وہ لوگ جو جرمنی میں قرآن کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کے خیالات قرآن
کے متعلق کس قدر غیر رسمی اور غیر قدامت پسند ہیں۔ ہم یہ بات فراموش نہیں کر سکتے کہ مشرقی اور
مغربی طریق تخیل طریق تجسس اور اصول حیات میں بین فرق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب ہماری
مقدس کتاب پر ایک مغربی نگاہ پڑیگی تو قرآن کے نئے معانی اور اسکو سمجھنے کے نئے اصول پیدا ہو جائینگے اور میرے
خیال میں یہ کسی صورت سے مضر نہ ہوگا بلکہ خداوند کریم کی طرف سے ایک رحمت ہوگی۔ کیونکہ قرآن
مقدس ہمکو بتاتا ہے۔ یہ بات انسانی سرشت میں داخل ہے کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو اور پھر
خود ہی تحریف کر کے ان حیرت انگیز حقائق کا غلط استعمال کرے جو خدا نے اپنے پیغمبروں کے
ذریعہ سے انسان تک پہونچائے ہیں اس لئے انسان کو اس امر کی ضرورت رہتی ہے کہ اس کی
زندگی میں تازہ روح پھونکی جاتی رہے اور ازلی صداقتوں کے لئے تجدید کی جستجو جاری رکھی جائے

زمانہ کے ساتھ انسان کی ذہنی اور جسمانی حالت بدلتی رہتی ہے قدیم عربی ایرانی ترکی
اور ہندوستانی روایات اپنے زمانہ کے لحاظ سے حقائق ازلی کی بہترین تفسیریں تھیں لیکن جس طرح
سمندر کو انسان کے بنائے ہوے ایک کوزے میں بھر دینا غیر ممکن ہے اسی طرح قرآن کے
حقائق و معارف اور ان خوبیوں کو جو قرآن میں پوشیدہ ہیں۔ ایک ہی انسانی ارتقائی
دور میں سمجھ لینا بھی نا ممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے رہنے سہنے اور سوچنے کے طریقوں
کو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہے۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جرمنی کے قابل اور مذہبی آدمی قرآن کو جس طرح سمجھیں گے وہ

ان تمام اصول و مبانی سے متعلق ہوگا۔ جن پر اسلامی روایات قائم ہوئی تھیں۔ پھر بھی اسلامی تہذیب کے قدیم مشہور رہنماؤں اور موجودہ یوروپ کی نوخیز اسلامی تہذیب کے سربرآوردہ ارکان کے درمیان ایک قریبی رشتہ قائم رہے گا یہ بالکل فطری امر ہے کیونکہ یوروپ کو اسلامی تعلیم دینے کا بیڑا اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ قدامت پسند حصہ یعنی ہندوستان نے اٹھایا ہے اس لئے میں یقین کرتا ہوں کہ آجکل جرمنی اور دوسرے ممالک مغربی کے روحانی اور دماغی قابلیت رکھنے والے جو حضرات قرآن شریف کے مطالعہ میں منہمک ہیں ان کی کوششوں کا نہایت ہی دلپذیر نتیجہ یہ ہوگا کہ از سر نو قرآنی تعلیم کا صحیح مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے گا۔ (۲)

باقی

مجلہ مکتبہ

یہ دارالاشاعت ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) حیدرآباد دکن کا علمی و ادبی مصور ماہوار رسالہ ہے جس کا شمار دنیائے اردو کے چیدہ ... رسالوں میں ہے تاریخ کئی سال سے مولوی عبدالقادر سروری صاحب ایم اے ال ال بی کی ادارت میں حسب ذیل خصوصیات کے ساتھ نہایت پابندی وقت سے شائع ہو رہا ہے۔ (۱) اس میں اکثر عمدہ طبع زاد افسانے یا ہندی عربی انگریزی فرانسیسی اور روسی افسانوں کے ترجمے ہوتے ہیں (۲) اس میں تاریخ سائنس فلسفہ معاشیات پر بھی مفید علمی مقالے شائع ہوتے ہیں (۳) اس میں عام ادبی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ دکن کے قدیم شعرا اور ... قدیم کی نسبت ... مضامین ہوتے ہیں۔ (۴) مشاہیر ادبا و شعرا اور اہل علم و فضل کی تصویریں ہر نمبر میں شائع ہوتی ہیں۔ (۵) اس میں اردو کی کتابوں پر تبصرے اور جدید مطبوعات کی اطلاعیں بالالتزام شائع ہوتی ہیں قیمت سالانہ چار روپے ششماہی دو روپے چار آنہ (۲/۴) فی پرچہ ۶/

منتظم مجلہ مکتبہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

بیرن عمر کی تقریر پر خیالات

از

جناب ذوقی شاہ صاحب

(۱)

پرانی چیزوں سے بلاوجہ بیزاری اور نئی چیزوں کے اشتیاق میں بلا ضرورت پیچھے پڑنی طفلان ناعاقبت اندیش کا خاصہ ہے جس قوم کو تمدن و ترقی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت اور عقل و فراست کا دعویٰ ہو اسے اس طفلانہ ذوق سے دور رہنا چاہئے اصل چیز تلاش حق ہے اس تلاش میں جدت و قدامت کے امتیاز کو کوئی دخل نہیں قدامت سے نفرت اور جدت سے رغبت یا اس کے برعکس کا تلاش حق پر کوئی اثر نہ پڑنا چاہئے علاوہ بریں انسانی نصب العین میں تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں۔ وہ نصب العین جو ماضی میں کچھ اور تھا حال میں کچھ اور ہے اور مستقبل میں کچھ اور ہو جائیگا، سچا انسانی نصب العین نہیں ہو سکتا۔ محدود جماعتوں کا نصب العین حالات مقیدہ میں عارضی اور وقتی ہونا اور حالات کے بدل جانے پر اس کا متغیر ہو جانا اور بات ہے مگر جملہ بنی نوع انسان کے لئے سچا حقیقی اور مستقل نصب العین کسی تغیر کو قبول نہیں کرتا۔ یورپ اگر اپنا نصب العین بدلنے کا مشتاق رہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یورپ کو ابھی تک صحیح نصب العین نصیب ہی نہیں ہوا۔ اور بہ حالات موجودہ ایسے ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ اس تلاش میں جن علوم کو بیشتر دخل ہے ان سے یورپ بڑی حد تک ناآشنا ہے قوانین قدرت کے متعلق جزوی و فروعی معلومات کے حصول میں محققین یورپ

نے جو سعی بلیغ کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے اور کوئی عقلمند او رمنصف مزاج شخص اس حیرت انگیز ترقی سے انکار نہیں کر سکتا جو سائنس کے میدان مغرب کو اس وقت تک حاصل ہوی ہے۔ مگر باوجود ان جملہ ترقیات کے امور نامعلوم کی بابت ان ممالک میں جو تاریکی چھائی ہوی ہے وہ اتنی وسیع ہے کہ موجودہ علمی فتوحات کو اس جہل سے کوئی مناسبت ہی نہیں جہل کی اس شب تاریک میں سائنٹفک کامیابیوں کے جو جگنوں چمک رہے ہیں' وہ باوجود اپنی چمک کے اس تاریکی کو دور نہ کر سکے اہل یورپ کو خود اعتراف ہے کہ ان کے علوم ابھی ناقص ہیں ترقی کی گنجایش بہت کچھ باقی ہے۔ قدم قدم پر جدید انکشافات قبل کے مسلمات اور نظریوں کو درہم و برہم کردیا کرتے ہیں۔ مگر یہ انکشافات ختم نہیں ہوتے کسی منزل پر آکر رکتے نہیں ہمکو یہ کہنے کا موقع نہیں دیتے کہ معلومات کے انتہائی نقطہ پر ہم پہنچ گئے۔ ہماری موجودہ تحقیقات پر ہم کو یہ اعتماد نہیں ہونے دیتے کہ کل یہ تحقیقات غلط ثابت نہ ہو سکے گی۔ علم کی پیمائش آسان ہے۔ مگر جہل کی پیمائش نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کے علم کو اس کے جہل سے کیا مناسبت ہے۔ یہ سب کچھ صرف ان علوم کی بابت ہے جو مادیات و مشاہدات و تجربات سے متعلق ہیں۔ روحانیات اور امور فوق المادۃ و ما بعد الطبیعات میں یورپ کی موجودہ معلومات کو ہم بلا خوف تردید بمنزلۂ صفر کے قرار دے سکتے ہیں جبکہ کائنات کے متعلق جو کہ انسان کی جولانگاہ ہے اور انسان کے متعلق جو کہ اس زمین پر حق تعالیٰ کا خلیفہ ہے یورپ کا علم اس قدر کم اور جہل اس قدر زیادہ ہے تو مستقبل انسانی نصب العین کے متعلق یورپ کیونکر کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ حقائق اشیا اور حقائق انفی کے کما حقہٗ انکشاف سے قبل کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بے بضاعتی اور کوتاہ علمی کے باوجود محض اپنے نت نئے خیالات خام کی بنا پر انسان جیسی اہم ہستی کے لئے

اپنی طرف سے کوئی نصب العین قرار دیدے اور اپنے تلون کے تحت میں آئے دن اسے بدلتا رہے۔

قطع نظر امور مندرجۂ بالا کے انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے خلیفہ خود مختار نہیں ہوتا بلکہ جس نے خلافت عطا فرمائی ہے اس کے ماتحت ہوتا ہے وہ اپنے لئے کسی دستور العمل کے قرار دینے یا نصب العین کے متعین کرنے کا کیونکر مجاز ہوسکتا ہے؟ اس کے لئے نصب العین تو وہی مقرر کرسکتا ہے جو اس کا خالق اس کا مالک اس کا رب اس کا ہادی ہے جس نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا اور حق خلافت ادا کرنے کی اسے استعداد بخشی انسان کا فرض ہے کہ کلام الٰہی سے دریافت کرے کہ حق تعالیٰ نے انسان کے لئے کیا نصب العین مقرر فرمایا ہے۔ پھر اس کا فرض ہے کہ احکام الٰہی کے مطابق اپنی زندگی اپنے خیالات اپنی اُمنگوں اور اپنی روش کو ڈھالے نہ یہ کہ اپنی دھندلی روشنی سے ہدایت الٰہی کے انوار کو دھندلا کرنے کی کوشش ناکام میں مصروف رہے قرآن "نعوذ باللہ" بازیچۂ اطفال نہیں کہ یورپ اپنی طفلانہ جدت پسندی کے شوق میں آئے دن نئے نئے نصب العین قرار دے اور تغیر پسندی کے ذوق میں مطالب قرآنی کو حسب دلخواہ الٹتا پلٹتا رہے۔ غلام کا یہ کام نہیں کہ اپنے لئے خود خدمت تجویز کرلے بلکہ اس کا فرض ہے کہ اپنے آقا کے اشارہ پر چلے۔

(۲)

قرآن کلام الٰہی ہے کلام مجموعہ ہوتا ہے الفاظ و معانی کا اگرچہ قرآن میں الفاظ و معانی کے ماوراء کچھ اور بھی ہے مگر اس موقعہ پر ہمیں صرف الفاظ و معانی ہی سے بحث ہے وحی کے ذریعہ جس طرح الفاظ قرآنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے اسی طرح ان الفاظ کے صحیح معنی بھی حضور سرور کائنات کے قلب پرواردہوئے (مزید تفصیل کے لئے

ملاحظہ فرمائیے مضمون "انقار۔ الہام۔ وحی جو اسی اشاعت میں دوسری جگہ شایع ہو رہا ہے) اور ان معانی سے ہٹ کر الفاظ قرآنی کی کوئی جدید تفسیر (خواہ وہ تفسیر مشرقیوں نے کی ہو یا مغربیوں نے علماء مصر و شام نے کی ہو یا محققین جرمنی نے کلام الٰہی کی صحیح تفسیر نہ ہوگی بلکہ ان لوگوں کی اپنی دماغی و ذہنی کیفیات کی تفسیر ہوگی قرآن کو صحیح معنی سے ہٹا دینے کی کوشش تحریف کی کوشش ہے جس میں کسی کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ ابتدائے کائنات سے لیکر اس وقت تک انسانی دماغ پر مختلف ارتقائی دور گذرے اور دماغی صلاحیت بتدریج ترقی کرتی چلی آئی مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ترقی اپنے انتہائی نقطہ پر اب سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل پہنچ چکی۔ اب جو کچھ نظر آ رہا ہے اور اس زمانے میں فہم و ادراک کی جو نمایش ہو رہی ہے اور سیرت و عمل کا جو مظاہرہ ہو رہا ہے وہ اسی انتہائی دور ترقی کی ایک انحطاطی اور نزولی کیفیت ہے۔

انسانی ترقی کے ہر دور میں پیغمبر مبعوث ہوئے جنہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کی استعداد کو ملحوظ رکھکر مناسب وقت تعلیم دی وہ تعلیم چند افراد و اقوام تک محدود اور وقت معین تک مخصوص رہی۔ ارتقائی تغیرات کی مناسبت سے تعلیم میں فروعی تغیرات پیدا ہوتے گئے ان مناسب وقت تغیرات کو عمل میں لانے کی غرض سے ہر ملک اور ہر زبان میں نئے نئے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے حتیٰ کہ حکمت الٰہی کے تحت میں یہ ترقی جب اپنے عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچی تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مبعوث ہوئے جو ہادی کافتہ الناس تھے جن کی تعلیمات جملہ انبیاء ماقبل کی تعلیمات پر مشتمل تھیں۔ جن کا دین جملہ ادیان سابقہ کا ناسخ قرار پایا، جن پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور جن پر وہ قرآن نازل فرمایا گیا جس کی حفاظت کا حق تعالیٰ نے

خود ذمہ اٹھایا اور جس میں اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی مہر لگا دی گئی۔ دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا اور قیامت تک اس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ و تغیر و تبدل کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

کوئی عقلمند شخص اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ افضل الناس سید البشر امام انبیاء خاتم المرسلین محبوب حق محمد مصطفےٰ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم جن پر قرآن نازل ہوا (نعوذ باللہ) قرآن کے معنی صحیح طور پر نہ سمجھ سکے یا اصحاب رسول جن کو رسول خدا نے خود بہ نفس نفیس قرآن کی تعلیم دی مفہوم قرآن سے صحیح طور پر آگاہ نہ ہو سکے۔ اور اب ساڑھے تیرہ سو برس بعد وہ جرمنی جن کی غلطی کی بدولت دنیا کا بڑا حصہ ایک عالمگیر جنگ کی سخت تباہ کن آگ میں بقول یورپ ہی کے حال میں کود چکا ہے جو اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں اور بقول بیرن عمر کے اپنی حیات میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتا ہے اور زندگی کے جدید اصولوں کی تلاش میں ہے یعنی بہ الفاظ دیگر وہ جرمنی جس نے اب تک ایک ناکام اور نامراد زندگی بسر کی ہے قرآنی تعلیم کا صحیح مفہوم از سر نو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

بیرن عمر کا خیال ہے کہ "مشرقیوں نے اب تک قرآن کو جس طور سے سمجھا ہے جرمنی اس سے بالکل مختلف طور پر فیضیاب ہوگا"۔ مگر یہ خیال بجز اس کے کہ مغربی شیخی بازی کا ایک نمونہ ہو کسی اور اہمیت کا مستحق نہیں حقائق منقلب نہیں ہوتے۔ دین شاعری نہیں جس میں مشرق و مغرب کے طبائع کا اختلاف موثر ہو جس طرح ریاضی اور ریاضی کے نتائج، سائنٹفک معلومات اور اس کے حاصل میں مشرقی و مغربی طبائع کے اختلاف کو دخل نہیں جس طرح مشرقی اور مغربی دونوں کے نزدیک دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک آگ جلانے والی اور پانی آگ بجھانے والا ثابت ہے۔ اسی طرح مشرقی اور مغربی دونوں کے نزدیک حقائق الٰہی و حقائق کونی یکساں ہوں گے خواہ دونوں کے

تخیل اصول تجسس طرز استدلال اور روش زندگی میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو کیا جرمنی قرآن مجید کے ساتھ بھی وہ سلوک کرنا چاہتا ہے جو عیسائی دنیا نے بائبل کے ساتھ کیا؟ لیکن ہم پیشین گوئی کئے دیتے ہیں کہ خواہ جرمنی کے باشندے ہوں یا کہیں اور کے اس کوشش میں کسی کو بھی کامیابی نہ ہوگی کیونکہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کی ضمانت قرآن کے الفاظ و معانی دونوں پر شامل ہے۔ نہ لفظی تحریف میں کسی کو کامیابی ہوگی نہ معنوی تحریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیشین گوئی فرما چکے ہیں کہ لَا یَزَالُ طَایفۃ من امتی علی الحق ظاہِرِینَ لا یَضُرُّھُمْ من خالفھم حتّٰی یاتِیَ امر اللہ (میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ کھلم کھلا حق پر رہیگا۔ ان لوگوں کو مخالف ان کا ضرر نہ پہونچا سکے گا۔ یہاں تک کہ آجاوے امر اللہ کا یعنی قیامت)۔

عالمگیر تحریک قرآن اور فرقہ بندیاں

از مولوی ابو محمد صاحب مصلح

قرآن مقدس انفرادی اور اجتماعی فلاح وبہبود کا حامل ہے۔ مدنیت اور تہذیب کی تعمیر کی ہر انیٹ کو استوار کرتا ہے انسانیت کے گوشہ گوشہ پر اپنی نگاہ رکھتا ہے ان کا احاطہ کرتا ہے اور ان کا حاوی ہے کوئی ضرورت نہیں جس کو وہ پورا نہ کرتا ہو۔ اور اس راہ کی جملہ قسم کی تاریکیوں کو دور کرکے اپنی ہمہ گیر روشنی نہ ڈالتا ہو۔ قرآن مجید عالم الغیب خدا کا کلام ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ فرقہ بندی جیسی چیز پر تیز نظر نہ ڈالتا اور اپنے خاص انداز میں ایک قطعی حکم ایسا نہ صادر فرماتا جو اس کے شایان شان ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہے۔ اعتصموا بحبل اللہ جمیعًا وَّلا تَفَرَّقوا اللہ اللہ اس ایک ٹکڑے کے اندر کس اٹل اصول کو کس طرح پیش کیا گیا ہے پہلے تو اعتصموا کی عمومیت ہے اور اس کے ساتھ ہی امر کی شکل میں پھر حبل اللہ کا عالیشان مضبوط حملہ ہے جس کے اندر محبت وپیار کے دریا موجیں مار رہے ہیں اس کے بعد جمیعًا کی تاکید ہے اور ایک مرتبہ پھر عمومیت کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ اور اس بات کا اظہار کر دیا گیا ہے کہ اس کلیہ میں کسی کا استثناد نہیں اخیر میں لاتفرقوا کا خدائی حکم جاری ہوا۔ اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں جو مصائب اور مضائیں اس کی طرف کھلا ہوا اشارہ فرما دیا گیا۔

آیت شریف مسلمانوں کے ہر فرقہ کے لئے قابل توجہ اور دعوت عمل ہے اپنی اپنی جگہ پر ہر فرقہ کو سوچنا چاہیے کہ خواہ وہ اپنے زعم میں راستی ہی پر کیوں نہ ہو لیکن جب تک اعتصموا اور جمیعًا کے حکم کو پورا نہیں کرتا

پیدا کرنے کے لئے بےچین نہیں ہے وَلَا تَفَرَّقُوا کی وعید میں داخل ہے یا نہیں اور کیا اس شکل میں کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ کا مصداق بنتا ہے یا نہیں اور پھر یہ کہ نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کی حالت تباہ و برباد ہو رہی ہے یا نہیں؟

اگر ایسا ہے اور ضرور ایسا ہے تو پھر فرقہ بندیوں کی پرورش سے جہاں تک جلد ممکن ہو ہر فرقہ والے کو باز آنا چاہئے اور بلا استثنا اپنی اپنی جگہ پر ہر فرقہ والے کو اس آیت شریف کے لفظ لفظ کی عملی تائید کرنی چاہئے فرقہ بندی کو ناپسند اور ایک ہو جانے کو دل سے پسند کرنا چاہئے اور اس پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو اختیاری نہیں بلکہ خدا کی طرف سے عاید کیا ہوا حکم سمجھنا چاہئے۔

"عالمگیر تحریک قرآن" کا مسلک اس سلسلہ میں وہی ہے جو ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ کا تقاضا ہے اور اس کی شہادت میں سب سے بڑی بات یہ پیش کی جا سکتی ہے کہ اس مقدس تحریک کے ہمدرد اور سرکار تقریباً ہر فرقہ کے نامور افراد ہیں۔ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرقہ بندی کی مصیبتوں سے بچنے کے لئے اپنی رسی (قرآن مجید) کو پیش فرمایا ہے اور پھر یہ بھی کہ اس کے اختیار کرنے اور اس کے معنی و مطالب سمجھنے میں کسی طرح بھی متفرق نہ ہو پس اگر آج یہ ذہنیت مسلمانوں کی ہو جائے تو بیڑہ پار ہے اور ہر طرح کی اجتماعی قوت پھر پیدا ہو جائے اور دریا کے بہاؤ کا رخ دوسری قوموں کو راہ راست پر لانے اور جہاد فی سبیل اللہ میں صرف ہونے لگے۔

"عالمگیر تحریک قرآن" کا بھی یہی مقصد ہے اور اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ قرآن کا علم و عمل قرآن کی روشنی میں عام ہو اور اگر ایسا ہو گیا تو خود بخود بات بن جائے گی۔ اور جو کام آج تک بحث و مباحثہ، طعن و تشنیع اور شمشیر و قلم کے ذریعہ سے نہیں ہو سکا صرف قرآن مجید کی خالص تعلیم سے ہو جائے گا وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

تحریک مقدس کے سلسلہ میں اب تک کم و بیش ایک لاکھ کی تعداد میں لٹریچر شائع کیا جا چکا ہے لیکن ان سب میں وہی شیوہ اختیار کیا گیا ہے جو اوپر بیان ہوا یہاں تک کہ شخصی بے دے کو بھی راہ دینا پسند نہیں کیا گیا۔ لہٰذا انشاء اللہ ترجمان القرآن بھی اپنے مقصد میں پورا اترے گا۔ وباللہ التوفیق۔

اللہ تعالیٰ نے جن الفاظ سے قرآن مجید کی تعریف کی ہے ان میں سے ایک لفظ "بیان" بھی ہے چنانچہ فرمایا ھٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ اور بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ۔ ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کو لوگ نہیں سمجھ سکتے خود قرآن اعتراف کرتا ہے کہ اس میں متشابہات بھی موجود ہیں۔ اور متشابہ کے متعلق خود اس کا قول ہے کہ وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰہ۔ پھر قرآن مجید "بیان" کیونکر ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کو ان لوگوں کی نسبت سے بیان کہا گیا ہے جو اس کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نہ کہ ہر سننے والے کی نسبت سے۔ اور یہ قرآن ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر کلام کو بیان اسی معنے کے لحاظ سے کہتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ شرط لگا دی جائے کہ بیان صرف اس کلام کو کہا جائے گا جس کو ہر شخص سمجھ لے، تو دنیا کے کسی کلام کو بھی بیان نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ ہر کلام بعض کے لئے بیان ہوتا ہے۔ اور بعض کے لئے نہیں ہوتا۔

سورۃ والضحیٰ میں اللہ تعالیٰ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی (اور تجھکو بھٹکا ہوا پایا تو راہ راست دکھا دی)۔ یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی گمراہی جائز ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ آیت میں ضلال سے مراد ان خصائص سے محرومی اور ان علوم و معارف الٰہی سے

ناواقفیت ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو نبوت سے سرفراز کرنے کے بعد بہرہ مند فرمایا
چنانچہ لغت میں جب کوئی شخص اپنی منفعت کے طریقہ سے ناواقف ہو تو کہتے ہیں کہ ضَلّ عن
کیت وکیت۔ ہاں اگر وَ وَجَدَكَ ضَالاًّ عَنِ الدِّین کہا گیا ہوتا تو البتہ اس سے وہ گمراہی
مراد ہو سکتی تھی جو عموماً لوگ اس لفظ سے سمجھتے ہیں۔

تحریم شراب کے سلسلہ میں پہلا حکم جو نازل ہوا ہے یہ ہے کہ یَا اَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا
لَاتَقرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنتُم سُکَارٰی حَتّٰی تَعلَمُوا مَا تَقُولُونَ (اے ایمان لانے والو
نماز کے قریب نہ جاؤ جب کہ تم نشہ کی حالت میں ہو۔ تاوقتیکہ تم جو کچھ کہتے ہو اس کو سمجھو نہیں)
اس کے متعلق ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ جب انسان نشہ کی حالت میں ہوگا تو اسے یہ یاد ہی کیسے رہیگا
کہ اب نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مقصود کلام یہ نہیں ہے کہ نشے کی حالت میں
نماز نہ پڑھو بلکہ یہ ہے کہ اپنے اوپر ایسی حالت ہی طاری نہ کرو جس سے تم نماز پڑھنے کے قابل
نہیں رہ سکتے۔ اور جس کی بدولت تمہاری یہ حالت ہو جاتی ہے کہ جو کچھ تمہاری زبان سے نکلتا ہے،
اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس آیت سے نہ صرف ہر نشہ آور چیز کی تحریم کا حکم نکلتا ہے، بلکہ یہ بھی معلوم
ہوتا ہے۔ کہ مصلّی کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ وہ پڑھتا ہے اس کو سمجھے بھی۔

نقد و نظر

لا الٰہ الّا اللہ | تالیف مولوی محمد ادریس خان صاحب نجیب آبادی مکتبۂ عبرت نجیب آباد

قیمت ۵ ضخامت ۸۰ صفحہ۔

توحید باری تعالیٰ کا بیان ہے اور زیادہ تر آیات قرآنی سے صفات الٰہی کی تفصیل کر کے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ شرک فی الصفات تمام گناہوں اور برائیوں کی جڑ ہے مصنف نے اپنے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے کہ ان کا مقصد بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں کا رد ہے اور اس میں کسی خاص شخص یا جماعت کو نشانہ نہیں بنایا گیا ہے لیکن ان کے رسالہ کی ابتدا میں جو معلمانہ رنگ ہے، وہ آخر میں مناظرانہ رنگ سے بدل گیا ہے، اور مسلمانوں کے بعض گروہوں پر انہوں نے بہت زور کے ساتھ شرک کا الزام عاید کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو غلط اعتقادات مسلمانوں میں پھیل گئے ہیں، ان کی اصلاح ضروری ہے۔ مگر ہماری رائے میں اصلاح کے لئے وہ طریقے اور وہ انداز اختیار کرنے مناسب نہیں جن سے الٹی ضد اور نفرت پیدا کر دیتے ہیں

نسخۂ زکوٰۃ و **آداب والدین** | انجمن رفیق الاسلام۔ گوڑگانوہ سے ایک آنہ کے ٹکٹ بھیج کر مفت منگائے جا سکتے ہیں۔

یہ دونوں رسالے ان اصلاحی رسائل میں سے ہیں جو انجمن رفیق الاسلام کچھ عرصہ سے شائع کر رہی ہے نسخۂ زکوٰۃ میں بھیک مانگنے کی مخالفت کرتے ہوئے یہ بتایا گیا کہ خیرات کن لوگوں کو دینی چاہئے سوال کن کن حالات میں جائز ہے زکوٰۃ کے مصارف کیا ہیں۔ زکوٰۃ کے مصالح کیا ہیں۔ اور کتنے مال پر کتنی زکوٰۃ دینی چاہئے رسالہ کا انداز بیان نہایت سادہ اور عام فہم ہے اور قصہ کے پیرایہ میں مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ دوسرے رسالہ "آداب والدین" میں اولاد پر ماں باپ کے حقوق بتائے گئے ہیں اور آیات قرآنی و احادیث نبوی سے یہ بتایا گیا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔

نوع انسان کو اکابر اسلام کی دعوت اتحاد

تمام دنیا میں ۷ جولائی کو یوم النبی منایا جائے

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا مینار تیرہ سو سال سے علم و عمل کی دو عظیم الشان چٹانوں پر قائم ہے اور وہ زندگی کے پر طوفانی زمانہ میں تہذیب تمدن کی ڈگمگاتی ہوئی کشتیوں کے لئے ایک آخری روشنی اور پناہ ثابت ہوا ہے یعنی حضور نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی سب کے لئے ہے، اور جو کچھ کیا ہے وہ بھی سب کے لئے ہے۔

پیغمبر اسلام دنیا کی مختلف تہذیبوں اور ملتوں کو صحیح اصول کی بنا پر ایک رشتہ مساوات میں پرونے کے لئے تشریف لائے تھے آپ صرف مذہبی فرقہ بندی ہی کے خلاف نہ تھے بلکہ عالم انسانیت میں ہر قسم کی فرقہ بندی کے خلاف تھے خواہ وہ کسی نام سے کی جائے آپنے دنیا کے سامنے جو تعلیم پیش فرمائی ہے وہ شخصی، ملکی نسلی یا ہنگامی تعلیم نہ تھی بلکہ ایسی ابدی تعلیم تھی جو تمام انسانوں کو اخوت و محبت کے محکم رشتوں میں مربوط کر دینے والی ہے آپنے نوع انسان کو جس دین فطرت کی طرف بلایا ہے وہ کسی خاص جماعت کا نہیں بلکہ تمام انسانوں کا مشترکہ دین ہے، اور اس دین کو قبول کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اُن تمام تنگ حلقوں سے جن کی بنیاد رنگ نسل زبان، قوم یا وطن پر ہے۔ یہ کہتے ہوئے آزاد ہو جاتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایک خدا ہے سارا کرہ ارضی ہمارا وطن ہے اور اسکی پشت پر بسنے والے تمام انسان ایک گھرانے کے افراد ہیں۔

آؤ اس پیغمبر وحدت و محبت کی یاد میں نوع انسان کے لئے سچی اور آزاد اخوت کا ایک ایسا عظیم الشان دن منائیں جس میں ہم سب اپنے اپنے ہنگامی اختلافات و تعصبات کو بھول جائیں وحدت و اخوت انسانی کے خیال کو لیکر محبت و مساوات کے متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہوں عظیم الشان دن ۱۲ ربیع الاول ۷ جولائی ۱۹۳۳ء کا دن ماننا چاہئے۔ یہ دن حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن ہے۔ ہم نہایت ہی خلوص و احترام سے تمام بنی نوع انسان کو اس عید اتحاد میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور اپیل کرتے ہیں کہ ۷ جولائی ۱۹۳۳ء کو تمام دنیا کی آبادیوں میں

سیرۃ النبی کے عنوان پر متعدد جلسے کئے جائیں! ایسے جلسے جو پیغمبر اسلام کے پاک نام اور مبارک کام کے شایان شان ہوں اور جن سے نوع انسان میں باہمی ہمدردی اور محبت و خدمت خلق کا صحیح جذبہ پیدا ہو۔

اس تقریب پر بعض ممتاز علماء کے قلم سے سیرت نبوی کے اہم پہلوؤں پر تقریریں شائع کی جا رہی ہیں نیز یہ یوم النبی کے جلسوں میں سنائی جائیں اور ان کے تراجم دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں شائع کر کے ہر جگہ مفت تقسیم کئے جائیں۔

ہماری دعا ہے کہ خداوند پاک اس بین الاقوامی تحریک کو نسل انسان کے لئے بابرکت بنائے۔

نوٹ ۔ سیرت کی اردو، ہندی، گورمکھی، انگریزی، عربی تقریروں کی قیمت پچاس روپیہ فی ہزار، ۶ روپیہ فی سیکڑہ ہے محصول ڈاک اس کے علاوہ۔ ایک روپیہ چار آنہ کا ٹکٹ بھیجکر ۲ کتابیں طلب کی جائیں۔ (پتہ) سکرٹری سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور

الداعیان

عرب

(مولنا) محمد عبدالظاہر۔ (امام و خطیب مسجد حرم مکہ معظمہ)
(مولنا) محمد عبدالرزاق (امام مسجد حرم مکہ)
(مولنا) عبید اللہ سندھی (مکہ معظمہ)

مصر

(علامہ) عبدالعزیز الثعالبی۔ (قاہرہ)
(ہز ہائینس) پرنس عمر طوسون پاشا۔ (قاہرہ)
(ہز ایکسیلنسی) محمد علی پاشا علوبہ (سابق وزیر اوقاف مصر)
(علامہ) عبدالقادر بک حمزہ (مدیر "البلاغ" مصر)

یورپ

(لارڈ) ہیڈلے فاروق (لنڈن)
(سر) عمر ہیوبرٹ رینکن (لنڈن)
(امیر) شکیب ارسلان (جنیوا)

افغانستان

(آقائے) برہان الدین کشکی (صاحب "اصلاح" کابل)
(عالی قدر) عطا محمد الحسینی۔ (رئیس مجلس اعیان کابل)

ایران

(ہز ایکسیلنسی) سید ضیاء الدین طباطبائی (سابق وزیر اعظم ایران)

شام

(حضرت المجاہد) علی ریاض الصلح، بیروت
(علامہ) صفوۃ یونس الحسینی (بیت المقدس)۔
(امیر) سعید الجزائری (رئیس جمعیۃ الخلافہ شام)

ہندوستان

(علامہ) سر محمد اقبال۔ (لاہور)
(ڈاکٹر) سر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ علیگڑھ)
(علامہ) سید سلیمان ندوی۔ (لکھنؤ)
(آنریبل) سر فیروز خاں نون (وزیر تعلیم پنجاب لاہور)
(نواب) سر عبدالقیوم (وزیر سرحد پشاور)
(نواب) محمد شاہ نواز خان (ملتان)
(سیٹھ) جمال محمد (مدراس)۔

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینہ کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے۔ لہذا کوئی صاحب رعایت کا مطالبہ نہ فرمائیں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں۔ لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر مضمون شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن

خیرت آباد۔ (حیدرآباد دکن)

جلد (۲) عدد (۲) صفر ۱۳۵۲ ہجری

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم و معارف قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مُرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

باہتمام

مولوی ابو محمد صاحب مصلح

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا

قیمت سالانہ عہ

قیمت فی پرچہ ۵ر

فہرست مضامین

قرآن مجید میں جگہ جگہ ان قوموں کا ذکر آیا ہے جن پر گذشتہ زمانہ میں خدا کا عذاب نازل ہوا ہے۔ ہر قوم پر نزول عذاب کی صورت مختلف رہی ہے۔ عاد پر کسی طرح کا عذاب اترا، ثمود پر کسی اور طرح کا، اہل مدین پر کسی دوسری صورت میں، اور آل فرعون پر ایک نئے انداز میں۔ مگر عذاب کی شکلیں اور صورتیں خواہ کتنی ہی مختلف ہوں، وہ قانون جس کے تحت یہ عذاب نازل ہوا کرتا ہے ایک ہی ہے، اور ہرگز بدلنے والا نہیں ہے سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (۳۳-۸)

نزول عذاب کے اس قانون کی تمام دفعات پوری تشریح کے ساتھ قرآن مجید میں درج کی گئی ہیں۔ اس کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ جب کسی قوم کی خوش حالی بڑھ جاتی ہے تو وہ غلط کاری اور گمراہی کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور فطرۃً اس کی عملی قوتوں کا رخ صلاح کے بجائے فساد کی طرف پھر جایا کرتا ہے۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا (۲:۱۷)	اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں پھر وہ لوگ اس بستی میں نافرمانیاں کرتے ہیں

پھر وہ بستی عذاب کے حکم کی مستحق ہو جاتی ہے پھر ہم اس کو تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں۔

دوسرا قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ خدا کسی قوم پر ظلم نہیں کرتا، بد کار قوم خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتی ہے، خدا کسی قوم کو نعمت دیکر اس سے کبھی نہیں چھینتا، ظالم قوم خود اپنی نعمت کے درپے ہو جاتی ہے اور اس کے مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۸: ۷)

یہ اس لئے کہ اللہ کبھی اس نعمت کو بدلنے والا نہیں ہے جو اس نے کسی قوم کو بخشی ہو، تا وقتیکہ وہ قوم خود اپنے آپ کو نہ بدلدے اور اس وجہ سے کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۹: ۹)

اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان پر ظلم کرتا، وہ تو خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

پھر یہ بھی اسی قانون کی ایک دفعہ ہے کہ خدا ظلم (ظلم برنفس خود) پر مواخذہ کرنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے۔ اور تنبیہیں کرتا رہتا ہے کہ نصیحت حاصل کریں اور سنبھل جائیں۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۱۶: ۸)

اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کے بدلے میں پکڑتا تو روئے زمین پر کوئی متنفس باقی نہ رہتا۔ مگر وہ لوگوں کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دیا کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ

ہم نے تم سے پہلے کی قوموں میں بھی اسی طرح پیغمبر بھیجے ان کو سختی اور تکلیف میں گرفتار کیا تاکہ شاید

لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۔ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶ : ۵)

وہ ہماری طرف عاجزانہ جھکیں پس جب ان پر ہماری طرف سے مصیبت آئی تو کیوں نہ وہ ہمارے آگے گڑگڑائے ؟ مگر ان کے دل سخت ہو چکے تھے اور شیطان نے ان کی نگاہوں میں ان کے اعمال کو مزین بنا دیا تھا۔

اس ڈھیل کی مدت میں اکثر ظالم قوموں کو خوش حالی کے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ وہ اس سے دھوکہ کھا جاتی ہیں۔ اور واقعی یہ سمجھ بیٹھتی ہیں کہ ہم ضرور نیکوکار ہیں۔ ورنہ ہم پر نعمتوں کی بارش کیوں ہوتی ؟

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ، نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (۲۳ : ۴)

کیا یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جو مال اولاد سے انکی امداد کئے چلے جا رہے ہیں (تو اس کے معنی یہ ہیں کہ) ہم ان کو فائدہ پہونچانے میں جلدی کر رہے ہیں (حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے اصلی بات جو کچھ ہے) اسے یہ نہیں سمجھتے۔

آخرکار جب وہ قوم کسی طرح کی تنبیہ سے نہیں سنبھلتی اور ظلم کئے جاتی ہے تو خدا اس کے حق میں نزول عذاب کا فیصلہ کر دیتا ہے اور جب اس پر عذاب کا حکم ہو جاتا ہے تو پھر کوئی قوت اس کو نہیں بچا سکتی۔

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا (۱۸ : ۸)

یہ بستیاں جن کے آثار تم دیکھ رہے ہو ان کو ہم نے اس وقت تباہ کیا جب انہوں نے ظلم کیا اور ہم نے انکے ہلاک ہونے کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا تھا

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ

اور جب تیرا رب ظالم بستیوں کو پکڑتا ہے تو وہ ایسی ہی

ظَالِمَةٌ، اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۱۱: ۹)	بری طرح پکڑتا ہے اور اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوا کرتی ہے۔
وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۳: ۲)	اور جب خدا کسی قوم کے حق میں برائی کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی قوت اس کی شامت کو دفع کرنے والی نہیں ہوتی، اور پھر خدا کے مقابلہ میں ان کا کوئی مددگار نہیں نکلتا

یہ عذاب الٰہی کا اٹل قانون جس طرح پچھلی قوموں پر جاری ہوتا رہا ہے اسی طرح آج بھی اس کا عمل جاری ہے اور اگر بصیرت رکھتے ہوں تو اپنی آنکھوں سے اس کے نفاذ کی کیفیت مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مغرب کی وہ عظیم الشان قومیں جن کی دولت مندی و خوشحالی، طاقت و جبروت، شان و شوکت، عقل و ہنر کو دیکھ دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور جن پر انعامات خداوندی کی پیہم بارشوں کے مشاہدے سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ شاید یہ خدا کے بڑے ہی مقبول اور چہیتے بندے اور خیر و صلاح کے مجسمے ہیں، ان کی اندرونی حالت پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اس عذاب الٰہی کے قانون کی گرفت میں آچکی ہیں۔ اور انہوں نے اپنے آپ کو خود اپنے انتخاب و اختیار سے اس دیو ظلم (ظلم بر نفس خود) کے چنگل میں پوری طرح پھنسا دیا ہے جو تیزی کے ساتھ انہیں تباہی و ہلاکت کی طرف لیے چلا جا رہا ہے۔

وہی صنعت و حرفت کی فراوانی، وہی تجارت کی گرم بازاری وہی دہائے سیاسی کی کامیابی، وہی علوم حکمیہ و فنون عقلیہ کی ترقی، وہی نظام معاشرت کی فلک پیما بلندی، جس نے ان قوموں کو تمام دنیا پر غالب کیا، اور روئے زمین پر ان کی دھاک بٹھائی آج ایک ایسا خطرناک جال بن کر

ان کو پٹ گئی ہے جس کے ہزاروں پھندے ہیں۔ اور ہر پھندے میں ہزاروں مصیبتیں ہیں۔ وہ اپنی عقلی تدبیروں سے جس پھندے کو کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا ہر تار کٹ کر ایک نیا پھندا بن جاتا ہے۔ اور رہائی کی ہر تدبیر مزید گرفتاری کا سبب ہو جاتی ہے۔

یہاں ان تمام معاشی اور سیاسی اور تمدنی مصائب کی تفصیل کا موقع نہیں ہے جن میں مغربی قومیں اس وقت گرفتار ہیں۔ بیان مدعا کے لئے اس تصویر کا صرف ایک پہلو پیش کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ قومیں کس طرح اپنے اوپر آپ ظلم کر رہی ہیں۔ اور کس طرح اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان مہیا کئے جا رہی ہیں۔

اپنے معاشی تمدنی اور سیاسی احوال کی خرابی کے اسباب تشخیص کرنے اور ان کا علاج تجویز کرنے میں اہل فرنگ سے عجیب عجیب غلطیاں ہو رہی ہیں منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی مشکلات کا بڑا اصلی سبب آبادی کی کثرت کو سمجھتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ افزائش نسل کو روکا جائے۔ معاشی مشکلات کے ساتھ ساتھ یہ خیال نہایت تیزی کے ساتھ مغربی ممالک میں پھیلنا شروع ہو گیا ہے اور دلوں میں کچھ اس طرح بیٹھا ہے کہ لوگ اپنی نسل کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر اپنی نسل کے سب سے بڑے دشمن بن گئے ہیں۔ ضبط ولادت کے نئے نئے طریقے جو پہلے کسی کے ذہن میں بھی نہ آتے تھے اب عام طور پر رائج ہو رہے ہیں۔ اس تحریک کو ترقی دینے کے لئے نہایت وسیع پیمانے پر تبلیغ و اشاعت ہو رہی ہے، کتابیں، پمفلٹ، رسائل اور جرائد خاص اسی موضوع پر شائع کئے جا رہے ہیں۔ انجمنیں اور جمعیتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ ہر عورت اور مرد کو اس کے متعلق معلومات بہم پہونچانے، اور عملی آسانیاں فراہم کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ غرض کئی سال سے یورپ اور امریکہ کے عمرانی "مصلحین" نے اپنی نسلوں کے خلاف ایک زبردست جنگ چھیڑ دی ہے اور جو شخص

اصلاح میں ان کو یہ سوچنے کا ہوش بھی نہیں ہے کہ آخر یہ جنگ کہاں جاکر رکے گی۔

توالد وتناسل سے مغربی قوموں کی نفرت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ضبط ولادت کے متعدد طریقوں سے بچ بچاکر جو حمل ٹھیر جاتے ہیں۔ ان کو بھی اکثر وبیشتر گرادیا جاتا ہے، روس میں تو یہ فعل قانوناً جائز قرار دیدیا گیا ہے۔ اور ہر عورت کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا ہے کہ تین مہینے تک کا حمل ساقط کردے لیکن انگلستان اور دوسرے فرنگی ممالک میں جہاں اسقاط حمل قانوناً ممنوع ہے خفیہ طور پر اسقاط کی کثرت وبا کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ فرانس میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جتنے بچے ہر سال پیدا ہوتے ہیں قریب قریب اتنے ہی حمل ہر سال ساقط کئے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض ڈاکٹروں کا خیال یہ ہے کہ اسقاط کی تعداد پیدائش سے زیادہ ہے تیس اور چالیس برس کے درمیان شاید ہی کوئی عورت ہو جس نے اسقاط کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ گو قانوناً یہ فعل جرم ہے لیکن دواخانوں میں علانیہ اس کا ارتکاب ہوتا ہے اور فرضی بیماریاں رجسٹروں میں درج کردی جاتی ہیں۔ انگلستان میں بہت سی دائیاں ہیں جن کا کاروبار اسقاط ہی سے چلتا ہے۔ ایک ڈاکٹر کا اندازہ ہے کہ ہر پانچ عورتوں میں سے چار ایسی ضرور نکلیں گی جنہوں نے کبھی نہ کبھی اسقاط کیا ہوگا۔ جرمنی میں تقریباً دس لاکھ حمل ہر سال ساقط کئے جاتے ہیں، اور اتنی ہی تعداد زندہ پیدا ہونے والے بچوں کی ہے بعض جرمن شہروں میں تو اندازہ کیا گیا ہے کہ گذشتہ بیس سال کے اندر جتنے بچے پیدا ہوے اس سے دوگنے حمل ساقط کردیے گئے

عورت جس کے اندر فطرت نے ایک زبردست جذبۂ مادری رکھا تھا، مغربی ممالک میں اب اتنی شقی القلب ہوگئی ہے کہ وہ اپنے پیٹ کی اولاد کو ہلاک کرنے کے لئے خود اپنی جان تک کو

خطرہ میں ڈالنے سے نہیں چوکتی۔ ڈاکٹر نارمن حیر (Norman Haire) اپنی ایک تقریر میں بیان کرتا ہے کہ ایک حاملہ عورت اس کے ہاں آئی اور اس نے اسقاط کی خواہش ظاہر کی جب قانونی مجبوری کی بنا پر عذر کیا گیا تو اس نے طرح طرح کی زہریلی دوائیں کھا کر پیٹ گرانے کی کوشش کی۔ سیڑھیوں پر سے قصداً اپنے آپ کو لڑھکایا۔ اونچے اونچے مقامات سے کودگئی۔ بھاری بھاری بوجھ اٹھائے۔ اور جب اس سے بھی اسقاط نہ ہوا تو آخر کار ایک اناڑی قابلہ کی دوا استعمال کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ مادام البرشیت (Madamme Albrecht) کا بیان ہے کہ عورتیں حمل ساقط کرنے کے لئے وہ وہ حرکتیں کر گذرتی ہیں جو بیان نہیں کی جا سکتیں۔ مثلاً پیٹ پر سخت آلات سے ضربیں لگانا، رحم کو مختلف آلات سے صدمہ پہنچانا، وحشیانہ طریقوں سے ناچنا، اپنے آپ کو قصداً اونچی جگہوں سے گرا دینا۔ سخت سے سخت زہریلی چیزیں حتیٰ کہ بارود تک کھا جانا۔ وہ ایک فرانسیسی عورت کا قصہ بیان کرتی ہے کہ اس نے حمل سے تنگ آکر ایک لمبی پن لی اور رحم میں چبھو چبھو کر اس کو اتنا زخمی کیا کہ خون جاری ہو گیا۔ اس قسم کی بدولت بکثرت عورتیں ہر سال اپنی جان دیدیتی ہیں۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ انگلستان کے شفاخانہائے نسوان میں جتنی عورتیں ہر سال مرتی ہیں۔ ان میں سے نصف کا سبب اسقاط حمل ہے۔ اور یہی کیفیت دوسرے ممالک کی بھی ہے

اس زبردست نسل کشی کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کی شرح پیدائش میں بہت کمی واقع ہو گئی ہے۔ ۱۸۷۶ء اور ۱۹۳۰ء کے اعداد کا مقابلہ کیجئے انگلستان اور ویلز میں شرح پیدائش ۲، ۳۶ فی ہزار سے گھٹ کر ۳، ۱۶ (اور ۱۹۳۱ء میں ۸، ۱۵) رہ گئی ہے۔ جرمنی میں ۹، ۴۰ سے ۵، ۱۷ اٹلی میں ۲، ۳۹ سے ۷، ۲۶، سویڈن میں ۸، ۳۰ سے ۴، ۱۵، نیوزی لینڈ میں ۰، ۴۱ سے ۸، ۱۸ تک گھٹ گئی ہے۔ سردست چونکہ ان ممالک میں شرح اموات بھی قریب قریب اسی نسبت سے

کم ہوگئی ہے اس لئے آبادی ایک حالت پر ٹھیری ہوی ہے لیکن اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر شرح پیدائش اسی رفتار سے گھٹتی رہی تو دس سال گذرنے کے بعد یہ ٹھیری ہوی حالت قائم نہیں رہیگی بلکہ آبادی گھٹنی شروع ہو جائے گی۔

سب سے زیادہ خطرناک حالت فرانس کی ہے۔ تمام دنیا کے ممالک میں صرف یہی ملک ایسا ہے جہاں کی آبادی روز بروز گھٹتی چلی جا رہی ہے سنہ ۱۸۸۰ء میں وہاں کی شرح پیدائش ۲۵ء۴ فی ہزار تھی سنہ ۱۹۳۱ء میں ۱۷،۱ رہ گئی مگر شرح اموات میں اس تناسب سے کمی نہیں ہوئی سنہ ۱۸۸۰ء میں شرح اموات ۶،۲۲ تھی سنہ ۱۹۳۱ء میں صرف ۳،۱۶ تک اتری۔ فرانس کے ہمسایہ اور حریف ممالک جرمنی، اور اٹلی میں ۱۳۵ اور ۱۳۰ آدمی فی مربع کیلو میٹر آباد ہیں۔ مگر فرانس میں صرف ۳،۷۶ فی مربع کیلو میٹر آبادی کا اوسط ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں فرانس کی سرزمین پر ۷۳۰۲۴۹ بچے پیدا ہوئے اور اس کے حریف جرمنی میں پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد ۱۰۳۱۵۰۸ تھی۔

مس سسلی ہیملٹن اپنی کتاب (ماڈرن فر   ) میں لکھتی ہے کہ اس حالت نے فرانس کے مدبرین سیاست میں ایک گہری پریشانی پیدا کر رکھی ہے جس کا بُرا اثر نہ صرف فرانس بلکہ تمام دنیا کی سیاست پر مترتب ہو رہا ہے۔ فرانس کی عیش پسند آبادی دیہات کو چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہو رہی ہے۔ اٹلی و پولینڈ وغیرہ ممالک کے باشندے ہجرت کر کے فرانس میں آ رہے ہیں اور زمینوں پر قبضہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ فی ہفتہ ۲ ہزار مہاجرین کا اوسط اندازہ لگایا گیا ہے سنہ ۱۹۲۹ء میں فرانسیسی سرزمین پر جتنے بچے پیدا ہوئے ان میں تقریباً ۹ فی صدی غیر قوموں کے تھے۔ اس سے فرانسیسی سیاسیین کو اندیشہ ہے کہ آگے چل کر ایک وقت ایسا آئے گا جب فرانسیسی قوم خود اپنے گھر میں غیر قوموں کی اکثریت سے مغلوب ہو جائے گی تاہم یہ خطرہ بعید ہے۔ بالکل قریبی خطرہ

یہ ہے کہ فرانس کے حریف اٹلی اور جرمنی کی آبادی اس سے بہت زیادہ ہے۔ اگر تخفیف اسلحہ کی تجاویز منظور کر کے فرانس اپنے آلات جنگ کم کر دے تو آیندہ لڑائی میں کامیابی کا انحصار فوج کی کثرت پر ہوگا اور اس میدان میں اکیلا جرمنی اور اکیلا اٹلی، فرانس پر غالب رہے گا۔ یہی خطرات ہیں جن کی وجہ سے فرانس کا طرز عمل بین الملی مسائل میں دوسری اقوام کے خلاف ہے۔

یہ نتائج ہیں اس عاقلانہ تدبیر کے جو یورپ نے اپنی معاشی اور تمدنی مشکلات کو دور کرنے کے لئے اختیار کی ہے۔ اس وقت فرانس کے سوا تمام فرنگی ممالک کی آبادی صرف اس وجہ سے ایک ٹھیری ہوئی حالت پر قائم ہے کہ شرح اموات سے شرح پیدائش ابھی تک زیادہ ہے۔ اس لئے شرح پیدائش کے گھٹنے کا اثر آبادی پر مترتب نہیں ہوا ہے لیکن اہل فرنگ کے پاس یہ یقین کرنے کی کونسی معقول وجہ ہے کہ شرح اموات اور شرح پیدائش کا یہی تناسب ہمیشہ برقرار رہے گا؟ کیا انہوں نے اسکا اطمینان کرلیا ہے کہ کسی روز مغربی افریقہ کے مچھر زرد بخار کے جراثیم لئے ہوئے خود انہی کے ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر یورپ نہ پہنچ جائیں گے؟ کیا انہوں نے اس کی کوئی ضمانت لے لی ہے کہ کبھی یورپ میں اچانک انفلوئنزا، طاعون، ہیضہ اور ایسے ہی دوسرے وبائی امراض میں سے کوئی مرض نہ پھیل جائے گا؟ کیا وہ اس سے بے خوف ہو چکے ہیں کہ ایک دن یکایک فرنگی سیاست کے باروت خانوں میں کسی ایک میں ویسی ہی کوئی چنگاری نہ آپڑے گی جیسی ۱۹۱۴ء میں سراجیفو میں گری تھی، اور پھر فرنگی قومیں خود اپنے ہاتھوں سے وہ سب کچھ نہ کر گذریں گی جو کوئی وبا اور کوئی بیماری نہیں کر سکتی؟ اگر ان میں سے کوئی صورت بھی پیش آگئی اور دفعتہً یورپ کی آبادی میں سے چند کروڑ آدمی قتل یا ہلاک یا ناکارہ ہو گئے، تو اس وقت یورپ کے باشندوں کو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اپنے آپ کو خود کس طرح تباہ کیا۔

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا — کیا بستیوں کے لوگ مطمئن ہیں کہ ہمارا عذاب اُن پر نہ آئیگا

بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُوْنَ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (۷ : ۱۲)

نہ جائے گا جب کہ وہ سوتے ہوں گے؟ اور کیا ان بستیوں کے لوگوں نے اس کا اطمینان کرلیا ہے، کہ ہمارا عذاب کبھی دن دہاڑے ان کو نہ آئے گا جبکہ وہ کھیلتے ہوں گے؟ اور کیا وہ اللہ کی چال سے بےخوف ہوگئے ہیں؟ سو اللہ کی چال سے تو وہی لوگ بےخوف ہوتے ہیں جن کو برباد ہونا ہے۔

ایسی ہی ایک قوم اب سے تین ہزار برس پہلے عرب کے جنوبی ساحل پر آباد تھی جس کا ذکر قرآن میں سبا کے نام سے آیا ہے اس قوم کی گھنی آبادی کا سلسلہ سواحل بحر ہند سے سواحل بحر احمر تک پھیلا ہوا تھا ہندوستان اور یورپ کے درمیان جتنی تجارت اس زمانہ میں ہوتی تھی، وہ سب اسی قوم کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کے تجارتی قافلے جنوبی ساحل سے مال لے کر چلتے تو مغربی ساحل تک مسلسل بستیوں اور باغوں کی چھاؤں میں چلے جاتے تھے۔ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ (۳۴ : ۲) مگر انہوں نے اللہ کی اس نعمت کو مصیبت سمجھا اور چاہا کہ ان کی یہ گھنی متصل مسلسل بستیاں کم ہوجائیں اور ان کا باہمی فصل بڑھ جائے فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ یہاں لفظ بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا سے پتہ چلتا ہے کہ تجارتی خوشحالی کی وجہ سے جب آبادی بڑھ گئی اور بستیاں گنجان ہوگئیں تو وہاں بھی یہی سوال پیدا ہوا تھا جو آج یورپ میں پیدا ہوا ہے۔ اور وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ سے اشارہ ملتا ہے کہ شاید انہوں نے بھی ایسی کچھ تدبیریں اختیار کی ہوں گی جن سے ان کی بستیوں کا درمیانی فصل بڑھ جائے یا بالفاظ دیگر آبادی کم ہوجائے۔ پھر ان کا حشر کیا ہوا؟ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۳۴ : ۲) خدا نے ان کو منتشر اور پارہ پارہ کرکے ایسا تباہ و برباد کیا کہ بس ان کا وجود افسانوں ہی میں رہ گیا۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۲)

زندگی کا اسلامی تصور

اسی لفظ خلافت و نیابت سے ایک اور اہم نکتہ کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے۔ نائب کا اصلی کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی املاک میں اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اسی شان کا تصرف کرے جس شان کا تصرف خود حقیقی مالک کرتا ہے بادشاہ اگر اپنی رعیت پر کسی شخص کو اپنا نائب بنائے تو اس کے لئے اپنے منصب نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ رعیت کی خبر گیری، شفقت، مہربانی، حفاظت، عدل اور حسب موقع سختی کرنے میں وہی سیرت اختیار کرے جو خود بادشاہ کی سیرت ہے اور بادشاہ کی املاک اور اس کے اموال میں ویسی ہی حکمت تدبر دانائی اور احتیاط سے تصرف کرے جس سے خود بادشاہ ان میں تصرف کرتا ہے۔

پس جب انسان کو خدا کا خلیفہ اور نائب قرار دیا گیا، تو اس کے معنی یہ ہوے کہ انسان خدا کی نیابت و خلافت کا پورا حق اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب خدا کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اس کی روش بھی ویسی ہی ہو جیسی خود خدا کی روش ہے یعنی جس شان ربوبیت کے ساتھ خدا اپنی مخلوق کی خبر گیری اور پرورش کرتا ہے ویسی ہی شان کے ساتھ انسان بھی اپنے محدود دائرۂ عمل میں ان چیزوں کی خبر گیری اور پرورش کرے جو اللہ نے اس کے قبضۂ قدرت میں دی ہیں۔ اسی طرح جس شان رحمانی و رحیمی کے ساتھ خدا اپنی مخلوق پر مہربان ہے جس شان حکمت و دانائی کے ساتھ خدا اپنی ملکیت میں تصرف کرتا ہے، جس شان عدل کے ساتھ خدا اپنی مخلوقات

پر نظم قائم کرتا ہے جس شان رحم و کرم کے ساتھ خدا اپنی صفت قہر و جبر کا اظہار کرتا ہے چھوٹے پیمانہ پر اسی شان کے ساتھ انسان بھی خدا کی اس مخلوق کے ساتھ معاملہ کرے جس پر اللہ نے اس کو حکومت بخشی ہے، اور جسے اس کے لئے مسخر کیا ہے یہی مفہوم ہے جو تخلقوا باخلاق اللہ کے حکیمانہ جملہ میں ادا کیا گیا ہے۔ مگر یہ اعلیٰ اخلاقی مرتبہ صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ اس دنیا میں کوئی خود مختار فرماں روا نہیں ہے بلکہ اس عالم کے حقیقی فرمانروا کا نائب ہے، اور یہی نیابت کا منصب ہے جو دنیا کی تمام اشیا حتی کہ خود اپنے جسم اور جسمانی و نفسانی قوتوں کے ساتھ اس کے تعلق کی حیثیت اور حدود متعین کرتا ہے

منصب نیابت کی تشریح میں یہ جتنے نکات بیان ہوئے ہیں ان سب کی تفصیل قرآن مجید میں موجود ہے جس سے دنیا اور انسان کے باہمی تعلق کا ہر پہلو روشن اور واضح ہو جاتا ہے۔

انسان نائب ہے نہ کہ مالک کہا گیا کہ :-

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ ءَاتَىٰكُمْ (۶ : ۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا۔ اور تم میں سے بعض کو بعض سے اونچے درجے دئے تاکہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔

قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۷ : ۱۴)

موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تمھیں زمین کی خلافت دے تاکہ دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔

يَٰدَاوُۥدُ إِنَّا جَعَلْنَٰكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ

اے داؤد! ہم نے تجھ کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (۳۸:۲)	پس تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ یہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیگی۔ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ ان کیلئے اس بنا پر سخت عذاب ہے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔
اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ (۹۵)	کیا خدا تمام حاکموں کا حاکم نہیں ہے؟
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶:۷)	حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہے۔
قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ (۳:۳)	کہو کہ اے خدا! ملک کے مالک تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے معزز کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔
اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءَ (۷:۱)	جو کچھ تمہاری طرف خدا کی جانب سے ہدایت بھیجی گئی ہے صرف اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے بناوٹی فرمانرواؤں کی پیروی نہ کرو
قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (۶:۲۰)	کہو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میری زندگی اور میری موت سب خدا کیلئے ہے جو رب العالمین ہے

یہ آیات بتاتی ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں انسان کے زیر تصرف اور زیر حکم ہیں حتیٰ کہ خود اس کا نفس بھی اس کی ملک نہیں ہے اصلی مالک اور حاکم اور فرمانروا خدا ہے۔ انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان چیزوں میں مالکانہ تصرف کرے اور من مانے طریقوں سے ان کو استعمال کرے

س کی حیثیت دنیا میں صرف نائب کی ہے اور اس کے اختیار کی حد بس اتنی ہے کہ خدا کی ہدایت
پر چلے اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق ان چیزوں میں تصرف کرے۔ اس حد سے
بڑھ کر اپنے نفس کی پیروی کرنا۔ یا فرمانروائے حقیقی کے سوا کسی اور فرمانروا کی پیروی کرنا بغاوت
اور گمراہی ہے۔

دنیا میں کامیابی کی اولین شرط کہا گیا کہ:۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۲۹: ۶)	اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ سے کفر کیا وہی دراصل نقصان میں ہیں۔
وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (۲: ۲۷)	اور تم میں سے جو کوئی خدا کی اطاعت سے پھر گیا اس حال میں مرا کہ وہ کافر تھا۔ تو ایسے تمام لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے
وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۵: ۱)۔	اور جو کوئی ایمان لانے سے انکار کرے اس کا عمل ضائع ہوگیا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہے

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے دنیوی زندگی میں انسان
کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی فرمانروائی تسلیم کرے۔ اور دنیا
میں جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ میں خدا کا نائب اور اس کا امین ہوں۔ اس حیثیت کو تسلیم کئے
بغیر خدا کی ملکیت میں وہ جس قدر تصرف کرے گا وہ محض باغیانہ تصرف ہوگا اور یہ قاعدے کی
بات ہے کہ باغی اگر کسی ملک پر متصرف ہوکر بہتر کارگذاری بھی دکھلائے، تب بھی ملک کی اصلی حکومت
اس کے حسن عمل کو تسلیم نہ کرے گی اور بادشاہ کی نگاہ میں باغی بہرحال باغی ہوگا، خواہ اس کی
ذاتی سیرت اچھی ہو یا بُری۔ خواہ بغاوت کر کے اس نے ملک میں اچھی طرح تصرف کیا ہو یا بری طرح

دنیا برتنے کے لئے ہے کہا گیا کہ:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ۔ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۲ : ۲۱)

اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاک ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں بدی اور بے حیائی اور خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہنے کا حکم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبٰتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔ وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنتُم بِهِ مُؤْمِنُونَ (۵ : ۱۲)

اے ایمان لانے والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں ان کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، اور حد سے بھی نہ گذرو کہ اللہ حد سے گذرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان پاک اور حلال چیزوں میں سے کھاؤ جو اللہ نے تمھیں عطا کی ہیں، اور اس خدا کے غضب سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷ : ۴)

کہو کہ کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کیا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالی ہے اور کس نے پاک رزق کو حرام کر دیا ہے۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷ : ۱۹)

ہمارا پیغمبر ان کو نیکی کا حکم کرتا، اور بدی سے روکتا ہے۔ اور ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان سے ان کے بوجھ اور بندشوں کو دور کرتا ہے جو ان پر تھیں۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (۲: ۲۵)	تمہارے لئے اس میں کوئی حرج نہیں کہ اپنے رب کا فضل یعنی کاروبار کے ذریعہ سے روزی تلاش کرو
رَهْبَانِيَّةَ نِابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ (۵۷: ۴)۔	اور رہبانیت کا طریقہ جو مسیح کے پیروؤں نے خود نکال لیا تھا۔ انہوں نے محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا تھا۔ وہ ہم نے ان پر نہیں لکھا تھا۔
وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷: ۲۲)	ہم نے جہنم کے لئے ایسے بہتیرے جن اور انسان پیدا کئے ہیں جن کے پاس دل ہیں مگر ان سے سوچتے سمجھتے نہیں اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے یہی لوگ غفلت میں ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کا کام دنیا کو چھوڑ دینا نہیں ہے، نہ دنیا کوئی ایسی چیز ہے کہ اس سے پرہیز اور حذر کیا جائے۔ اس سے دور بھاگا جائے، اس کے کاروبار اس کے معاملات اس کی نعمتوں، اور اس کی لذتوں اور زینتوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا جائے۔ یہ دنیا انسان ہی کے لئے بنائی گئی ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ اس کو برتے اور خوب برتے۔ مگر برے اور بھلے پاک اور ناپاک، مناسب اور نامناسب کے فرق کو ملحوظ رکھ کر برتے۔ خدا نے اس کو آنکھیں دی ہیں اس لئے کہ وہ ان سے دیکھے۔ کان دیئے ہیں کہ ان سے سنے عقل دی ہے کہ اس سے کام لے اگر وہ اپنے حواس، اپنے اعضاء اور اپنے قوائے ذہنی کو استعمال نہ کرے، یا استعمال کرے مگر غلط طریقہ سے تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔

دنیوی زندگی کا مآل کہا گیا۔

إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللّٰهِ الْغَرُورُ (۳۵:۱)

آخرت کے متعلق اللہ کا وعدہ سچا ہے پس دنیا کی زندگی تم کو دھوکہ میں نہ ڈالے اور نہ کوئی فریبی تم کو خدا سے بے فکر کرے

وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ (۱۱:۱۰)

جن لوگوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا وہ ان دنیوی نعمتوں کے پیچھے پڑے رہے جو ان کو دی گئی تھیں اور وہ مجرم تھے

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيٰحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا (۱۸:۶)

ان کے سامنے دنیوی زندگی کی مثال پیش کر۔ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا اور وہ زمین کے برگ و بار کے ساتھ مل گیا پھر آخر کار یہ سب نباتات بھوسہ ہو کر رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے مال اور اولاد محض دنیوی زندگی کی زینت ہیں مگر تیرے رب کے نزدیک ثواب آیندہ کی توقع کے اعتبار سے باقی رہنے والی نیکیاں زیادہ بہتر ہیں۔

يٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَن ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ (۶۳:۲)

اے ایمان لانے والو! تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تم کو خدا کی یاد سے غافل نہ کر دیں جو لوگ ایسا کریں گے در اصل وہی ٹوٹے میں ہیں۔

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُم بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفٰى إِلَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا (۳۴:۵)

تمہارے اموال اور تمہاری اولاد وہ چیزیں نہیں ہیں جو تم کو ہم سے قریب کرنے والی ہوں ہم سے قریب صرف وہ ہے جو ایمان لایا اور جس نے نیک عمل کیا

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا۔ (۵۷ : ۳)

جان رکھو کہ دنیا کی زندگی ایک کھیل ایک تماشا ایک ظاہری شان ہے اور آپس میں تمہارا ایک دوسرے پر فخر کرنا، اور مال اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بارش ہوئی، اس کی روئیدگی نے نافرمانوں کو خوش کر دیا۔ پھر وہ پک گئی اور تو نے دیکھا کہ وہ زرد پڑ گئی، پھر آخر کار وہ بھوسہ ہو کر رہ گئی۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (۲۶ : ۷)

کیا تم ہر اونچی جگہ بے نتیجہ یادگاریں بناتے اور عمارتیں کھڑی کرتے ہو، شاید کہ تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔

اَتُتْرَكُوْنَ فِىْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ فِىْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ (۲۶ : ۸)۔

کیا تم ان چیزوں میں جو یہاں ہیں اطمینان سے چھوڑ دیے جاؤ گے؟ ان باغوں ان چشموں ان کھیتوں، ان نخلستانوں میں جن کے خوشے ٹوٹے پڑتے ہیں، تم پہاڑ کاٹ کاٹ کر گھر بنا رہے ہو اور خوش ہو۔

اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِىْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (۴ : ۱۱)

تم جہاں کہیں بھی ہوگے موت تم کو آئے گی، خواہ تم بڑے مضبوط برجوں ہی میں کیوں نہ ہو

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۲۹ : ۶)

ہر جی کو موت آنی ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف واپس لائے جاؤ گے۔

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ (۲۳: ۶)	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے نتیجہ پیدا کیا ہے۔ اور تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے

پہلے کہا گیا تھا کہ دنیا تمہارے لئے ہے، اور اسی لئے بنائی گئی ہے کہ تم اس کو خوب اچھی طرح برتو۔ اب معاملہ کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ مگر تم دنیا کے لئے نہیں ہو نہ اس لئے بنائے گئے ہو کہ یہ دنیا تمہیں برتے اور تم اسی میں اپنے آپ کو گم کردو۔ دنیا کی زندگی سے دہوکا کھا کر کبھی یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ ہمیں دائماً یہیں رہنا ہے۔ خوب یاد رکھو کہ یہ مال یہ دولت، یہ جائداد یہ عمارتیں یہ اولاد، یہ عزیز، یہ اقارب، یہ دولت، یہ شان و شوکت کے سامان، سب ناپائدار ہیں سب کچھ دیر کا بہلاوا ہیں، سب کا انجام موت ہے۔ اور تمہاری طرح یہ سب بھی خاک میں مل جانے والے ہیں۔ اس ناپائدار عالم میں سے اگر کوئی چیز باقی رہنے والی ہے تو وہ صرف نیکی ہے۔ دل اور روح کی نیکی عمل اور فعل کی نیکی۔

اعمال کی ذمہ داری اور جواب دہی

پھر کہا گیا:۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡهَا لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی (۲۰: ۱)	فیصلہ کی گھڑی جس کو ہم چھپانے کا ارادہ رکھتے ہیں آنے والی ہے تاکہ ہر نفس کو اسکی سعی کے مطابق بدلہ ملے
هَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (۲۷: ۷)	کیا تم کو تمہارے عملوں کے سوا کسی اور چیز کے لحاظ سے جزا دیجائے گی؟
وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاَنَّ سَعۡیَهٗ سَوۡفَ یُرٰی ثُمَّ یُجۡزٰٮهُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَهٰی (۵۳: ۳)۔	اور یہ کہ انسان کو اتنا ہی ملیگا جتنی اس کوشش نے کوشش کی ہے اور اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کو پورا پورا بدلہ ملے گا۔ اور یہ کہ آخرکار سب کو تیرے پروردگار کے پاس پہنچنا ہے۔

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ أَعْمٰى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمٰى وَأَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۷ : ۸)

جو اس دنیا میں اندھا تھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اور راہ راست سے بہت ہٹا ہوا

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ، إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲ : ۱۳)

تم اپنے لئے جو نیکیاں اس دنیا سے بھیجو گے انہیں اللہ کے ہاں پاؤ گے، تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲ : ۳۸)

اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کے پاس واپس کئے جاؤ گے پھر ہر نفس کو اس کے کئے کا بدلہ ملیگا اور ان پر ہرگز ظلم نہ کیا جائے گا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمِنْ سُوْءٍ (۳ : ۱۳)

وہ دن جبکہ ہر نفس اپنی کی ہوئی نیکی اور اپنی کی ہوئی بدی کو حاضر پائیگا۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِآيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (۷ : ۱۰)

اس دن وزن ہی حق ہوگا۔ جن کے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا وہی لوگ اپنے آپ کو نقصان پہونچانے والے ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹)

جو شخص ذرہ برابر نیک عمل کریگا اس کا نتیجہ دیکھ لیگا اور جو ذرہ برابر برا عمل کریگا اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیگا۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّيْ لَا أُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى (۳ : ۲۰)

اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور کہا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل ضائع نہیں کرونگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا (۶۳:۲)

ہمنے تم کو جو کچھ بخشا ہے وہ خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے اور وہ کہے کہ میرے رب! کاش تو مجھے تھوڑی مہلت اور دیتا تو میں تیرے پیغام کی تصدیق کرتا اور نیکو کاروں میں سے ہوتا مگر اللہ کسی نفس کی مدت مقررہ آن پہنچنے کے بعد پھر اس کو مہلت ہرگز نہیں دیتا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ..... فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۲:۲)

کاش تم وہ وقت دیکھتے جب مجرم اپنے رب کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور کہیں گے کہ پروردگارا ہم نے اب دیکھ لیا اور سن لیا اب تو ہمیں واپس کر دے ہم اچھے عمل کریں گے۔ اب ہم کو ایقان حاصل ہو گیا ہے ..... مگر کہا جائیگا کہ اب اس کوتاہی کا مزا چکھو کہ تم نے اس دن ہمارے پاس حاضر ہونیکو بھلا دیا تھا ہم نے بھی تم کو بھلا دیا اب ہمیشگی کے عذاب کا مزہ چکھو ان اعمال کے بدلہ میں جو تم کرتے تھے

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا دار العمل ہے سعی اور کوشش کی جگہ ہے اور آخرت کی زندگی دار الجزا ہے نیکی اور بدی کے پھل اور اعمال کے بدلے کا گھر ہے۔ انسان کو موت کی گھڑی تک دنیا میں عمل کرنے کی مہلت ملی ہوی ہے اس کے بعد اسے پھر عمل کی مہلت ہرگز نہ ملے گی لہذا اس عرصۂ حیات میں اس کو یہ سمجھکر سعی کرنی چاہئے کہ میرا ہر کام، میری ہر حرکت، میری ہر برائی اور بھلائی اپنا ایک اثر رکھتی ہے۔ ایک وزن رکھتی ہے، اور اس اثر اور وزن کے مطابق مجھے بعد کی زندگی میں اچھا

یا بُرا نتیجہ ملنے والا ہے۔ مجھے جو کچھ ملے گا وہ میری یہاں کی کوشش اور میرے یہاں کے عمل کا بدلہ ہوگا۔ نہ میری کوئی نیکی ضائع ہوگی اور نہ کوئی بدی سزا سے بچے گی۔

انفرادی ذمہ داری اس ذمہ داری کے احساس کو مزید تقویت دینے کے لئے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ہر شخص خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہے، نہ کوئی دوسرا اس کی ذمہ داری میں شریک ہے، اور نہ کوئی شخص کسی کو اس کے نتائج عمل سے بچا سکتا ہے:۔

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔ (۵:۱۴)	تم پر تمہارے اپنے نفس کی ذمہ داری ہے، اگر تم ہدایت پاؤ تو دوسرا گمراہ ہونے والا تم کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔
وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶:۲۰)	ہر نفس جو کچھ کماتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔
لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۶۰:۱)	قیامت کے دن تمہارے رشتے اور تمہاری اولاد ہرگز کام نہ آئے گی تمہارے درمیان اللہ فیصلہ کریگا۔ اور اس کی نظر تمہارے عملوں پر ہے
اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷:۱)	اگر تم نیک کام کروگے تو اپنے نفس کے لئے کروگے اور اگر بُرے کام کروگے تو اسی کے لئے۔
وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (۳۵:۳)	کوئی شخص کسی دوسرے کا بارگناہ اپنے سر نہ لیگا اور اگر کسی پر گناہوں کا بڑا بار ہو۔ اور وہ اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے کسی کو بلائے تو وہ اس کے بوجھ کا کوئی حصہ اپنے اوپر نہ لیگا خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا (۲۱ : ۴)	اے لوگو اپنے رب سے ڈرو اور اس دن کا خوف کرو۔ جب کہ نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا
مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ (۳ : ۵)	جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال اس کے سر ہے اور جس نے نیک عمل کیا تو ایسے لوگ خود اپنی بہتری کے لئے راستہ صاف کر رہے ہیں۔

یہاں ہر انسان پر فرداً فرداً اس کے تمام اچھے اور برے اعمال کی کامل ذمہ داری کا بوجھ ڈالدیا گیا ہے نہ یہ امید باقی رہنے دی گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کریگا نہ اس توقع کے لئے کوئی گنجایش چھوڑی گئی ہے کہ کسی کے تعلق اور کسی کے واسطہ سے ہم اپنے جرائم کی پاداش سے بچ جائینگے۔ اور نہ اس خطرہ کا کوئی موقع باقی رکھا گیا ہے کہ کسی کا جرم ہمارے حسن عمل پر اثر انداز ہوگا یا خدا کے سوا کسی کی خوشی کو ہمارے اعمال کی مقبولیت و نامقبولیت میں کوئی دخل ہے۔ جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے والے کو جلنے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی اور شہد کھانے والے کو شیرینی کے احساس سے کوئی شئے نہیں روک سکتی نہ جلنے کی مضرت میں کوئی دوسرا شخص اس کا شریک وسہیم ہو سکتا ہے، اور نہ شیرینی کی لذت سے کوئی دوسرا اس کو محروم کر سکتا ہے اسی طرح بدکاری کے نتیجہ بد اور نیکوکاری کے انجام نیک میں بھی ہر شخص جائے خود منفرد ہے۔ لہذا دنیا کو برتنے میں ہر شخص کو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے۔ اور دنیا و ما فیہا سے قطع نظر کر کے یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہئے کہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار میں خود ہوں، برائی کا وبال بھی تنہا میرے اوپر ہے، اور بھلائی کا فائدہ بھی اکیلا میں اٹھانے والا ہوں۔

باقی

باغ جنت

(از مولانا عبداللہ العمادی)

(۱)

اِنَّ اللہ اشتری مِنَ المؤمنین اَنفُسَهُم و اموالهم بانّ لهم الجنّة یہ جنت تو وہ ہے جو مومنین کو بعد موت نصیب ہوگی اس پر ہم سب کا ایمان ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور جنت بھی ہے جس کا اسی دنیا سے تعلق ہے۔

سورۂ بقر کے دوسرے رکوع آیت نمبر ۱۲ میں نیک کردار ایماندار وں کو بشارت دیگئی ہے کہ ان کے لئے باغ ہوں گے۔ جاری نہریں ہونگی۔ پاکیزہ بیویاں ہوں گی جب کوئی میوہ ملیگا تو عام رواج کے مطابق اس کو نیا دیکھکر طبیعت رک نہ جائے گی کہ نہ معلوم کیسا ہو کیسا نہ ہو۔ جتنے میوے ہوں گے صورت میں سب یکساں ہوں گے اور مزے میں ہر ایک کے ذائقے جدا جدا نکلیں گے کہ یکسان ہونے سے طبیعت مانوس رہے گی اور ذائقہ میں تفاوت سے سب میں نیا مزہ آئے گا۔ یہ حالت پائدار ہوگی اور یہ نیک بندے اسی حالت میں ہمیشہ رہیں گے۔ مفسرین نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔

الف۔ باغ سے مراد باغ بہشت ہے[۱]

ب۔ بہشت کے جتنے درخت ہوں گے جڑ سے شاخ تک برابر و با ترتیب یکساں ہوں گے۔[۲]

---

[۱] روی ابن جریر قال حدثنا کریب عن الاشجعی عن سفیان عن عمرو بن مُرّة عن مسروق قال نخل الجنة نضید من اصلها الی فرعها وثمرها امثال القلال کلما نزعت ثمرةٌ عادت مکانها اخری ...ها وماءها یجری فی غیر اخدود

[۲] عن مجاهد قال حدثنا یزید قال اخبرنا مسعر بن کدام عن عمرو بن مرة عن ابی عبیدة بنحوه

ج - درختوں کے میوے مٹکے برابر ہوں گے۔[۱]

د - جہاں کوئی میوہ توڑا گیا کہ فوراً دوسرا میوہ وہاں لگ جائیگا۔[۲]

ھ - باغ بہشت میں بغیر نالیوں کے پانی رواں رہیگا۔[۳]

و - باغ بہشت کے خوشے بارہ بارہ گز کے ہوں گے۔[۴]

ز - درخت ایسے ہوں گے کہ ان کے سایہ میں مسافر سو برس تک چلا جائے اور پھر بھی سایہ طے نہ ہو۔[۵]

ح - باغ بہشت میں جب کوئی میوہ لے کر کھانا چاہے گا تو وہ میوہ اس کے منہ تک نہ پہونچنے پائیگا کہ خدا ویسا ہی دوسرا میوہ بجائے اس کے لادیگا۔[۶]

ان کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سن لینے کی بات ہے:-

لا یشبہ شی مما فی الجنۃ ما فی الدنیا الا الاسماء[۷] — بہشت کی چیزوں میں کوئی چیز دنیا کی چیزوں سے اگر مشابہ ہوگی تو بہ اعتبار نام کے ہوگی

دوسری روایت میں ہے:-

لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء[۸] — بہشت کی چیزوں میں سے دنیا میں کچھ نہیں ہے اگر ہے تو نام ہی نام ہے

ایک اور حدیث میں ہے۔

لیس فی الدنیا من الجنۃ شی الا الاسماء — نام کے سوا دنیا میں بہشت کی اور کوئی چیز نہیں ہے[۹]

---

[۱] عن محمد بن بشار قال حدثنا ابن مہدی قال حدثنا سفیان قال سمعت عمرو بن مرۃ یحدث عن ابی عبیدۃ فذکر مثلہ۔

[۲] عن مسروق وابی عبیدہ۔ [۳] عن مسروق وابی عبیدۃ۔

[۴] اورد النیسابوری والخطیب الشربینی وغیرہما حدیثاً فی صفۃ ثمار الجنۃ وعناقیدہا فقالا العنقود اثنا عشر ذراعاً

[۵] قال النیسابوری یروی ان الشجرۃ یسیر الراکب فی ظلہا مائۃ عام لا یقطعہ

[۶] زعم الخطیب الشربینی فی تفسیرہ المسمی بالسراج المنیر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال والذی نفس محمد بیدہ ان الرجل من اہل الجنۃ یتناول الثمرۃ لیاکلہا فما ہی واصلۃ الی فیہ یبدل اللہ مکانہا مثلہا۔

[۷] ابن جریر عن محمد بن بشار قال حدثنا مومل قال جمیعاً حدثنا سفیان عن الاعمش عن ابن عباس الخ

[۸] ابن بشار فی حدیثہ عن مومل [۹] ابن جریر عن عباس بن محمد قال حدثنا محمد بن عبید عن الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس الخ۔

بہر حال اصل آیت یوں ہے :-

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ؕ کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْھَا مِنْ ثَمَرَۃٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِھًا ؕ وَلَھُمْ فِیْھَآ اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ وَّھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ۔ سورہ بقرہ آیت ۲۰ رکوع ۳

اے پیغمبر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کئے ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لئے (بہشت کے) باغ ہیں جن کے تلے نہریں (پڑی) بہ رہی ہوں گی جب ان کو ان میں کا کوئی میوہ کھانے کو دیا جائیگا تو کہیں گے یہ تو ہم کو پہلے بھی (کھانے کے لئے) مل چکا ہے اور (یہ اس لئے کہیں گے کہ) انکو ایک ہی صورت و شکل کے میوے ملا کریں گے اور وہاں انکے لئے بیویاں ہوں گی پاک و صاف اور وہ ان باغوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے [1]

اس آیت میں کئی باتیں قابل تنقیح (۲) ہیں۔

الف - جنت (باغ) سے کیا مراد ہے ؟

ب - ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے نصیب ہو چکا ہے) سے کیا مراد ہے ؟

ج - اُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِھًا (میوہ ان کو یکساں دیا جائیگا) سے کیا مراد ہے ؟

د - ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ (وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے) سے کیا مراد ہے ؟

الف - تمام مفسرین نے جنت سے بہشت مراد لی ہے حتیٰ کہ سید احمد خان نے بھی اسی کو

---

۱ یہ ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم سے ماخوذ ہے مولوی صاحب نے جنت کا ترجمہ باغ کیا ہے مگر اس کے ساتھ بہشت کا لفظ بھی اضافہ کر دیا ہے آیت میں میوہ کھانے کا کچھ تذکرہ نہیں ہے اور اس کے لئے کوئی لفظ وارد نہیں ہے لیکن مطلب سمجھانے کے لئے خیال مصنوعی اس کو بڑھا دیا ہے۔ خلدون کا ترجمہ محض لطف کلام کے لئے "ہمیشہ ہمیشہ" کیا ہے حالانکہ یہ ترجمہ اگر ہو سکتا ہے تو خٰلِدُوْنَ اَبَدًا کا ہو سکتا ہے

صحیح مان کر آیت کے مفہوم کو واقعات بعد الموت سے وابستہ کیا ہے یعنے نیک کردار ایمان والوں کو یہ نعمتیں جیتے جی نہ ملیں گی مرنے کے بعد ملیں گی خاتمۂ آیت (هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ) سے یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا کیونکہ بظاہر خلود کے معنی ہمیشگی کے ہیں۔ اور دنیا کی زندگی میں کوئی ایسی نعمت موجود نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے جس کے لئے ہمیشگی و بقائے دوام ممکن ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا کے فضل سے جن کو بہشت ملیگی وہ ہمیشہ پر لطف زندگی بسر کریں گے اور جو نعمتیں انہیں ملیں گی وہ سب دوامی ہوں گی البتہ سید صاحب نے اتنی بات بڑھائی ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتوں کی حقیقت و ماہیت کچھ اور ہے۔ ان کی رائے بہشت اور اس کی نعمتوں کے بیان کرنے سے "صرف اعلیٰ درجہ کی راحت کا بقدر فہم انسانی خیال پیدا کرنا مقصود تھا۔ نہ واقعی ان دونوں چیزوں کا دوزخ و بہشت میں موجود ہونا[۱]" اس لئے کہ "یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا کی ہوئی ہے اس میں سنگ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں۔ باغ میں سرسبز شاداب درخت ہیں۔ دودھ اور شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے ساقی اور ساقنیں نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں شراب پلا رہی ہیں۔ ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہات ڈالے پڑا ہے۔ ایک نے ران پر سر دھرا ہے۔ ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے ایک نے لب جان بخش کا بوسہ لیا ہے۔ کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں۔ کچھ ایسا بیہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہو تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں[۲]"

ب۔ هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ کی تاویل میں سب نے یہی لکھا ہے کہ جب کسی کو نیا پھل کھانے کو دیا جائے جو اس نے کبھی نہ دیکھا ہو تو اس کے کھانے سے رکتا ہے کہ نہیں

[۱] تفسیر القرآن (طبع لاہور) جلد ۱ صفحہ ۴۳ [۲] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۴۳۔

معلوم کیا ہے۔ جنتیوں کو جو ایک ہی صورت کے پھل ملیں گے تو وہ ان کے کھانے میں تامل نہیں
کرسکتے۔ جانتے ہیں کہ ایسا تو ہم پہلے بھی کھا چکے ہیں۔ ہاں شاید صورت کے دھوکہ میں آکر چند ل
لالچ بھی نہ آئے۔ کہ حلوا چو ایکبار خوردند بس۔ تو چکھنے کے بعد دوسرا ذائقہ ملے گا۔ اور ان
کے دل زیادہ خوش ہوں گے کہ خلاف توقع مزہ ملا۔ یہ تو جسمانیت اور مادیت کی باتیں
ہوئیں لیکن امام رازی کی رائے میں ان تمام باتوں کا تعلق روحانیت سے ہے جسمانیت کو
اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

فی الآیة قول ثالث علی لسان
اهل المعرفة وهو ان کمال السعادة
لیس الا فی معرفة ذات الله تعالی و
معرفة صفاته ومعرفة افعاله من
الملائکة الکروبیة والملائکة الروحانیة
وطبقات الارواح وعالم السموات و
بالجملة یجب ان یصیر روح الانسان کالمرآة
المحاذیة العالم القدس ثم ان هذه
المعارف تحصل فی الدنیا ولا یحصل
بها کمال الالتذاذ والابتهاج لما
ان العلائق البدنیة تعوق عن ظهور
تلك السعادة فاذا زال هذا العائق
حصلت السعادة العظیمة والغبطة

آیت میں اہل معرفت کی زبان سے ایک تیسری
بات بھی مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ کمال نعمت اور سعادت
صرف خدا کی ذات وصفات وافعال کے پہچاننے
میں ہے کہ کروبیان عالم بالا و فرشتگان روحانی
وطبقات ارواح وعالم سموات کے متعلق انسان
کو شناسائی حاصل ہو۔ اور لازم ہے کہ اس کی روح
ایک ایسے آئینہ کے مماثل ہو جائے۔ جو عالم قدس
کے ٹھیک سامنے ہو۔ یہ معرفت دنیا میں بھی حاصل
ہوتی ہے لیکن اس میں پوری لذت اور کافی خوشی
نہیں ہوتی اس لئے کہ جسمانی تعلقات اس لذت
وسعادت کے ظاہر ہونے میں سنگ راہ بن جاتے ہیں
اور اگر یہ روک اٹھ جائے تو اصلی وحقیقی لطف
حاصل ہو۔ ماحصل یہ ہے کہ جو روحانی نعمتیں اور لذتیں

الکبری۔ فالحاصل ان کل سعادة روحانية يجدها الانسان بعد الموت فانه يقول هذه هي التي كانت حاصلة في الدنيا الا انها في الدنيا ما افادت اللذة والبهجة والسرور وفي الآخرة افادت هذه الاشياء فزال العائق[1]

انسان کو مرنے کے بعد حاصل ہوگی تو وہ کہیگا کہ یہ وہی نعمتیں ہیں جو دنیا میں بھی حاصل تھیں مگر دنیا میں یہ بات نہ تھی کہ ان کی وجہ سے مزہ و دلچسپی و خوشی ہوتی ہو۔ آخرت میں یہ سب باتیں حاصل ہوگئیں اس لئے کہ جو روک تھی وہ مٹ گئی[1]

ج۔ واتوا بہ مُتَشَابِهًا کے معنی تو یہی لئے گئے ہیں۔ کہ اہل جنت کو جو میوے ملیں گے وہ سب کے سب شکل و صورت میں یکساں ہوں گے اور دنیا کے میووں سے انکی شکلیں ملتی جلتی ہوں گی لیکن حسن بن الحسن البصری و قتادہ و ابن جریج سے متعدد حدیثیں اس مفہوم کی بھی روایت کیگئی ہیں کہ بہشت کے میووں کا ہر ایک حصہ اور ہر ایک جزو دوسرے جز کے تشابہ (ملتا جلتا) ہوگا۔ یعنے جنت کے میوے چھلکے سے لیکر مغز تک بے داغ و بے عیب ہوں گے دنیاوی میوں کی سی کیفیت نہو گی کہ میوے کا کچھ حصہ تو اچھا ہوتا ہے اور کچھ ناقص رہتا ہے[2] قاضی بیضاوی نے اس جسمانی کیفیت کو بھی روحانیت پر محمول کیا ہے لکھتے ہیں۔

ان للآية الكريمة محملا آخر وهو ان مستلذات اهل الجنة في مقابلة ما رزقوا في الدنيا من المعارف والطاعات متفاوتة في اللذة بحسب تفاوتها فيحتمل ان يكون المراد من هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا انه ثوابه ومن تشابهما تماثلهما في الشرف

آیت کریمہ کا ایک اور مطلب بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ معرفت و عبادت کے ضمن میں جو مزے دنیا میں حاصل تھے ان کے مقابلہ میں بہشت کے مزوں اور لذتوں میں فرق ہوگا ہو سکتا ہے کہ آیت "یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے نصیب ہو چکا ہے" سے مراد دنیاوی عبادت و معرفت کا ثواب ہو (یعنی ہم

[1] تفسیر کبیر (طبع خیریہ مصر [illegible]) جلد ۱ صفحہ ۲۳۲۔ [2] تفسیر ابن جریر (طبع میمنیہ مصر) جلد ۱ صفحہ ۱۳۲ و ۱۳۳

والمزیۃ وعلو الطبقۃ فیکون ھٰذا فی الوعد نظیر قولہٗ ذوقوا ماکنتم تعملون۔ فی الوعید [1]

لذت دنیا میں خدا کی عبادت و معرفت میں چکھی تھی بہشت کی لذت اس سے بڑھ کر ہوگی اور ان کو میوہ یکساں دیا جائیگا۔ میں یکساں ہوتے بزرگی و برتری و علو مدارج میں یکساں ہونا مقصود ہو۔ اس صورت میں یہ وعدہ اس وعید کی نظیر ہوگا جس میں دھمکی دی گئی ہے کہ اب اپنے کئے کو چکھو [1]

اور خطیب شربینی بھی اس قول میں قاضی بیضاوی کے ہم زبان ہیں۔ [2]

د۔ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ کا مطلب بالاتفاق یہی بیان کیا گیا ہے کہ اہل بہشت ہمیشہ انہیں نعمتوں میں بسر ہوگی اور اس حالت میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہونے پائے گا۔

(۳)

اس باب میں تحقیقات کا دائرہ صرف پہلی اور آخری تنقیح تک وسیع ہے جس کے ضمن میں آیت کا مفہوم و مدعا بھی واضح ہو جائے گا۔ پہلی تنقیح کا انحصار لفظ جنت کی تشریح پر ہے۔ اور دوسری تنقیح پہ دوسری فرصت میں بحث ہوگی۔

لغت میں جنت کے معنے اس باغ کے ہیں جس کے درخت گھنے ہوں شاخ در شاخ و پیچ در پیچ ہوں اور آپس میں لپٹے نظر آئیں۔ اصطلاح میں جنت کو صرف باغ آخرت سے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے اور اصل میں حقیقی جنت وہی ہے بھی لیکن کلام اللہ نے آخرت کے باغوں کو بھی جنت کہا ہے اور دنیا کے باغوں کے لئے بھی جنت ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔

[1] تفسیر البیضاوی (علی ہامش الخطیب الشربینی) جلد ۱ صفحہ ۹۲ - [2] تفسیر الخطیب الشربینی جلد ۱ صفحہ ۳۱ -

وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ
غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ
مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ
مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ
ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ
حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ
الْمُسْرِفِیْنَ ۔ (سورۃ الانعام ۔ رکوع ، آیت (۱۴۲)

اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے باغ پیدا کئے
(بعض تو ٹٹیوں پر) چڑھائے ہوئے (جیسے انگور کی بیلیں) اور
بعض نہیں چڑھائے ہوئے اور کھجور کے درخت اور
کھیتی جن کے پھل مختلف (قسموں کے) ہوتے ہیں اور
زیتون و انار (کہ بعض تو صورت و شکل و مزہ میں)
ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض نہیں بھی
ملتے جلتے (لوگو!) یہ سب چیزیں جب پھلیں تو انکے پھل (بے
تامل) کھاؤ اور (ان نعمتوں کے شکریہ میں) ان کے کاٹنے (اور توڑنے) کے دن حق اللہ (یعنی زکوٰۃ
ان میں سے) دیا کرو ۔ اور فضول خرچی نہ کرو کیونکہ فضول خرچی کرنے والوں کو خدا پسند نہیں کرتا

ایک اور مقام پر ہے:۔

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا
مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ
وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ
وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ
مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا
اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ
لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (سورۃ ۶ ۔ آیت ۹۹
(رکوع ۱۲)

اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے پانی اتارا پھر (اسکے بعد
ہم (ہی) نے اس سے ہر قسم (کی روئیدگی) کے کوئے
نکالے پھر کوئوں سے ہم نے ہری بھری ٹہنیاں نکال
کھڑی کیں کہ ان سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور
کھجور کے گابھے میں گچھے جو (مارے بوجھ کے) جھکے پڑتے ہیں
اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار (ظاہر میں ایک
دوسرے سے) ملتے جلتے اور (مزے کے اعتبار) سے
ملتے جلتے نہیں (لوگو!) ان میں سے ہر ایک چیز جب پھلتی
ہے تو اس کا پھل اور پھل کا پکنا (قابل) دید ہے ۔ اور

اور اس کو نظر غور سے دیکھو بیشک جو لوگ (خدا پر) ایمان رکھتے ہیں ان کے لئے ان سب چیزوں میں (قدرت خدا کی بہتیری) نشانیاں (موجود) ہیں۔

سورہ یٰسٓ میں ہے۔

وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ اَحْیَیْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ یَاْكُلُوْنَ وَجَعَلْنَا فِیْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا مِنَ الْعُیُوْنِ لِیَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَیْدِیْهِمْ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ۔ (سورۂ ۳۶ ـ رکوع ۳ آیت ۲۵ و ۲۶)

اور ان لوگوں کے (سمجھنے کے) لئے ہماری (قدرت کی) ایک نشانی مری ہوئی (یعنی پڑتی پڑی ہوئی) زمین ہے کہ ہم نے اس کو (پانی برسا کر) جلا اٹھایا اور اس سے اناج نکالا اسی میں سے یہ (لوگ بھی اپنی قسمت کا) کھاتے ہیں۔ اور زمین میں ہم نے کھجوروں کے اور انگوروں کے باغ لگائے اور ان میں (پانی کے) چشمے بہائے تاکہ باغ کے پھلوں میں سے یہ (لوگ اپنی قسمت کا) کھائیں اور (معلوم ہے کہ) یہ (پھل) ان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے نہیں۔ تو کیا یہ (لوگ اس نعمت کا) شکر نہیں کرتے

سورہ قٓ میں ہے:۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِیْدِ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۔ وَاَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۔ (سورۂ ۵۰ رکوع آیت (۶)

اور ہم نے آسمان سے برکت کا پانی اتارا (اپنے بندوں) کو روزی دینے کے لئے اس (پانی) کے ذریعہ سے باغ اگائے اور کھیتی کا اناج اور لانبی لانبی کھجوریں جن کی گیلیں خوب گتھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور (نیز) ہم نے مینہ کے ذریعہ سے مری ہوئی (یعنی پڑتی پڑی ہوئی) بستی کو جلا اٹھایا۔ اسی طرح (لوگوں کو) نکلنا ہوگا

سورۂ نوح میں ہے۔

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۔ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا

گناہوں کی اپنے پروردگار سے معافی مانگو کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے تم پر موسلادھار مینہ برسائیگا اور مال اور اولاد سے تمہاری مدد کریگا اور تمہارے لئے نہریں بنائے گا۔

(سورہ۔۱، رکوع اول۔ آیت ۵)

سورہ مؤمنون میں ہے:۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ۔ (سورہ ۲۳۔ رکوع اول آیت ۱۹)

ہمیں نے ایک انداز کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا پھر اُس کو زمین میں (جمع کرکے) ٹھہرائے رکھا اور ہم اس (پانی) کے (اڑا) لے جانے پر (بھی) قادر ہیں پھر اس (پانی) کے ذریعہ سے ہم نے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ بنا کھڑے کئے تمہارے لئے ان میں بہت سے میوے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے (بعض کو) تم کھاتے (بھی) ہو۔

سورہ شعرا میں ہے:۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ (سورہ ۲۶ رکوع ۴ آیۃ ۱۴)

غرض ہم نے فرعون اور (اس کی قوم کو) باغوں سے اور چشموں (سے) اور خزانوں (سے) اور عزت کی جگہ (سے) نکال باہر کیا۔

سورہ دخان میں ہے:۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا

یہ لوگ کتنے ہی باغ اور (کتنی ہی) نہریں اور (کتنی ہی) کھیتیاں (۱) اور (کتنے ہی) عمدہ عمدہ مکانات اور (کتنے ہی)

فِيهَا فَاكِهِينَ - كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ - فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ - (سورۂ ۴۴۔ رکوع اول آیت ۱۳ و ۱۴ -

آرام و آسائش کے سامان چھوڑ مرے جن میں مزے اڑایا کرتے تھے (واقع میں) ایسا ہی ہوا اور ہم نے دوسرے لوگوں کو اس (تمام ساز و سامان) کا وارث بنا دیا تو ان لوگوں پر آسمان و زمین (کسی) کو (بھی تو) رقت نہ آئی اور نہ ان کو توبہ و ندامت (ہی) کی مہلت ملی۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے :-

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (سورہ ۱۷ رکوع ۱۰ آیت ۹۳

اور انہوں نے کہا کہ ہم تو اس وقت تک تم پر ایمان لانے والے نہیں کہ (یا تو ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ (بہا) نکالو یا کھجوروں اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اور اس کے بیچ بیچ میں تم (بہت سی نہریں) جاری کر دکھاؤ۔

سورۂ فرقان میں ہے :-

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا - اَوْ يُلْقٰى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا - (سورہ ۲۵ - رکوع اول آیت ۸)

اور انہوں نے (یعنی کافروں نے) کہا کہ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا اور بازاروں میں پھرتا ہے۔ اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ اس کے ساتھ ہو کر (دنیا کو) عذاب خدا سے) ڈراتا۔ یا اس پر کوئی خزانہ (ہی) نازل ہوتا۔ (یا زیادہ نہیں تو) اس کے پاس ایک باغ (ہی) ہوتا کہ اس سے کھاتا (پیتا) اور یہ ظالم (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم بس ایسے آدمی کے پیچھے ہو لئے جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

سورہ کہف میں ہے:۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ ×× كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا ××× وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ××× وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ××× فَعَسَىٰ رَبِّي أَن يُؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّن جَنَّتِكَ ××××××× (سورہ ۱۸ رکوع ۵ آیت ۲۵ و ۲۶ و ۲۷ و ۳۰)

اور ان لوگوں سے ان دو شخصوں کی مثال بیان کرو جن میں سے ایک کو ہم نے دو باغ دے رکھے تھے ×××××× دونوں باغ اپنے اپنے پھل لائے ×× ×××× وہ باغ میں ایسی حالت میں داخل ہوا کہ اپنے نفس پر آپ ہی ظلم کر رہا تھا ×××××× اور جب تو اپنے باغ میں آیا تو تو نے (یوں) کیوں نہ کہا کہ یہ (سب) تو خدا کے چاہنے سے ہوا ہے اور مجھ میں تو بے مدد خدا کچھ بھی طاقت نہیں ×××× تو عجب نہیں میرا پروردگار تیرے باغ سے (بھی) اچھا باغ مجھکو عطا فرمائے۔

سورۂ سبا میں ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ ×××× وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ۔ (سورہ ۳۴۔ رکوع ۲۔ آیت ۱۳ و ۱۴)

قوم سبا کے لئے ان کے اپنے ہی گھروں میں قدرت خدا کی البتہ ایک بڑی نشانی (موجود تھی۔ (کہ) انکے داہنے ہات اور بائیں ہات دو دو باغ تھے ×××× اور ہمنے ان کے دو باغوں کے بدلے میں دو باغ (اور) دئے مگر ایسے کہ ان کے پھل بدمزہ تھے اور ان میں کچھ جھاؤ تھا اور قدر قلیل بیری۔

باغ بہشت کے حق ہونے میں کلام نہیں جس کا وعدہ موت کے بعد ہے یہاں کہنے کی بات صرف اتنی ہی ہے کہ ان آیتوں میں جنت سے مراد باغ دنیا ہے۔ اور اگر

اسی ضمن میں وہ آیتیں بھی شامل کرلی جائیں جن میں حضرت آدم وحوا (علیہما السلام) کے جنت میں داخل ہونے اور نکلنے کا تذکرہ ہے تو نظیروں کا شمار نہایت وسیع ہوجاتا ہے اس لئے کہ بعض نامور محققین نے حضرت آدم کی جنت کو بھی باغ دنیا قرار دیا ہے۔ اس معنے کے تسلیم کرنے پر خدا کے مطیع بندوں (مسلمانوں) کو آیت مذکورۂ بالا میں جس جنت کی بشارت دی گئی ہے وہ ایماندار و نیک کردار ہونے کی شرط پر دنیا میں بھی انھیں مل سکتی ہے اور اگر چاہیں تو سچے مسلمان بن کر اسی دنیا میں اپنے آپ کو بہشت کا مستحق بنا سکتے ہیں جس کے بعد بشرط ایمان و عمل صالح اُس بہشت موعود (جنت آخرت) کے ملنے میں کیا کلام ہے ؎

من کہ در کعبۂ حق منزل و ماویٰ دارم　　گر دہد جائے بفردوس بریں چہ شود

لیکن جہاں "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" کی دشواریاں درپیش ہوں وہاں کیا یہ ممکن ہے کہ ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ۔ (اے ایمان والو اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ) کا خطاب دائرۂ عمل میں آجائیگا اور مسلمان بھی کسی دن مسلمان بن جائیں گے ؎

خواہم از زلف بتاں نافہ کشائی کردن　　فکر دوراست ہمانا کہ خطائی کنیم (باقی)

دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور لکھئے

القاء۔ الہام۔ وحی

از

جناب ذوقی شاہ صاحب

ہر وہ چیز جو بطریق استدلال حاصل نہ کیگئی ہو بلکہ قلب سالک پر حق تعالیٰ کی جانب سے یقین کامل کے ساتھ وارد ہوئی ہو القاء ہے یا الہام ہے یا وحی ہے۔

ابتداءً سالک کے قلب پر خطرات رحمانی وارد ہوتے ہیں۔ انتہا میں جاکر حق تعالیٰ سے مکالمت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ابتدائی حالت کو القاء اور انتہائی حالت کو الہام اور وحی کہتے ہیں۔ وحی چونکہ القاء و الہام کی انتہائی اور کامل ترین صورت کا نام ہے اس لئے اس لفظ کا استعمال کبھی کبھی القاء و الہام کے معنوں میں بھی ہوتا ہے بلکہ دل میں وسوسہ ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال کر دیا جاتا ہے۔ وسوسہ ڈالنے والا خواہ کوئی بھی ہو۔ مثلاً حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ۔ (۶ : ۱۱۴)	اور اسی طرح ہمنے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیاطین پیدا کئے کچھ آدمی اور کچھ جن جنمیں سے بعض بعض کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔

لیکن اس مضمون میں وساوس شیطانی سے بحث نہیں بلکہ اس القاء و الہام اور ان خطرات رحمانی سے بحث ہے جو حق تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں پر وارد ہوتے ہیں۔ اولیاء اللہ کو الہام ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہوتی ہے یا الہام

حق تعالیٰ کی جانب سے بندہ پر بلا کسی فرشتہ کی وساطت کے اس جہت سے فائز ہوتا ہے جو حق تعالیٰ کو ہر موجود سے کے ساتھ ہے وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا (اور ہر ایک کے لئے ایک جہت ہے کہ وہ منہ پھیرتا ہے اس کی طرف (۲: ۱۴۸) سے اسی جہت کی جانب اشارہ فرمایا گیا ہے وحی فرشتہ کے واسطے سے ہوتی ہے۔ اسی بنار پر حدیث قدسی کو وحی و قرآن نہیں کہتے۔ وحی کشف شہودی و معنوی دونوں ہے۔ الہام صرف کشف معنوی ہے۔ وحی مخصوص بہ نبوت ہے ظاہر ہے متعلق ہے اور تبلیغ کے ساتھ مشروط ہے۔ الہام ولایت کے ساتھ مخصوص ہے اور تبلیغ کے ساتھ مشروط نہیں

یہ اجمال کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے جو حسب ذیل ہے:۔

حق تعالیٰ کا تعلق کائنات کیساتھ اس نوع کا نہیں جس نوع کا تعلق کہ ایک گھڑی ساز یا گھڑی رکھنے والے کا گھڑی کے ساتھ ہوتا ہے۔ گھڑی ساز گھڑی کے کل پرزوں کو بناتا ہے درست کرتا ہے اور انہیں ترتیب دیکر گھڑی کو چلا دیتا ہے یا گھڑی رکھنے والا رات دن میں ایک بار گھڑی کو کوک دیتا ہے اور چوبیس گھنٹے کے لئے اس سے فراغت پالیتا ہے۔ گھڑی خود بخود چلتی رہتی ہے اور دوسرے دن تک اپنی رفتار قائم رکھنے کے لئے اپنے مالک کے چابی دینے یا گھڑی ساز کی نگرانی کی محتاج نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ کو کائنات کے ساتھ اس قسم کا تعلق نہیں بلکہ کائنات اپنے ابداع اور اپنی تخلیق کے بعد بھی اپنے قیام کے لئے ہر لمحہ اور ہر ساعت حق تعالیٰ کی توجہ کی محتاج رہتی ہے ایک لمحہ کے لئے نظر حق اس کی جانب سے ہٹ جائے تو ساری کائنات نیست و نابود ہو جائے۔ حق تعالیٰ ہر وقت کائنات کی جانب متوجہ رہتا ہے۔ اس متوجہ رہنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی ذات و صفات سے کائنات پر متوجہ رہتا ہے صفات میں ایک بہت بڑی صفت صفت کلام بھی ہے جس سے حق تعالیٰ اپنی مخلوق کی جانب ہر وقت متوجہ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت کسی وقت بھی معطل نہیں رہتی۔ وہ اپنی مخلوق کے ہر فرد سے اس فرد کی استعداد کے مطابق ہمکلام ہوتا رہتا ہے

کسی کو براہ راست ہمکلامی کا شرف عطا فرماتا ہے جیسے کَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا یعنے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے خوب گفتگو کی۔ کسی سے وحی کے ذریعہ کلام فرماتا ہے۔ کسی سے ہمکلامی کی یہ شان ظاہر فرماتا ہے کہ فرشتے کے ذریعہ اس کے دل میں جو چاہتا ہے القار فرماتا ہے۔ جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں القار فرمایا تھا۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں القار فرمایا تھا۔ کسی سے مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ یعنے پردہ کے پیچھے سے کلام فرماتا ہے کسی کے دل میں براہ راست یعنے بلاواسطت فرشتہ جو چاہتا ہے القار فرماتا ہے جیسے شہد کی مکھی کو القار ہوتا ہے اور اس القار کو بھی وحی سے تعبیر فرمایا جاتا ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (اور وحی فرمائی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف) کسی سے بذریعہ خواب و رویائے صالحہ باتیں ہوتی ہیں غرض کہ ہمکلامی کی جتنی شانیں اور جتنے ذرایع ہیں خواہ وہ القار کے نام سے موسوم ہوں خواہ الہام کے نام سے خواہ کسی اور نام سے وہ سب حقیقت وحی ہی کی مختلف اقسام یا مختلف فروع ہیں۔ صرف قوت اور کمزوری یا کشف و حجاب کے اختلافات سے مختلف اسمارسے وہ مختلف فروع موسوم ہیں۔ اور سب سے زیادہ واضح طریقہ ہمکلامی کا وحی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے تو اس وحی اصطلاحی کی صحیح تعریف حسب ذیل ہوگی۔

"وحی کلام الٰہی ہے جو عالم غیب سے عالم شہادت کی جانب بذریعہ ایک مقرب فرشتہ کے جنھیں جبرئیل (علیہ السلام) کہتے ہیں رسولوں کے پاس پہونچایا جاتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا	اور نہیں طاقت کسی بشر میں یہ کہ کلام کرے (بالشافہ)
وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ	اس سے اللہ مگر بذریعہ وحی کے یا پردہ کے پیچھے سے
فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ	یا کسی (فرشتہ) کو پیغامبر بنا کر بھیجے پس وہ اس کے حکم

عَلِیٌّ حَکِیْمٌ ○ وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ط مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○

الشوریٰ رکوع ۵

سے وہ چاہتا ہے جی میں ڈالدیوے تحقیق وہ بلند مرتبہ حکمت والا ہے اور اسی طرح وحی کی ہم نے طرف آپکے (اے محمدؐ) روح کو ساتھ حکم اپنے کے نہ جانتے تھے آپ کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان ولیکن کیا ہے ہم نے اس کو نور۔ ہدایت کرتے ہیں ہم ساتھ اس کے جس کو چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے۔ اور تحقیق آپ البتہ ہدایت کرتے ہیں۔ طرف سیدھی راہ کے۔

بلحاظ ضعف و قوت اور بلحاظ زیادہ واضح اور کم واضح ہونے کے وحی کے تین مراتب ہیں۔

پہلا مرتبہ سب سے زیادہ قوی اور اکمل ہے اس مرتبہ میں علوم غیب اللہ کی طرف سے رسول کی عقل پر ظاہر کئے جاتے ہیں اور رسول کے نفس میں ان علوم کو اس طرح منقش کیا جاتا ہے کہ رسول انھیں اپنے دل میں یاد رکھ سکے اور دوسروں کے سامنے بیان بھی کر سکے۔

اسکی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ بلا واسطہ کلام کرے جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق حق تعالیٰ فرماتا ہے وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا (اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے خوب گفتگو کی) اور ہمارے حضورؐ کے متعلق فرماتا ہے فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی (اپنے بندے کی طرف جو کچھ وحی کرنی تھی وہ کردی) اسے وحی صریح کہتے ہیں۔

وحی کے پہلے مرتبہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کلمات مقررہ اور عبارات معینہ کے ساتھ نازل ہوں اور حروف وصوت رسول کے کانوں تک پہنچا دیں اور معانی انکے قلب میں القا کریں۔

یہ دونوں صورتیں انبیاء کے لئے مخصوص ہیں۔

دوسرا مرتبہ جو پہلے مرتبہ کے مقابلہ میں کمزور اور کمتر درجہ کا ہے یہ ہے کہ کلام الٰہی اس نفس تک پہنچ جائے جو اس کلام کے قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد رکھتا ہو جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈالدی کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلاکر صندوق میں بند کرکے دریا میں ڈالدیں۔ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۝ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ (جس وقت کہ وحی ڈالی ہمنے طرف ماں تیری کے وہ چیز کہ وحی کی جاتی ہے اب یہ کہ ڈالدے اس کو بیچ صندوق کے پس ڈالدے اس کو بیچ دریا کے (طٰہٰ ع ۲) اس وحی خفی اور تعلیم سِرّی کے القا نے ان کی والدہ کے نفس کو خواب جہالت سے بیدار کردیا اور ان کا دل اپنے بیٹے کے متعلق تردد اور دشمنوں کے خوف سے مامون ہوگیا اسی نوع کی وحی عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم کو بھی ہوئی تھی جبکہ درخت کے نیچے سے ان کو آواز آئی کہ غمگین مت ہو۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا۔ (پس پکارا اس کو (یعنی مریم کو) اس (درخت) کے نیچے سے کہ غم مت کھا تحقیق تیرے پروردگار نے تیرے نیچے چشمہ کردیا ہے (مریم ع ۲)

یقینی امر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پیغمبر نہ تھیں اس سے معلوم ہوا کہ وحی کا یہ مرتبہ جسے القا اور الہام کہتے ہیں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے بھی رکھا ہے جو نبی یا رسول نہیں خضر علیہ السلام کو علم لدنی کی تعلیم ہوئی جن کی بابت حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ (اور ہم نے ان کو اپنے خاص علم میں سے تعلیم کیا الکہف ع ۹) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:- اِنَّ لِلّٰهِ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ عِبَادٌ مُحَدَّثُوْنَ واشار الٰی بعض اصحابہ یعنی بیشک ہر امت کے اندر اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوتا ہے پھر آپ نے اپنے بعض اصحاب کی جانب اشارہ فرمایا بعض

روایات کی رو سے حضرت عمرؓ کی جانب اشارہ فرمایا۔

تیسرا مرتبہ وحی کا جو دوسرے مرتبہ سے بھی ضعیف تر ہے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نفوس کو ان کاموں کی تعلیم فرماتا ہے جو ان نفوس کے مقاصد سے متعلق ہیں۔ اور وہ نفوس اس وحی کے سبب ان صنائع و بدائع کا استخراج کرتے ہیں جو ان کی قوت اور استعداد کے اندر ہیں۔ جیسے کڑی کا جالا بُننا۔ ریشم کے کیڑے کا ریشم تیار کرنا شہد کی مکھی کا چھتہ بنانا۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا۔ (وحی کی تیرے رب نے طرف شہد کی مکھی کے کہ پہاڑوں میں اپنا گھر بنا (النحل۔ ع) مکھی پر کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوا نہ اللہ تعالیٰ نے حروف و صوت سے اسے خطاب فرمایا۔ بلکہ اس میں ایک بات کی استعداد پیدا کر کے اس کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اپنی استعداد کو جنبش میں لائے اور اپنا کام کرے۔

نفوس ناطقہ جب ایک حد تک کمالاتِ معنوی حاصل کر لیتے ہیں، طبیعت کی کدورتوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔ خواہشات کی قیود سے آزاد اور بشریت کے تقتضیات سے برتر ہو جاتے ہیں۔ تو فطرۃً ان کی توجہ عالم سفلی سے ہٹ کر عالم علوی کی جانب مائل ہوتی ہے خصائل ملکوتی کا ان پر غلبہ اور علوم آسمانی کی تحصیل کا شوق انہیں دامنگیر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ملائکہ کی ہمنشینی کا انہیں شرف حاصل ہوتا ہے اور اس ہمنشینی سے وہ راحت پاتے ہیں۔ ان ہی ملائکہ کے واسطہ سے خوش قسمت نفوس کو کلام الٰہی سننے کی دولت نصیب ہوتی ہے اور صحبت ملائکہ کے اثرات سے متاثر ہو کر وحی کی مختلف شاخوں اور عالم قدس کے مختلف پھول پتوں اور علومِ غیب کے مختلف پھلوں سے وہ شکم سیر ہوتے ہیں۔

علم کے حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔ ظاہری طریقہ تو وہی معمولی طالب علم کا طریقہ ہے جو بہت عام ہے۔ اور باطنی طریقہ مراقبہ اور تفکر کا ہے۔ مراقبہ اسے کہتے ہیں

کہ دل کو دوسرے خیالات سے ہٹا کر ایک ہی خیال پر جما دیا جائے۔ اور اسی خیال کے اندر فکر میں منہمک ہو جائے۔ اور تفکر یہ ہے کہ نفس ان علوم کو جو کہ اپنے سے مخفی ہیں۔ مدت اور حیلہ اور آلہ کے ساتھ تلاش کرے۔ ایک تیسری چیز اور ہے۔ جسے حدس کہتے ہیں۔ تفکر اور حدس میں یہ فرق ہے کہ تفکر میں تو غور وخوض سے اور طبیعت پر زور ڈالکر کوئی بات معلوم کیجاتی ہے لیکن حدس میں بغیر سوچے سمجھے اور بلا غور وخوض اور بغیر آلہ یا حیلہ کے دفعتہً ایک بات قلب میں القا ہو جاتی ہے۔ صاحب حدس یکبیک غیب کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور یکبارگی علم مطلوبہ اس پر منکشف ہونے لگتا ہے بغیر اس کے کہ عرصہ گذرے اور بغیر اس کے کہ وہ ریاضت میں مشغول ہو۔ حدس بمقابلہ فکر کے نفوس کاملہ سے اقرب ہے حدس سے فراست پیدا ہوتی ہے۔ اور فکر سے کیاست۔ کیاست اس زیرکی و دانائی کو کہتے ہیں جس کا تعلق دماغ سے ہے۔ اور فراست اللہ کا اک نور ہے جس سے مومن دیکھتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔ کا ارشاد ہے کہ "تم مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے" یہی فراست ہے جو حدس سے پیدا ہوتی ہے۔ حدس ہی الہام کا زینہ ہے۔ اور نبوت زینہ ہے وحی کا۔

جب نفس انسانی حدس کی قوت سے عالم بالا کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور علوم غیبیہ کے انوار اس پر کھلنا شروع ہوتے ہیں۔ تو ان علوم کا اظہار اس پہ رمز کے حجاب اور اخفا و ابہام کے پردوں کی آڑ میں ہوتا ہے پھر اگر نفس میں اتنی قوت نہیں کہ حالت بیداری میں اس ظہور کا متحمل ہو سکے تو یہ جلوے اسے خواب میں دکھلائے جاتے ہیں۔ اور غیب کے اسرار عالم رویا کی صورتوں اور شکلوں اور مثالوں میں متمثل کر کے اس پر منکشف کئے جاتے ہیں۔

عالم رویا کے ذریعہ انکشاف حاصل کرنے کا مرتبہ الہام سے بھی کمتر ہے الہام کا

مرتبہ فرشتہ کے نازل ہونے سے جسے وحی کہتے ہیں۔ اور وحی کا مرتبہ صریح مکالمہ سے جسے وحی صریح کہتے ہیں بکثرت ہے۔ اسرار غیب کے ظہور کی انتہائی شان صریح مکالمہ کی شکل میں اولوالعزم رسولوں کے لئے مختص ہے وحی انبیاء میں سے رسولوں کے لئے مختص ہے۔ وحی فی المنام یعنی خواب میں وحی ہونا محض انبیاء کے لئے ہے۔ الہام کی دولت سے اولیاء اللہ نوازے جاتے ہیں۔ ان اولیاء اللہ کے نفوس ظاہرہ جب اپنے عنصری قالبوں کی قید سے رہائی پاکر آسمانِ مکاشفہ کی بلندیوں کی پرواز فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے ان کے مقام معاد میں خطاب صریح کے ساتھ کلام فرماتا ہے جیساکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:- مامن عبد الا وسیکلمہ ربہ لیس بین العبد والرب ترجمان ولا واسطۃ (متفق علیہ) یعنی ہر ایک مومن بندے سے خداوند تعالیٰ کلام فرماویگا۔ اور اس وقت خدا اور مومن بندے کے درمیان نہ کوئی ترجمان ہوگا نہ کوئی واسطہ۔

القاء اور الہام میں کسب کو کسی قدر دخل ہے۔ مگر وحی میں کسب کو مطلق دخل نہیں ریاضت اور مجاہدہ سے یہ دولت ہاتھ نہیں آتی جس طرح نبوت محنت و مجاہدہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ وحی بھی کوشش انسانی سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ الہام کے ذریعہ صرف معانی کا انکشاف ہوتا ہے۔ وحی کے ذریعہ معانی کا بھی انکشاف ہوتا ہے اور کشف تنزلات کا بھی اور نزول روح القدس یعنی جبرئیل کا بھی۔ روح القدس اور جبرئیل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں جبرئیل میں لطافت کا جب غلبہ ہوتا ہے تو وہ روح القدس ہو جاتے ہیں اور جب ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ مکشوف ہوسکیں تو وہ جبرئیل ہو جاتے ہیں۔ جب وحی نازل ہوتی ہے تو روح القدس یا روح الامین معانی کو رسول کے قلب میں منقش کرتے ہیں۔ اور الفاظ و عبارت کو جبرئیل رسول کے کان میں القاء کرتے ہیں۔ پھر مسموع او معقول کان اور دل کی راہ سے ذات رسول

میں مجتمع ہو جاتے ہیں اور رسول کی زبان و توجہ ان دونوں کے فیضان میں مصروف ہو جاتی ہے

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ (الشعراء ع ۱۱)

"روح الامین نے (یعنی جبرئیل نے اپنی شانِ الفت سے) اس کو تمہارے قلب پر نازل کیا ہے تاکہ تم عذاب الٰہی سے ڈرانے والوں میں سے ہو اور اس کو عربی زبان میں جو سب زبانوں میں روشن اور مبین ہے نازل کیا ہے۔

انبیا وحی کی قوت سے ان چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں جن چیزوں کو اولیاء اللہ الہام کی قوت سے نہیں دیکھ سکتے انبیاء کلمات وحی کو اپنے کانوں سے سنتے ہیں۔ معانی کو دل میں سمجھتے ہیں معالاخہ الہام میں سوائے انکشافِ معنی مجردۂ مخفیہ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

قرآن مجید اور جرمنی

ترجمہ تقریر بیرن عمر رالف ایہرن فلس

آسٹریا کے نومسلم امیر عمر رالف ایہرن فلس حال میں ہندوستان تشریف لا چکے ہیں۔ اس سیاحت کے دوران میں چند روز ان کا قیام حیدرآباد میں بھی رہا۔ یہاں انہوں نے مجلس تحریک قرآنی کی استدعا پر ایک تقریر بعنوان مندرجہ بالا پڑھی تھی جسے عموماً پسند کیا گیا مولوی سید شریف الحسن صاحب بی۔ اے نے اس کا ترجمہ ہمارے پاس بھیجا ہے اور اس کے ساتھ جناب ذوقی شاہ صاحب کے حواشی بھی ہیں جن میں انہوں نے بیرن عمر کے بعض خیالات کی اصلاح فرمائی ہے۔ ذیل میں وہ تقریر معہ حواشی درج کی جاتی ہے)۔

جرمنی اپنی اصلاح کے لئے سرگرم عمل ہے یہی نہیں بلکہ وہ اپنی زندگی میں ایک نئی روح پھونکنے والا ہے۔ موجودہ سیاسی اور ذہنی حالات سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں جرمنی کو جو مصیبتیں اور تمدنی شکستیں اٹھانی پڑیں ان سے جرمنی کی قوتوں کو بالکل نقصان نہ پہنچ سکا فنا کرنا تو درکنار یہ مشکلات ان قوتوں کو کمزور تک نہ کرسکیں۔

جرمنی میں سرعت کے ساتھ جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سے ایک اجنبی شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ جرمن قوم کی اخلاقی اور قومی قوتیں بالکل زائل ہو چکی ہیں لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اس قوم کی ذہنیت زندگی کی نئی حالتوں اور نئے نئے نصب العین تلاش کرنے میں

بہت مضبوط ہے دیانت دار اور اخلاص پسند واقع ہوئی ہے کیونکہ زندگی کے پرانے اصول اور نصب العین ایک ایسی یورپین قوم کو ہرگز مطمئن نہیں کر سکتے جو حقیقتہً متمدن ہے اور ہمیشہ نئے اصولوں کی تلاش میں منہمک رہتی ہے۔ (۱)

آج کل جرمنی میں دو جماعتیں ہیں جو ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ ان میں سے ایک تو بالکل بین الاقوامی خیال کی ہے اور وہ اس خیال کی بھی تائید کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ فوجی قوت سے اپنی حفاظت کی جائے دوسری جماعت خالص قومیت کی حامی ہے اور وہ فوجی قوت اور جنگ کی مخالف نہیں ہے اگرچہ یہ امر یقینی ہے کہ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد یہ دونوں فریق اپنے اپنے خیالات میں ترمیم کر لیں گے لیکن ان دونوں میں سے کسی میں بھی روحانیت نہیں ہے کہ اس کی روشنی میں وہ انسان کے ذاتی اور ذہنی نصب العین متعین کر سکیں۔ ہاں البتہ چند اصول ایسے ہیں جو پوری قوم کی بھلائی یا متفرق جماعتوں کی بہبود میں ممدو معاون ہوتے ہیں تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انفرادی اور قومی قوتوں کا ارتقا کسی نہ کسی نئے نصب العین یا مدار حیات کی بنا پر ہوا ہے اس لئے یہ امر غالب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید جیسی لبریز ہدایت کتاب جس میں سوشل مشکلات کے حل کے ساتھ ساتھ انفرادی قومی اور بین الاقوامی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہدایات بھی موجود ہیں جرمنی کے لئے موجودہ حالت میں بے نظیر مددگار ثابت ہوگی۔ میرا یہ خیال بالکل قرین قیاس معلوم ہوگا اگر ہم اس واقعہ پر غور کریں کہ مسلمانوں کا موجودہ زوال قرآنی تعلیمات سے بے خبری کی وجہ سے ہے نہ کہ قرآنی تعلیمات کی وجہ سے جیسا کہ کسی زمانہ میں باور کیا جاتا تھا

اپنے اس خیال کی تائید میں میں حیدرآباد کی مثال پیش کرتا ہوں جہاں ۹۰ فیصدی ہندو آبادی اور ایک بہت ہی مختصر سی مسلمان آبادی کے درمیان پورا پورا اتحاد اور روادارانہ تعلق قائم ہے یہاں قرآن شریف کے دو بنیادی قواعد پر عمل ہوتا ہے جس کی وجہ سے ملک یہ

س قدر خوش و خرم ہے۔ سب سے پہلے تعلیم و تعلم کا چرچا ہے جس میں اس ملک کی قوتیں پوشیدہ ہیں
بصسرا کبر حیدری کے اس لیکچر کو جو انہوں نے جامعہ عثمانیہ کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر دیا تھا
سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ قرآن کی ہدایات کے مطابق تعلیم و تعلم میں منہمک رہنے کا جذبہ تھا جس
اس خوبصورت جامعہ کے قیام میں رہنمائی کی صرف یہی نہیں بلکہ میں نے اس مشہور سیاسی مدبر سے
گفتگو کر کے یہ محسوس کیا ہے کہ قرآن کے اصول رواداری پر عمل پیرا ہونے اور پیغمبر صلعم کی تعلیم کی
خوبیوں کو سمجھنے کا شوق اس ملک کے لوگوں پر اسقدر غالب ہے کہ وہ سب سے پہلے بنی نوع انسان
کی فلاح اور ریاست کی بہبود مدنظر رکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنی اپنی قوم کی بھلائی دیکھتے ہیں
میں نے اعلیحضرت نظام دکن سے شرف ملاقات حاصل کیا وہ اسلامی سادگی اور بینت
اخلاق کی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ملاقات سے میرے اوپر ایک ایسا اثر ہوا جو کبھی نہ
مٹے گا میں اعلیحضرت کے سب سے بڑے صاحبزادے سے بھی ملا جو ولیعہد ہیں اور صدر اعظم سے بھی
ملاقات کی جو ایک سچے ہندو کی طرح اسی اخلاص و انہماک سے تمام ملک کی خدمت کرتے ہیں
ان سب سے ملکر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرا مذکورہ بالا خیال بالکل صحیح ہے۔
آج ممالک اسلامیہ محض اس بنا پر مبتلائے ادبار ہیں کہ ان میں تعلیم کی کمی ہے جہاں
جہاں اور جن جن ممالک میں قرآن کے ان دو بنیادی قواعد تعلیم اور رواداری پر صحیح معنی میں
عمل ہو رہا ہے۔ وہ ممالک ترقی کر رہے ہیں پس میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جرمنی کا جو
تجسس ان خزائن حکمت کو نظر انداز نہیں کرے گا جنسے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔
لیکن مشرقیوں نے ابتک قرآن کو جس طور سے سمجھا ہے جرمنی اس سے بالکل مختلف طریقہ سے
فیضیاب ہوگا۔
ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ جرمنی میں قرآن مجید کا رسمًا کوئی احترام نہیں ہے

بلکہ اس کی حیثیت بالکل تاریخی ہے اور وہ علم الالسنہ میں مدد دینے والی ایک کتاب سمجھی جاتی ہے
فلسفلاس کے اگر ہم اس کی مذہبی حیثیت معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اگر کوئی انقلابی
کتاب نہیں سمجھی جاتی تو ایک بالکل نرالی کتاب ضرور سمجھی جاتی ہے صرف یہی واقعہ اس امر پر کافی
روشنی ڈالتا ہے کہ وہ لوگ جو جرمنی میں قرآن کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کے خیالات قرآن
کے متعلق کس قدر غیر رسمی اور غیر قدامت پسند ہیں۔ ہم یہ بات فراموش نہیں کر سکتے کہ مشرقی اور
مغربی طریق تخیل طریق تجسس اور اصول حیات میں بین فرق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب ہماری
مقدس کتاب پر ایک مغربی نگاہ پڑیگی تو قرآن کے نئے معانی اور اسکے سمجھنے کے نئے اصول پیدا ہو جائینگے اور میرے
خیال میں یہ کسی صورت سے مضر نہ ہوگا بلکہ خداوند کریم کی طرف سے ایک رحمت ہوگی۔ کیونکہ قرآن
مقدس ہمکو بتاتا ہے۔ یہ بات انسانی سرشت میں داخل ہے کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو اور پھر
خود ہی تحریف کر کے ان حیرت انگیز حقائق کا غلط استعمال کرے جو خدا نے اپنے پیغمبروں کے
ذریعہ سے انسان تک پہونچائے ہیں اس لئے انسان کو اس امر کی ضرورت رہتی ہے کہ اس کی
زندگی میں تازہ روح پھونکی جاتی رہے اور ازلی صداقتوں کے لئے تجددی جستجو جاری رکھی جائے
زمانہ کے ساتھ انسان کی ذہنی اور جسمانی حالت بدلتی رہتی ہے قدیم عربی ایرانی ترکی
اور ہندوستانی روایات اپنے زمانہ کے لحاظ سے حقائق ازلی کی بہترین تفسیریں تھیں لیکن جس طرح
سمندر کو انسان کے بنائے ہوئے ایک کوزے میں بھر دینا غیر ممکن ہے اسی طرح قرآن کے
حقائق و معارف اور ان خوبیوں کو جو قرآن میں پوشیدہ ہیں۔ ایک ہی انسانی ارتقائی
دور میں سمجھ لینا بھی ناممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے رہنے سہنے اور سوچنے کے طریقوں
کو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہے۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جرمنی کے قابل اور مذہبی آدمی قرآن کو جس طرح سمجھیں گے وہ

ان تمام اصول و مبانی سے متعلق ہوگا جن پر اسلامی روایات قائم ہوئی تھیں۔ پھر بھی اسلامی
تہذیب کے قدیم مشہور رہنماؤں اور موجودہ یوروپ کی نوخیز اسلامی تہذیب کے معرب آوردہ
ارکان کے درمیان ایک قریبی رشتہ قائم رہے گا یہ بالکل فطری امر ہے کیونکہ یوروپ کو اسلامی
تعلیم دینے کا بیڑا اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ قدامت پسند حصہ یعنی ہندوستان نے اٹھایا
ہے اس لئے میں یقین کرتا ہوں کہ آجکل جرمنی اور دوسرے ممالک مغربی کے روحانی اور
دماغی قابلیت رکھنے والے جو حضرات قرآن شریف کے مطالعہ میں منہمک ہیں ان کی کوششوں
کا نہایت ہی دلپذیر نتیجہ یہ ہوگا کہ از سر نو قرآنی تعلیم کا صحیح مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا
جا سکے گا۔ (۲)

باقی

مجلہ مکتبہ

یہ دار الاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) حیدرآباد دکن کا علمی و ادبی مصور ماہوار رسالہ ہے جس کا شمار دنیائے اردو کے
چیدہ رسالوں میں ہے تقریباً دو سال سے مولوی عبدالقادر سروری صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ادارت میں حسب ذیل خصوصیات کے ساتھ
نہایت پابندی وقت سے شائع ہو رہا ہے۔ (۱) اس میں اکثر عمدہ طبعزاد افسانے یا ہندی عربی انگریزی فرانسیسی اور روسی افسانوں کے ترجمے ہوتے ہیں
(۲) [illegible] تاریخ سائنس فلسفہ معاشیات پر بھی مفید علمی مقالے شائع ہوتے ہیں (۳) اس میں عام ادبی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ دکن کے قدیم
قدیم کی نسبت نادر مضامین ہوتے ہیں۔ (۴) مشاہیر ادباء شعراء اور اہل علم و فضل کی تصویریں ہر نمبر میں شائع ہوتی ہیں۔
(۵) اس میں اردو کی کتابوں پر تبصرے اور جدید مطبوعات کی اطلاعیں بالالتزام شائع ہوتی ہیں قیمت سالانہ چار روپے ششماہی دو روپے
چار آنہ (۴) فی پرچہ ۶/

منتظم مجلہ مکتبہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

بیرن عمر کی تقریر پر خیالات

از

جناب ذوقی شاہ صاحب

(۱)

پرانی چیزوں سے بلاوجہ بیزاری اور نئی چیزوں کے اشتیاق میں بلاضرورت بےچینی طفلان ناعاقبت اندیش کا خاصہ ہے جس قوم کو تمدن و ترقی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت اور عقل و فراست کا دعویٰ ہو اسے اس طفلانہ ذوق سے دور رہنا چاہئے اصل چیز تلاش حق ہے اس تلاش میں جدت و قدامت کے امتیاز کو کوئی دخل نہیں قدامت سے نفرت اور جدت سے رغبت یا اس کے برعکس کا تلاش حق پر کوئی اثر نہ پڑنا چاہئے علاوہ بریں انسانی نصب العین میں تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں۔ وہ نصب العین جو ماضی میں کچھ اور تھا حال میں کچھ اور ہے اور مستقبل میں کچھ اور ہو جائیگا' سچا انسانی نصب العین نہیں ہو سکتا۔ محدود جماعتوں کا نصب العین حالات مقیدہ میں عارضی اور وقتی ہونا اور حالات کے بدل جانے پر اس کا متغیر ہو جانا اور بات ہے مگر جملہ بنی نوع انسان کے لئے سچا حقیقی اور مستقل نصب العین کسی تغیر کو قبول نہیں کرتا۔ یورپ اگر اپنا نصب العین بدلنے کا مشتاق رہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یورپ کو ابھی تک صحیح نصب العین نصیب ہی نہیں ہوا؛ اور بہ حالات موجودہ اسے ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ اس تلاش میں جن علوم کو بیشتر دخل ہے ان سے یورپ بڑی حد تک ناآشنا ہے قوانین قدرت کے متعلق جزوی و فروعی معلومات کے حصول میں محققین یورپ

نے جو سعی بلیغ کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے اور کوئی عقلمند اور منصف مزاج شخص اس حیرت انگیز ترقی سے انکار نہیں کر سکتا جو سائنس کے میدان مغرب کو اس وقت تک حاصل ہوئی ہے۔ مگر باوجود ان جملہ ترقیات کے امور نامعلوم کی بابت ان ممالک میں جو تاریکی چھائی ہوئی ہے وہ اتنی وسیع ہے کہ موجودہ علمی فتوحات کو اس جہل سے کوئی مناسبت ہی نہیں جہل کی اس شب تاریک میں سائنٹیفک کامیابیوں کے جو جگنوں چمک رہے ہیں، وہ باوجود اپنی چمک کے اس تاریکی کو دور نہ کر سکے اہل یورپ کو خود اعتراف ہے کہ ان کے علوم ابھی ناقص ہیں ترقی کی گنجایش بہت کچھ باقی ہے۔ قدم قدم پر جدید انکشافات قبل کے مسلمات اور نظریوں کو درہم وبرہم کردیا کرتے ہیں۔ مگر یہ انکشافات ختم نہیں ہوتے کسی منزل پر آکر رکتے نہیں ہمکو یہ کہنے کا موقع نہیں دیتے کہ معلومات کے انتہائی نقطہ پر ہم پہنچ گئے۔ ہماری موجودہ تحقیقات پر ہم کو یہ اعتماد نہیں ہونے دیتے کہ کل یہ تحقیقات غلط ثابت نہ ہوسکے گی۔ علم کی پیمائش آسان ہے۔ مگر جہل کی پیمائش نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کے علم کو اس کے جہل سے کیا مناسبت ہے۔ یہ سب کچھ صرف ان علوم کی بابت ہے جو مادیات و مشاہدات و تجربات سے متعلق ہیں۔ روحانیات اور امور فوق المادہ و مابعد الطبیعات میں یورپ کی موجودہ معلومات کو ہم بلاخوف تردید بمنزلہ صفر کے قرار دے سکتے ہیں جبکہ کائنات کے متعلق جو کہ انسان کی جولانگاہ ہے اور انسان کے متعلق جو کہ اس زمین پر حق تعالیٰ کا خلیفہ ہے یورپ کا علم اس قدر کم اور جہل اس قدر زیادہ ہے تو مستقبل انسانی نصب العین کے متعلق یورپ کیونکر کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ حقائق اشیاء اور حقائق انفسی کے کما حقہٗ انکشاف سے قبل کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بے بضاعتی اور کوتاہ علمی کے باوجود محض اپنے نت نئے خیالات خام کی بنا پر انسان جیسی اہم ہستی کے لئے

اپنی طرف سے کوئی نصب العین قرار دیدے اور اپنے تلون کے تحت ہیں آئے دن اسے بدلتا رہے۔

قطع نظر امور مندرجۂ بالا کے انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے خلیفہ خود مختار نہیں ہوتا بلکہ جس نے خلافت عطا فرمائی ہے اس کے ماتحت ہوتا ہے وہ اپنے لئے کسی دستور العمل کے قرار دینے یا نصب العین کے متعین کرنے کا کیونکر مجاز ہو سکتا ہے؟ اس کے لئے نصب العین تو وہی مقرر کر سکتا ہے جو اس کا خالق اس کا مالک اس کا رب اس کا ہادی ہے جس نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا اور حق خلافت ادا کرنے کی اسے استعداد بخشی انسان کا فرض ہے کہ کلام الٰہی سے دریافت کرے کہ حق تعالیٰ نے انسان کے لئے کیا نصب العین مقرر فرمایا ہے۔ پھر اس کا فرض ہے کہ احکام الٰہی کے مطابق اپنی زندگی اپنے خیالات اپنی امنگوں اور اپنی روش کو ڈھالے نہ یہ کہ اپنی دھندلی روشنی سے ہدایت الٰہی کے انوار کو دھندلا کرنے کی کوشش ناکام میں مصروف رہے قرآن "نعوذ باللہ" بازیچۂ اطفال نہیں کہ یورپ اپنی طفلانہ جدت پسندی کے شوق میں آئے دن نئے نئے نصب العین قرار دے اور تغیر پسندی کے ذوق میں مطالب قرآنی کو حسب دلخواہ الٹتا پلٹتا رہے۔ غلام کا یہ کام نہیں کہ اپنے لئے خود خدمت تجویز کرے بلکہ اس کا فرض ہے کہ اپنے آقا کے اشارہ پر چلے۔

(۲)

قرآن کلام الٰہی ہے کلام مجموعہ ہوتا ہے الفاظ و معانی کا اگرچہ قرآن میں الفاظ و معانی کے ماوراء کچھ اور بھی ہے مگر اس موقعہ پر ہمیں صرف الفاظ و معانی ہی سے بحث ہے وحی کے ذریعہ جس طرح الفاظ قرآنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے اسی طرح ان الفاظ کے صحیح معنی بھی حضور سرور کائنات کے قلب پر وارد ہوئے (مزید تفصیل کے لئے

ملاحظہ فرمائیے مضمون " القار۔ الہام۔ وحی جو اسی اشاعت میں دوسری جگہ شایع ہو رہا ہے) اون معانی سے ہٹ کر الفاظ قرآنی کی کوئی جدید تفسیر (خواہ وہ تفسیر مشرقیوں نے کی ہو یا مغربیوں نے، علماء مصروشام نے کی ہو یا محققین جرمنی نے) کلام الٰہی کی صحیح تفسیر نہ ہوگی بلکہ ان لوگوں کی اپنی دماغی وذہنی کیفیات کی تفسیر ہوگی قرآن کو صحیح معنی سے ہٹا دینے کی کوشش تحریف کی کوشش ہے جس میں کسی کو کامیابی نہیں ہوسکتی۔

اس میں شک نہیں کہ ابتدائے کائنات سے لیکر اس وقت تک انسانی دماغ پر مختلف ارتقائی دور گذرے اور دماغی صلاحیت بتدریج ترقی کرتی چلی آئی مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ترقی اپنے انتہائی نقطہ پر اب سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل پہنچ چکی۔ اب جو کچھ نظر آ رہا ہے اور اس زمانے میں فہم وادراک کی جو نمایش ہو رہی ہے اور سیرت وعمل کا جو مظاہرہ ہو رہا ہے وہ اسی انتہائی دور ترقی کی ایک انحطاطی اور تنزولی کیفیت ہے۔

انسانی ترقی کے ہر دور میں پیغمبر مبعوث ہوئے جنہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کی استعداد کو ملحوظ رکھکر مناسب وقت تعلیم دی وہ تعلیم چند افراد واقوام تک محدود اور وقت معین تک مخصوص رہی۔ ارتقائی تغیرات کی مناسبت سے تعلیم میں فروعی تغیرات پیدا ہوتے گئے ان مناسب وقت تغیرات کو عمل میں لانے کی غرض سے ہر ملک اور ہر زبان میں نئے نئے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے حتّٰی کہ حکمت الٰہی کے تحت میں یہ ترقی جب اپنے عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچی تو خاتم النبیئین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے جو ہادی کافۃ الناس تھے جن کی تعلیمات جملہ انبیاء ماقبل کی تعلیمات پر مشتمل تھیں جن کا دین جملہ ادیان سابقہ کا ناسخ قرار پایا جن پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور جن پر وہ قرآن نازل فرمایا گیا جس کی حفاظت کا حق تعالیٰ نے

خود ذمہ اٹھایا اور جس میں اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی مہر لگا دی گئی۔ وین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ اور قیامت تک اس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ و تغیرو تبدل کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

کوئی عقلمند شخص اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ افضل الناس سید البشر امام انبیاء خاتم المرسلین محبوب حق محمد مصطفےٰ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم ـ جن پر قرآن نازل ہوا (نعوذ باللہ) قرآن کے معنی صحیح طور پر نہ سمجھ سکے یا اصحاب رسول جن کو رسول خدا نے خود بہ نفس نفیس قرآن کی تعلیم دی مفہوم قرآن سے صحیح طور پر آگاہ نہ ہو سکے۔ اور اب ساڑھے تیرہ سو برس بعد وہ جرمنی جن کی غلطی کی بدولت دنیا کا بڑا حصہ ایک عالمگیر جنگ کی سخت تباہ کن آگ میں بقول یورپ ہی کے حال میں کو د چکا ہے جو اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں اور بقول بیرن عمر کے اپنی حیات میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتا ہے اور زندگی کے جدید اصولوں کی تلاش میں ہے یعنی بہ الفاظ دیگر وہ جرمنی جنہے ابتک ایک ناکام اور نامراد زندگی بسر کی ہے قرآنی تعلیم کا صحیح مفہوم از سر نو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو جائیگا۔

بیرن عمر کا خیال ہے کہ "مشرقیوں نے ابتک قرآن کو جس طور سے سمجھا ہے جرمنی اس سے بالکل مختلف طور پر فیضیاب ہوگا" مگر یہ خیال بجز اس کے کہ مغربی شیخی بازی کا ایک نمونہ ہو کسی اور اہمیت کا مستحق نہیں حقائق منقلب نہیں ہوتے۔ وین شاعری نہیں جس میں مشرق و مغرب کے طبائع کا اختلاف موثر ہو جس طرح ریاضی اور ریاضی کے نتائج، سائنٹفک معلومات اور اس کے ماحصل میں مشرقی و مغربی طبائع کے اختلاف کو دخل نہیں جس طرح مشرقی اور مغربی دونوں کے نزدیک دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک آگ جلانے والی اور پانی آگ بجھانے والا ثابت ہے۔ اسی طرح مشرقی اور مغربی دونوں کے نزدیک حقائق الٰہی و حقائق کونی یکساں ہوں گے خواہ دونوں کے

تخیل اصول تجسس طرز استدلال اور روش زندگی میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ کیا جرمنی قرآن مجید کے ساتھ بھی وہ سلوک کرنا چاہتا ہے جو عیسائی دنیا نے بائیبل کے ساتھ کیا؟ لیکن ہم پیشین گوئی کئے دیتے ہیں کہ خواہ جرمنی کے باشندے ہوں یا کہیں اور کے، اس کوشش میں کسی کو بھی کامیابی نہ ہوگی کیونکہ اِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ کی ضمانت قرآن کے الفاظ و معانی دونوں پر شامل ہے۔ نہ لفظی تحریف میں کسی کو کامیابی ہوگی نہ معنوی تحریف میں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیشین گوئی فرما چکے ہیں کہ لَا يَزَالُ طَايفة من امتی علی الحق ظَاهِرِينَ لَا يَضُرُّهُمْ من خالفهم حتّٰی يَاتِيَ امر الله (میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ کھلم کھلا حق پر رہیگا۔ ان لوگوں کو مخالف ان کا ضرر نہ پہونچا سکے گا۔ یہاں تک کہ آجاوے امر اللہ کا یعنی قیامت)۔

عالمگیر تحریک قرآن اور فرقہ بندیاں

از مولوی ابو محمد صاحب مصلح

قرآن مقدس انفرادی اور اجتماعی فلاح و بہبود کا حامل ہے۔ مدنیت اور تہذیب کی تعمیر کی ہدایت کو استوار کرتا ہے انسانیت کے گوشہ گوشہ پر اپنی نگاہ رکھتا ہے ان کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی حاوی ہے کوئی ضرورت نہیں جس کو وہ پورا نہ کرتا ہو۔ اور اس راہ کی جملہ قسم کی تاریکیوں کو دور کرکے اپنی ہمہ گیر روشنی نہ ڈالتا ہو۔ قرآن مجید عالم الغیب خدا کا کلام ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ فرقہ بندی جیسی چیز پر تیز نظر نہ ڈالتا اور اپنے خاص انداز میں ایک قطعی حکم ایسا نہ صادر فرماتا جو اس کے شایان شان ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہے۔ اعتصمو الحبل اللہ جمیعًا وَ لَا تَفَرَّقُوا۔ اللہ اللہ اس ایک ٹکڑے کے اندر کس اٹل اصول کو کس طرح پیش کیا گیا ہے پہلے تو اعتصموا کی عمومیت ہے اور اس کے ساتھ ہی امر کی شکل میں پھر حبل اللہ کا عالیشان مضبوط حملہ ہے جس کے اندر محبت و پیار کے دریا موجیں مار رہے ہیں اس کے بعد جمیعًا کی تاکید ہے اور ایک مرتبہ پھر عمومیت کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ اور اس بات کا اظہار کر دیا گیا ہے کہ اس کلیہ میں کسی کا استثناد نہیں آخیر میں لاتفرقوا کا خدائی حکم جاری ہوا۔ اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں جو مصائب اور مضائیں اس کی طرف کھلا ہوا اشارہ فرما دیا گیا۔

آیت شریف مسلمانوں کے ہر فرقہ کے لئے قابل توجہ اور دعوت عمل ہے اپنی اپنی جگہ پر ہر فرقہ کو سوچنا چاہئے کہ خواہ وہ اپنے زعم میں راستی ہی کیوں نہ ہو لیکن جب تک اعتصموا اور جمیعًا کے حکم کو پورا نہیں کرتا

یا پورا کرنے کے لئے بے چین نہیں ہے ولا تفرقوا کی وعید میں داخل ہے یا نہیں اور کیا اس شکل میں کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْن کا مصداق بنتا ہے یا نہیں اور پھر یہ کہ نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کی حالت تباہ و برباد ہو رہی ہے یا نہیں ؟

اگر ایسا ہے اور ضرور ایسا ہے تو پھر فرقہ بندیوں کی پرورش سے جہاں تک جلد ممکن ہو ہر فرقہ والے کو باز آنا چاہئے اور بلا استثناء اپنی اپنی جگہ پر ہر فرقہ والے کو اس آیت شریف کے لفظ لفظ کی عملی تائید کرنی چاہئے فرقہ بندی کو ناپسند اور ایک ہو جانے کو دل سے پسند کرنا چاہئے اور اس پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو اختیاری نہیں بلکہ خدا کی طرف سے عاید کیا ہوا حکم سمجھنا چاہئے ۔

"عالمگیر تحریک قرآن" کا مسلک اس سلسلہ میں وہی ہے جو اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ کا تقاضا ہے اور اس کی شہادت میں سب سے بڑی بات یہ پیش کی جا سکتی ہے کہ اس مقدس تحریک کے ہمدرد اور سرکار تقریباً ہر فرقہ کے نامور افراد ہیں ۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرقہ بندی کی مصیبتوں سے بچنے کے لئے اپنی رسی (قرآن مجید) کو پیش فرمایا ہے اور پھر یہ بھی کہ اس کے اختیار کرنے اور اس کے معنی و مطالب سمجھنے میں کسی طرح بھی متفرق نہ ہو پس اگر آج یہ ذہنیت مسلمانوں کی ہو جائے تو بیڑہ پار ہے اور ہر طرح کی اجتماعی قوت پھر پیدا ہو جائے اور دریا کے بہاؤ کا رخ دوسری قوموں کو راہ راست پر لانے اور جہاد فی سبیل اللہ میں صرف ہونے لگے ۔

"عالمگیر تحریک قرآن" کا بھی یہی مقصد ہے اور اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ قرآن کا علم و عمل قرآن کی روشنی میں عام ہو اور اگر ایسا ہو گیا تو خود بخود بات بن جائیگی اور جو کام آج تک بحث و مباحثہ لعن و تشنیع اور شمشیر و قلم کے ذریعہ سے نہیں ہو سکا صرف قرآن مجید کی خالص تعلیم سے ہو جائیگا وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

تحریک مقدس کے سلسلہ میں اب تک کم و بیش ایک لاکھ کی تعداد میں لٹریچر شائع کیا جا چکا ہے لیکن ان سب میں وہی شیوہ اختیار کیا گیا ہے جو اوپر بیان ہوا یہاں تک کہ شخصی لے دے کو بھی راہ دینا پسند نہیں کیا گیا ۔ لہٰذا انشاء اللہ ترجمان القرآن بھی اپنے مقصد میں پورا اترے گا ۔ وباللہ التوفیق ۔

اللہ تعالیٰ نے جن الفاظ سے قرآن مجید کی تعریف کی ہے ان میں سے ایک لفظ "بیان" بھی ہے چنانچہ فرمایا هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ اور بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کو لوگ نہیں سمجھ سکتے خود قرآن اعتراف کرتا ہے کہ اس میں متشابہات بھی موجود ہیں۔ اور متشابہ کے متعلق خود اس کا قول ہے کہ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗ إِلَّا اللّٰهُ۔ پھر قرآن مجید "بیان" کیونکر ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کو ان لوگوں کی نسبت سے بیان کہا گیا ہے جو اس کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نہ کہ ہر سننے والے کی نسبت سے۔ اور یہ قرآن ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر کلام کو بیان اسی معنے کے لحاظ سے کہتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ شرط لگا دی جائے کہ بیان صرف اس کلام کو کہا جائے گا جس کو ہر شخص سمجھ لے، تو دنیا کے کسی کلام کو بھی بیان نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ ہر کلام بعض کے لئے بیان ہوتا ہے۔ اور بعض کے لئے نہیں ہوتا۔

سورۃ والضحیٰ میں اللہ تعالیٰ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (اور تجھکو بھٹکا ہوا پایا تو راہ راست دکھا دی)۔ یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی گمراہی جائز ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ آیت میں ضلال سے مراد ان خصائص سے محرومی اور ان علوم و معارف الٰہی سے

ملوا قفیت ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو نبوت سے سرفراز کرنے کے بعد بہرہ مند فرمایا
چنانچہ لغت میں جب کوئی شخص اپنی منفعت کے طریقہ سے ناواقف ہو تو کہتے ہیں کہ ضلّ عن
کیت وکیت۔ ہاں اگر وَ وَجَدَكَ ضَالاًّ عَنِ الدِّین کہا گیا ہوتا تو البتہ اس سے وہ گمراہی
مراد ہو سکتی تھی جو عموماً لوگ اس لفظ سے سمجھتے ہیں۔

تحریم شراب کے سلسلہ میں پہلا حکم جو نازل ہوا ہے یہ ہے کہ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا
لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (اے ایمان لانے والو
نماز کے قریب نہ جاؤ جب کہ تم نشہ کی حالت میں ہو۔ تا وقتیکہ تم جو کچھ کہتے ہو اس کو سمجھو نہیں)
اس کے متعلق ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ جب انسان نشہ کی حالت میں ہوگا تو اسے یہ یاد ہی کیسے رہیگا
کہ اب نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مقصود کلام یہ نہیں ہے کہ نشے کی حالت میں
نماز نہ پڑھو بلکہ یہ ہے کہ اپنے اوپر ایسی حالت ہی طاری نہ کرو جس سے تم نماز پڑھنے کے قابل
نہیں رہ سکتے۔ اور جس کی بدولت تمہاری یہ حالت ہو جاتی ہے کہ جو کچھ تمہاری زبان سے نکلتا ہے
اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس آیت سے نہ صرف ہر نشہ آور چیز کی تحریم کا حکم نکلتا ہے، بلکہ یہ بھی معلوم
ہوتا ہے۔ کہ مصلّی کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ وہ پڑھتا ہے اس کو سمجھے بھی۔

نقد و نظر

لا الٰہ الّا اللہ تالیف مولوی محمد ادریس خان صاحب نجیب آبادی مکتبۂ عبرت نجیب آباد قیمت ۵ر ضخامت ۸۰ صفحہ۔

توحید باری تعالیٰ کا بیان ہے اور زیادہ تر آیات قرآنی سے صفات الٰہی کی تفصیل کرکے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ شرک فی الصفات تمام گناہوں اور برائیوں کی جڑ ہے مصنف نے اپنے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے کہ ان کا مقصد بد اعمالیوں اور بدعقیدگیوں کا رد ہے اور اس میں کسی خاص شخص یا جماعت کو نشانہ نہیں بنایا گیا ہے لیکن ان کے رسالہ کی ابتدا میں جو معلمانہ رنگ ہے، وہ آخر میں مناظرانہ رنگ سے بدل گیا ہے، او مسلمانوں کے بعض گروہوں پر انہوں نے بہت زور کے ساتھ شرک کا الزام عاید کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو غلط اعتقادات مسلمانوں میں پھیل گئے ہیں، ان کی اصلاح ضروری ہے۔ مگر ہماری رائے میں اصلاح کے لئے وہ طریقے اور وہ انداز اختیار کرنے مناسب نہیں جن سے الٹی ضد اور نفرت پیدا کرنے کا اندیشہ ہو۔

نسخۂ زکوٰۃ و آداب والدین انجمن رفیق الاسلام۔ گوجرانوالہ سے ایک آنہ کے ٹکٹ بھیج کر مفت منگائے جا سکتے ہیں۔

یہ دونوں رسالے ان اصلاحی رسائل میں سے ہیں جو انجمن رفیق الاسلام کچھ عرصہ سے شائع کر رہی ہے نسخۂ زکوٰۃ میں بھیک مانگنے کی مخالفت کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ خیرات کن لوگوں کو دینی چاہئے سوال کن کن حالات میں جائز ہے، زکوٰۃ کے مصارف کیا ہیں۔ زکوٰۃ کے مصالح کیا ہیں۔ اور کتنے مال پر کتنی زکوٰۃ دینی چاہئے رسالہ کا انداز بیان نہایت سادہ اور عام فہم ہے اور قصہ کے پیرایہ میں مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ دوسرے رسالہ "آداب والدین" میں اولاد پر ماں باپ کے حقوق بتائے گئے ہیں اور آیات قرآنی و احادیث نبوی سے یہ بتایا گیا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔

نوعِ انسان کو اکابرِ اسلام کی دعوتِ اتحاد

تمام دنیا میں ۷ جولائی کو یوم النبی منایا جائے

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا مینار تیرہ سو سال سے علم و عمل کی دو عظیم الشان چٹانوں پر قائم ہے اور وہ زندگی کے ہر طوفانی زمانہ میں تہذیب و تمدن کی ڈگمگاتی ہوئی کشتیوں کے لئے ایک آخری روشنی اور پناہ ثابت ہوا ہے یعنی حضور نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی سب کے لئے ہے، اور جو کچھ کیا ہے وہ بھی سب کے لئے ہے۔

پیغمبر اسلام دنیا کی مختلف تہذیبوں اور ملتوں کو صحیح اصول کی بنا پر ایک رشتہ مساوات میں پرونے کے لئے تشریف لائے تھے آپ صرف مذہبی فرقہ بندی ہی کے خلاف نہ تھے بلکہ عالم انسانیت میں ہر قسم کی فرقہ بندی کے خلاف تھے خواہ وہ کسی نام سے کی جائے۔ آپ نے دنیا کے سامنے جو تعلیم پیش فرمائی ہے وہ شخصی، ملکی، نسلی یا ہنگامی تعلیم نہ تھی بلکہ ایسی ابدی تعلیم تھی جو تمام انسانوں کو اخوت و محبت کے محکم رشتوں میں مربوط کر دینے والی ہے آپ نے نوع انسان کو جس دین فطرت کی طرف بلایا ہے وہ کسی خاص جماعت کا نہیں بلکہ تمام انسانوں کا مشترکہ دین ہے، اور اس دین کو قبول کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اُن تمام تنگ حلقوں سے جن کی بنیاد رنگ، نسل، زبان، قوم یا وطن پر ہے۔ یہ کہتے ہوئے آزاد ہو جاتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایک خدا ہے سارا کرۂ ارضی ہمارا وطن ہے اور اس کی پشت پر بسنے والے تمام انسان ایک گھرانے کے افراد ہیں۔

آؤ اس پیغمبر وحدت و محبت کی یاد میں نوع انسان کے لئے سچی اور آزاد اخوت کا ایک ایسا عظیم الشان دن منائیں جس میں ہم سب اپنے اپنے ہنگامی اختلافات و تعصبات کو بھول جائیں اور وحدت و اخوت انسانی کے خیال کو لیکر محبت و مساوات کے متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہوں عظیم الشان دن ۱۲ ربیع الاول ۷ جولائی ۱۹۳۳ء کا دن منانا چاہئے۔ یہ دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن ہے۔ ہم نہایت ہی خلوص و احترام سے تمام بنی نوع انسان کو اس عید اتحاد میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور اپیل کرتے ہیں کہ ۷ جولائی ۱۹۳۳ء کو تمام دنیا کی آبادیوں میں

سیرۃ النبی کے عنوان پر متعدد جلسے کئے جائیں! ایسے جلسے جو پیغمبر اسلام کے پاک نام و مبارک کام کے شایان شان ہیں اور جن سے نوع انسان میں باہمی ہمدردی اور محبت و خدمت خلق کا صحیح جذبہ پیدا ہو۔

اس تقریب پر بعض ممتاز علماء کے قلم سے سیرت نبوی کے اہم پہلوؤں پر تقریریں شائع کیجا رہی ہیں تعمیر یوم النبی کے جلسوں میں سنائی جائیں اور انکے تراجم دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں شائع کر کے بخش بمفت تقسیم کئے جائیں۔

ہماری دعا ہے کہ خداوند پاک اس بین الاقوامی تحریک کو نسل انسان کے لئے بابرکت بنائے۔

نوٹ۔ سیرت کی اردو ہندی گورمکھی انگریزی عربی تقریروں کی قیمت بچاس روپیہ فی ہزار ۶ روپیہ فی سیکڑہ ہے محصولڈاک اس کے علاوہ۔ ایک روپیہ چار آنہ کا ٹکٹ بھیکر کتابیں طلب کیجائیں۔ (پتہ) سکرٹری سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور

الـعيـد ۱۰

عرب

(مولنا محمد) عبد الظاہر۔ (امام و خطیب مسجد حرم مکہ معظمہ)

(مولنا) محمد عبد الرزاق (امام مسجد حرم مکہ)

(مولنا) عبید اللہ سندھی (مکہ معظمہ)

مصر

(علامہ) عبد العزیز الثعالبی۔ (قاہرہ)

(ہز ہائینس) پرنس عمر طوسون پاشا۔ (قاہرہ)

(ہز ایکسیلنسی) محمد علی پاشا علویہ (سابق وزیر اوقاف مصر)

(علامہ) عبد القادر بک حمزہ (مدیر البلاغ "مصر")

یورپ

(لارڈ) ہیڈلے فاروق (لنڈن)

(سر) عمر ہیوبرٹ رینکن (لنڈن)

(امیر) شکیب ارسلان (جنیوا)

افغانستان

(آغائے) برہان الدین کشکی (صاحب "اصلاح" کابل)

(عالی قدر) عطا محمد الحسینی۔ (رئیس مجلس اعیان کابل)

ایران

(ہز ایکسیلنسی) سید ضیاء الدین طباطبائی (سابق وزیر اعظم ایران)

شام

(حضرت المجاہد) علی ریاض الصلح) بیروت

(علامہ) صفوۃ یونس الحسینی (بیت المقدس)۔

(امیر) سعید الجزائری (رئیس جمعیۃ الخلافہ شام)

ہندوستان

(علامہ) سر محمد اقبال۔ (لاہور)

(ڈاکٹر) سر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ علیگڈھ)

(علامہ) سید سلیمان ندوی۔ (لکھنؤ)

(آنریبل) سر فیروز خاں نون (وزیر تعلیم پنجاب لاہور)

(نواب) سر عبد القیوم (وزیر سرحد پشاور)

(نواب) محمد شاہنواز خان (ملتان)

(سیٹھ) جمال محمد (مدراس)۔

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینہ کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی ان کو پرچہ قیمتہً دیا جائے گا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے۔ لہذا کوئی صاحب رعایت کا مطالبہ نہ فرمائیں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر مضمون شائع کرے۔

مینجر ترجمان القرآن

خیرت آباد۔ (حیدرآباد دکن)

جلد (۲) عدد (۳)   ربیع الاول ۱۳۵۲ ہجری

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم و معارف قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

باہتمام

مولوی ابو محمد صاحب مصلح

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا

قیمت سالانہ صمہ - بیرون ہند کے لئے (ہشے)۔   قیمت فی پرچہ مر

فہرست مضامین

گذشتہ سال قدس شریف میں موتمر اسلامی کا جو اجتماع ہوا تھا اس کی تجاویز میں سب سے بہتر اور مبارک تجویز یہ تھی کہ اسلام کے قبلۂ اول میں تمام مسلمانانِ عالم کے لئے ایک جامعۂ اسلامیہ (مسلم یونیورسٹی) قائم کی جائے۔ اس تجویز کو عموماً پسند کیا گیا! اور مصر و فلسطین میں اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک حرکت شروع ہوگئی تاحال کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تعلیمگاہ کے لئے ایک بڑی عمارت اور اس کے مصارف کیلئے ۸ ہزار پونڈ سالانہ کے اوقاف مل گئے ہیں لیکن ابھی کام شروع کرنیکے لئے مزید ۸۰۰۰۰ پونڈ کا انتظام ہونا ضروری ہے چنانچہ اس غرض کے لئے فلسطین کے مفتی اعظم مولانا الحاج امین الحسینیؒ اور مصر کے سابق وزیر محمد علی پاشا علوبہ آجکل ہندوستان آئے ہوئے ہیں! اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس جامعۂ اسلامیہ میں تعلیم کا انتظام جس نہج پر ہوگا اس کی تفصیلات ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آئیں لیکن معزز وافدین نے اس کا جو مختصر خاکہ اپنے بیانات میں پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سردست جامعہ کے چار شعبے ہوں گے: دینیات، طب، زراعت اور صنعت و حرفت۔

اگرچہ جامعہ مذکور کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی تفصیلات کا مطالعہ کئے بغیر محض اس مختصر بیان پر کوئی رائے ظاہر کرنا قبل از وقت ہوگا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ان تفصیلات کے متعین ہونے سے پہلے چند باتیں اصول کے طور پر جامعۂ اسلامیہ کے موسسین و ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کریں۔

جہانتک مسلمانان فلسطین کی مقامی ضروریات کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے نہ صرف ان شعبوں کا قائم

ہونا ضروری ہے جن کا ذکر معزز وافدین نے کیا ہے، بلکہ فنونِ ہندسہ حقوق اور اگر ممکن ہو تو فنِ حرب کے شعبے بھی قائم کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن اس حیثیت سے اس جامعہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہ ہوگی جس کی بنا پر وہ جامعۂ اسلامیہ کہی جاسکے، اور تمام مسلمانانِ عالم کے لئے ایک علمی و فکری مرکز بن سکے اسی طرح اگر اس میں شعبۂ دینیات کی حیثیت بھی وہی ہو جیسی قاہرہ، حیدرآباد، دہلی اور علیگڈھ کی یونیورسٹیوں میں ہے تب بھی یہ اس مقصد کو پورا نہ کرسکے گی جس کی خاطر دنیائے اسلام کے لئے ایک مرکزی جامعۂ اسلامیہ کی ضرورت محسوس کیجارہی ہے، اور یہی کیفیت اس صورت میں بھی ہوگی کہ اس مجوزہ یونیورسٹی کا شعبۂ دینیات عالم اسلامی میں دیوبند اور ازہر کی طرح کے ایک اور معہد علمی اسلامی کا اضافہ کردے۔ دراصل عالم اسلامی کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک ایسی جامعہ ہے جو علوم اسلامیہ میں نئے سرے سے زندگی کی روح پھونک دے، سات صدیوں سے ان پر جمود اور خمود کی جو کیفیت طاری ہے اس کو دور کرے، ان میں حرکت اور نمو کی قوت پیدا کرے، اور ان کے نظام میں ایسی جان ڈال دے کہ جو لوگ ان کو پڑھ کر نکلیں وہ جامد اور ٹھوس مقلد نہ ہوں بلکہ اصحاب فکر و اجتہاد ہوں، اور علمائے متاخرین کی طرح محض درس و افتا کے مسند نشین نہ ہوں، بلکہ فکر و عمل کے میدان میں مسلمانوں کے قائد و رہنما بن سکیں۔

اس وقت مسلمانوں کی جتنی یونیورسٹیاں دنیا میں قائم ہیں وہ سب بلاشبہ اپنے اپنے میدان میں کچھ نہ کچھ مفید کام کررہی ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی اصلی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو ان میں مغربی یونیورسٹیوں کی ہوبہو نقل اتارنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس بنا پر وہ اس تخیل، اس روح، اس قوت محرکہ اور اس ذہنیت سے خالی ہیں جو خالص اسلامی ہو، یا پھر وہ صدیوں پہلے کے اسلامی مدارس کے آثار باقیہ ہیں جن میں اسلامیت اس معنی میں تو ضرور ہے کہ ان کا ڈھانچا اسلامی طرز کا ہے، مگر وہ فکر و عمل کی روح سے خالی محض ایک بے جان ڈھانچہ ہے۔ پہلی قسم کی یونیورسٹیاں اس ٹکسال کی طرح ہیں جو دوسری ٹکسالوں کے سکے بناتی ہے۔ اور دوسری قسم کی یونیورسٹیاں اس ٹکسال کے مانند ہیں جو سکے تو اپنے ہی بناتی ہے، مگر ان کا چلن دنیا میں نہیں ہے۔ ہماری ضرورت ان دونوں ٹکسالوں سے پوری نہیں ہوتی کیونکہ ہمیں ضرورت ایسی ٹکسال کی ہے جو سکے بھی اپنے بنائے اور دنیا میں ان کا چلن بھی ہو۔ یہی مسئلہ ہے جس کو حل کرنے کے لئے گذشتہ نصف صدی

یے مسلمانوں کے ارباب فکر کوشش کر رہے ہیں غور کیا جا رہا ہے کہ تعلیم کے ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر کوئی ایسا طریقہ ایجاد کیا جائے جس کا ڈھانچہ بھی اسلامی ہو اور روح بھی اسلامی اور پھر اس کے ساتھ ہی اس میں وہ قوت محرکہ بھی ہو جو وقت کی رہنمائی کے لئے ضروری ہے کچھ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس سوال کا حل علوم جدیدہ اور علوم اسلامیہ کے ایک معتدل امتزاج میں ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے یہ رائے قائم کی کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم کو علوم جدیدہ کے طرز پر ڈھالا جائے۔ ان مختلف خیالات کے تحت اب تک مختلف تعلیمی تجربے ہو چکے ہیں اور ان سے نسبۃً بہتر نتائج بھی حاصل ہوئے ہیں لیکن اصلی مقصد جس کے لئے یہ تمام کوششیں کی جارہی ہیں اب تک حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

جہاں تک علوم جدیدہ اور علوم اسلامیہ کی آمیزش کا تعلق ہے، اس کے مفید اور ضروری ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر ہمارے نزدیک صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم کے طرز میں بنیادی تغیر کیا جائے اور سرے سے پوری مشین کی ترتیب ہی کو بدل دیا جائے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم جدید طرز پر ہو جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے بلکہ ہمارا مقصد اس کے بالکل برعکس ہے ہم چاہتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم کو جس ڈھنگ پر متاخرین نے ڈال دیا ہے اس کو چھوڑ کر وہ ڈھنگ اختیار کیا جائے جو اسلام کی ابتدائی چار صدیوں میں رائج تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آج اس چودھویں صدی میں ہم وہ طریق تعلیم اختیار کرنا چاہتے ہیں جو دوسری اور تیسری صدی کے مناسب حال تھا۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ہمیں اسلامی علوم کی تعلیم کا وہ اصول اختیار کرنا چاہئے جس سے مجتہد پیدا ہوتے تھے اور وہ اصول ترک کر دینا چاہئے جس سے بعد میں مقلد پیدا ہونے لگے۔

یہ اصول کیا ہے؟ مختصر الفاظ میں اس کا بیان یہ ہے کہ ہمارے پورے نظام تعلیم کا مرکز اور مدار قرآن مجید ہونا چاہئے درس و تدریس کی اصلی غرض یہ ہو کہ ہمیں قرآن مجید کو سمجھنا ہے، اس کے معانی و مطالب تک رسائی حاصل کرنی ہے، اس کے معارف و حقائق میں بصیرت پیدا کرنی ہے، اس کو اپنے افکار و اپنے تخیلات کا حقیقی رہنما بنانا ہے، اور

اپنی زندگی اس کے سانچے میں ڈھالنی ہے عربی صرف ونحو لغت و ادب معانی و بیان کی تعلیم اس لئے ہو کہ کلام الٰہی کی عبارتوں کو سمجھا جائے سیرت رسول احادیث و آثار صحابہ و تابعین اور بزرگان اہل بیت کی سیرتوں اور ان کے اقوال کا تفحص اس لئے کیا جائے کہ رسول اکرم اور آپ کے بعد تابعین نے قرآن کو کس طرح سمجھا کس طرح سمجھایا اور اپنی عملی زندگی میں اس کو کس طرح برتا فقہا کے کلام اور ان کے اجتہادات میں اس نقطۂ نظر سے غور و خوض کیا جائے کہ ان سے وہ طریقے معلوم کئے جائیں جن پر عمل کر کے مشکوٰۃ نبوت سے اقتباس کرنے والوں نے مسائل کا استنباط کیا اور اصول سے فروع نکالے مفسرین کی تقریروں اور متکلمین کی تاویلوں کا مطالعہ اس غرض سے کیا جائے کہ ان سے وہ تمام پہلو نظر میں آجائیں جو مختلف خیالات رکھنے والے اہل علم و تحقیق نے کتاب و سنت کی تعبیر میں اختیار کئے ہیں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات، قانون اور علوم عمرانی کا مطالعہ اس غرض سے کیا جائے کہ ہم اپنی زندگی کے مسائل میں کتاب و سنت کے مقرر کئے ہوئے اصول پر عمل کرنے کے صحیح طریقے متعین کر سکیں، اور اسلامی نظام تمدن کو ایک ایسا نظام بنا سکیں جو ساکن و جامد نہ ہو، بلکہ وقت اور زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا رہے فلسفہ و منطق اور علوم عقلیہ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ افکار بشری میں انقلاب پیدا ہو اور اسلامی فکر اور اسلامی تخیل دماغوں پر حکمران ہو جائے غرض ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہم ایک ایسا نظام تعلیم قائم کریں جس میں قرآن کی حیثیت ایک محور کی ہو اور یہ پورا نظام اسی محور پر گردش کرے یہی ایک صورت ہے جس سے اسلامی تمدن نہ صرف زندہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کو دنیا کا غالب تمدن بنایا جا سکتا ہے۔

گذشتہ مہینے سے نواب بہادر یار جنگ بہادر نے ایک عمدہ تحریک شروع کی ہے جس کا چرچا حیدرآباد میں آہستہ آہستہ شروع ہو گیا ہے مقصد اس کا یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حلقۂ اثر میں قرآن مجید کی تعلیمات کو اشاعت دینے کی کوشش کرے اور نہ صرف خود اپنے اوقات کا ایک حصہ، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، قرآن مجید کو سمجھنے میں صرف کرے بلکہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بھی اس طرف توجہ دلائے نیز جن لوگوں کو وہ خود پڑھا سکتا ہو انھیں پڑھائے بھی چاہے وہ

روزانہ ایک ہی آیت ہو۔ یہ در اصل وہی تحریک ہے جو قرن اول کے مسلمانوں میں رائج تھی ہجرت کے بعد پچاس سال کے اندر اسلام جو آندھی اور طوفان کی طرح دنیا کے اطراف و اکناف میں پھیل گیا اس کے وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہر مسلمان اپنی دوسری حیثیات کیساتھ ایک مستقل حیثیت مبلغ اور معلم ہونیکی بھی رکھتا تھا۔ قرآن کی تعلیم اس وقت مسجد کے ملاؤں اور مکتب کے استادوں کیلئے مختص نہ تھی اور نہ اسلام کی تبلیغ کیلئے واعظوں اور مبلغوں کا کوئی الگ پیشہ بنا تھا بلکہ مسلمان جہاں اور جس حیثیت میں بھی تھا معلم قرآن اور مبلغ اسلام تھا ضرورت ہے کہ اسی طریقے کو اب بھی اختیار کیا جائے اور ہر شخص فرداً فرداً کلام الٰہی کے پھیلانے کی کوشش کرے۔

کیا ہم امید کریں کہ دوسرے مقامات کے مسلمان بھی اس تحریک کو اشاعت دیں گے؟

مغرب کے نظام تمدن کو جو شدید امراض اس وقت لاحق ہیں ان میں سے ایک بڑا مرض عورتوں کا معاشی استقلال ہے اہل مغرب نے غلطی سے عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات پیدا کرنے کے معنی یہ سمجھے کہ جو کام مرد کریں وہی عورتیں بھی کریں۔ گذشتہ جنگ عظیم کی غیر معمولی ضروریات نے اس غلط نظریہ کو عملی صورت دیدی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام عورتوں سے متعلق تھے ان کو چھوڑ کر وہ کارخانوں، بازاروں اور دفتروں میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگیں یورپ اور امریکہ کے صنعتی ممالک اس وقت عائلی زندگی کی برہمی ازدواجی رشتوں کے فقدان مناکحت کی طرف رجحانات کی کمی معیار اخلاق کی پستی امراض خبیثہ کی خوفناک ترقی شرح پیدائش کے روز افزوں تنزل اور محنت پیشہ طبقوں کی بڑھتی ہوئی بیکاری کے جن گوناگون خطرات میں مبتلا ہیں ان کی براہ راست ذمہ داری عورتوں کے اسی معاشی استقلال پر عائد ہوتی ہے۔

بظاہر اس معاشی استقلال میں جو محاسن ہیں ان کو دیکھ کر اہل مشرق بھی مغرب کی تقلید کرنا چاہتے ہیں مگر شاید ان کو معلوم نہیں کہ مغرب کے عاقبت اندیش مدبر خود اس غلط نظام کی خرابیاں محسوس کر کے اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں! اس معاملہ میں اٹلی کے فرمانروا سینور مسولینی نے جو کچھ کیا ہے وہ مشہور ہے اب دوسری مثال جرمنی کے نئے چانسلر ہٹلر کی ہے جو جرمنی کی تعمیر جدید کے لئے وہ جن تدابیر کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے ان میں سے

ایک یہ ہے کہ عورتوں کو ان کے فطری حدود عمل میں واپس کیا جائے چنانچہ حال میں جو قانون اس نے نافذ کیا ہے اس کی رو سے تمام غیر شادی شدہ مردوں و عورتوں پر ایک ٹیکس عائد کیا جائے گا اور اس ٹیکس سے جو رقم جمع ہوگی اس سے ان لوگوں کو ضروریات خانہ داری مہیا کرنے میں مدد دی جائے گی جو شادی کریں گے بشرطیکہ عورت یہ عہد کرے کہ جب تک اس کا شوہر کم از کم ۱۲۵ مارک ماہوار کماتا رہیگا اس وقت تک وہ کوئی ملازمت قبول نہ کریگی۔

امریکہ کی دولت مندی و خوشحالی پر دنیا میں رشک کیا جاتا ہے مگر خود اس ملک کے باشندے اپنے نظام تمدن کی بدولت جن مشکلات میں مبتلا ہیں ان کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کے اس سب سے زیادہ دولت مند ملک میں خودکشی کی رفتار تمام ممالک سے زیادہ بڑھ رہی ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں وہاں (۲۰۰۸۸) آدمیوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں یہ تعداد (۲۲۳۰۰) تک پہنچ گئی گویا ایک سال میں تقریباً ۲ ہزار خودکشیوں کا اضافہ ہوا۔ اس کے قریب قریب انگلستان کا حال بھی ہے جہاں سنہ ۱۹۱۱-۲۰ء میں خودکشی کا اوسط ۸۰ فی ملین تھا سنہ ۱۹۲۵ء میں ۱۰۵ ہوا، اور سنہ ۱۹۳۰ء میں ۲۷ تک پہنچ گیا۔ ظاہر ہے کہ انسان اپنی ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ اسی حالت میں کرتا ہے جب اس کے لئے زندگی کے آلام ناقابل برداشت ہوجاتے ہیں، اور اس حالت میں بھی صرف وہی لوگ ایسا کرتے ہیں جن میں قوت تحمل کم ہوتی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مغربی زندگی کے آلام کتنی کثیر آبادی کو پریشانیوں میں مبتلا کئے ہوئے ہوں گے جن میں سے چند ہزار آدمی ہر سال اپنے آپ کو خود ہلاک کر دینے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔

یہ نتائج ہیں اس نظام تمدن کے جسے اختیار کرنے کے لئے ہماری قوم کے ارباب تجدد بےچین ہیں مگر کیا انہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اسلامی تمدن کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی، کبھی اسلامی ممالک میں انسان پر عرصۂ حیات اتنا تنگ ہوا تھا کہ وہ دنیا سے بھاگ کر اس طرح موت کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہوتا؟ کیا اسلامی تاریخ کے کسی دور میں خودکشیوں کی اتنی کثرت یا اس سے کم کسی قابل لحاظ تعداد کا پتہ دیا جاسکتا ہے؟

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۳)

زندگی کا اسلامی تصور

گذشتہ دو صحبتوں میں اسلام کے تصور حیات و دنیا کی جو تحلیل کی گئی ہے اس سے وہ تمام اجزاء آپ کے سامنے آگئے ہیں جن سے یہ تصور مرکب ہے۔ اب تحلیل و تجزیہ کے پہلو کو چھوڑ کر ترکیب و تالیف کے پہلو پر نظر ڈالئے اور یہ دیکھئے کہ ان متفرق اجزا کے ملنے سے جو کلی تصور حاصل ہوتا ہے وہ کس حد تک فطرت اور واقعہ کے مطابق ہے؟ اور دنیوی زندگی کے متعلق دوسری تہذیبوں کے تصورات کی نسبت سے اس کا کیا مرتبہ ہے؟ اور اس تصور حیات پر جس تہذیب کی بنیاد قائم ہو وہ انسان کے فکر و عمل کو کس سانچے میں ڈھالتی ہے؟

زندگی کا فطری تصور تھوڑی دیر کے لئے اپنے ذہن کو تمام ان تصورات سے جو دنیا اور حیات دنیا کے متعلق مختلف مذاہب نے پیش کئے ہیں خالی کر کے ایک مبصر کی حیثیت سے اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نگاہ ڈالئے اور غور کیجئے کہ اس پورے ماحول میں آپ کی حالت کیا ہے۔ اس مشاہدہ میں آپ کو چند باتیں واضح طور پر نظر آئیں گی۔

آپ دیکھیں گے کہ جتنی قوتیں آپ کو حاصل ہیں ان کا دائرہ محدود ہے۔ آپ کے حواس جن پر آپ کے علم کا انحصار ہے آپ کے قریبی ماحول کی حدود سے آگے نہیں بڑھتے۔ آپ کے جوارح جن پر آپ کے عمل کا انحصار ہے بہت تھوڑی سی اشیا پر دسترس رکھتے ہیں۔ آپ کے گرد و پیش بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو آپ سے جسم اور طاقت میں بڑھی ہوئی ہیں اور ان کے مقابلہ میں آپ کی ہستی نہایت حقیر اور کمزور نظر آتی ہے۔ دنیا کے اس بڑے کارخانے میں جو زبردست قوتیں کارفرما ہیں ان میں سے کوئی بھی آپ کے دستِ قدرت میں نہیں ہے اور آپ ان قوتوں کے مقابلہ میں اپنے

آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ جسمانی حیثیت سے آپ ایک متوسط درجے کی ہستی رکھتے ہیں جو اپنے سے چھوٹی چیزوں پر غالب اور اپنے سے بڑی چیزوں سے مغلوب ہے ۔

لیکن ایک اور قوت آپ کے اندر ایسی ہے جس نے آپ کو ان تمام چیزوں پر شرف عطا کر دیا ہے۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنی جنس کے تمام حیوانات پر قابو پالیتے ہیں اور ان کی جسمانی طاقتوں کو جو آپ کی جسمانی طاقت سے بہت بڑھی ہوئی ہیں مغلوب کر لیتے ہیں۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنے گردوپیش کی چیزوں میں تصرف کرتے ہیں اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق خدمت لیتے ہیں۔ اسی قوت کی بدولت آپ طاقت کے نئے نئے خزانوں کا پتہ چلاتے ہیں اور ان کو نکال کر نئے نئے طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنے وسائل اکتساب علم کو وسعت دیتے ہیں اور ان چیزوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو آپ کے طبیعی قویٰ کی دسترس سے باہر ہیں۔ غرض ایک قوت ہے جس کی بدولت تمام دنیا کی چیزیں آپ کی خادم بن جاتی ہیں اور آپ ان کے مخدوم ہونے کی عزت حاصل کرتے ہیں ۔

پھر کارگاہ ہستی کی وہ بالاتر قوتیں بھی جو آپ کے دست قدرت میں نہیں ہیں اس ڈھنگ پر کام کر رہی ہیں کہ بحیثیت مجموعی وہ آپ کی دشمن و مخالف نہیں بلکہ آپ کی مددگار اور آپ کے مفاد و مصلحت کی تابع ہیں۔ ہوا، پانی، روشنی، حرارت، اور ایسی ہی دوسری قوتیں جن پر آپ کی زندگی کا انحصار ہے کسی ایسے نظام کے ماتحت عمل کر رہی ہیں جس کا مقصد آپ کی مساعدت کرنا ہے اور اسی بنا پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سب آپ کے لیے مسخر ہیں ۔

اپنے اس ماحول پر جب آپ ایک عمیق نگاہ ڈالتے ہیں تو آپ کو ایک زبردست قانون کارفرما نظر آتا ہے جس کی گرفت میں قصیر ترین ہستیوں سے لیکر عظیم ترین ہستیاں تک یکساں جکڑی ہوئی ہیں، اور جس کے ضبط و نظم پر تمام عالم کے بقا کا انحصار ہے۔ آپ خود بھی اس قانون کے تابع ہیں، مگر آپ میں اور دوسری اشیاء عالم میں ایک بڑا فرق ہے۔ دوسری تمام چیزیں اس قانون کے خلاف حرکت کرنے پر ذرہ برابر قدرت نہیں رکھتیں لیکن آپ کو اس کے خلاف چلنے کی قدرت حاصل ہے یہی نہیں بلکہ جب آپ اس کے خلاف چلنا چاہتے ہیں تو وہ قانون اس خلاف ورزی میں بھی آپ کی مساعدت کرتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر ایسی خلاف ورزی اپنے ساتھ کچھ مضرتیں رکھتی ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آپ اس کی مخالفت کرنے

کے بعد اس کے برے اثرات سے بچ جائیں۔

اس عالمگیر اور ہائل قانون کے تحت دنیا میں کون و فساد کے مختلف مظاہر آپ کو نظر آتے ہیں تمام عالم میں بننے اور بگڑنے کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے جس قانون کے تحت ایک چیز کو پیدا اور پرورش کیا جاتا ہے اسی قانون کے تحت اس کو مٹایا اور ہلاک بھی کر دیا جاتا ہے۔ دنیا کی کوئی شے اس قانون کے نفاذ سے محفوظ نہیں ہے بظاہر جو چیزیں اس سے محفوظ نظر آتی ہیں اور جن پر استمرار و دوام کا شبہ ہوتا ہے ان کو بھی جب آپ تعمق کی نظر سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حرکت و تغیر کا عمل ان میں بھی جاری ہے۔ اور کون و فساد کے چکر سے ان کو بھی نجات حاصل نہیں ہے چونکہ کائنات کی دوسری چیزیں شعور و ادراک نہیں رکھتیں، یا کم از کم ہم کو اس کا علم نہیں ہے کہ ان میں شعور و ادراک ہے یا نہیں اس لئے ہم ان کے اندر اس بننے و بگڑنے سے کسی لذت و الم کا اثر محسوس نہیں کرتے اور اگر انواع حیوانی میں اس کا اثر محسوس ہوتا بھی ہے تو وہ بہت محدود ہوتا ہے لیکن انسان جو ایک صاحب شعور و ادراک ہستی ہے اپنے گرد و پیش ان تغیرات کو دیکھ کر لذت و الم کے شدید اثرات محسوس کرتا ہے کبھی مناسب طبع امور سے اس کی لذت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے کہ اس دنیا میں فساد بھی ہے اور کبھی مخالف طبع امور سے اس کا الم اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں اسے نرا فساد ہی فساد نظر آنے لگتا ہے اور وہ بھول جاتا ہے کہ یہاں کون بھی ہے۔

مگر خواہ آپ کے اندر لذت اور الم کے کیسے ہی متضاد احساسات ہوں اور ان کے زیر اثر دنیوی زندگی کے متعلق آپ کا نظریہ کتنا ہی افراط یا تفریط کی طرف مائل ہو، بہرحال آپ اپنی جبلت سے مجبور ہیں کہ اس دنیا کو جیسی بھی یہ ہے، عملاً برتیں اور ان قوتوں سے جو آپ کے اندر موجود ہیں کام لیں۔ آپ کی جبلت میں زندہ رہنے کی خواہش موجود ہے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے آپ کے اندر بھوک کی ایک زبردست قوت رکھ دی گئی ہے جو دائماً آپ کو عمل پر مجبور کرتی رہتی ہے فطرت کا قانون آپ کی نوع کے استمرار کے لئے آپ سے خدمت لینا چاہتا ہے اور اس کے لئے اس نے شہوت کی ایک ناقابل دفع قوت آپ کے اندر رکھ دی ہے جو آپ سے اپنا مقصد پورا کرا کے ہی چھوڑتی ہے۔ اسی طرح آپ کی جبلت میں کچھ دوسرے مقاصد کے لئے کچھ اور قوتیں بھی رکھ دی گئی ہیں اور وہ سب آپ سے بزور اپنا کام لے لیتی ہیں۔ اب یہ آپ کی اپنی

فراست و دانائی پر موقوف ہے کہ فطرت کے ان مقاصد کی خدمت اچھے طریقے سے انجام دیں یا برے طریقے سے طیب نفس انجام دیں یا بجبر و اکراہ یہی نہیں بلکہ خود فطرت ہی نے مخصوص طور پر آپ کو یہ قدرت بھی عطا کی ہے کہ ان مقاصد کی خدمت انجام دیں یا نہ دیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس فطرت کا قانون یہ بھی ہے کہ اس کی خدمت بجا لانا اور اچھے طریقے سے طیب نفس بجا لانا آپ کے لئے مفید ہوتا ہے اور اگر آپ اس سے روگردانی کریں۔ یا اگر اس کی متابعت کریں بھی تو بری طرح کریں تو یہ خود آپ ہی کے لئے مضر ہوتا ہے۔

مختلف مذاہب کے تصورات ایک صحیح الفطرت اور صحیح النظر آدمی جب دنیا پر نظر ڈالے گا اور اس دنیا کی نسبت سے اپنی حالت پر غور کرے گا تو وہ تمام پہلو اس کی نگاہ کے سامنے آجائیں گے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں لیکن نوع انسانی کے مختلف گروہوں نے اس مرقع کو مختلف گوشوں سے دیکھا ہے اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ جس کو جو پہلو نمایاں نظر آیا، اس نے حیات دنیا کے متعلق اسی پہلو کے لحاظ سے ایک نظریہ قائم کرلیا، اور دوسرے پہلوؤں پر نگاہ ڈالنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

مثال کے طور پر ایک گروہ نے انسان کی کمزوری اور بے بسی اور اس کے مقابلہ میں فطرت کی بڑی بڑی طاقتوں کی شوکت و جبروت کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ دنیا میں وہ ایک نہایت ہی حقیر ہستی ہے اور یہ نافع و ضار قوتیں جو دنیا میں نظر آتی ہیں کسی عالمگیر قانون کی تابع نہیں ہیں بلکہ خود مختار یا نیم خود مختار طاقتیں ہیں۔ یہ تخیل ان کے ذہن پر اتنا غالب ہوا کہ وہ پہلو جس سے تمام کائنات پر انسان کو شرف و مزیت حاصل ہے، ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا وہ اپنی ہستی کے روشن پہلو کو بھول گئے، اور اپنی عزت و بزرگی کے احساس کو انہوں نے اپنی کمزوری و ناتوانی کے مبالغہ آمیز اعتراف پر قربان کر دیا بت پرستی شجر پرستی ستارہ پرستی اور دوسرے قوائے فطرت کی پرستش اسی نظریہ کی پیداوار ہے۔

ایک دوسرے گروہ نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں بس فساد ہی فساد ہے تمام کارخانہ ہستی اس لئے چل رہا ہے کہ انسان کو تکلیف و رنج و الم پہنچائے۔ دنیا کے جتنے تعلقات اور روابط ہیں سب انسان کو پریشانیوں اور مصیبتوں میں پھانسنے والے پھندے ہیں۔ ایک انسان پر ہی کیا موقوف ہے تمام کائنات افسردگی اور ہلاکت کے پنجے میں گرفتار ہے

یہاں جو کچھ بنتا ہے بگڑنے کے لئے بنتا ہے۔ بہار اس لئے آتی ہے کہ خزاں اس کا چمن لوٹ لے، زندگی کا شجر اس لئے برگ و بار لاتا ہے کہ موت کا عفریت اس سے لطف اندوز ہو، بقا کا جمال سنور سنور کر اس لئے آتا ہے کہ فنا کے دیوتا کو اس سے کھیلنے کا خوب موقع ملے۔ اس تخیل نے ان لوگوں کے لئے دنیا اور اس کی زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ چھوڑی اور انہوں نے اپنے لئے نجات کی راہ بس اسی میں دیکھی کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائیں، نفس کشی اور ریاضت سے اپنے تمام حسیات کو باطل کر دیں اور فطرت کے اس ظالم قانون کو توڑ ڈالیں جس نے محض اپنے کارخانے کو چلانے کے لئے انسان کو آلۂ کار بنا لیا ہے۔

ایک اور گروہ نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں انسان کے لئے لذت و عیش کے سامان فراہم ہیں اور اس کو ایک تھوڑی سی مدت ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے مل گئی ہے تکلیف اور الم کا احساس ان لذتوں کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ اگر انسان اس احساس کو باطل کر دے اور کسی چیز کو اپنے لئے موجب الم اور باعث تکلیف نہ رہنے دے تو پھر یہاں لطف ہی لطف ہے۔ اس کے لئے جو کچھ بھی ہے یہی دنیا ہے اور اس کو جو کچھ مزے اڑانے ہیں اسی دنیوی زندگی میں اڑانے ہیں۔ موت کے بعد نہ وہ ہوگا نہ دنیا ہوگی نہ اس کی لذتیں ہوں گی، سب کچھ نسیاً منسیا ہو جائیگا۔

اس کے مقابلہ میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو دنیا اور اس کی لذتوں اور مسرتوں بلکہ خود دنیوی زندگی ہی کو سراسر گناہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی روح کے لئے دنیا کی مادی آلائشیں ایک نجاست اور ایک ناپاکی کا حکم رکھتی ہیں۔ اس دنیا کو برتنے اور اس کے کاروبار میں حصہ لینے اور اس کی لذتوں اور مسرتوں سے لطف اندوز ہونے میں انسان کے لئے کوئی پاکیزگی اور کوئی صلاح اور خیر نہیں ہے۔ جو شخص آسمانی بادشاہت سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہو اسے دنیا سے الگ تھلگ رہنا چاہئے، اور جو دنیا کی دولت و حکومت اور دنیوی زندگی کا لطف اٹھانا چاہتا ہو اسے یقین رکھنا چاہئے کہ آسمانی بادشاہت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر جب اس گروہ نے محسوس کیا کہ انسان اس دنیا کو برتنے اور اس کے دھندوں میں پھنسنے کے لئے اپنی جبلت سے مجبور ہے اور آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کا خیال خواہ کتنا ہی دلفریب ہو، مگر وہ اتنا قوی نہیں ہو سکتا کہ انسان اس کے بل پر اپنی فطرت کے اقتضاء کا مقابلہ

کرسکے، تو انہوں نے آسمانی بادشاہت تک پہنچنے کے لئے ایک قریب کا راستہ نکال لیا، اور وہ یہ تھا کہ ایک ہستی کے کفارے نے ان سب لوگوں کو ان کے اعمال کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے جو اس ہستی پر ایمان لائیں۔

ایک اور گروہ نے قانونِ فطرت کی ہمہ گیری کو دیکھ کر انسان کو ایک مجبور محض ہستی سمجھ لیا۔ اس نے دیکھا کہ نفسیات، عضویات، حیاتیات اور قانون توریث کی شہادتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان ہرگز کوئی مرید و مختار ہستی نہیں ہے، فطرت کے قانون نے اس کو بالکل جکڑ رکھا ہے، وہ اس قانون کے خلاف نہ کچھ سوچ سکتا ہے، نہ کسی چیز کا ارادہ کر سکتا ہے، اور نہ کوئی حرکت کرنے پر قادر ہے۔ لہٰذا اس پر اپنے کسی فعل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اس کے بالکل برعکس ایک گروہ کی نگاہ میں انسان نہ صرف ایک صاحبِ ارادہ ہستی ہے بلکہ وہ کسی بالاتر ارادہ کا تابع، اور کسی اعلیٰ طاقت کا مطیع و فرمانبردار نہیں ہے، اور نہ اپنے اعمال و افعال میں خود اپنے ضمیر یا انسانی حکومت کے قانون کے سوا کسی کے آگے جواب دہ ہے۔ وہ اس دنیا کا مالک ہے۔ دنیا کی سب چیزیں اس کے لئے ہیں، اسے اختیار ہے کہ ان کو جس طرح چاہے برتے۔ اس نے اپنی زندگی کو بہتر بنانے اور اپنے اعمال و افعال میں ایک ضبط و نظم پیدا کرنے کے لئے اپنی حیاتِ انفرادی پر خود ہی کچھ پابندیاں عاید کر لی ہیں مگر اجتماعی حیثیت سے وہ بالکل مطلق العنان ہے، اور کسی بالاتر ہستی کے آگے مسئول ہونے کا تخیل سراسر لغو ہے۔

یہ دنیوی زندگی کے متعلق مختلف مذاہبِ فکر و رائے کے مختلف تصورات ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن پر مختلف تہذیبوں کی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں۔ ہر تہذیب کی عمارت میں جو مختلف طرز و انداز ہم کو نظر آ رہے ہیں ان کے ایک مخصوص اور جداگانہ ہیئت اختیار کرنے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان کی بنیادیں دنیوی زندگی کا ایک خاص تصور ہے جو اس مخصوص ہیئت کا مقتضی ہوا ہے۔ اگر ہم ان میں سے ہر ایک کی تفصیلات پر نظر ڈال کر یہ تحقیق کریں کہ اس نے کس طرح ایک خاص طرز و انداز کی تہذیب پیدا کی ہے تو یہ یقیناً ایک دلچسپ بحث ہوگی لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے کیونکہ ہم صرف اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ

زندگی کے یہ جتنے تصورات آپ کے سامنے بیان ہوئے ہیں یہ سب دنیا کو ایک خاص گوشۂ نظر سے دیکھنے کا نتیجہ ہیں ان میں سے کوئی تصور ایسا نہیں ہے جو مجموعی حیثیت سے تمام کائنات پر ایک کلی نگاہ ڈالنے، اور موجوداتِ عالم میں انسان کی صحیح حیثیت متعین کرنے کے بعد قائم کیا گیا ہو، اور یہی وجہ ہے کہ ہر تصور ہماری نظر میں باطل ہو جاتا ہے جب ہم اس زاویۂ نگاہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دنیا کو دیکھتے ہیں۔ اور پھر دنیا کے کلی ملاحظہ کے بعد ان تمام تصورات کی غلطی ہم پر روشن ہو جاتی ہے۔

اسلامی تصور کی خصوصیت اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ زندگی کے تمام تصورات میں صرف اسلام ہی کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو فطرت اور حقیقت کے مطابق ہے، اور جس میں دنیا اور انسان کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ نہ تو دنیا کوئی ترک اور نفرت کے قابل چیز ہے اور نہ ایسی چیز ہے کہ انسان اس کا فریفتہ ہو اور اس کی لذتوں میں گم ہو جائے۔ نہ وہ سراسر سکون ہے، نہ سراسر فساد۔ نہ اس سے اجتناب درست ہے، اور نہ اس میں کلی انہماک صحیح۔ نہ وہ بالکل نجاست و آلودگی ہے۔ اور نہ تمام تر پاکیزگی و طہارت پھر اس دنیا سے انسان کا تعلق نہ اس قسم کا ہے جیسا ایک بادشاہ کا اپنی مملکت سے ہوتا ہے اور نہ اس قسم کا جیسا ایک قیدی کا اپنے قید خانے سے۔ نہ انسان اتنا حقیر ہے کہ دنیا کی ہر قوت اس کی مسجود ہو، اور نہ اتنا غالب و قاہر ہے کہ وہ دنیا کی ہر شے کا مسجود بن جائے۔ نہ وہ اتنا بے بس ہے کہ اس کا ذاتی ارادہ کوئی چیز ہی نہ ہو۔ اور نہ اتنا طاقتور ہے کہ بس اسی کا ارادہ سب کچھ ہو۔ نہ وہ عالم ہستی کا مطلق العنان فرمانروا ہے۔ اور نہ کمزوروں آقاؤں کا بیچارہ غلام حقیقت جو کچھ ہے وہ ان مختلف اطراف و نہایات کے درمیان ایک متوسط حالت ہے۔

یہاں تک تو فطرت اور عقل سلیم ہماری رہنمائی کرتی ہے لیکن اسلام اس سے آگے بڑھتا ہے اور اس امر کا ٹھیک ٹھیک تعین کرتا ہے کہ دنیا میں انسان کا حقیقی مرتبہ کیا ہے؟ انسان اور دنیا کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے؟ اور انسان اس دنیا کو برتے تو کیا سمجھ کر برتے؟ وہ یہ کہہ کر انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے کہ تو عام مخلوقات کی طرح نہیں ہے بلکہ روئے زمین پر رب العالمین کا ذمہ دار خلیفہ ہے، دنیا اور اس کی طاقتوں کو

تیرے لئے مسخر کیا گیا ہے، تو سب کا حاکم اور ایک کا محکوم ہے، سب کا فرماں روا اور صرف ایک کا تابع فرمان ہے۔ تجھے تمام مخلوقات پر عزت و شرف حاصل ہے مگر عزت کا صحیح استحقاق تجھے اس وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب تو اس کا مطیع اور فرماں بردار رہو اور اس کے احکام کا اتباع کرے جس نے تجھے نیابت کا منصب عطا کر کے دنیا پر شرف بخشا ہے۔ دنیا میں تو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس کو برتے اور اس میں تصرف کرے پھر تو اس دنیا کی زندگی میں جس طرح صحیح یا غلط عمل کریگا اس پر وہ اچھے یا برے نتائج مترتب ہوں گے جنھیں تو بعد کی زندگی میں دیکھے گا۔ لہذا دنیوی زندگی کی اس تھوڑی سی مدت میں تجھ کو اپنی شخصی ذمہ داری اور مسئولیت کا ہر لحظہ احساس رہنا چاہئے اور کبھی اس سے غافل نہ ہونا چاہئے کہ جو چیزیں رب العالمین نے اپنے نائب کی حیثیت سے تیری امانت میں دی ہیں، ان سب کا تجھ سے پورا پورا حساب لیا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تصور اپنے جزئیات کے ساتھ ہر مسلمان کے ذہن میں حاضر نہیں ہے، اور نہ اہل علم کے مخصوص گروہ کے سوا کوئی ان جزئیات کا واضح ادراک رکھتا ہے لیکن چونکہ یہ تصور اسلامی تہذیب کی بیخ و بنیاد میں مکمن ہے اس لئے مسلمان کی سیرت اپنی اصلی شان اور اپنی حقیقی خصوصیات سے بہت کچھ عاری ہو جانے کے باوجود آج بھی اس کے اثرات سے خالی نہیں ہے ایک مسلمان جس نے اسلامی تہذیب کے ماحول میں تربیت پائی ہو، اس کا عمل خواہ بیرونی اثرات سے کتنا ہی ناقص ہو گیا ہو، لیکن خودداری و عزت نفس کا احساس خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنا خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنا خدا کے سوا کسی کو اپنا مالک اور آقا نہ سمجھنا دنیا میں اپنے آپ کو شخصاً مسئول سمجھنا۔ دنیا کو دار العمل اور آخرت کو دار الجزا سمجھنا صرف اپنے ذاتی اعمال کے حسن و قبح پر اپنی آخرت کی کامیابی و ناکامی کو منحصر سمجھنا، دنیا اور اس کی دولت و لذت کو ناپائیدار اور صرف اپنے اعمال اور ان کے نتائج کو باقی و دائم خیال کرنا یہ ایسے امور ہیں جو اس کے رگ و پے میں پیوست کئے ہوئے ہوں گے اور ایک عمیق النظر مبصر اس کی باتوں اور اس کی حرکات و سکنات میں اس عقیدے کے اثرات کو (خواہ وہ کتنے ہی دھندلے کیوں نہ ہوں) صاف محسوس کریگا جو اس کی روح اور اس کے دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہے۔

پھر جو شخص تہذیب اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اسے یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہوگی کہ اس میں

جب تک خالص اسلامیت رہی اس وقت تک یہ ایک خالص عملی تہذیب تھی۔ اس کے پیرووں کے نزدیک دنیا آخرت کی کھیتی تھی اور وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ دنیا میں جتنی مدت وہ زندہ رہیں اس کا ہر لمحہ اس کھیتی کے بونے اور جوتنے میں صرف کردیں اور زیادہ سے زیادہ تخم ریزی کریں تاکہ بعد کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ فصل کاٹنے کا موقع ملے۔ انہوں نے رہبانیت اور لذتیت کے درمیان ایک ایسی معتدل و متوسط حالت میں دنیا کو برتا جس کا نام و نشان بھی ہم کو کسی دوسری تہذیب میں نظر نہیں آتا۔ خلافت الٰہی کا تصور ان کو دنیا میں پوری طرح منہمک ہونے اور اس کے معاملات کو انتہائی سرگرمی کے ساتھ انجام دینے پر ابھارتا تھا، اور اس کے ساتھ مسئولیت اور ذمہ داری کا خیال انہیں حد سے متجاوز بھی نہ ہونے دیتا تھا۔ وہ نائب خدا ہونے کی وجہ سے انتہا درجہ کے خوددار تھے، اور پھر یہی تصور ان میں تکبر اور غرور کی پیدائش کو روکتا بھی تھا۔ وہ خلافت کے فرائض انجام دینے کے لئے ان تمام چیزوں کی طرف رغبت رکھتے تھے جو دنیا کا کام چلانے کے لئے ضروری ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی ان چیزوں کی طرف ان کو کوئی رغبت نہ تھی جو دنیا کی لذتوں میں گم کرکے انسان کو اس کے فرائض سے غافل کر دینے والی ہیں۔ غرض وہ دنیا کے کام کو اس طرح چلاتے تھے کہ گویا ان کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے، اور پھر اس کی لذتوں میں منہمک ہونے سے اس طرح بچے رہتے تھے کہ گویا یہ دنیا ان کے لئے ایک سرائے ہے جہاں محض عارضی طور پر وہ مقیم ہو گئے ہیں۔

بعد میں جب اسلامیت کا اثر کم ہو گیا، اور دوسری تہذیبوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی سیرت میں پوری اسلامی شان باقی نہیں رہی تو انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو دنیوی زندگی کے اسلامی تصور کے خلاف تھا۔ عیش و عشرت میں منہمک ہوئے، عالیشان قصر تعمیر کئے، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور دوسرے فنون لطیفہ میں دلچسپی لی، معاشرت اور طرز بود و ماند میں اس اسراف اور اس شان و شکوہ کو اختیار کیا جو اسلامی مذاق کے بالکل خلاف تھی، اور حکومت و سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات میں وہ طریقے اختیار کرلئے جو بالکل غیر اسلامی تھے، مگر اس کے باوجود دنیوی زندگی کا اسلامی تصور جو ان کے دل میں اترا ہوا تھا کہیں نہ کہیں اپنا اثر نمایاں کرکے رہتا تھا، اور یہی اثر ان کے اندر دوسروں کے مقابلے میں ایک امتیازی شان پیدا کر دیتا تھا۔ ایک مسلمان بادشاہ جمنا کے کنارے ایک عالیشان قصر

تعمیر کرتا ہے اور اس میں لطف و تفریح اور شان و شوکت کے وہ تمام سامان فراہم کرتا ہے جن کا انسان اس زمانہ میں تصور کر سکتا تھا مگر اس قصر کی سب سے زیادہ پر لطف تفریح گاہ میں پشت کی جانب (یعنی قبلہ کے رخ پر) یہ رباعی بھی کندہ کرتا ہے۔

اے بندپای قفل بروں ہشدار — وے دوختہ چشم و پای ودل ہشدار

عزم سفر مغرب درو در مشرق — اے راہ روپشت بمنزل ہشدار

وہ قصر اپنی عجیب نظر نہیں ہے۔ اس سے بہتر قصر دنیا کی دوسری قوموں میں مل سکتے ہیں مگر اس تخیل کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں مل سکتی جو روئے زمین پر فردوس بنانے والے کو "اے راہ روپشت بمنزل ھشدار" کی تنبیہ کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بکثرت ملیں گی کہ قیصر و کسریٰ کے نمونوں پر بادشاہی کرنے والوں نے بھی جب کسی دشمن پر فتح پائی تو اپنی کبریائی کا اظہار کرنے کے بجائے خدائے واحد کے سامنے خاک پر سربسجود ہو گئے۔ بڑے بڑے جابر و گردن کش فرمان رواؤں نے جب شریعت اسلامی کے خلاف عمل کرنا چاہا تو کسی بندۂ خدا نے ان کو برملا ٹوک دیا اور وہ خوف خدا سے کانپ اٹھے۔ انتہا درجہ کے بدعمل اور سیہ کار لوگوں کو کسی ایک معمولی بات سے تنبیہ ہو گئی اور دفعتہً ان کی زندگی کا رنگ بدل گیا۔ دولت دنیا پر جان فدا کرنے والوں کے دل میں دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کے حساب کتاب کا خیال آیا اور انہوں نے خدا کے بندوں پر سب کچھ تقسیم کر کے ایک مقتصدانہ زندگی اختیار کر لی غرض ان تمام غیر اسلامی اثرات کے باوجود جو مسلمانوں کی زندگی میں پھیل گئے ہیں۔ آپ کو ہر قدم پر ان کی قومی سیرت میں اسلامی تصور کا جلوہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آئے گا اور اس کو دیکھ کر آپ ایسا محسوس کریں گے کہ گویا اندھیرے میں دفعتاً روشنی نمودار ہو گئی۔

منظر الکرام حیدرآباد دکن کے مشاہیر حاضرہ کا تذکرہ جس کو کتبخانہ سرکار عالی، صیغہ جات ریاست، معزز ارباب حکومت اور تحت کے اکثر دفاتر کے کتبخانوں کیلئے خرید جا چکا ہے۔ اس کے سوا کتب خانہ آصفیہ کتبخانہ جامعہ عثمانیہ کتبخانہ دار الترجمہ میں بھی کتاب خریدی گئی ہے سرکار عالی کے سررشتہ تعلیمات نے بروئے گشتی اس کتاب کو حوالہ جات کی ایک مفید کتاب قرار دیا ہے۔ قیمت چہ روپے

سید منظر علی والنیئر کلب خیریت آباد حیدرآباد

باغ جنت

از

مولانا عبداللہ العمادی

(۴)

دوسری تنقیح هُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ یعنے اہل جنت ہمیشہ اسی میں رہیں گے ہیں خلود (ہیشگی) اپر بڑا زور دیا گیا ہے کہ آیت میں جنت سے اگر جنت دنیا مراد ہوتی تو اس میں ہیشگی کی شرط کیوں کیجاتی ، دنیا تو خود ناپائیدار ہے پھر اس کی نعمتیں کیونکر پائدار ہو سکتی ہیں لیکن اصل میں یہ ایک طرح کی غلط فہمی ہے خلود کے معنی بقائے دوام کے نہیں ہیں بقائے طویل کے ہیں[1] امام رازی فرماتے ہیں۔

قَال اصحابنا الخلد هو الثبات الطويل سواءٌ دام او لم يدم و احتجّوا فيه بالاٰيته والعرف امّا الاٰية فقوله تعالى خٰلِدِيْنَ فِيهَا اَبَدًا وَلَوْ كَانَ التابيد داخلاً فی مفهوم الخلد لكان ذالك تكرارًا واما العرف فيقال حبس فلان فلانًا حبسًا مخلدًا ولِانهٗ يكتب فی صكوك الاوقاف وقف فلان وقفًا مخلدًا[2]

ہمارے علما کہتے ہیں کہ خلود (ہمیشگی) کے معنے دیر تک پائدار رہنا ہے چاہے ہمیشہ ہمیشہ رہے یا نہ رہے اس باب میں قرآن و محاورہ عرب کی دلیل لاتے ہیں قرآن کی دلیل تو یہ ہے کہ بہشت میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنیگے" بقائے دوام کے معنی اگر ہمیشگی کے مفہوم ہوتے تو دوبار ہمیشہ ہمیشہ کہنا کیا ضرور تھا محاورہ میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں کو ہمیشہ کے لئے بند رکھا ہے اور وقف ناموں میں لکھتے ہیں فلاں شخص نے ہمیشہ کیلئے جائداد وقف کی ہے حالانکہ دنیا اور اسکی کوئی چیز بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے

[1] سراج المنیر (طبع خیریہ مصر) صفحہ ۳۲ - جلد ا [2] تفسیر کبیر - جلد ا صفحہ ۲۳۵،

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں۔

اَلخلد والخلود فی الاصل الثبات المدیٰ دام او لم یدم ولذالك قیل للاثافی والاحجار خوالد وللجزء الذی یبقیٰ من الانسان علی حاله مادام حیًّا خلد ×× بخلاف مالو وضع للاعم منه فاستعمل فیه بذالك الاعتبار کاطلاق الجسم علی الانسان مثل قوله تعالیٰ "وَمَا جَعَلْنَا لِرَجُلٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ" لہ	خلد اور خلود اصل میں دیر تک ثابت رہنے کو کہتے ہیں چاہے کیفیت دوامی ہو یا نہو اسی لئے چولہے اور پتھروں کو بھی خوالد (ہمیشہ رہنے والے) کہتے ہیں اور انسان کے جسم کا وہ جز جو بجائے خود باقی رہتا ہے اسے بھی خلد کہا جاتا ہے ×× لیکن جہاں کہیں عام ترین معنے کے لئے یہ لفظ رکھا گیا ہو وہاں اسی اعتبار سے استعمال بھی ہوتا ہے مثلاً یہ آیت ہم نے تجھ سے پہلے کسی شخص کیلئے ہیشگی نہیں بنائی ہے لہ"

نظام نیشاپوری نے لفظ خلد کے معنے بقائے دوام کے ہونے کے متعلق یہی تشریح کی ہے کہ صرف معتزلہ نے خلد وخلود کے معنے بقائے دوام کے لئے ہیں ورنہ اشاعرہ اہل سنت کا اتفاق ہے کہ اس کے معنے دیر تک ثابت رہنے کے ہیں بایں ہمہ اس ضمن میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ خلود کے معنی بقائے دوام نہ سہی مگر وصال جنت میں بقائے دوام ہی ہوگا اس تاویل کی ضرورت یہ تھی کہ جس کو بہشت نصیب ہوگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نصیب ہوگی لیکن سوال یہ ہے کہ جب قرآن نے جنت کو باغ دنیا کیلئے بھی استعمال کیا ہے اور خلود کے معنی بھی بقائے دوام کے نہیں ہیں تو پھر ان تاویلات کی کیا حاجت ہے؟ اور کیا ضرور ہے کہ اس دنیاوی جنت کی نعمتوں کو بھی روحانی مانا جائے جسمانی نہ مانا جائے؟

اس بیان توضیحی کا نتیجہ یہ ہے:—

لہ انوار التنزیل واسرار التاویل للقاضی البیضاوی (علی ہامش السراج المنیر) جلد ا صفحہ ۹۳۔

لہ غرائب القرآن ورغائب الفرقان للنظام النیساپوری (علی ہامش جامع البیان ابن جریر الطبری) جلد ۱ صفحہ ۱۹۴۔

(الف) آیت میں مہذب و صالح مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے اور اس بشارت سے پہلے شرط کر دی گئی ہے کہ ان میں اسلامی تقویٰ و تہذیب (کہ حقیقت میں وہی ایک تہذیب ہی اور شائستگی) و صلاحیت ہونا ضروری ہے۔

(ب) دعای بشارت یہ ہے کہ جو مسلمان صالح و نیک کردار اور شریفانہ اخلاق سے آراستہ ہوں گے خدا ان کو جنت اور اس کی نعمتیں عطا کرے گا۔

(ج) یہ دور ترقی بہت دیر تک قائم رہے گا! اور اسی لحاظ سے اس کو خالد کہا جائے گا۔

(۵)

یہ تمہید تھی۔ ناظرین اب اس کے بعد نشار آیت ملاحظہ فرمائیں۔

آیت میں اسلامی ترقی کے وعدے کو ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ایمان کے معنی کیا ہیں۔ ایمان یہ نہیں ہے کہ زبان تو لا الٰہ الا اللہ کہہ رہی ہو۔ اور دل میں سے

صنمے در دل ما یافت راہ　　　نحن لا نعبد الا ایاہ

نے ناپاک جذبات بھرے ہوں کہنے کو اپنے تئیں مسلمان کہا جائے مگر اسلام کے احکام سے عملاً کچھ علاقہ نہ ہو۔ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جگہ رسم و رواج کو دیجائے اور مذہبی و قومی پیشوائی کی منزل جو پہلے قرآن کریم کو اور صرف قرآن کریم کو حاصل تھی اب علماء کے قیاسات و مفروضات کو عطا کی جائے۔ ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کی خدائی کا معتقد ہو۔ اور علم النفس میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ اعتقاد وہی ہے جس کے آثار انسان کے کردار و گفتار سے ظاہر ہوتے ہیں لہٰذا وہ ایمان ہرگز ایمان نہیں ہے جس میں بندے کے افعال خدا کے احکام سے بے پروا ہیں قرآن میں جہاں کہیں بھی اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (وہ لوگ جو ایمان لائے) کے الفاظ وارد ہیں ساتھ کے ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (اور انہوں نے نیک کام کئے) بھی موجود ہیں[1]۔ اور جن آیات میں اٰمَنَ (ایمان لایا) کا تذکرہ ہے اسی کے بعد وَعَمِلَ صَالِحًا (اور نیک کام کیا) کی شرط بھی لگا دی ہے[2] جس کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری

[1] دیکھو سورہ رعد و شوری و مائدہ و فتح و ابراہیم و حج و یونس و بقرہ و طلاق و آل عمران و نساء و شوری و نور و سجدہ و جاثیہ۔

[2] سورہ بقرہ و مائدہ و کہف و مریم و طہ و قصص و سبا۔

ایمان کافی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ حسن عمل بھی لازم ہے۔ سورۂ نور میں ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ لَئِنْ اَمَرْتَھُمْ لَیَخْرُجُنَّ۔ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا طَاعَۃٌ مَّعْرُوْفَۃٌ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (سورہ ۲۴۔ رکوع ۷، آیتہ ۵۳)

اور انہوں نے اللہ کی بڑی پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر حکم تو دو (بلا عذر گھر بار سب چھوڑ کر) باہر نکل کھڑے ہوں (ان سے) کہو قسمیں نہ کھاؤ پسندیدہ فرمانبرداری چاہئے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی سب خبر ہے (یعنی جو ایمان کا مدعی ہو اس کو زبانی دعوے نہ کرنے چاہئیں بلکہ عمل سے اپنی ایمانداری کا ثبوت دینا چاہئے)۔

سورۂ حجرات میں ہے:-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (سورہ ۴۹۔ رکوع ۲، آیت ۱۵)

ایمان دار تو صرف وہ ہیں جو (۱) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا شک (و شبہ) نہیں کیا (۲) اور اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے کوشش کی (حقیقت میں) سچے یہی ہیں (یعنی جن لوگوں میں یہ دونوں شرطیں موجود ہوں ان کا ایمان تو سچا ہے اور جو ایسے نہ ہوں وہ جھوٹے بے ایمان ہیں)۔

یہ معیار ایمان اگر صحیح ہے اور ضرور صحیح ہے۔ تو ہم میں کتنے ہیں جو ایمان دار کہے جا سکتے ہیں اگر ہم اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہوتے تو کیا یہ نہ دیکھتے کہ مسلمان کس روز بد میں گرفتار ہیں اسلامی دنیا پر نامسلمان کیوں کر غالب آتے جاتے ہیں۔ اور ہر ایک شعبۂ علم میں مسلمانوں کی کیا گت بن رہی ہے جہالت کی ہم کو شکایت ہے لیکن اس عمارت کی بنیاد خود ہمارے ہاتھوں سے پڑی ہے۔ قومی تنزل کا گلہ ہے مگر اس طوق کو ہمارے اعمال ہی نے گلوگیر بنایا ہے۔ ترقی کی خواہش ہے لیکن ایمان کا دل میں نشان تک نہیں۔ عزت و سربلندی کی تمنا ہے مگر عمل صالح سے بے پروا ہیں۔ گھر کی بضاعت ہے تو سود خواروں کے لیے وقف ہے۔ ذاتی آمدنی ہے تو بے اصول کاموں میں صرف ہو رہی ہے۔ وقت ہے تو رائیگاں جا رہا ہے۔ نہ دماغ کی کسی طرح کی تربیت کی جاتی ہے۔ نہ دماغی و ذہنی قوتوں کے نشو و نما کے لئے تعلیم دی جاتی ہے نہ قوم کی فلاح مطلوب ہے۔ نہ اخلاق درست ہیں

نہ درست کرنے کی فکر ہے، اور پھر ان بے اصولیوں کے ہوتے ہوئے ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کے جو لوازم ہیں (یعنی ترقی و سربلندی) اُن کے خواہاں رہتے ہیں!!!

یہ سادہ دل بشارت قرآن سے شاد ہے	مومن نہیں ہے انتم الاعلون یاد ہے

———(۶)———

بے شبہ قرآن کریم کا وعدہ ہے اور نہایت سچا وعدہ ہے کہ :۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا

اور جو نیک عمل کریگا اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا تو اس کو نہ کسی طرح کے ظلم و ستم کا خوف ہوگا اور نہ کسی طرح کی حق تلفی کا۔

(سورہ طٰہٰ۔ رکوع ۶ آیۃ ۱۱۱)

لیکن اس وعدہ کے وفا ہونیکے لئے جو شرط لگی ہوئی ہے کیا ہم اس پر بھی ملتفت ہونا چاہتے ہیں اور دل کو ایمان اور دماغ کو تہذیب نفس اور تمام اعضائے جوارح کو عمل صالح کا پابند بنانے پر آمادہ ہیں ہمارے اخبار ہماری قومی حق تلفیوں کے شکوہ سنج رہتے ہیں مظالم کے دادخواہ ہوتے ہیں قوم کی تباہی کا مرثیہ سناتے ہیں اور تلافی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات نہیں ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ہماری بدبختیوں کا نتیجہ ہے مسلمان ایمان دار ہوں، نیک کردار ہوں تو نہ ان پر ظلم ہو سکتا ہے اور نہ ان کی حق تلفی ممکن ہے لیکن جب اس خصوصیت سے بیگانہ ہیں تو ظلم و ستم کا گلہ کیا اور حق تلفی کی شکایت کیوں؟ اے نور چشم من بجز از کشتہ ندروی۔

———(۷)———

عمل صالح کا تعلق صرف ظواہر سے ہی نہیں ہے عمل صالح اگر ہے تو اخلاق کو مہذب رکھنا اور اعمال کو ایسے معیار تقوی پر لانا ہے جس سے خود اس کو اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچے اور وہ فائدہ بھی منشائے قرآن کے مطابق ہو جو ہماری ہلاکو محیط ہے وہ اسی معیار کو نظر انداز کرنے سے لاحق ہوئی ہے دنیا میں نظر کرو دنیاوی ممالک پر نگاہ دوڑاؤ جزائر یونان کو دیکھو جزائر بحر روم کو دیکھو سسلی کو دیکھو سارڈینیا کو دیکھو ہسپانیہ کو دیکھو پرتگال کو دیکھو جنوبی فرانس کو دیکھو جنوبی

اطالیہ کو دیکھو۔ اور پھر بتاؤ کہ ان ممالک کے مسلمان کیا ہوئے اور کہاں گئے ؟ الجزائر میں جاؤ جہاں آجکل فرانس کی حکومت ہے اور دیکھو کہ کیسی کیسی مسجدیں کلیسا کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہیں بزرگوں کے مزاروں اور روضوں پر صلیبیں نصب ہیں اور مدرسوں اور خانقاہوں کے مشنری ہاوس بنے ہوئے ہیں۔ خود اسی ہندوستان کو دیکھو اور بتاؤ کہ قطب مینار جس فاتحانہ عظمت و سربلندی کی داستان سنارہا ہے تاج محل جس تمدن کا نوحہ خواں ہے۔ قوۃ اسلام جس جلالت و جبروت کی عزادار ہے جونپور کا پل اور قلعہ اور مسجدیں جس فر و شکوہ کی سوگوار ہیں احمد آباد و لاہور کی عبادت گاہیں جس دینداری کا ماتم کر رہی ہیں۔ وہ سب باتیں کیا ہوئیں اور کدہر گئیں ہندوستان اب بھی وہی ہے لیکن اب وہ جاہ و جلال کہاں ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ آیا تھا۔ وہ فلسفہ کہاں ہے جس کی ملا محمود جونپوری نے بنیاد ڈالی تھی۔ وہ فلسفہ کی درسگاہیں کیا ہوئیں جو بہار و جونپور میں قائم تھیں۔ کیا ان سب کے فنا ہونے کا باعث یہی نہیں تھا کہ بزرگوں نے عمل صالح کا جو میراث چھوڑا تھا وہ برباد گیا اور ہم اس سے بے خبر رہے ہم اپنے اخلاق و عادات کو اگر مہذب بناتے اور مہذب رکھتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا ہماری غلام نہ ہوتی، اور زمانے پر ہمارا سکہ نہ بیٹھا رہتا ہم ایک ریگستان (عرب) سے نکل کر اپنی اخلاقی طاقتوں کی بدولت ساری دنیا پر چھا گئے تھے اب تقوی نہ ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں پہلے بھی ہیں اور پھر بھی مٹی خراب ہو رہی ہے عبرت پذیر دل کے لئے کیا یہ خون ہو جانے کی باتیں نہیں ہیں اور کیا اس انحطاط کی مصیبتوں میں بھی ہم کو خدا یاد نہ آئے گا۔ اور ہم اپنے ایمان و اخلاق کو محکم نہ بنائیں گے ؟ بے شبہ ہم اب بھی ترقی کر سکتے ہیں خدانے جو وعدے کئے تھے وہ ابتدائی صدیوں کے لئے مخصوص نہ تھے وہ پاک و مقدس وعدے ہمیشہ کے لئے ہیں اور اب بھی انکا وہی اثر ظاہر ہو سکتا ہے۔ دنیا ہمارے لئے ہے اور دنیا کی تمام علمی و اخلاقی و مادی و روحانی ترقیاں بھی ہمارے ہی لئے ہیں لیکن ان ترقیات کے لئے شرط کیا ہے ؟ شرط محض اتنی ہے کہ ہمارے اخلاق و اعمال میں شائستگی و تہذیب و صلاحیت ہونی چاہئے یہی شرط اگلی قوموں سے بھی ہوئی تھی اور اسی کی خدانے یاد بھی دلایا ہے کہ :-

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وہ اگر توراۃ و انجیل کو قائم رکھتے (یعنی ان کے احکام کے پابند ہوتے)

وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔ مائدہ (۵) رکوع ۹۔ آیت (۶۶)

اور وہ جہان کے پروردگار کی جانب سے انپر اترا ہے اسکی پیروی کرتے تو انھیں اتنی نعمت روزی ہوتی کہ اوپر سے اور پاؤں تلے سے کھاتے (یعنی ہر سمت ان کے لئے نعمت ہی نعمت ہوتی)۔

لیکن افسوس ہے کہ جس طرح ان اقوام نے اس شرط کو فراموش کردیا وہی حالت آج ہماری ہے۔

کہ ایمان و عمل صالح کی پابندی پر ہم کو ترقی کی بشارت دی گئی تھی مگر ہم ہیں کہ دونوں کو بھولے اور نظر انداز کئے ہوئے ہیں اور پھر بھی ترقی کے متمنی ہیں کیا یہ کامیابی کی صورتیں ہیں اور کیا ایسی حالت میں ترقی ممکن ہے؟

قرآن مجید و جرمنی

ترجمہ تقریر بیرن عمر رالف ایرن فلس

(۲)

اگر ہم اس بات کا یقین کرلیں کہ مشرق اپنے مذکورہ بالا مقصد میں کامیاب ہو جائیگا تو سب سے پہلے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کے دماغ پر قرآنی تعلیمات میں سب سے زیادہ کونسی چیز اثر کریگی؟

جرمن زبان بولنے والے ایک آسٹرین کی حیثیت سے میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ کم سے کم یورپ کا وہ حصہ جو جرمن بولتا ہے، سب سے زیادہ قرآن کی اس تعلیم کی شگفتگی اور قابل عمل ہونے سے متاثر ہوگا جو وہ ہماری روح اور جسم کے ارتقاء کے ما بین اتحاد پیدا کرنے کے بارے میں دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یسوع مسیح کی حیرت انگیز تعلیم کہ "حقیقتاً خدائی سلطنت تمہارے ہی درمیان ہے" وہی خیال ادا کرتی ہے جو قرآن کے وہ الفاظ ادا کرتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہم سے ہماری رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے لیکن بدقسمتی سے عیسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ کو یہ مفہوم پہنا دیا گیا کہ خدا مانند انسان کے ہے جس کا مسکن آسمانوں کے اوپر ہے۔ اگرچہ وہ انسان سے زیادہ شاندار اور مہربان خدا بھی ہے اور باپ بھی بخلاف اس کے قرآنی تعلیم نہیں بدلی بلکہ مختلف ادوار ارتقائی میں مختلف و عارضی معانی بیان کئے گئے ہیں اور بالآخر وہ لوگ جو خلوص کے ساتھ اس کے معانی کی تلاش میں کوشاں ہیں ان کو ان الفاظ کا صحیح مفہوم یاد آجائے گا۔ اسی خیال کو اسلام کے احکام میں مدنظر رکھا گیا ہے مثال کے طور پر عبادت کو لے لیجئے کہ قرآن مجید نے عبادت کے ساتھ حضور قلب کو کس درجہ اہمیت دی ہے جس سے انسانی عمل اور انسانی تہذیب اور انسانی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور ایک نئی روح سرایت کرجاتی ہے یورپ نے اپنی سائنس دانی کے زور سے فطرت کی بیرونی قوتوں پر حکومت کرنی سیکھ لی ہے اس طرح انسانی قوت مدے

بڑھ کر ناقابل مقابلہ ہوگئی ہے لیکن ان بیرونی قوتوں کے ارتقاء کے زمانہ میں انسان کی اصلی خوشی نے کچھ بھی ترقی نہیں کی محض قوتوں کے حاصل ہو جانے کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ ان قوتوں کا مالک ان کو اچھے اور مفید مصرف میں لائے ایک مالی جس کو دو بیلوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ اس کا پانی کھینچیں اگر اس کو دو وحشی بیل دیدیئے جائیں جن کو وہ قابو میں نہیں لا سکتا اور وہ اپنی لڑائی سے اس کے باغ کے تمام پھول اور پودوں کو پامال کر ڈالیں، تو اس کو کچھ فائدہ نہ ہوگا اگر وہ مالی ان کو رام کرلے تو وہی بیل اس کے لئے بہت فائدہ مند ہو جائیں گے اس مثال سے آپ خود اندازہ کرلیں گے کہ یورپ میں اور خاصکر جرمنی میں ان قوتوں کی کیا حالت ہے جو انسانی قبضہ میں تو ہیں لیکن انکا استعمال مناسب طور پر نہیں کیا جاتا۔ ہماری روح کی اندرونی اصلاح ہی ہماری روح اور ہماری زندگی کے مابین خوشگوار رابطہ پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ خوشگوار رابطہ قائم ہو جائے تو ہماری موجودہ مشکلات سب کی سب آج ہی حل ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ موجودہ مشکلات صرف معاشی ہی نہیں ہیں بلکہ موجودہ تہذیب اور اس کے نظام کی پیدا کردہ ہیں۔

علاوہ اس عام حکم کے قرآن شریف ہمیں صاف طور پر اپنی اجتماعی زندگی کو تعمیر کرنے کے قوانین بتاتا ہے۔ وہ محض اشتراکیت کی طرح انفرادی عمل کی خوبیوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ کیا خوب بات ہے کہ بالشویک گورنمنٹ بھی عملاً اس قیمتی قوت کو نظر انداز نہیں کر سکی جو انفرادی جوش عمل کا باعث ہوتی ہے بخلاف اس کے قرآن کا منشا حکم یہ ہے کہ وہ لوگ جو دولت مند ہیں اور جو زیادہ دماغی قابلیت رکھتے ہیں اور جو جسمانی قوت میں زیادہ ہیں ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے ان بھائیوں کی جو مالی یا ذہنی یا جسمانی اعتبار سے غریب اور کمزور ہیں مدد کریں اور ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ یہ لوگ اپنے غریب بھائیوں کی ترقی اور اصلاح کے ذمہ دار ہیں اس بارے میں جو اسم احکام ہیں ان کو ہر مسلمان جانتا ہے اور میں اس جگہ ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر قرآنی تعلیمات کو جرمنی تک پہنچا دیا گیا تو کیا وہ ان پر اس سے بہتر طریقے سے عمل پیرا ہو سکیگا جیسا کہ آج کل بعض اسلامی ممالک میں عمل ہو رہا ہے میں امید کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا کیونکہ جرمنی ہمیشہ ہر کام کو پوری طرح انجام دینے کا خوگر رہا ہے پس اسلام موجودہ زمانے کی مشکلات پر حاوی ہونے میں ضرور معاون ثابت ہوگا۔

اسلام میں عورت کی حیثیت قرآن کی سچی تعلیم کے موافق اس سے بہت زیادہ اچھی ہے جو یورپ نے اس کو دی ہے یہ بات دوسری ہے کہ مقامی رسم و رواج اور رومی او ایرانی اثرات کی بنا پر اور قرآنی حکم کو مختلف طور پر سمجھنے کی وجہ سے پردے کی رسم معاشرت میں داخل کر لی گئی ہے میں یہاں پر ایک سٹرن نومسلم لیڈی بیرونس للیفماء اوسلر کی رائے بیان کرتا ہوں۔ وہ کہتی ہیں کہ قرآن شریف کی رو سے جو معاشی اور طلاق کے حقوق عورت کو حاصل ہوئے ہیں وہ ان حقوق سے اچھے ہیں اور عورتوں کے لئے مفید ہیں جو قبل جنگ یورپ کے قوانین نے عورت کو دے تھے اور بعض بعض ممالک میں اب تک رائج ہیں۔ مشرقی ممالک میں جو عمل قرآنی تعلیم کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ دوسرا سوال ہے اور اس کو یہاں بحث میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب قرآن کی عملی تعلیم کا تیسرا سب سے زیادہ اہم حصہ قومی مسئلہ کا حل ہے جو ایک حیرت انگیز طور پر کیا گیا ہے صرف یہی نہیں کہ قرآن نے مختلف مسلم اقوام کو آپس میں منافرت کرنے سے منع کیا ہے بلکہ وہ غیر مسلم افراد اور اقوام سے بھی دل آزارانہ برتاؤ کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر اس پر بھی بس نہیں مذہبی معاملہ میں قرآن نے صرف جبر و اکراہ ہی کو ممنوع قرار نہیں دیا بلکہ ہم مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ان بے شمار پیغمبروں کو بھی مانیں جو ہمارے پیغمبر صلعم سے قبل ہر ملک اور ہر قوم میں مبعوث ہو چکے ہیں۔ چاہے وہ موسیٰ ہوں یا عیسیٰ، بودھ ہوں یا کرشنا۔ یا چین کے لاؤ سی ہی کیوں نہ ہوں یہی صحیح رواداری کا حیرت انگیز خیال ایک ایسا اطمینان بخش پیغام تھا جس نے مجھے یقین دلا دیا کہ اسلام بنی نوع انسان کے لئے ایک رحمت ہونے والا ہے صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ دوسرے پیغمبروں کے پیروں کے لئے بھی۔ (۳)

ان شاندار اور سب سے زیادہ اہم تعلیمات کے علاوہ قرآن ہماری پوشاک، ہمارے فرنیچر اور ہماری تعمیرات کے بارے میں ایک ایسا نیا طریق زندگی بتاتا ہے جو اچھی طرح منظم ہے، سادہ ہے اور فطرت سے بالکل قریب ہے یہ تقریر بہت طویل ہو جائے گی اگر میں تفصیل کے ساتھ اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کروں کہ مشرق میں جو پوشاک اور دیگر رسوم رائج ہیں ان کی قرآن کس طرح مخالفت کرتا ہے اور کس طرح سادے اور تھوڑے کپڑے پہننے پر زور دیتا ہے جو جنوبی ممالک کی آب و ہوا کے عین مطابق ہے کیونکہ ان مقامات میں زیادہ کپڑے ایک ناقابل برداشت

موجب بن جاتے ہیں۔ لیکن جیسا میں نے کہا جرمن قرآن کے سمجھنے میں ان روایات کا ہرگز تتبع نہ کریں گے جو شرق میں رائج ہیں بلکہ حقیقی قرآن ہی کی پیروی کریں گے میں یہاں بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ موجودہ انقلاب نے جرمنی میں ایسے رجحانات پیدا کر دئے ہیں جن کی وجہ سے جرمنی کے موجودہ طرز تعمیر اور فن نجار اور پرانے عربی طرز میں مماثلت پیدا ہو گئی ہے (۴) ۔

جہاں حالات اس امر کے موافق ہیں کہ جرمن قوم قرآنی تعلیم سے فائدہ اٹھائے وہاں اس امر کے امکانات بھی بہت کم ہیں کہ ان تعلیمات کو جرمنی تک پہنچایا جائے۔

اب تک قرآن شریف کے جرمنی میں متعدد ترجمے ہوئے لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کو کسی مسلمان اور جرمن زبان کے ماہر نے کیا ہو اب تک جو ترجمے ہوئے ہیں وہ علم الالسنہ کے ماہرین نے اپنے مقصد کو پیش نظر رکھکر کئے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو اس کی مذہبی تعلیمات اور اس کے حقایق پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ اس قابل ہوئے ہیں کہ عربی متن کی خوبیاں ترجمہ میں ظاہر کر سکیں صرف ترجمہ کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہماری کوشش تو یہ ہونی چاہئے کہ ترجمہ میں اصل کی خوبی اور روح ہاتھ سے نہ جانے پائے تا کہ پڑھنے والے کے دل پر پورا اثر ہو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے قرآن کا ترجمہ جرمنی زبان میں شروع کر دیا ہے۔ ہمارے دوست مولنا صدرالدین جو یہاں موجود ہیں اس کام کو ڈاکٹر منصور پی ایچ ڈی کی مدد سے کر رہے ہیں میں ترجمہ پر زبان کو بہتر کرنے کی غرض سے نظر ثانی کروں گا۔ یہ مقدس کام اس امر کا مستحق ہے کہ ہر مسلمان اس میں مدد دے۔ اور مجھے یقین ہے کہ کوئی سچا مسلمان اسلام کی ترقی میں مدد دینے سے حتی الوسع پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اس اسلام کو مدد دینے سے جو ہم سب کو اس قدر عزیز اور پیارا ہے۔

بیرن عمر کی تقریر پر خیالات

از جناب ذوقی شاہ صاحب

اسلامی رواداری کے ثبوت میں بیرن صاحب دوسرے پیغمبروں پر ایمان لانے کے متعلق اسلامی ہدایات کو پیش کرتے ہیں اس سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ شاید اسلامی رواداری کے صحیح مفہوم سے ابھی تک آگاہ نہیں ہوئے تقریر مندرجہ بالا میں (TOLERATION) انگریزی لفظ (TOLERATION) کا ترجمہ "رواداری" کیا گیا ہے کسی خلاف طبع امر یا مخالف چیز کی برداشت کو کہتے ہیں۔ دیگر انبیاء کا وجود اور ان کی تعلیمات نہ اسلام کے مخالف ہیں نہ طبائع اسلامی کے خلاف ہیں موافق چیزوں کے ساتھ موافقت کو (TOLERATION) نہیں کہتے۔

اس سلسلے میں ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے۔ دیگر انبیاء پر ایمان لانے کے یہ معنی نہیں کہ جو غلط تعلیمات ان انبیاء سے غلط طور پر منسوب کر دی گئی ہیں ان کو بھی مان لیا جائے مثلاً ہر مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کو نبی برحق مانتا ہے مگر کوئی مسلمان تثلیث کو تسلیم کرنے اور اہل تثلیث کو اہل حق کہنے، اور تثلیث کی تعلیم کو عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب کرنے کے لئے از روئے اسلام آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اسلامی رواداری کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ حق کو ناحق اور ناحق کو حق کہدیا جائے مومن کو کافر اور کافر کو مومن سمجھ لیا جائے۔ صالح اور فاسق میں کوئی امتیاز نہ برتا جائے لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ ایک بالکل دوسری چیز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صراط المستقیم وہی ہے جس کی تعلیم قرآن پاک میں فرمائی گئی ہے ہمارا جی یہ چاہتا ہے کہ ہمارے سب دوست ہمارے ہم وطن، ہماری اس دنیا کے سب رہنے بسنے والے اس صراط المستقیم پر چلیں اور فائدہ اٹھائیں اس دنیا میں بھی سرسبز ہوں اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں ہم ہر ممکن تدابیر کوشش کرنے کے لئے بھی تیار ہیں کہ ایسا ہو اور سب ایک ہو جائیں مگر باوجود ان تمام جائز خواہشات کے ہم کسی کو جبراً مسلمان کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جبر و خوف کے تحت مسلمان بن جانے سے کوئی سچا مسلمان نہیں بن سکتا

اور جب تک کوئی دل سے اور برضا و رغبت اسلام قبول نہ کرے آخرت کے فوائد سے وہ محروم رہیگا اغیار کو بجبر مسلمان نہ بنانے کے یہ معنی سمجھ لئے جائیں کہ ادیان غیراز اسلام کی حقانیت کے بھی ہم نعوذ باللہ قائل ہیں۔

(۴) اس سے اگر کوئی نتیجہ نکالا بھی جا سکتا ہے تو بس یہی کہ جرمنی ترقی کرتے کرتے اب اس منزل پر پہنچا جس پر عرب صدیوں قبل پہونچ چکے تھے طرز تعمیر اور نیز بحر وغیرہ میں تو صدیوں قبل کے عربوں سے مماثلت پر فخر کیا جاتا ہے لیکن تفسیر قرآن کے باب میں ان عربوں سے گریز اور جدت کی تلاش ہے کیا عجیب و غریب ذہنیت ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دانشمندان یورپ ابھی تک ایسی محدود دنیا کے چکر میں مقید ہیں۔ مذہب کو صرف دنیوی معیار ہی سے پرکھتے ہیں اسلام کے صرف دنیوی مفاد ہی کو ٹٹولتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک وسیع تر اور بالاتر میدان میں ترقی کے لئے پیدا کیا ہے دنیوی مفاد تو محض ضمنی اور درمیانی اور عارضی چیزیں ہیں سچا مذہب انسان کی عقلی اور علوی دونوں ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ دونوں میدانوں میں ترقی کی شاہ راہ کو کھولتا ہے دنیوی سرسبزی کا بھی باعث ہوتا ہے اور آخرت کی نجات کا سامان بھی مہیا کرتا ہے ان دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے دونوں میدانوں میں کامیابی حاصل کرنا انسان کا فرض ہے یورپ ابھی تک صرف ایک ہی میدان میں ترقی کرنیکا خواہشمند نظر آتا ہے۔ دوسرے میدانوں سے بالکل غافل ہے حالانکہ کامل ترقی وہی ہے جس میں ہر پہلو کا اس پہلو کی اہمیت کی مناسبت سے خیال رکھا جائے۔ اگر انسان اپنے کسی ایک عضو کو نشوونما دینے دیتے بہت زیادہ قوی کرے مگر بقیہ اعضا کو بیکار و معطل رکھکر بالکل بے حس کمزور اور مردہ بنا دے تو عضو قوی کی قوت کے باوجود اس شخص کو کوئی پورا انسان بھی نہ کہیگا چہ جائے کہ ترقی یافتہ انسان اسے سمجھے۔ یورپ کی ایک محدود دائرہ میں ترقی اس کے لئے کافی نہیں کہ اسے صحیح معنوں میں ترقی یافتہ کہا جائے۔ یورپ کی ان شدید خامیوں ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ باوجود اپنی حیرت انگیز سائنٹفک ترقیوں کے وہ دنیا میں امن و عافیت و مسرت حقیقی پھیلانے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کا بین ثبوت عمر کو بھی اقرار ہے یورپ کی یہ خامیاں اسی صورت میں دور ہو سکتی ہیں جبکہ یورپ قرآن مجید کو اسی طور پر سمجھنے کی کوشش کرے جس طور پر اصحاب رسول نے اسے سمجھا اور قرآن پر اس طریقے سے عمل کرے جس طریقہ سے اس برگزیدہ جماعت نے اس پر عمل کیا

اگر یورپ نے بہت جلد ایسا نہ کیا اور اپنے ہی جہل مرکب پر اڑا رہا تو نتیجہ جو کچھ ہوگا وہ ارباب عقل و فہم پر ظاہر ہے

تصحیح

ماہ صفر کے ترجمان القرآن میں صفحہ ۱۱۱ سطر ۱۶ پر یہ فقرہ غلط چھپ گیا ہے۔ کہ حق تعالی ہر وقت کائنات کی جانب متوجہ رہتا ہے اس متوجہ رہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنی ذات و صفات سے کائنات پر متوجہ رہتا ہے" خط کشیدہ فقرہ دراصل یوں ہے کہ "اس متوجہ رہنے کے یہ معنی ہیں"

مجلہ مکتبہ

یہ دار الاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود) حیدر آباد دکن کا علمی و ادبی مصور ماہوار رسالہ ہے جس کا شمار دنیائے اردو کے چیدہ رسالوں میں ہوتا ہے جو کئی سال سے مولوی عبدالقادر سروری صاحب ایم اے ال ال بی کی ادارت میں حسب ذیل خصوصیات کے ساتھ نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔ (۱) اس میں اکثر عمدہ طبعزاد افسانے یا ہندی عربی انگریزی فرانسیسی اور روسی افسانوں کے تراجم ہوتے ہیں۔ (۲) اس میں تاریخ سائنس فلسفہ و معاشیات پر بھی مفید علمی مقالے شائع ہوتے ہیں، (۳) اس میں عام ادبی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ دکن کے قدیم شعرا اور اردوئے قدیم کی نسبت محققانہ مضامین ہوتے ہیں۔ (۴) مشاہیر ادبا، و شعرا اور اہل علم و فضل کی تصویریں ہر نمبر میں شائع ہوتی ہیں (۵) اس میں اردو کی کتابوں پر تبصرے اور جدید مطبوعات کی اطلاعیں بالالتزام شائع ہوتی ہیں قیمت سالانہ چار روپیے ششماہی دو روپیہ چار آنہ (۲؍۴) فی پرچہ ۶؍

منتظم مجلہ مکتبہ اسٹیشن روڈ
(حیدرآباد دکن)

مذاکرۂ علمیہ

ایمان بالغیب اور مذہب تجدد

جریدہ "نگار" کا تبصرہ اور میری ایک نظر

ماہ جون کے "نگار" میں حضرت نیاز فتحپوری نے "ترجمان القرآن" پر ایک مفصل تبصرہ فرمایا ہے جس کے لئے میں ان کا شکرگذار ہوں اگرچہ عموماً رسائل و جرائد کے انتقادات پر بحث کرنے اور ان پر جوابی نقد کرنیکا دستور نہیں ہے لیکن چونکہ ناقد فاضل نے اپنے تبصرہ میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو ان کے مذہب تجدد کے مخصوص اصول و مبانی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی اصلاح کرنا "ترجمان القرآن" کے اولین مقاصد میں سے ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان پر اظہار خیال کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھاؤں۔

عبارت تبصرہ | وہ لکھتے ہیں:-

اس رسالہ کا مقصود اس کے نام سے ظاہر ہے یعنی مطالب قرآنی اور تعلیمات فرقانی کو ان کی صحیح روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا یقیناً اس مقصود کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن جیسا کہ خود فاضل ایڈیٹر نے ظاہر کیا ہے عہد حاضر میں اس مدعا کی تکمیل آسان نہیں۔ عہد ماضی میں جب مذہب نام صرف اسلاف پرستی و قدامت پرستی کا تھا کسی شخص کا مبلغ یا مصلح بن جانا دشوار نہ تھا لیکن اب جبکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے "عمل و خیال" کی شکل نئی طرح ڈال کر حریت فکر و ضمیر کی بدولت دماغوں کو لا امال کر دیا ہے

مذہب صرف اس دلیل کی بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے اسلاف کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔ اور وہ بھی وہی سوچتے تھے جواب بتایا جاتا ہے۔

پہلے اگر خدا کی وحدانیت سے بحث کی جاتی تھی تو اب سرے سے خدا کا وجود ہی محل نظر بتایا جاتا ہے اگر پہلے ایک رسول کی ہدایت اس کے معجزوں سے ثابت کی جاسکتی تھی تو اب علوم منقاطیسیہ انہی معجزوں کی دلیل پر ہزاروں رسول و نبی پیدا کرنے کے لئے آمادہ ہیں پہلے ایک واعظ آسمان کی طرف دیکھ کر عرش و کرسی والے خدا کو پکار سکتا تھا، لیکن آج جب کہ آسمان ہی کوئی چیز نہیں رہا، ان کا ایسا کرنا کسی طرح مفید یقین نہیں ہو سکتا الغرض اب زمانہ یُومنون بالغیب کا نہیں رہا بلکہ یُومنون بالتجربۃ والشہود کا ہے اور ایسے نازک وقت میں کسی شخص کا مذہب کی حمایت کے لئے کھڑا ہو جانا آسان کام نہیں، جب کہ خود نفس مذہبیت کا خیال بھی اپنی جگہ چنداں قابل قبول نہیں

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں:۔

قرآن پاک اپنے معنی کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہے ایک وہ جس میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرا وہ جس میں اعتقادات پیش کئے گئے ہیں اور تیسرا وہ جو قصص و تمثیلات پر مشتمل ہے حصۂ اول کے متعلق نہ زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کے لانے کی کیونکہ تعلیم اخلاق تمام مذاہب کی تقریباً یکساں ہے اور ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں ہے البتہ حصہ دوم اور حصہ سوم پر زیادہ توجہ کرنا چاہئے، کیونکہ علوم جدیدہ اور انکشافات حالیہ نے انہی دو حصوں کی طرف سے ریب و تذبذب کی کیفیت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان شبہات کے دور کر دینے میں

کامیاب ہوجائے تو وہ اس صدی کا مجدد کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اس لئے میں مشورہ دونگا کہ ایک مستقل باب اس موضوع پر قائم کرکے تمام ان آیات قرآنی کا استقصا کرنا چاہئے جو عقاید تعلیم کے متعلق ہیں اور ان کا صحیح مفہوم معین کرکے ان اعتراضات کو رفع کرنا چاہئے جو اس وقت اہل علم و تحقیق کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں"۔

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"آیندہ کے لئے میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ سب سے پہلے وحی و الہام کی حقیقت پر گفتگو کریں کہ اسی کے سمجھنے پر کلام اللہ کی حقیقت کا سمجھنا منحصر ہے اور پھر مسئلہ معاد کو لیں کہ اسی کے حل ہونے پر انحصار مذہبیت و لا مذہبیت کا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کلام الٰہی اور معاد کا کیا مفہوم متعین کرتے ہیں۔ اس کے بعد میں اپنے شبہات و اعتراضات پیش کرونگا اور اگر ان کی کوشش سے وہ دور ہوگئے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کیونکہ "نا چار مسلمان شو" کی جس لعنت میں بہت سے لوگ گرفتار ہیں، اس کا ایک سبب عقیدہ معاد بھی ہے"

ماحصل فاضل معترض نے جن فرعی و جزئی مسائل کی طرف اشارات کئے ہیں ان کو چھوڑ کر میں صرف ان امور سے بحث کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق اصول سے ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کے مباحث کی تقسیم تین حصوں پر کی ہے لیکن ہم بہ آسانی ان کو صرف دو حصوں پر تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک وہ حصہ جس کا تعلق ان امور سے ہے جو ہمارے علم کی حدود سے باہر یا ہمارے ادراک کی سرحد سے ماوراء ہیں جن کے متعلق ہم قطعیت کے ساتھ صحیح یا غلط ہونے کا کوئی حکم عقلی نہیں لگا سکتے اور جن میں قرآن ہم کو ایمان بالغیب لانے کی دعوت دیتا ہے، اور دوسرے وہ امور جو ہمارے دائرہ علم سے باہر نہیں ہیں، اور جن میں قطعیت کے ساتھ کوئی حکم عقلی لگانا ہمارے لئے ممکن ہے۔ پہلے حصہ میں وجود و صفات الٰہی، فرشتے، وحی و کتب آسمانی، حقیقت نبوت

بعث بعد الموت، عذاب و ثواب آخرت، اور ایسے ہی دوسرے مسائل کے علاوہ وہ تمام ماورائے سرحد علم و ادراک آجاتی ہیں، جو قصص اور تمثیلات کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں، عام اس سے کہ وہ بالذات عام انسانی ادراک کی سرحد سے ماوراء ہوں یا اس بنا پر ایسی ہوں کہ سردست ہم جس مرتبہ عقلی و علمی میں ہیں اس میں ہم ان کی صحت و صداقت کے متعلق کوئی حکم لگانے کے قابل نہیں ہیں۔ دوسرے حصہ میں وہ تمام امور آجاتے ہیں جن کا تعلق اسلام کی تعلیم حکمت و تزکیۂ نفوس اور تنظیم حیات انسانی کے اصول سے ہے۔

ناقد فاضل کی رائے میں دوسرے حصے سے بحث کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں کیونکہ اس بارے میں جیسے اور مذاہب ہیں ویسا ہی اسلام بھی ہے۔ البتہ بحث صرف پہلے حصے سے کی جانی چاہئے اس لئے کہ لوگوں میں ریب و تذبذب کی کیفیت انہی امور کے بارے میں پیدا ہو گئی ہے جو اس حصے سے تعلق رکھتے ہیں پھر یہ سوال کہ ان امور کے متعلق ریب و تذبذب کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ عہد ماضی میں تو قدامت پرستی اور جہالت کی وجہ سے لوگ غیب کی باتوں پر ایمان لے آتے تھے لیکن اب علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے عمل و خیال کی بالکل نئی طرح ڈال کر حریت فکر و ضمیر کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے، اس لئے اب "یومنون بالغیب" کا زمانہ نہیں رہا، بلکہ "یومنون بالتجربۃ والشہود" کا زمانہ ہے۔

مذہب اور علوم جدیدہ اس رائے کی بنیاد چند غلطیوں پر ہے، جن میں سے پہلی غلطی گذشتہ اور موجودہ زمانہ کے فرق کو سمجھنے میں ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے تنہا حضرت نیاز ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا گروہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مذہب کی شمع صرف گذشتہ زمانے کی تاریکی میں ہی جل سکتی تھی، علوم جدیدہ کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد اس کا روشن ہونا مشکل ہے حالانکہ علوم عقلیہ جن کو وہ روشنی سے تعبیر کرتے ہیں اس زمانے کی خصوصیات سے نہیں ہیں گذشتہ زمانے میں بھی ان علوم کی روشنی نے آنکھوں کو اسی طرح خیرہ کیا ہے اور گذشتہ زمانے میں بھی جن لوگوں کی آنکھیں ان سے خیرہ ہوئی ہیں، انہوں نے یہی سمجھا ہے کہ مذہب کی شمع اب روشن نہیں رہ سکتی کیونکہ ان کے نزدیک جو علوم اس زمانے کے "علوم جدیدہ" اور جو اکتشافات اس زمانے کے اکتشافات حاضرہ تھے بزعم خود عمل و خیال کی بالکل نئی طرح ڈال چکے تھے اور انہوں نے

حریت فکر وضمیر کی دولت سے دماغوں کو ایسا مالا مال کیا تھا کہ ان کے روشن زمانہ میں "یومنون بالغیب" کی گنجائش ہی نہ تھی کیا بالکل یہی حالت دوسری صدی ہجری سے چوتھی صدی تک نہیں گذری ہے؟ افلاطون، ارسطو، اپکیوریس، زینو، ہرقلس، اسکندر افرودسی، فرفوریوس، فلاطینوس اور دوسرے علمائے فلسفہ وحکمت کے خیالات جب اسلامی ممالک میں شائع ہوئے تھے اور ان کی بدولت فلسفیانہ تفکر اور عقلی اجتہاد کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا، تو کیا اس وقت بھی ایک گروہ نے بالکل یہی نہ سمجھا تھا جو اب ایک گروہ سمجھ رہا ہے؟ کیا اس زمانہ کی "حریت فکر وضمیر" اور عمل وخیال کی نئی طرح نے اسی طرح لوگوں کو مذہبی معتقدات کی طرف سے ریب وشک میں نہ ڈال دیا تھا؟ مگر پھر کیا ہوا؟ فلاسفہ کے وہ بہت سے نظری وقیاسی مسائل جن پر اس وقت کے لوگ ایمان لے آئے تھے، بعد میں غلط ثابت ہوئے وہ آفتاب علم جس کے سامنے ان لوگوں کو مذہب کی شمع ٹمٹماتی نظر آ رہی تھی زمانہ کی ایک ہی گردش میں بے نور ہو کر رہ گیا، ان کے علوم جدیدہ فرسودہ ہو گئے، ان کے اکتشافات میں عمل وخیال کی نئی طرحیں ڈالنے کی قوت باقی نہ رہی اور جو طرحیں انہوں نے ڈالی تھیں وہ سب پرانی ہو گئیں حتی کہ اپنے زمانہ کے اکتشافات پر کامل یقین واذعان رکھتے ہوئے انہوں نے جو عقلی استدلالات کئے تھے اور ان پر جن مذاہب حکمت کی بنیاد رکھی تھی ان میں سے اکثر کو آج ایک معمولی طالب علم بھی لغو ومہمل قرار دینے میں تامل نہیں کرتا۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ گذشتہ زمانہ کی تاریکی میں مذہب کی شمع جل سکتی تھی مگر اب اس روشنی کے زمانے میں نہیں جل سکتی، تو ہمیں بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے کیونکہ جن چیزوں کو آج علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ کہہ کر وہی دعوے کئے جا رہے ہیں جو پہلے کئے گئے تھے، ان کے متعلق بھی ہم کو یقین ہے کہ ان میں سے بیشتر کا وہی حشر ہونا ہے جو گذشتہ لوگوں کے "علوم جدیدہ" و "اکتشافات حاضرہ" کا ہو چکا ہے، وہ عمل وخیال کی یہ نئی طرحیں بھی زمانہ کی گردش کے ساتھ پرانی اور فرسودہ ہو جانے والی ہیں، آپ ان تمام علوم واکتشافات پر ایک غائر نظر ڈالئے جو آپ کا سرمایہ فخر وناز ہیں، اور خود ان لوگوں سے جو ان علوم واکتشافات کے اصلی محقق اور مکتشف ہیں تحقیق کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گذشتہ علوم کی طرح ان میں بھی ایسے تعینیات بہت کم ہیں جن کے متعلق اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہو کہ انکے غلط ثابت ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، باقی جتنی چیزیں ہیں سب ظنون، قیاسات، نظریات، ارتیابات اور تذبذبات ہیں جن کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جا سکتا۔

ہے کہ ترقی کی جانب زمانہ کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا جائیگا، یہ "علوم جدیدہ" اور یہ "اکتشافات حاضرہ" قدامت کا لباس خود پہنتے جائیں گے اور عمل وخیال کی یہ نئی طرحیں جو ان نا پائدار علوم واکتشافات کے بھروسہ پر پڑی ہیں، کچھ دوسری نئی طرحوں کے لئے جگہ خالی کرتی چلی جائیں گی۔

پس جب حال یہ ہے تو ایک ہوشمند اور بالغ النظر آدمی کے لئے محض اس چیز سے مرعوب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب "علوم جدیدہ" و "اکتشافات حاضرہ" نے "عمل وخیال کی نئی طرحیں ڈالدی ہیں" اور "حریت فکر وضمیر" کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے لہذا اب خدا جانے مذہب کا کیا حشر ہو۔ وہ تو ان علوم واکتشافات پر ایک تحقیقی نظر ڈالکر یہ دیکھے گا کہ ان میں جو چیزیں مذہب سے متصادم ہو رہی ہیں وہ یقینی بھی ہیں یا نہیں اگر وہ فی الواقع یقینیات ہوں اور مذہب کے حقیقی معتقدات سے متصادم بھی ہوں تو بلاشبہ اس کے لیے یہ سوال پیدا ہو جائیگا کہ مذہب پر یا ان یقینی تحقیق پر، لیکن اگر وہ محض قیاسات ونظریات ہوں۔ یا محض شک اور تذبذب میں ڈالنے والی چیزیں ہوں تو وہ ان کے اور مذہب کے تصادم سے ہرگز نہ گھبرائے گا کیونکہ مذہب کی بنیاد اگر یقین واذعان پر ہے تو یقین واذعان کے مقابلہ میں ظن وقیاس اور شک وتذبذب کو ہرگز کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے۔ اور اگر وہ بھی ظنی وقیاسی چیز ہے تو اسی ظن وقیاس ان علمی نظریات کی بنیاد بھی ہے پھر دونوں میں موجب ترجیح کیا چیز ہے؟

علوم جدیدہ واکتشافات حاضرہ سے مرعوب ہو کر مذہب کی طرف ایک ترمیم طلب نگاہ ڈالنا صرف ان لوگوں کا شیوہ ہے جن کے دل میں یہ تخیل گھر کر گیا ہے کہ ہر نئی چیز علم واکتشاف ہے اور زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے اس کو قبول کر لینا یا اس پر ایمان لے آنا ضروری ہے۔ خواہ اس کی حیثیت محض قیاسی ونظری ہی ہو، خواہ اس کو انہوں نے گہری علمی بصیرت کے ساتھ نقد وتحقیق کی کسوٹی پر پرکھا بھی نہ ہو۔ ایسے ہی لوگوں میں "عمل وخیال کی نئی طرحیں" ڈالنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے حالانکہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ عمل وخیال کی نئی طرحیں کیونکر پڑتی ہیں، اور کونسی طرحیں عاقلانہ ہوتی ہیں اور کونسی محض طفلانہ؟

اسی طرح حریت فکر وضمیر کی دولت سے مالا مال ہونے کا ادعا بھی ایسے ہی کلی النظر لوگوں کا طرۂ امتیاز بنا ہوا ہے مگر انہیں معلوم نہیں کہ مجرد حریت فکر وضمیر ایک فتنہ اور ایک خطرناک حالت ہے اگر اس کے ساتھ ایک وسیع اور پختہ علم، ایک عمیق اور

بالغ نظر، ایک متوازن اور صحیح الفکر دماغ نہ ہو، اور یہ وہ چیز ہے جس کو عطا کرنے میں قدرت نے اتنی فیاضی سے کام نہیں لیا ہے جتنی آج کل فرض کر لی گئی ہے۔

ایمان بالغیب دوسرا نظریہ جو اسی پہلے نظریہ سے نکلا ہے، یہ ہے کہ اب زمانہ "یؤمنون بالغیب" کا نہیں بلکہ "یؤمنون بالتجربۃ والشہود" کا ہے۔ میں بہت غور کرنے کے بعد بھی نہیں سمجھ سکا کہ ان الفاظ سے قائل کا حقیقی مقصود کیا ہے، اگر مقصود یہ ہے کہ اس زمانہ میں کوئی ایسی بات تسلیم نہیں کی جاتی جس پر غیب کا اطلاق ہوتا ہو، اور جس کا تجربہ یا مشاہدہ نہ کیا گیا ہو، تو یہ بالکل غلط ہے، ایسا کہنے کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہوگا کہ اس زمانہ کے لوگوں نے صرف اسی حد کے اندر محدود رہنا قبول کر لیا ہے جس میں ان کا تجربہ و مشاہدہ ان کے لئے وسیلۂ اکتساب علم بن سکتا ہے، اور جس میں ان کے حواس کام دے سکتے ہیں، اور اس دائرے سے باہر جتنے امور ہیں ان کے بارے میں فکر کرنا اور قیاس و استقراء سے ان کے متعلق حکم لگانا انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ مگر کوئی شخص جس نے "علوم جدیدہ و اکتشافات حاضرہ" کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے، اس بیان کو تسلیم نہ کریگا۔ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کو تو چھوڑیئے کہ ان کی بحث تمام تر امور غیب سے ہے، خود سائنس اور اس کے علوم طبیعیہ کو لیجئے جن کے اعتماد پر آپ "ایمان بالتجربۃ والشہود" کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس فن کا کونسا شعبہ ایسا ہے جس کی تحقیقات کا مدار قوت، انرجی، قانون فطرت، مادہ، رشتۂ علت و معلول اور ایسے ہی دوسرے امور کے قرار و اثبات پر نہیں ہے؟ کونسا عالم طبیعی ایسا ہے جو ان چیزوں پر ایمان نہیں رکھتا؟ مگر کسی بڑے سے بڑے حکیم سے تو پوچھیے کہ ان میں سے کسی کی حقیقت وہ جانتا ہے؟ کس کی کنہ تک اس کے حواس پہنچ سکے ہیں؟ کس کے نفس وجود کا تجربہ و مشاہدہ اس نے کر لیا ہے؟ اور کس کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت وہ پیش کر سکتا ہے؟ پھر یہ غیب پر ایمان نہیں تو کیا ہے!

ان الفاظ کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف وہی بات مانی جاتی ہے جس کا تمام انسانوں نے تجربہ و مشاہدہ کیا ہے اور مجموع انسانی کے ہر فرد کے لئے شہود و حضور کا مرتبہ رکھتی ہے، لیکن یہ ایسی بات ہے جو کسی مرد عاقل کی زبان سے نہیں نکل سکتی اس لئے کہ یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ تمام انسانی معلومات تمام افراد انسانی کو فرداً فرداً حاصل نہیں ہیں بلکہ ان کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس میں مخصوص جماعتوں اور مخصوص افراد کو اختصاص کا درجہ حاصل ہے تاہم ان خصوصی معلومات کا ہر شعبہ صرف اپنے مختص عالموں کیلئے حاضر اور باقی تمام انسانوں کیلئے غائب ہوتا ہے اور جو کوئی اس شعبۂ تحقیق کے مباحث پر ایمان بالغیب لانا پڑتا ہے جو اس شعبہ کا عالم ہے۔ تیسرا مفہوم اس قضیۂ کلیہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کا ہر شخص صرف وہی بات مانتا ہے جو اس کے حواس کی

تجربے یا مشاہدے میں آئی ہوا اور ایسی کسی بات کو نہیں مانتا جو خود اس کے لئے غیب کا حکم رکھتی ہو لیکن یہ ایسی بات ہو کہ اس سے زیادہ مہمل کوئی بات انسانی دماغ سے نکل نہیں سکتی اس صنعت کا کوئی آدمی نہ کبھی پایا گیا ہے نہ آج پایا جاتا ہے، نہ قیامت تک اس کے پائے جانے کی امید ہو اور اگر وہ فی الواقع کہیں موجود ہو تو اس کی نشان دہی کرنے میں ہرگز تامل نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ تو اس کا مستحق ہو کہ عجائب عالم میں اس کا نمبر سب سے پہلا ہو۔

غرض آپ خواہ کسی پہلو سے اس فقرہ کو دیکھیں اس میں کوئی صداقت آپ کو نظر نہ آئے گی، خود تجربہ و مشاہدہ اس پر گواہ ہے کہ یہ زمانہ بھی اسی طرح یومنون بالغیب کا ہے جس طرح گذشتہ زمانہ تھا، اور ایمان بالغیب جس چیز کا نام ہے اس سے انسان کو نہ کبھی چھٹکارا ملا ہے، نہ مل سکتا ہے، ہر شخص اپنی زندگی کے ۹۹۹ فی ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ معاملات میں ایمان بالغیب لاتا ہے اور لانے پر مجبور ہے، اگر وہ یہ عہد کرے کہ صرف اپنے تجربہ اور مشاہدہ پر ہی ایمان لائے گا تو اس کو معلومات کا وہ تمام ذخیرہ اپنے دماغ سے خارج کر دینا پڑیگا جسے دوسروں پر اعتماد کر کے اس نے مقام علم و یقین میں جگہ دی ہے اور اکتساب علم کے ان تمام ذرائع کا مقاطعہ کر دینا پڑیگا جو خود اس کے اپنے تجربہ و مشاہدہ سے ماسوی ہیں، اور یہ ایسی حالت ہوگی جس میں وہ زندہ ہی نہ رہ سکے گا، کجا کہ دنیا کا کوئی کام کر سکے پس ایمان بالغیب کی کلی نفی، اور "ایمان بالتجربۃ والشہود" کا کلی اثبات نہ اس زمانہ میں ممکن ہو اور نہ اس سے بھی زیادہ روشن کسی اور زمانہ میں لامحالہ ہر زمانے اور ہر حالت میں انسان مجبور ہو کہ اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے بغیر بہت سی باتیں محض دوسروں کے اعتماد پر مان لے کچھ باتیں اس کو خبر متواتر کی بنا پر ماننی پڑتی ہیں جیسے کہ سنکھیا کھانے سے آدمی مر جاتا ہے درانحالیکہ ہر شخص نے نہ خود سنکھیا کھا کر اس کا تجربہ کیا نہ کسی کو کھا کر مرتے ہوئے دیکھا کچھ باتوں کو ایک یا چند معتبر آدمیوں کی روایت سے مان لینا پڑتا ہے جیسے عدالتوں کا شہادت پر اعتماد، کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو قانون کی مشین ایک لمحہ کے لئے بھی حرکت نہ کر سکے کچھ باتیں صرف اس بنا پر تسلیم کر لینی پڑتی ہیں کہ انکو ایک ماہر فن کہہ رہا ہو۔ یہ حالت ہر مدرسہ اور ہر کالج میں ہر طالب علم پر گذرتی ہو، اگر وہ اپنے فن کے اکابر علما و ماہرین کی تحقیقات اور ان کے اکتشافات و نظریات پر ایمان بالغیب نہ لائے تو علم کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، اور نہ کبھی ترقی کر کے اس مقام

تک پہنچ سکتا ہے۔ جہاں وہ خود ان علماء و ماہرین کی طرح حقائق علمیہ کی تحقیق کرنے کے قابل ہو۔

اس سے ثابت ہوا کہ ہم ان تمام معاملات میں دوسروں پر ایمان بالغیب لاتے ہیں اور لانے پر مجبور ہیں جن میں ہم نے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے اکتساب علم نہیں کیا ہے، اور دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے اور اسی پر فیصلہ کا انحصار ہے کہ کس معاملہ میں کس پر ایمان بالغیب لانا چاہئے؟ اصولاً یہ بات ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ ایسے ہر معاملہ میں صرف اس شخص یا جماعت پر ایمان لانا چاہئے جس کے متعلق ہم کو یہ اطمینان ہو کہ اسے اس معاملہ کا بہتر علم حاصل ہے اور اس کے پاس اس کو جاننے کے بہتر ذرائع موجود ہیں۔ اسی قاعدہ کلیہ کے تحت ایک مریض ڈاکٹر کو چھوڑ کر وکیل سے مشورہ نہیں کرتا۔ اور ایک اہل مقدمہ وکیل کو چھوڑ کر انجنیر کے پاس نہیں جاتا۔ لیکن الٰہیات و روحانیات کے مسائل میں یہ اختلاف واقع ہوتا ہے کہ آیا ان میں علماء فلسفہ و ماہرین علوم عقلیہ کی رائے تسلیم کی جائے یا عالم انسانی کے مذہبی و روحانی پیشواؤں کی؟ خدا اور ملائکہ، وحی و الہام، روح اور حیات بعد الموت، عذاب و ثواب آخرت اور ایسے ہی دوسرے امور غیب میں کانٹ اور ہینسر، آئن سٹائن اور برگساں جیسے لوگوں کی بات مانی جائے، یا ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ و محمد علیہم السلام جیسے بزرگوں کی؟ "حریت فکر و ضمیر" کے مدعیوں کا رجحان پہلے گروہ کی جانب ہے، اور وہ انہی کی مہیا کی ہوئی کسوٹی پر دوسرے گروہ کی باتوں کو کس کر دیکھتے ہیں۔ جو باتیں اس کسوٹی پر کھری نکلتی ہیں انھیں مان لیتے ہیں، اس لئے نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے کہی ہیں، بلکہ اس لئے کہ حکماء و فلاسفہ نے ان کو شرف قبول عطا کیا ہے (اور بدقسمتی سے ایسی باتیں بہت ہی کم بلکہ بالکل نہیں ہیں) اور جو باتیں اس پر کھوٹی نکلتی ہیں، ان کو غیر معتبر قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ برعکس اس کے "قدامت پرستوں" اور اسلاف پرستوں کا مسلک یہ ہے کہ نہ طبیعیات و عقلیات کی باتیں الٰہیات و روحانیات والوں سے پوچھو اور نہ اس کے برعکس الٰہیات و روحانیات کی باتیں عقلیات و طبیعیات والوں سے۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں، اور ایک علم میں دوسرے علم کے ماہر کی رائے پر اعتماد کرنا پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ حکماء و فلاسفہ اپنے عقلی علوم میں خواہ کتنی ہی اعلیٰ بصیرت رکھتے ہوں، لیکن علوم الٰہیہ میں ان کا مرتبہ ایک عامی سے زیادہ نہیں ہے اور وہ ان کے متعلق معلومات کے اتنے ہی ذرائع رکھتے ہیں جتنے ہر معمولی انسان رکھتا ہے۔ یہ علوم مخصوص ہیں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ۔ وہی ان کے

ما ہیں اور انہی کے پاس ان کے جاننے کے اصلی ذرایع ہیں اس لئے ان کے مسائل میں انہی پر ایمان بالغیب لانا چاہیے آپ کے لئے بحث و کلام کی گنجایش اگر ہے تو وہ صرف اس امر میں ہو کہ آیا وہ فی الواقع سچے اور علوم الہیہ میں صاحب بصیرت تامہ ہیں یا نہیں مگر جب یہ بات ثابت ہو جائے، یا ثابت کر دی جائے کہ فی الحقیقت ایسے ہیں، تو پھر جو باتیں اپنی بصیرت اور اپنے علم کی بنا پر انہوں نے بیان کی ہیں وہ سب آپ کو ماننی پڑیں گی۔ ان سے انکار کرنا اور ان کے خلاف دلیل و حجت لانا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے ایک اندھا سورج کے وجود سے انکار کردے اور آنکھوں والے کو جھٹلانے کے لئے وجود شمس کے امتناع پر دلیلیں پیش کرے۔ ایسا شخص اپنے زعم میں خواہ کتنا ہی بڑا فلسفی ہو، اگرچہ اپنی آنکھوں سے سورج کو دیکھ رہا ہے وہ اس نابینا کے متعلق جو کچھ رائے قائم کریگا اس کے بیان کی حاجت نہیں ہے۔

ریب و تذبذب کا اصلی علاج آپ کہیں گے کہ انبیاء علیہم السلام نے امور غیب کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کی تائید "علوم جدیدہ" و "اکتشافات حاضرہ" سے نہیں ہوتی، اور اس لئے لوگ "ریب و تذبذب" میں مبتلا ہو رہے اور ناچار "مسلمان شو" کی لعنت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ مگر میں کہونگا کہ ان علوم و اکتشافات میں وہ کونسے تعینیات ہیں جو اصول اسلام سے ٹکراتے ہیں؟ اگر ہیں تو وہ پیش فرمائیے تاکہ ہم بھی غور کریں کہ آیا قرآن کو مانیں یا علوم جدیدہ و اکتشافات حاضرہ کو۔ اور اگر نہیں ہیں اور ہرگز نہیں ہیں جیسا کہ خود آپکے الفاظ "ریب و تذبذب" اور "ناچار مسلماں شو" سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر کیا علوم جدیدہ و اکتشافات حاضرہ کے اسلحہ خانے میں صرف ظنیات و قیاسات ہی کے وہ ہتھیار رہ گئے ہیں جن کے بل پر وہ مذہب کے خلاف اعلان جنگ دے رہے ہیں؟ اور جن کی حقیقت نہیں محض چمک دمک دیکھ کر آج کل کے ارباب "حریت فکر و ضمیر" یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ مذہب ان کا نام سنتے ہی سہم جائے گا۔ اور میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائیگا؟ آپ ان علوم و اکتشافات کو خواہ کتنی ہی اہمیت دیں مگر یاد رکھیے کہ امور غیب میں وہ ہرگز مفید یقین نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انکا یہ اثر ہو سکتا ہے کہ آپ "ریب و تذبذب" میں پڑ جائیں اور کہیں کہ ہم وحی و الہام، بعث بعد الموت یا عذاب و ثواب آخرت یا فرشتوں کے وجود یا

خود خدا کے وجود کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم نہیں لگا سکتے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کو "ناچار مسلمان شو" کی لعنت سے نکالنے اور "کافر نتوانی شد" کی "برکت" سے مالامال ہونے میں یہ علوم کچھ بھی مدد دے سکیں کیونکہ امور ماوراء کو بالا تقطعی انکار کر دینے کے لئے یہ علوم کوئی حجت فراہم نہیں کرتے اور کسی چیز کے عدم کا حکم لگانے کے لئے صرف اتنی حجت کافی نہیں ہو کہ اس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ہے پس "ریب و تذبذب" کا مقام وہ آخری مقام ہے جہاں آپ کے "علوم جدیدہ" و "اکتشافات حاضرہ" آپ کو لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر عقلی و ذہنی حیثیت سے یہ ایک بدترین مقام ہے اور جو علوم انسان کو یقین نہ بخش سکیں جو اسے ایک ایسے مقام پر معلق چھوڑ دیں جہاں اس کو کوئی جائے قرار نہ ملتی ہو جو اسے "کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو" کی دلدل میں لیجا کر پھنسا دیں۔ وہ یقیناً جہل سے بدتر ہیں

اس مشکل سے اگر کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایمان بالغیب ہے۔ ایک دفعہ جب آپ نے ایک شخص کو نبی مان لیا اور یہ سمجھ لیا کہ وہ علوم الٰہیہ میں کامل بصیرت رکھتا ہے! اور یہ تسلیم کر لیا کہ وہ ہرگز جھوٹ نہیں بولتا، تو پھر آپ کے لئے امور غیب میں کسی تذبذب و ریب کی گنجایش نہیں رہتی، اور آپ کا اعتقاد یقین و اذعان کی ایک ایسی مضبوط بنیاد پر قائم ہو جاتا ہے جسے کسی "علم جدید" و "اکتشاف حاضر" اور "عمل و خیال" کی کسی "نئی طرح" اور "حریت فکر و ضمیر" کی کسی گرم بازاری سے کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے متقین کے لئے اور متقین کی پہلی صفت یہ ہو کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (۲:۱) اسی ایمان بالغیب پر مذہب کی پوری عمارت قائم ہے۔ اگر آپ نے اس اصل الاصول کو منہدم کر دیا تو پھر مذہب کے ان بنیادی معتقدات کے متعلق جن کی حقیقت معلوم کرنے کا خود آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے آپ کسی ایسی رائے پر نہیں پہنچ سکتے جس کی صحت کا خود آپ کو یقین ہو اور جس کی صداقت کا آپ دوسروں کو یقین دلا سکیں۔

نبوت کا مسئلہ بنیادی مسئلہ ہے

اب آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایک شخص کے متعلق یہ دریافت کرنے کا کونسا ذریعہ ہے کہ وہ نبی ہے، اس کو علوم الٰہیہ میں کامل بصیرت حاصل ہے، اور وہ اس مرتبہ کا صادق

نسان ہے کہ اگر وہ امور غیب کے متعلق ہم کو ایسی باتیں سنائے جو ہماری عقل سے ماوراء اور ہمارے دائرۂ علم سے باہر
ہوں تب بھی ہم اس کی بات پر ایمان لے آئیں اور یقین کے ساتھ کہہ سکیں کہ وہ ہرگز جھوٹا نہیں ہے؟ اس سوال
تصفیہ منحصر ہے دو چیزوں پر ایک یہ کہ ہم اس شخص کی ذاتی سیرت کو اس سخت سے سخت معیار پر جانچ کر
یکھیں جس پر کسی انسان کی سیرت جانچی جا سکتی ہے دوسرے یہ کہ ہم اس کی پیش کی ہوی ان باتوں پر نگاہ
ڈالیں جو ہمارے دائرۂ علم سے باہر نہیں ہیں اور جن میں قطعیت کے ساتھ ایک حکم عقلی لگانا ہمارے لئے ممکن ہے
جب ان دونوں امتحانوں سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے صادق القول ہونے میں بے مثل ہے اور اس کے
ساتھ زندگی کے تمام عملی اور فکری شعبوں میں خیر و صلاح و حکمت کی ایسی کامل تعلیم دیتا ہے جس میں انسانی عقل
ہیں سے کوئی عیب نہیں نکال سکتی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو سچا نہ مانیں اور یہ بدگمانی کریں کہ اس نے
ی علم و واقفیت کے بغیر محض دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے خدا اور فرشتوں اور عرش و کرسی اور وحی و الہام
و البعث بعد الموت اور دوزخ و جنت کا اتنا بڑا فریب گھڑ کر رکھ دیا ہے۔

پس حضرت نیاز کی تیسری غلطی یہ ہے کہ وہ قرآن کے پہلے حصہ کو (جسے ہم نے اپنی تقسیم میں دوسرا
حصہ قرار دیا ہے) قابل بحث نہیں سمجھتے اور مزید برآں یہ خیال کرتے ہیں کہ اس معاملہ میں تمام مذاہب
تقریباً یکساں ہیں۔ اور مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں ہے۔ برعکس
اس کے ہم کہتے ہیں کہ ان کی تقسیم کے مطابق قرآن کے دوسرے اور تیسرے حصے (یا ہماری تقسیم کے مطابق پہلے
حصے) کی صداقت کا فیصلہ منحصر ہی اس پر ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور قرآن مجید کے
ان تمام حصوں کی ناقدانہ چھان بین کریں جن کا تعلق امور غیب سے نہیں ہے۔ اور صرف اس پر اکتفا نہ کریں
کہ اسلام کی تعلیم کا یہ حصہ "دوسرے مذاہب سے مختلف یا فروتر نہیں ہے"۔ بلکہ بدلائل یہ ثابت کریں کہ وہ تمام
ان مذاہب سے جو غیر اسلام ہیں اعلیٰ و ارفع و اجل ہے جب تک بحث کا یہ مرحلہ طے نہ ہو جائے۔ دوسرے مرحلے
(یعنی امور غیب کی بحث) میں قدم رکھنا اصولاً غلط ہے، اور اس کے تصفیہ کے بغیر ان کا تصفیہ ممکن نہیں ہے۔

اصول بحث حضرت نیاز چاہتے ہیں کہ ہم "معاد" اور "کلام الہیٰ" اور ان آیات سے بحث کریں جو عقاید و قصص سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس بحث کے دو پہلو ہیں، اور وہ دو مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور اس بنا پر ان امور میں شک کرتا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو آپ کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے، مگر امور غیب میں اس کو شکوک و شبہات ہیں۔ ان دونوں گروہوں سے بحث کرنے کے طریقے مختلف ہیں، اور جب تک ہمیں معلوم نہ ہو کہ معترض کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے اس وقت تک ہم اس سے بحث نہیں کر سکتے

پہلے گروہ سے معاد اور کلام الہیٰ اور دوسرے امور غیب پر بحث کرنا بالکل بے نتیجہ ہے، کیونکہ اصل میں اختلاف رہتے ہوئے فروع پر بحث کر کے نتیجہ پر پہونچنا ممکن نہیں ہے۔ ہم معاد اور کلام الہیٰ حتیٰ کہ خود وجود و صفات الٰہی کے متعلق بھی جن باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، ان پر ہمارا ایمان و یقین اس بنا پر نہیں ہے کہ ہماری عقلی تحقیق یا ہمارے ذاتی تجربہ و مشاہدہ نے ان کے متعلق ہم کو کوئی ایسا قطعی اور یقینی علم بخشا ہے، جس کے خلاف پر کوئی دلیل عقلی قائم نہ کی جا سکتی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ نبوت کی بحث سے بے نیاز ہو کر ان مسائل سے بحث کی جا سکتی تھی لیکن ان امور پر ہمارے قطعی ایمان و اذعان کی بنیاد تو اس اعتقاد پر ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم صادق القول ہیں، اور اپنی رسالت اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اسی اصل سے یہ بات متفرع ہوتی ہے کہ محمد صلعم اور ان کے پیش کردہ قرآن نے امور غیب کے متعلق جو کچھ خبریں دی ہیں، وہ سب صحیح ہیں۔ پس جب تک محمد صلعم کی صداقت کے منکر سے ہم اس بنیادی مسئلہ کو تسلیم نہ کرا لیں گے، اس وقت تک کسی فرعی مسئلہ سے بحث ہی نہ کریں گے۔

رہا دوسرا گروہ تو اس کے اس حق کو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت تسلیم کر لینے کے بعد امور غیب پر اس حیثیت سے کلام کرے کہ آیا قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ خبریں دی ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط؟ . . . .

اس لئے کہ یہ پہلو اختیار کرتے ہی وہ پہلے گروہ میں شامل ہو جائیگا۔ اگر وہ حقیقت میں دوسرے گروہ کا آدمی ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ قرآن کا لفظ صحیح ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ پیش کیا ہے غلطی سے مبرا ہے۔ البتہ وہ اس پر دو پہلوؤں سے کلام کر سکتا ہے ایک یہ کہ آیا فی الواقع قرآن میں ایسا ہے یا نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ قرآن اور سنت میں جو کچھ فی الواقع ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

آخری گذارش آخر میں ایک بات مجھے اور عرض کرنی ہے۔ حضرت نیاز نے رائے دی ہے کہ ترجمان القرآن میں ایک باب المناظرہ کھولا جائے اور ارادہ ظاہر فرمایا ہے کہ وہ اپنے شبہات و اعتراضات بھی پیش کریں گے جہاں تک اصطلاحی مناظرہ کا تعلق ہے میں نے ہمیشہ اس سے دامن بچایا ہے اور اب بھی بچانا چاہتا ہوں کیونکہ ایسی بحث کا میں ہرگز قائل نہیں ہوں جس کا مقصد محض دماغی ورزش یا عقلی کشتی ہو۔ رہا علمی مناظرہ، جس کا مقصد احقاق و تحقیق ہو، اور جس میں فریقین اس دلی خواہش کے ساتھ شریک ہوں کہ جو کچھ ان کے نزدیک حق ہے اس کا اظہار کریں گے، اور جو کچھ حق ثابت ہو جائیگا اس کو تسلیم کرلیں گے تو اس کے لئے میں ہر وقت آمادہ ہوں ”نگار“ میں جن شبہات و اعتراضات کو پیش کیا جائیگا۔ وہ بجنسہٖ ”ترجمان القرآن“ میں نقل کئے جائیں گے اور پھر جواب دیا جائیگا۔ اسی طرح امید ہے کہ ترجمان القرآن کے جواب پر اگر حضرت نیاز کوئی تنقید فرمائیں گے تو اصل جواب بھی اس کے ساتھ نقل فرمائیں گے، تاکہ دونوں رسالوں کے ناظرین بحث کے دونوں پہلوؤں سے واقف ہوں، اور خود بھی کوئی رائے قائم کرسکیں صرف ایک پہلو پیش کرنا اور دوسرے پہلو کو پیش کرنے سے احتراز کرنا میرے نزدیک خود اپنی کمزوری کا اعتراف ہے۔

افکار بشری کی آزادی میں قرآن کا حصہ

شیخ عبدالعزیز شاویش مرحوم کے خطبات

حصّہ اوّل

آج چار پانچ سال قبل مصر کے مشہور فاضل شیخ عبدالعزیز شاویش مرحوم نے مدرسہ دارالعلوم قاہرہ میں عنوان مذکور پر چار خطبات دئے تھے جن کا ترجمہ صفحات ذیل میں درج کیا جاتا ہے ضروری نہیں ہے کہ شیخ کے تمام خیالات سے ہم متفق ہوں لیکن مجموعی حیثیت سے ہم خیال کرتے ہیں کہ شیخ نے جس پہلو سے قرآن حکیم پر نظر ڈالی ہے اس پہلو پر بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ (ایڈیٹر)

حضرات!

غالباً یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ فکر بشری کی تحریک تحریر (آزادی) میں قرآن مجید کے اثر کو بیان کرنے سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک مختصر تاریخی بیان پیش کروں جس سے معلوم ہو کہ ظہور اسلام سے پہلے دنیا کی بڑی بڑی قومیں کن انقلابات سے گذری ہیں اور اس کے بعد کئی صدیوں تک قوموں کی عقلوں میں کس قسم کا مدوجزر اور آزادی وغلامی کا الٹ پھیر رہا ہے، یہ بیان ہم کو اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے میں مدد دیگا کہ قرآن نے عقل انسانی کو اس کا پورا پورا حصہ دلانے اور اسے اس مقام تک پہنچانے میں کس قدر حصہ لیا ہے جس تک انسان کے خالق نے اول آفرینش میں اس کا پہنچنا مقدر فرمایا تھا۔

سلطنت رومیہ (Roman Empire) کے عام سیاسی قانون کی بنیاد ادیان وعقائد اور افکار کی کھلی ہوئی آزادی پر تھی اور وہاں یہ حالت برابر قائم رہی تا آنکہ مسیحی مذہب یورپ میں داخل ہوا، اور اس کے ساتھ ہی روک ٹوک اور قیود اور بندشوں کا وہ دور شروع ہوا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

قدیم زمانہ میں بعض شعراء یونان اور مذہبی پیشواؤں کے اثر سے لوگ خرافات اور رسوم اور تنگ نظری و تعگ دلی پیدا کرنے والے افسانوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے ان سے افکار کو آزاد کرانے میں سب سے زیادہ جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں ہرقلیتوس (Heracleitus) اور دیموقریطا (Demoeritus) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں نے مادہ طبیعیہ کی تحقیق و تفتیش کے بعد نفس بشری کے احوال اور سیاسی مسائل سے بحث کی، اور اپنی تمام کوششوں اور کاوشوں میں ایک ہی چیز کو اصل الاصول قرار دیا یعنی ہر شئے کو عقل اور فکر کی کسوٹی سے پرکھنا یہی طریقہ انکسافورس (Anaxagoras) کا بھی تھا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورج جس کی تم صبح شام پوجا کیا کرتے ہو، یہ محض آگ کا ایک تودہ ہے، خدا نہیں ہے کہ اس کی پرستش کیجائے انسانی عقل کو اوہام کی بندشوں سے آزاد کرانے میں ان فلاسفہ نے جو کچھ کیا، اسی نے ان علماء تربیت کیلئے راہ صاف کی جو صوفیہ یا سفسطائیہ (Sophists) کے نام سے موسوم ہیں، جو پانچویں صدی قبل مسیح میں ظاہر ہوئے اور جنہوں نے قرن مذکور کے نصف ثانی میں اخلاق و سیاست کے نقطہ نظر سے حیات اجتماعی کے قواعد و اصول وضع کئے اور خطاء و صواب عقل اور قوانین منطق و خطابت وغیرہ سے بحث کی۔ لیکن یہ سب باتیں ایک بہت ہی قلیل طبقہ علماء اور مفکرین کے طبقہ سے آگے نہ بڑھ سکیں، رہے عوام، تو وہ ہر جگہ خرافات اور باطل عقاید کے دام میں اسیر تھے البتہ اس عہد میں ایتھنز (Athens) جس آزادی فکر اور سیاسی مسائل میں بحث و کلام کی حریت سے بہرہ مند تھا، اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا خصوصاً ایتھنز کے زعیم حریت پریکل (Pericles) کے عہد میں کہ وہ آزاد مفکرین کا بڑا حامی تھا، اور اسی کی طاقت نے ایتھنز کے دیوتاؤں سے انکار کرنے والے فلسفی انکساغورس کو قانون کی گرفت سے بچایا۔

اس زمانے کے واقعات و حوادث کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ادیان کے خلاف خروج کرنے والا سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا تھا اور اس مضمون میں جو کتاب شائع ہوتی تھی، اس کے نسخے جمع کر کے جلا ڈالے جاتے تھے اور اس کی فروخت کو ممنوع قرار دیا جاتا تھا لیکن بے دین منطقیوں (Rationalists

کے خلاف جو منظم شورشیں اور باقاعدہ سختیاں پہلے ہوتی تھیں وہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں کم ہونے لگیں جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اب ان لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور ان کا گروہ پھیلتا جا رہا تھا۔ یونانیوں اور رومیوں کے ہاں ان کی انتہائی علمی تمدنی اور مادی ترقی کے زمانہ میں جو قضایا مسلّم تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مطلقاً مذہب عوام کے لئے نافع اور ضروری ہے جو لوگ حقیقت میں مذہب کے قائل نہ تھے وہ بھی سیاست عامہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کے فائدے کے ضرور قائل تھے کیونکہ ان کے فلاسفہ اکثر اس قسم کے عقائد اور نظریات کی اشاعت کا اقدام کر بیٹھتے تھے جو حیات اجتماعی میں اضطراب اور برہمی پیدا کرنے والے ہوتے تھے۔ یونانیوں میں سے جن لوگوں کا قدم اس میدان میں سب سے آگے تھا، ان میں ایک سقراط ہے، جو عام طور پر ان علمائے تربیت میں سب سے زیادہ جلیل القدر سمجھا جاتا ہے جس چیز نے اس کو ممتاز اور یکتائے روزگار بنا دیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ وہ نکتہ چینی اور مناقشہ کے طریق میں نہایت مضبوط تھا اور جو لوگ اس سے گفتگو کرتے یا اس کا کلام سنتے، ان کو اپنے زور تقریر سے اس نقطہ پر کھینچ لاتا تھا کہ معروف و مقبول عام عقائد کو بغیر جانچے پرکھے تسلیم نہ کریں، ان کو عقل و فکر کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں رسوم و تقالید کی بندشوں میں بند ہے نہ رہیں عوام کی خواہشوں اور رغبتوں سے بے پروا ہو جائیں اور ہر بحث و تحقیق کے لئے اپنے سینے کو کشادہ کر لیں۔ سقراط نے علم کی اشاعت اور تلاش حق اور فکر صحیح کے طریقوں کی جانب اپنے عہد کے نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں یونان ایک ایسی فکری حرکت کا میدان بنا ہوا تھا جس کی ابتدا کرنے والے یا تو پیٹ کا دھندا چاہتے تھے یا شہرت و ناموری کے طالب تھے۔ ان لوگوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے جدل اور تشکیک کے طریقوں میں غلو کی انتہا کر دی تھی، اور ان کو اس کی کچھ پروا نہ رہی تھی کہ ان طریقوں سے لوگ کس قدر گمراہ ہوں گے اور اس کے کیسے بُرے نتائج ظاہر ہوں گے ان لوگوں نے حق اور باطل، فضیلت اور رذیلت کو ایسا گڈمڈ اور خلط ملط کیا کہ لوگوں کے لئے صحیح اور غلط میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا، اور علم صحیح کے نشانات و حدود نگاہوں سے چھپ گئے انھوں نے

فکر و نظر کے شعبوں میں سے کوئی شعبہ اور معرفت کے میدانوں میں سے کوئی میدان نہ چھوڑا جس کے اساس و ارکان میں تشکیک کے تیشے نہ چلائے ہوں نہ اس غرض سے کہ کسی علمی فائدے تک پہنچیں، یا صحیح نتائج حاصل کریں، بلکہ محض بھٹکنے اور بھٹکانے کے لئے محض جاہل بننے اور بنانے کے لئے۔

پس جب سقراط عقل رزیں رائے سدید اور علم صحیح لے کر آیا تو اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق کلام کرے اور انکی رہنمائی کے لئے اسی راستہ پر چلے جن پر دوسرے لوگ ان کو گمراہ کرنے اور ان کو بھٹکانے کے لئے چلتے تھے اگر وہ انکی تعلیم و ارشاد میں ان راہوں سے الگ کوئی راہ اختیار کرتا جن کے وہ لوگ گرویدہ ہو چکے تھے، تو وہ نہ ان کو اپنے طریقہ کی طرف کھینچ سکتا اور نہ اپنے مقاصد میں کوئی کامیابی حاصل کر سکتا سقراط کے زمانہ تک تربیت عالیہ کو یونان کے سیاسیین اور مفکرین کے مقاصد میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہ ہوا تھا، باوجودیکہ ایتھنز اس عہد میں اپنی جمہوریت اور رواداری اور آزادخیالی کے لئے تمام دنیا میں مشہور تھا مگر تاریخ ہمکو حریت فکر کی طرف دعوت دینے والوں اور عقل سے فیصلہ چاہنے والوں کے خلاف اہل ایتھنز کے ظلم و ستم کی وہ وہ داستانیں سناتی ہے جن کے باور کرنے سے وہم انکار کرتا ہے سقراط مناظرہ و مجادلہ اور تشکیک و نقد کے فن میں پہلے درجہ کا ماہر تھا، اور لوگوں کے رسوم و عقاید کی پابندیوں سے اس کی آزادی مشہور تھی اس کے مقابلے میں یونانیوں کے اندر ایک ایسی روح کام کر رہی تھی جو جدید عقلی زندگی کی دشمن تھی، وہ فلاسفہ اور ان کے پیرو سقراط سے جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے جھوٹے قصے گھڑ گھڑ کر ان کو بدنام کیا، ان کا مذاق اڑایا سقراط جیسے شخص کو زندیق، بدعمل اور گمراہی کی طرف بلانے والا مشہور کیا، یہاں تک کہ یونانی قوم اس کے خلاف بھڑک اٹھی اور اس کو ملحد اور نوجوانوں کے عقاید خراب کرنے والا قرار دیکر ۳۹۹ء قبل مسیح میں قتل کر دیا اس پر نوجوانوں کے عقائد خراب کرنے کا الزام تھا۔ اس کو رد کرتے ہوئے اس نے دو باتیں پیش کی تھیں :۔

۱۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ جب وہ دیکھے کہ اس پر ظلم کیا جا رہا ہے تو اس کا مقابلہ کرے، خواہ نتیجہ خلاف ہو یا موافق اور چاہے وہ ظلم کرنے والا کوئی صاحب اثر آدمی ہو، یا کوئی محکمہ ہو۔

۲۔ اپنی بات سے ہرگز نہ ٹلے کیونکہ آزاد مباحثہ میں بڑی مصلحت ہے اور یہی چیز علم صحیح کی ضامن ہے۔
اس کے ۷۰ برس بعد ارسطو کو بھی اسی انجام کے خوف سے ایتھنز چھوڑنا پڑا کیونکہ وہاں اس کو بھی ملحد مشہور کیا جانے لگا تھا۔

سقراط کے سب سے زیادہ جلیل القدر شاگرد افلاطون نے ایک نئی ضرب لگائی جس نے حریت فکر و مباحثہ کی جانب پیشقدمی کو رجعت سے بدل دیا وہ اپنی مثالی ریاست (Ideal state) میں لوگوں کو ایک خاص دین قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کا خاکہ خود اس نے پیش کیا ہے جو کوئی اس دین پر ایمان نہ لائے افلاطون اس کو قتل اور قید کی سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ گفتگو اور مباحثہ کی آزادی کو بھی سزاؤں سے روکتا ہے جو اس نے اپنی کتاب میں تجویز کی ہیں۔

سقراط کی تعلیمات ایک ایسا سرچشمہ تھیں جس سے فلسفہ کے متعدد مذاہب رونما ہوئے اور فلاسفہ کا ایک ممتاز گروہ پیدا ہوا جن میں افلاطون اور ارسطو اور رواقیہ (Stoics) وغیرہ شامل ہیں جن کے مذاہب تیسری صدی قبل مسیح سے بلاد یونان کے اطراف میں پھیلنے شروع ہوئے، اور جنھوں نے عقلی زندگی کے دروازے کھول دئیے اور اہل یونان میں فکر و تدبر کی قابلیت پیدا کی۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل بیان ہے کہ گو ابیقورس (Epicurus) اس وجود میں تدبیر و تصرف کرنے والی خدائی حکومت کا منکر تھا، اور اس کی نظر مادہ اور مادیات کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکتی تھی مگر اس کے باوجود وہ جدت فکر کی دشوار گذار گھاٹیوں سے اس حیرت ناک سرعت کے ساتھ گذرا کہ سوتی ہوئی عقلیں چونک پڑیں اور صدیوں تک زمانہ اس کے اثر کو نہ مٹا سکا حتیٰ کہ ایک رومی شاعر کو تو اس کے فلسفہ میں وحی و الہام کا جلوہ نظر آیا جس کو اس نے اپنے قصیدے "طبیعۃ الدنیا" نامی میں بیان کیا ہے۔
انسانی عقل کی آزادی میں رواقی فلسفہ کا بھی کچھ کم حصہ نہ تھا بلکہ درحقیقت اس مذہب نے ان قوانین اجتماعیہ کو ایک منظم اور مفصل طریق پر پیش کیا جن کا سقراط نے کچھ بھی ذکر نہ کیا تھا۔ رواقی فلسفہ نے رومی قوانین پر

خاص اثر کیا، کیونکہ رومی سلطنت کے قانون مدنی کی بنیاد تمام ادیان کی کھلی ہوئی آزادی اور اظہار رائے کی پوری حریت پر تھی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

حضرات!

رومی سلطنت اسی آزادی فکر اور حریت دینی کے قانون پر چل رہی تھی کہ مسیحی مذہب یورپ پہنچا۔ اور رومی قوم نے اپنی صنم پرستی کی حفاظت کیلئے مذہبی آزادی کے اصول کو خیرباد کہدیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ رومی اس مذہب کو یہودیت کی ایک شاخ سمجھتے تھے، اور یہودیت بالطبع رومیوں کے وثنی عقاید کی مخالف تھی، اور رومیوں کو ایک آن نہ بھاتی تھی، یہودیت اور اس کے شبہ میں مسیحیت سے رومیوں کی شدید نفرت اور بغض کا نتیجہ یہ ہوا کہ تراجان (Trajan) نے ان لوگوں کے قتل کا حکم دیدیا جو دین نصرانی کے پیرو تھے اگرچہ اس کے ساتھ ایسی قیود بھی عاید کریں کہ حد سے زیادہ قتل عام نہ ہونے پائے، لیکن بعد میں قیصر ڈیوکلیتیان (Diocletian) نے حکومت کے مذہب کی تائید کرنے کا عزم کر لیا اور پوری سنگدلی اور قساوت کے ساتھ مسیحیوں کا قتل عام کرایا۔ درحقیقت جس چیز نے اس فرمانروا کو ان جرائم پر آمادہ کیا وہ یہی تھی کہ مسیحیت رومیوں کی اس عبادت کی مخالف تھی جس کا مرکز رومن ایمپائر کا تخت تھا۔ بخلاف اس کے رومی فرمانروا اس کو ضروری سمجھتے تھے کہ قومیں ان کو اپنی عبادت کے لئے مخصوص کریں تاکہ ان کی وحدت قومی باقی رہے اور اس تخت سے انکا خالص تعلق قائم رہے جو پوری سلطنت کا مرکز ہے۔

لیکن قسطنطین اعظم کے نصرانیت میں داخل ہوتے ہی نقشہ بدل گیا۔ اس سے پہلے دو صدیوں تک تو مسیحیت کے پیشوا یہ اعلان کرتے رہتے تھے کہ مذہبی رواداری واجب ہے اور عقاید وہ چیز نہیں ہیں جو زبردستی انسان کے سر تھوپی جا سکتی ہو۔ قسطنطین کا مسیحیت میں داخل ہونا تھا کہ سرے سے یہ سب اصول پلٹ گئے۔ اب حکام اور فرمانروا بیشتر سیاسی اغراض کے لئے، اور عوام کے مختلف گروہ آپس کے مذہبی اختلافات کی بنا پر فتنوں کے شعلے بھڑکانے لگے۔ جگہ جگہ ہولناک قتل عام برپا کرنے لگے، دنیا سے امن و سلامتی رخصت ہوگئی دلوں سے راحت و اطمینان کی متاع چھین گئی۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ نجات مسیحیت قبول کئے بغیر ہو نہیں سکتی، اور جو اس کو قبول نہ کرے اس کو کوئی فدیہ نہ عذاب دنیا سے

بچا سکتا ہے اور نہ عذاب آخرت سے چاہے اس میں کیسے ہی فضائل ہوں اور اس نے کیسے ہی نیک کام کئے ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر بچہ بپتسمہ لئے بغیر مرجائے تو وہ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ پیٹ کے بل دوزخ کی زمین پر گھسٹتا رہیگا۔ ان کے مقدس ترین آدمیوں میں سے ایک سینٹ اگسٹائن (St. Augustine متوفی ۴۳۰ء) نے نصرانیت قبول نہ کرنیوالوں پر جبر و ظلم کرنے کے لئے ایک نظام مقرر کیا تھا جو اس کے بعد بارہویں صدی تک مسلسل چلتا رہا۔ جب کبھی نصاری کے درمیان کوئی بدعت رونما ہوتی یا کوئی ایسا عقیدہ نکلتا جو چرچ کے نفوذ و اثر کو کم کرنیوالا ہوتا، تو اس عقیدہ کے پیرووں پر پادریوں کی طرف سے سختیاں کی جاتیں اور ان کو سزائیں دینے میں انتہائی مبالغہ کیا جاتا تھا، پوپ انوسنٹ سوم (Innocent) نے کونٹ طولوز کو حکم دیا کہ اپنی رعایا میں سے اس گروہ کا استیصال کردے جس پر مذہبی بدعت کا الزام تھا، اور جب کونٹ نے اس کا حکم نہ مانا تو پوپ نے اس کے خلاف صلیبی جہاد کیا جس میں اس کی قوم فنا ہوتے ہوتے رہ گئی، کونٹ کی املاک ضبط کی گئیں اس کی شوکت مٹادی گئی، اور پوپ نے اس سے اس وقت تک صلح نہ کی جب تک کونٹ نے اپنے ملک سے اس مذہب کا کلی استیصال کر دینے کی شرط نہ مانی۔

اس طرح ۱۲۳۳ء میں ملحدین کی تحقیقات کے لئے نظام تفتیش (inquisition) قائم کیا گیا اس کی تنظیم پوپ انوسینٹ چہارم کے عہد میں ۱۲۵۲ء میں مکمل ہوئی۔ تمام نصرانی ممالک میں سے پھیلا یا گیا اور پولیس کو اس میں مفتش مقرر کیا گیا۔ پاپاؤں کی جانب سے ان کو مطلق اختیارات عطا کئے گئے جن کے استعمال میں ان سے کوئی بازپرس نہ کی جاتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی نصرانی سلاطین نے بھی ملحدوں کو سزائیں دینے کے لئے سخت ظالمانہ قوانین مقرر کئے۔ باوجودیکہ فریڈرک دوم (Frederick) نہایت آزاد خیال شخص تھا لیکن اس نے بھی ایک حکم صادر کیا کہ جو کوئی نصرانیت میں کوئی بدعت نکالے، وہ دین سے خارج سمجھا جائے، اگر توبہ نہ کرے تو جلا دیا جائے اگر توبہ کرے تو قید کیا جائے، اور اگر توبہ سے پھر جائے تو قتل کر دیا جائے اور بہر صورت ان سب کی املاک ضبط کی جائیں اور ان کے گھر ڈھادئے جائیں، ان کے بچے اور پوتے تک رحم کے مستحق نہیں ہیں، اگر وہ ملحدین و مبتدعین کی مخبری نہ کریں (چاہے وہ ان کے باپ ہی کیوں نہ ہوں) تو ان کے ساتھ بھی ویسی ہی سختی کا برتاؤ کیا جائے۔ فریڈرک نے

الحاد اور بدعت کے لئے سولی کی سزا مقرر کی تھی یہ حکم اٹلی اور جرمنی میں ۱۵ سال تک (۱۲۲۰ء سے ۱۲۳۵ء) جاری رہا۔

پھر نظام تفتیش تمام مغربی یورپ میں پھیل گیا ہنری چہارم و پنجم کے زمانہ میں انگلستان میں بھی الحاد کی سزا سولی سے دی جاتی تھی، یہ قانون ۱۴۰۱ء میں جاری ہوا، ۱۵۳۳ء میں منسوخ ہوا پھر دوبارہ ملکہ میری کے عہد میں جاری کیا گیا اور ۱۶۷۷ء میں آخری مرتبہ منسوخ ہوا لیکن مسلمانوں اور یہودیوں کے خلاف بدترین وحشیانہ طریقوں کے ساتھ اس قانون کو برابر جاری رکھا گیا، اور اس کی قانونیت انیسویں صدی میں منسوخ کی گئی، اس دوران میں یہ قانون ان مسلمانوں اور یہودیوں پر نافذ کیا جاتا تھا جن پر ارتداد کا الزام ہوتا تھا، مختصر یہ کہ نظام تفتیش نے یہ قاعدہ کلیہ مقرر کر رکھا تھا کہ "سو بےگناہوں کا قتل کیا جانا اس سے بہتر ہے کہ ایک شخص الحاد کرے" اس قاعدہ کے مطابق وہ کم سے کم شبہ کی بنا پر بھی لوگوں کو قتل کرتے اور جلا ڈالتے تھے، اور کسی کو اپنی طرف سے مدافعت پیش کرنے کا حق نہ تھا، اور نہ کوئی محکمہ کسی حال میں تردیدی شہادت قبول کرتا تھا، چنانچہ پوپ انوسنٹ ہشتم نے ۱۴۸۴ء میں اعلان شائع کیا کہ طاعون اور آندھیوں کا آنا دراصل جادوگروں کے عمل کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا ہر جگہ ان کو تلاش کرو اور جہاں ملیں بری طرح مارو اور قتل کرو۔ یہ حکم خصوصیت کے ساتھ انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں زیادہ زور کے ساتھ نافذ کیا گیا۔

بارھویں صدی کے آخر میں ایک دوسری دنیا سے اہل یورپ کی عقلوں کے لئے ایک نئی روشنی پہنچی تاکہ انہیں ان بندشوں اور بندھنوں سے آزاد کرائے جن میں یہ جکڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی یورپ میں اہل عرب کے واسطے سے فلسفہ ارسطو کی تعلیم پھیل رہی تھی۔ یورپ والوں کی عقلوں کو آزاد کرانے میں ابن رشد اور اس جیسے دوسرے فلاسفۂ اسلام کا بڑا حصہ تھا، اور انکی تعلیمات کے اثر کو مٹانے اور ان کا مقابلہ کرنے میں پاپاؤں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پوپ یوحنا یاز دہم ابن رشد کی تعلیمات کی سخت برائی کرتا تھا۔ اور اس کے وجود اور اسکی اشاعت کو حد درجہ مضر بتاتا تھا، جنوبی اٹلی میں سینٹ طامس اکوئن نے ۱۲۷۳ء میں ارسطو اور مسلمانوں کے فلسفہ کے مقابل کرنے کیلئے ایک فلسفہ ایجاد کیا جس پر آجتک رومن کیتھولک چرچ قائم ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے فلسفہ میں انسانی عقل کو کوئی جائے قرار نہیں ملتی

بلکہ وہ اسے ایک تنکے کی طرح ہوا میں اس طرح اڑائے لئے پھرتا ہے کہ کہیں وہ ٹھیر نہیں سکتا۔

مورخین کا اس پر اجماع ہے کہ حرکت فکری اور نہضت علمی یورپ میں بارھویں صدی عیسوی کے قریب دو راستوں سے داخل ہوئی: ایک تصادم جو دو صدیوں تک صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں فرنگی اقوام اور اسلامی مشرق کے درمیان ہوتا رہا، دوسرے وہ مدارس علمیہ جو عربوں نے اندلس، سپلز اور صقلیہ میں قائم کئے۔ اور محقق مورخین یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ یورپ میں جن لوگوں سے نہضت علمیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے، مثلاً راجر بیکن وغیرہ، وہ عربی زبان جانتے تھے اور لاطینی سے بھی واقف تھے جس میں قریب قریب فن کے متعلق عربوں کے علوم و مباحث منتقل ہو رہے تھے۔ جہاں کہیں ان لوگوں نے ایجاد و ابداع کے شرف کا دعوی کیا ہے، یا یہ شرف ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے عمداً وہ مصادر چھپائے ہیں جہاں سے مسائل انہوں نے اخذ کئے اور اپنے بنا کر پیش کر دئے۔ ائمۂ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی راہب راجر بیکن نے جس کی طرف اہل فرنگ عدسات و نظارات (Optios) میں سبقت کا شرف منسوب کرتے ہیں، یہ مسائل ابن الہیثم سے اخذ کئے تھے جو طبیعیات اور خصوصاً نور اور بصریات کے مسائل میں اہم مباحث لکھ گیا ہے پس یہ اہل قرآن ہی تھے جن کے ساتھ ربط و تعلق نے اہل یورپ کی آنکھیں کھولیں ان کی بصیرت پر سے جہالت کے پردے ہٹائے، اور صدیوں کی چھائی ہوئی تاریکی سے ان کو نکالا اگر مغرب کے باشندے اس وقت ہر حیثیت سے اسی مرتبۂ عقلی پر ہوتے جس پر اہل قرآن تھے، تو عربی تمدن اور اسلامی حریت فکر سے رابطہ قائم ہونے کے بعد انکی فکری بیداری میں ذرا سی بھی تاخیر نہ ہوتی لیکن اس زمانے میں مذہبی پیشواؤں کی گرفت ایسی مضبوط تھی اور مسیحی دنیا کی عقلیں کچھ اس طرح انکی غلامی میں پھنسی ہوئی تھیں کہ اسلامی تمدن کے اثرات پوری قوت کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکے جو فلسفہ ان کے ہاں پہنچا اس کا رخ مذہبی پیشواؤں نے دینی مباحث کی طرف پھیر دیا اور کنیسہ کی چار دیواری میں اس کو مقید کر دیا اور اس طرح اس کی غایت طبیعی تک نہ پہنچنے دیا۔

سنہ ۵۲۹ء میں کیتھولک چرچ کی جانب سے اس مضمون کا جو فرمان جاری کیا گیا تھا، کہ تمام عبادات

سے پرہیز کیا جائے، اور توراۃ و انجیل کی تفسیر بجز اس طریقہ کے کسی اور طریقہ سے نہ کی جائے جو کنیسہ نے مقرر کردیا ہے، اس نے نصرانی قوموں میں عام ناراضی پھیلادی تھی اور یہ حکم من جملہ ان اسباب کے ایک بڑا سبب تھا جن کی بدولت پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا لیکن اس کے باوجود مسٹی پراٹسٹنٹ مذہب کے بانی لوتھر نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ حکومت قوم کو وہ عقیدہ اختیار کرنے پر مجبور کرسکتی ہے جسے وہ صحیح سمجھتی ہو، اور اسے حق ہے کہ ملحدوں اور اس عقیدہ کا انکار کرنے والوں کا استیصال کردے اسی قسم کے عقل کش قواعد و اصول تھے جنھوں نے ایک مدت تک حرکت فکریہ کو اپنی اصلی رفتار پر نہ چلنے دیا۔

آخرکار سولہویں صدی کے اواخر میں انگلستان کا فلسفی فرانسس بیکن ظاہر ہوا جس نے فلسفہ دینیہ پر زبردست حملے کئے اس کے عالیشان قصر کو دلائل کے تیشوں سے ڈھاکر رکھدیا۔ لوگوں کو عقلی آزادی کی طرف دعوت دی، اور علمی مسائل پر جدید اسالیب سے بحث کرنے کی بنا ڈالی علمی تحقیق کرنے والوں نے اس کی رہنمائی کو قبول کیا اور اس وقت سے تجدید علمی اور تجرید عقلی کا وہ دور شروع ہوا جس کی ثمرات سے ابتک مشرق و مغرب متمتع ہو رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہو کہ یورپ میں تاریخ فلک جدید کی ابتدا ۱۵۴۳ء سے ہوئی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب کوپرنیکس Copernicus کی کتاب شائع ہوئی جس میں اس نے سورج کے گرد زمین کا گھومنا ثابت کیا تھا پھر گیلیلیو (Galileo) نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے مریخ کے چاند ثابت کئے اور یہ بھی ثابت کیا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے پھر کنیسہ نے ان اکتشافات کا استقبال کس طرح کیا؟ فروری ۱۶۱۶ء میں کتب مقدس نے فیصلہ کیا کہ کوپرنیکس کا مذہب نہایت رکیک ہے اسے مسیح کی وصیت کے مطابق بدعتی ٹھیرایا گیا اور اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک رومانظام شمسی کی تعلیم سے محروم رکھا گیا اس مخالفت نے اٹلی میں علوم طبیعیہ کی ترقی پر بہت برا اثر ڈالا اسی طرح پوپ الگزینڈر نے ۱۵۰۱ء میں مطابع پر نگرانی قائم کردی تاکہ ایسے آزاد خیالات جن کو کنیسہ پسند نہ کرتا ہو شائع نہ ہونے پائیں، چاہے وہ ثابت شدہ علمی حقائق ہی کیوں نہ ہوں مغرانس نے

ہنری دوم نے اس شخص کے لئے قتل کی سزا مقرر کی تھی جو کوئی چیز بلا اجازت طبع کرے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے کسی حصہ میں پریس کو انیسویں صدی سے پہلے آزادی نصیب نہیں ہوئی یہی زمانہ ہے جس میں کنیسہ اقتدار ضعیف ہوا اور ملوک وامراء مذہبیت کا اقتدار بڑھا اور دستوری نظم وقوانین کا چرچا ہوا۔ فرانس میں جب جمہوری حکومت قائم ہوئی (سنہ ۱۷۹۲ء) تو پاپا کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ کنیسہ کے خلاف ایک زبردست حرکت شروع ہوئی پیرس میں تمام معابد کو بلا استثنار بند کر دینے کا حکم دیدیا گیا۔ پھر جب روبس پیر (Robespierre) برسر حکومت آیا تو اس نے طے کیا کہ حکومت کا مذہب بزرگ و برتر کی عبادت ہو۔ اس کے تھوڑی مدت کے بعد ایک نیا دین ایجاد کیا گیا جس کا نام دین فطرت تھا اور یہ اس صدی کے فلاسفہ اور شعراء مثلاً والٹیر (۱۶۹۴ تا ۱۷۷۸) وغیرہ کا مذہب تھا اس کے قواعد یہ تھے کہ خدا اور بقاء روح کا اعتقاد رکھو، اور اخوت وانسانیت ورحمت کو شیوہ بناؤ، ورنہ اس دین کی دوسرے ادیان ومذاہب سے کشمکش برپا ہوجائے گی۔ اس نئے مذہب کو دین محبت الہی (The ophilanthropy) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مگر سنہ ۱۸۰۱ء میں نپولین نے اس مذہب کا تختہ الٹ دیا اور پاپائیت دوبارہ میدان میں آگئی۔ اس حرکت سے نپولین کا مقصد بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ روحانی اقتدار سے فائدہ اٹھائے اور آیندہ کی لڑائیوں میں اس سے کام لے اور تھوڑا بہت دنیا میں اپنی سلطنت وسیع کرے۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں بہت سی مسیحی جماعتوں کا عقیدہ اس وجہ سے متزلزل ہوگیا کہ اس زمانہ میں یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ تورات اور اناجیل کے بیانات میں تضاد اور اختلاف ہے جس کو قبول کرنے سے عقل انکار کرتی ہے۔ اس سے نکاروی کا خیال پیدا ہوگیا اور جگہ جگہ علمی مناقشات ہونے لگے انیسویں صدی میں قدیم رسوم وعقائد کے خلاف زیادہ منظم حملے ہوئے اور ان میں سے اکثر کی جڑیں اکھاڑ پھینکی گئیں اگرچہ اس زمانے کے علماء میں خود بھی باہم اختلاف تھا بعض کھلم کھلا ان تقالید کے منکر تھے اور ان کو غیر معقول اور رکیک سمجھتے تھے، اور بعض اس حد تک نہیں پہونچے تھے فرانسیسی عالم پاسکل (Pascal

ان پر ایمان رکھتا تھا۔ انگریز فلسفی بیکن ظاہر میں لاہوتیت کا اعلان کرتا تھا۔ مگر دل میں الحاد چھپائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف ڈیکارٹ (Rene Descartes) کوشش کر رہا تھا کہ عقل اور کنیسہ میں موافقت پیدا کرے۔ اس زمانہ میں بسا اوقات ہم کو کنیسہ پر عقل کا غلبہ علانیہ نظر آتا ہے، مثلاً جادوگروں کے معاملہ میں یا تو ہم دیکھ رہے تھے کہ ۱۶۰۳ء میں جیمز اول انجیل کی آیت "تو جادوگر کو زندہ نہ چھوڑ" کے مطابق عمل کر کے ان مسکینوں سے نہایت سختی کے ساتھ پیش آ رہا ہے یا دوسری طرف ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ ہر ٹفورڈ شائر کی ایک جادوگرنی کو جیوری سزائے قتل کی مستحق قرار دیتی ہے مگر جج ان کی بات کو قبول نہیں کرتا اور کنیسہ کی تعلیمات اور عام رسم کو نظر انداز کر کے اسے رہا کر دیتا ہے اگرچہ انگلستان میں ساحر کے قتل کا قانون ۱۷۳۶ء میں منسوخ ہوا لیکن اس کے بعد بھی ۱۷۵۲ء میں اسکاٹ لینڈ کی ایک عورت اس الزام میں زندہ جلائی گئی۔

قابل ذکر مذاہب میں سے ایک وہ ہے جس کی بنا ہالینڈ کے یہودی فلسفی اسپینوزا (Spinoza) نے رکھی اس کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم کا ایک خدا ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے اور یہ کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد نہیں ہے اور علت اولیٰ یا علت العلل کا اعتقاد خرافات میں سے ہے، دوسرے الفاظ میں وہ وحدت الموجود یا وحدت الوجود کا اعتقاد رکھتا تھا۔ یہ ملحوظ خاطر ہے کہ یہ کلمہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں آزاد منکرین کے رموز میں سے تھا، کیونکہ اس کے اظہار سے عالم غضب اور تکفیر کا طوفان برپا ہو جاتا تھا اس کا اظہار صرف دقیق کتابوں ہی میں کیا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں جتنے لوگ آزاد خیال کیے جا سکتے تھے وہ سب کے سب آلہیین تھے، جو خدا پرستی کے تو قائل تھے مگر وحی کو نہ مانتے تھے۔

اسپینوزا کے معاصرین میں سے ایک لوک (Locke) ہے جس کی کتاب Essay on the Human understanding کا لب لباب یہ ہے کہ علم کلیۃً تجربات کا نتیجہ ہے۔ ہر حال میں اعتقاد کو حکم عقلی کے تابع ہونا چاہیے جو چیز حکم عقلی کے خلاف ہو اس کے ماننے سے انکار کر دو خواہ وہ وحی ہی کیوں نہ ہو جو علم صحیح نظر عقلی سے حاصل ہوتا ہے وہ وحی سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس نے ایک کتاب نصرانیت کو عقل کے موافق بنانے کے لیے بھی لکھی تھی اسی ڈھنگ پر اس کا

معاصر بایل بھی چلا جس نے فرانس سے جلاوطن ہونے کے بعد ہالینڈ میں اپنی کتاب القاموس الفلسفی Phylosophical Dictionary مرتب کی۔ وہ کہتا ہے کہ اعتقاد کی فضیلت بس اس میں ہے کہ خدائے واحد کی قدرت اور اس کی فرمانروائی پر ایمان رکھو" ایک اور موقع پر کہتا ہے کہ "الہیین کے لئے ارتھوڈوکس مذہب کے خدا کی صفات کو اس خدا کی صفات سے تطبیق دینا محال ہے جس کا وجود عقل سے ثابت ہوتا ہے" مگر جب ارتھوڈوکس لوگوں میں سے ایک فریق نے عقل کو حکم بنانا قبول کیا تو وہ گمراہ ہوگئے اور ان میں سے اکثر الحاد کے گڑھے میں جا پڑے۔ الہیین اور اسپینوزا اس امر میں متفق ہیں کہ آسمانی کتابوں کی تفسیر بھی اسی طرح ہونی چاہئے جس طرح دوسری کتابوں کی ہوتی ہے۔

سترھویں صدی کے آخر تک الہیین کے خیالات پوشیدہ رہے، پھر جب قوانین مطبوعات منسوخ ہوگئے تو انھوں نے کچھ کچھ اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ پوری آزادی اب بھی نہ تھی کیونکہ اب بھی چند مزاحمتیں باقی تھیں مثلاً مذہبی پیشواؤں کو حق تھا کہ جو کوئی مسیحی تعلیمات پر اعتراض کرے، یا ان کی تقالید کے خلاف رائے ظاہر کرے یا مسیح پر حرف گیری کرے اسے قید کردیں۔ انگلستان کے لارڈ چیف جسٹس ہیل (Sir Mathew Hale) نے ۱۶۷۶ء میں قانون عام کی یہ تعبیر کی کہ ہر وہ عمل یا قول جو کنیسہ کی تعلیم کے خلاف ہو، قانون عام کے خلاف سمجھا جائیگا کیونکہ نصرانیت انگریزی قانون عام کے ارکان میں ہے ۱۶۹۸ء کے قانون عام میں یہ تصریح کی گئی کہ کسی نصرانی کے لئے کنیسہ کے اصول اور اس کی تعلیمات کے خلاف رائے ظاہر کرنا جائز نہیں ہے جو کوئی ایسا کریگا اس کو پہلی مرتبہ خدمت سے محرومی کی سزا دی جائیگی اور دوسری مرتبہ وہ عام مدنی حقوق سے محروم کردیا جائیگا۔

اٹھارھویں صدی میں والٹیر اور روسو (Rousseau) نے آزادی فکر کی تحریک کا بیڑا اٹھایا مؤخر الذکر کی کتاب ایمیل (Emile) علانیہ پیرس میں جلائی گئی اور حکومت نے اس کے مؤلف کی گرفتاری کا حکم صادر کیا، تمام یورپ میں فریڈریک شاہ پروشیا کے سوا کسی نے اس کو پناہ نہ دی۔ مگر وہاں بھی مذہبی پیشوا اس کے پیچھے پڑے رہے یہاں تک کہ اسے پروشیا سے بھی نکلنے پر مجبور کردیا۔ روسو نے اپنی کتاب العقد الاجتماعی (Social Contract) میں جو اشتراکی نظریات بیان کئے ہیں ان کا حیات اجتماعی پر بڑا اثر ہوا ہے لیکن یہی کتاب اس نے

علانیہ جینوا میں جلائی گئی تھی،

۱۷۷۰ء میں جرمن بیرن دی ہولباخ (Holbach) کی کتاب نظام طبیعت (System of Nature) شائع ہوئی جس میں اس نے خدا کے وجود اور بقائے روح سے انکار کیا تھا تو تمام فرانسیسی ناظرین گھبرا اٹھے تھے غرض اٹھارہویں صدی میں گو اس تحریک کی مخالفت پوری قوت پر تھی لیکن الحاد اور آزاد خیالی اس کے علی الرغم پھیلتی چلی گئی۔

انیسویں صدی تک بھی مذہب و آزاد خیالی میں کشمکش برپا رہی چنانچہ ۱۸۱۹ء میں جب کارلائل کی کتاب عصر العقل (The Age of Reason) شائع ہوئی تو اسے تین سال کے لئے قید کی سزا دی گئی پھر اسی کتاب کی بدولت اس کی بیوی بیٹی اور بہت سے کتب فروشوں پر مقدمہ چلایا گیا۔

غرض اٹھارہویں صدی کے وسط تک اہل یورپ کی عقلیں قدیم تقالید کی بندشوں میں بری طرح جکڑی ہوئی تھیں اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ فریڈریک شاہ پروشیا کے باپ نے فیلسوف وولف (Wolfe) کو صرف اس جرم میں نکال دیا کہ اس نے کنفیوشس کے مذہب کی تعریف کی تھی گویا اس فرمانروا کی رائے میں کسی شخص کو نصرانیت کے سوا کسی مذہب کی تعریف کرنے کا حق ہی نہ تھا" مگر اسی باپ کے بیٹے نے اپنے ملک کو تمام ان لوگوں کے لئے جائے پناہ بنایا جو دوسرے ممالک میں حریت فکر کی بنا پر ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنکر بھاگتے تھے، ۱۷۸۱ء میں کانٹ (Kant) نے اپنی کتاب نقد عقل صحیح (Critic of Pure Reason) لکھ کر دنیا بھر میں ہلچل برپا کر دی اس نے رائے ظاہر کی کہ اس کائنات سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا غلط ہے۔ اور بقائے روح پر جتنے دلائل قائم کئے گئے ہیں باطل ہیں اور دعوی کیا کہ علم کے لئے تجربہ کے سوا کوئی مصدر نہیں ہے لیکن آخر میں اس نے ایک اور کتاب لکھی جو الہیت کے انداز میں تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حیات اجتماعیہ میں اخلاق کے معیار کو برقرار رکھنا چاہتا تھا جس کے لئے بجز اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ ایک روحانی رنگ اختیار کیا جائے اور آسمانی مصادر سے استناد کیا جائے۔

حدیث صحیح ہے کہ جب یہ آیت اتری کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُھْتَدُوْنَ (۶:) یعنی "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کی آمیزش نہ کر دی تو انہی لوگوں کے لئے امن ہے اور وہی راہ راست پانے والے ہیں"، تو مسلمانوں کو اس سے بڑی تشویش ہوی اور انہوں نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا ہے! آپنے فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے۔ دراصل وہاں ظلم سے مراد شرک ہے تم نے سنا نہیں کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے کیا کہا تھا، یَا بُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (۳۱: ۳) ۔ بیٹا کسی کو خدا کے ساتھ شریک نہ کرنا کیونکہ شرک بہت ہی بڑا ظلم ہے، (رواہ الترمذی)

مسروق بن الاجدع روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ کے پاس تکیہ سے لگا بیٹھا تھا آپنے فرمایا کہ اے ابو عائشہ (یہ مسروق کی کنیت تھی) تین باتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی ان میں سے ایک کا بھی قائل ہو تو اس نے اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔

ایک یہ کہ کوئی گمان کرے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ ایسا گمان کرنے والا اللہ پر افترا باندھنے والا ہے، کیونکہ خدا قرآن میں خود فرماتا ہے لاتدر، که الابصار وھو یدرك الابصار وھو اللطیف الخبیر (۶: ۱۳) ۔ نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ وہ بڑا باریک بین اور باخبر ہے" اور وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ اِلا وحیاً او من وراء

حجاب (۴۲ : ۵) "کسی بشر میں یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے بجز اس کے کہ یہ کلام وحی کے طور پر ہو یا پردے کے پیچھے سے"۔ یہ سن کر میں تکیے سے ہٹ کر سیدھا ہو بیٹھا۔ اور میں نے کہا کہ اے ام المومنین جلدی نہ کیجئے۔ ذرا مجھ کو بھی کہنے کا موقع دیجئے۔ کیا اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا ہے کہ ولقد راٰہ نزلۃً اخریٰ (۵۳ : ۱) "اور درحقیقت وہ اس کو ایک اور دفعہ بھی دیکھ چکا ہے" اور ولقد راٰہ بالافق المبین (۸۱) "اور بیشک اس نے آسمان کے مطلع صاف میں اس کو دیکھا ہے"۔ اس پر حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ سب سے پہلے میں نے ہی ان آیتوں کا مطلب رسول اللہ صلعم سے پوچھا تھا۔ آپ نے فرمایا اس سے مراد جبرئیل ہیں۔ ان کو میں نے ان کی اصلی صورت میں جس میں کہ اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے صرف انہی دو موقعوں پر دیکھا ہے میں نے ان کو آسمان سے اترتے دیکھا۔ ان کی بناوٹ کا بڑا حصہ آسمان اور زمین کے درمیان کی فضا پر چھا گیا تھا،

دوسرے یہ کہ کوئی گمان کرے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان باتوں میں کسی چیز کو چھپایا جو ان پر اللہ نے نازل فرمائی تھیں۔ ایسا کہنے والا اللہ پر افترا باندھنے والا ہے۔ اللہ تو فرماتا ہے کہ یا ایھا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک (۵ : ۱۰) "اے رسول تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس کو پہنچا دو"۔

تیسرے یہ کہ کوئی گمان کرے کہ رسول اللہ یہ جانتے تھے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ ایسا گمان کرنے والا بھی خدا پر بڑا افترا باندھنے والا ہے۔ خدا تو فرماتا ہے۔ لا یعلم من فی السمٰوٰت والارض الغیب الا اللہ (۲۷ : ۵)۔ "جتنی مخلوقات زمین و آسمان میں ہیں، ان میں سے کوئی بھی غیب کا علم نہیں رکھتا۔ یہ علم صرف اللہ کو ہے"۔ (رواہ ترمذی)

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں تنگدستی کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اس پر آپ نے اپنی ازواج

مطہرات کے پاس آدمی بھیجا، مگر ان کے پاس کچھ نہ ملا پھر آپ نے فرمایا کہ کیا کوئی ایسا نہیں ہے جو آج رات اس کی ضیافت کرے اللہ اس پر رحمت نازل فرمائے گا۔ یہ سن کر انصار میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں" پھر وہ اپنے گھر گیا اور اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہمان ہے۔ تو کوئی چیز بچا کر نہ رکھ" اس نے کہا خدا کی قسم میرے پاس بچوں کی خوراک کے سوا کچھ نہیں ہے" انصاری نے جواب دیا کہ "اگر بچے رات کو کچھ کھانا چاہیں تو ان کو بہلا کر سلا دینا۔ تو اٹھ کر چراغ بجھا دے۔ ہم آج رات کو بھوکے سو جائیں گے" چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن صبح کو وہ انصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل کو فلاں مرد اور فلاں عورت کی بات بہت پسند آئی پھر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵۹: ۱) وہ خود اپنے نفس پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ وہ خود تنگی میں ہوں۔ اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے بچا لیا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (رواہ البخاری)۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک تجارتی قافلہ جمعہ کے دن آیا ہم سب لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں تھے (ایک دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت خطبہ دے رہے تھے) قافلہ کی خبر سنتے ہی ۱۲ آدمیوں کے سوا سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (۶۲: ۲) اور جب انہوں نے تجارت یا کھیل تماشا دیکھا تو جھٹ کر ادھر چلے گئے اور تجھ کو کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہہ دے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے سے بہتر ہے اور اللہ بہتر روزی دینے والا ہے۔ (رواہ البخاری)۔

علقمہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ "اللہ کی لعنت ہو گودنا گودنے والیوں اور گدوانے والیوں پر اور چہرے کے بال اکھاڑنے والیوں پر اور حسن کی خاطر دانتوں میں چھری نکلوانے والیوں پر، اور ان پر جو اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بدلیں"۔ یہ بات بنی اسد میں سے ایک عورت نے سنی جس کا نام ام یعقوب تھا۔ وہ حضرت عبداللہ کے پاس آئی اور بولی کہ "میں نے سنا ہے آپ نے ایسا اور ایسا کرنے والیوں پر لعنت بھیجی ہے"۔ حضرت عبداللہ نے کہا کہ "میں کیوں نہ اس پر لعنت بھیجوں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے، اور جس کو کتاب اللہ میں برا کہا گیا ہے"۔ اس نے کہا کہ "دونوں تختیوں کے درمیان جو کچھ ہے (یعنی قرآن) اس کو تو میں نے پڑھا ہے۔ مگر اس میں مجھے وہ چیز نہیں ملی جو آپ کہتے ہیں"۔ حضرت عبداللہ نے جواب دیا کہ "اگر تو نے اس کو پڑھا ہوتا تو یہ بات تجھے مل جاتی۔ کیا تو نے یہ نہیں پڑھا کہ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (۵۹ : ۱) جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لو اور جس سے وہ تمہیں منع کرے اس سے باز آجاؤ؟ اس نے کہا ہاں۔ حضرت عبداللہ نے کہا "تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے"۔ اس نے کہا "میں تو دیکھتی ہوں کہ آپ کے گھر کے لوگ ایسا کرتے ہیں"۔ حضرت عبداللہ نے کہا تو جا کر دیکھ لے۔ چنانچہ وہ گھر میں گئی اور دیکھا۔ مگر اسے کوئی بات اپنے مطلب کی نہ ملی۔ تب حضرت عبداللہ نے کہا کہ اگر میری بیوی ایسا کرتی تو میں کبھی اس سے نہ ملتا۔ (رواہ البخاری)۔

نقد و نظر

اصلاح المسلمین

تالیف مولوی سید محمد ادریس صاحب تحصیلدار پنشنر تاج گنج۔ آگرہ قیمت ۴؍

اس مختصر رسالہ میں مولف نے عقائد اور اخلاق اور عبادات اور معاملات کے متعلق قران مجید کی آیات کا صرف ترجمہ الگ الگ عنوانات کے تحت جمع کر دیا ہے۔ مثلاً صفات الٰہی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بعث و نشر اور یوم آخر کے متعلق جتنی آیات ہیں ان کا ترجمہ ان عنوانات کے تحت ایک جگہ لکھدیا ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی آیات کا ترجمہ الگ الگ سلسلہ وار لکھدیا ہے۔ اور اخلاق و معاشرت اور معاملات کے متعلق جدا جدا عنوانات قائم کر کے ان کے بارے میں جو آیات ہیں ان کے تراجم یکجا جمع کر دیے ہیں۔ عام مسلمانوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے کہ اس طرح قران حکیم کے احکام اور اس کی تعلیمات پر مجملاً اتنی اطلاع حاصل ہو جاتی ہے جتنی ایک عامی کے لئے ضروری ہے۔

بشریٰ

ماہوار رسالہ، زیر تحریر مولوی عبد الرزاق صاحب فاضل دیوبند و مولوی ابو الجلال صاحب ندوی۔ مقام اشاعت ۳۱؍۱ کتابت خان اسٹریٹ۔ مونٹ روڈ۔ مدراس قیمت سالانہ تین روپیے۔

ایک مذہبی تاریخی اور علمی رسالہ ہے۔ مختلف مذاق کے مضامین اس میں جمع کرنیکی کوشش کی گئی ہے مدراس جیسے مقام میں زبان اردو کی یہ ایک مفید خدمت ہے جنوبی ہند کے لوگوں کو اس رسالہ سے فائدہ اٹھانا اور اسے ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

نرخنامہ و قواعد اشتہارات

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	۱۰	۲۵	۴۵	۸۰
نصف صفحہ	۶	۱۵	۲۵	۴۵
ربع صفحہ	۳	۱۰	۱۶	۲۵

(۱) کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب اشتہار شایع نہ کیا جائیگا۔

(۲) اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

(۳) صرف وہی چربے قبول کئے جائینگے جو اس رسالہ کی وضع و ہیئت کا لحاظ رکھ کر تیار کئے گئے ہوں۔

(۴) نرخنامہ میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جائے گی۔

(۵) ٹائیٹل کے صفحات کی اجرت عام نرخنامے کی بہ نسبت ۲۵ فیصدی زیادہ ہوگی۔

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۵ تاریخ کو شایع ہوا کرے گا۔ مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینہ کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی ان کو پرچہ قیمتہً دیا جائے گا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے۔ لہذا کوئی صاحب رعایت کا مطالبہ نہ فرمائیں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے۔ لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں۔ لیکن اڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر مضمون شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن

خیرت آباد (حیدر آباد دکن)

جلد (۲) عدد (۶)۔ ۷۸۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۲ھ

ترجمان القرآن

مجلس تحریکِ قرآن کا ماہوار رسالہ

مرتبہٗ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ صمہ بیرون ہند کے لئے ۱عہ قیمت فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

اشارات

سیاست، تجارت، صنعت وحرفت، اور علوم و فنون کے میدانوں میں مغربی قوموں کے حیرت انگیز اقدامات کو دیکھکر بہت سے دل اور دماغ سخت دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید ان قوموں کی ترقی لازوال ہے۔ دنیا پر ان کے غلبہ وتسلط کا دائمی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ربع مسکون کی حکومت اور عناصر کی فرمانروائی کا انھیں ٹھیکہ دیدیا گیا ہے۔ اور ان کی طاقت ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگئی ہے کہ کسی کے اکھاڑے نہیں اکھڑ سکتی۔

ایسا ہی گمان ہر زمانے میں ان سب قوموں کے متعلق کیا جا چکا ہے۔ جو اپنے اپنے وقت کی غالب قومیں تھیں مصر کے فراعنہ، عرب کے عاد وثمود، عراق کے کلدانی، ایران کے اکاسرہ، یونان کے جہانگیر فاتح، روم کے عالمگیر فرمانروا، اسلام کے جہاں کشا مجاہد، تاتار کے عالم سوز سپاہی، سب اس کرۂ خاکی کے سٹیج پر اسی طرح غلبہ وقوت کے تماشے دکھا چکے ہیں۔ ان میں سے جس جس کے کھیل کی باری آئی، اس نے اپنی حیلت پھرت کے کرتب دکھا کر اسی طرح دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہر قوم جب اٹھی ہے تو وہ اسی طرح دنیا پر چھا گئی ہے، اسی طرح اس نے چار دانگ عالم میں اپنی شوکت وجبروت کے ڈنکے بجائے ہیں اسی طرح دنیا نے مبہوت ہو کر گمان کیا ہے کہ ان کی طاقت لازوال ہے۔ ——————— مگر جب انکی اجل پوری ہو گئی اور حقیقت میں لازوال طاقت رکھنے والے فرمانروا نے ان کے زوال کا اٹل فیصلہ صادر کر دیا، تو وہ ایسے گرے کہ اکثر تو صفحۂ ہستی سے ناپید ہی ہو گئے، اور بعض کا نام ونشان اگر دنیا میں باقی رہا بھی تو وہ اس طرح کہ وہ اپنے محکوموں کے محکوم ہوئے، اپنے غلاموں کے غلام بنے، اپنے مغلوبوں سے مغلوب ہو کر رہے۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ

قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۳ : ۱۴)

کائنات کا نظام کچھ اس طور پر واقع ہوا ہے کہ اس میں کہیں سکون اور ٹھیراؤ نہیں ہے۔ ایک پیہم حرکت، تغیر اور گردش ہے جو کسی چیز کو ایک حالت پر قرار نہیں لینے دیتی۔ ہر کون کے ساتھ ایک فساد ہے، ہر بناؤ کے ساتھ ایک بگاڑ ہے، ہر بہار کے ساتھ ایک خزان ہے، ہر چڑھاؤ کے ساتھ ایک اتار ہے، اور اسی طرح اس کا عکس بھی ہے۔ ایک ماشہ بھر کا دانہ آج ہوا میں اڑا اڑا پھرتا ہے، کل وہی زمین میں استحکام حاصل کرکے ایک تناور درخت بن جاتا ہے، پرسوں وہی سوکھ کر پیوند خاک ہو جاتا ہے، اور پھر فطرت کی نوبخشنے والی قوتیں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے بیج کی پرورش میں لگ جاتی ہیں۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ میں انسان جب ان میں سے کسی ایک حالت کو زیادہ طویل مدت تک جاری رہتے ہوئے دیکھتا ہے، تو سمجھتا ہے کہ یہ حالت دائمی ہے۔ اگر اتار ہے تو سمجھتا ہے کہ اتار ہی رہے گا۔ اگر چڑھاؤ ہے تو خیال کرتا ہے کہ چڑھاؤ ہی رہے گا لیکن یہاں فرق جو کچھ بھی ہے دیر اور سویر کا ہے۔ دوام کسی حالت میں بھی نہیں ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳ : ۱۴)

دنیا کے حالات ایک طرح کی دوری حرکت میں گردش کر رہے ہیں۔ پیدائش اور موت، جوانی اور بڑھاپا، قوت اور ضعف، بہار اور خزان، شگفتگی اور پژمردگی سب اسی گردش کے مختلف شئون ہیں۔ اس گردش میں باری باری سے ہر چیز پر ایک دور اقبال کا آتا ہے جس میں وہ بڑھتی ہے، پھلتی ہے، قوت اور زور دکھاتی ہے، حسن اور بہار کی نمائش کرتی ہے حتیٰ کہ اپنی ترقی کی انتہائی حد کو پہنچ جاتی ہے، پھر ایک دوسرا دور ادبار کا آتا ہے جس میں وہ گھٹتی ہے، مرجھاتی ہے، ضعف اور ناتوانی میں مبتلا ہوتی ہے، اور آخرکار وہی قوتیں اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں جنھوں نے اس کی ابتدا کی تھی۔

یہ اپنی مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، اور دنیا کی سب چیزوں کے مانند یہی سنت انسانی

بھی جاری ہے، خواہ اس کو فرد کی حیثیت سے لیا جائے یا قوم کی حیثیت سے ذلت اور عزت، عسر اور یسر، تنزل اور ترقی۔ اور ایسی ہی دوسری تمام کیفیات اسی دوری حرکت کے ساتھ مختلف افراد اور مختلف قوموں میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ باری باری سے سب پر یہ دور گذرتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس تقسیم میں کلیتہً محروم رکھا گیا ہو، یا جس پر کسی ایک کیفیت کو دوام بخشا گیا ہو، عام اس سے کہ وہ اقبال کی کیفیت ہو یا ادبار کی سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳ : ۸)

روئے زمین کے چپہ چپہ پر ہم کو ان قوموں کے آثار ملتے ہیں جو ہم سے پہلے ہو گذری ہیں۔ وہ اپنے تمدن تہذیب، اپنی صنعت و کاریگری، اپنی ہنرمندی و چابک دستی کے ایسے نشانات دنیا میں چھوڑ گئی ہیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آجکل کی ترقی یافتہ اور غالب قوموں سے کچھ کم نہ تھیں بلکہ اپنے ہم عصروں پر ان کا غلبہ کچھ ان سے زیادہ ہی تھا۔ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا (۳۰) مگر پھر ان کا حشر کیا ہوا؟ اقبال سامنے دیکھکر وہ دھوکہ کھا گئے، نعمتوں کی بارش نے ان کو غرہ میں ڈالدیا، خوشحالی ان کے لئے فتنہ بن گئی، غلبہ اور حکومت سے مغرور ہو کر وہ جبار و قہار بن بیٹھے۔ انہوں نے اپنے کرتوتوں سے اپنے نفس پر آپ ظلم کرنا شروع کر دیا۔ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ (۱۱ : ۱۰) خدا نے ان کی سرکشی کے باوجود ان کو ڈھیل دی وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ (۲۲) اور یہ ڈھیل بھی کچھ معمولی ڈھیل نہ تھی بعض قوموں کو صدیوں تک یونہی ڈھیل دی جاتی رہی۔ وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (۲۲ : ۶) مگر یہ مہلت ان کے لئے ایک نیا فتنہ بن گئی۔ وہ سمجھے کہ خدا ان کی تدبیروں کے مقابلہ میں عاجز آگیا ہے۔ اور اب دنیا پر خدا کی نہیں ان کی حکومت ہے۔ آخر کار قہر الٰہی بھڑک اٹھا۔ ان کی طرف سے نظر عنایت پھر گئی۔ اقبال کے بجائے ادبار کا دور آگیا۔ ان کی چالوں کے مقابلہ میں خدا بھی ایک چال چلا۔ مگر خدا کی چال ایسی تھی کہ وہ اس کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے پھر اس کا

تو کہاں سے کرتے وَمَکَرُوْا مَکْرًا وَّمَکَرْنَا مَکْرًا وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (۲۷: ۵۰) خدا کی چال سامنے سے نہیں آتی خود انسان کے اندر سے اس کے دماغ اور دل میں سرایت کرکے اپنا کام کرتی ہے۔ وہ انسان کی عقل، اس کے شعور، اس کی تمیز، اس کی فکر، اس کے حواس پر حملہ کرتی ہے۔ وہ اس کے بینے کی آنکھیں پھوڑ دیتی ہے، وہ اس کو آنکھوں کا اندھا نہیں بلکہ عقل کا اندھا بنا دیتی ہے۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (۲۲: ۴۶) اور جب اس کے دل کی آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں تو ہر تدبیر جو وہ اپنی بہتری کے لئے سوچتا ہے، وہ الٹی اس کے خلاف پڑتی ہے۔ ہر قدم جو وہ کامیابی کے مقصود کی طرف بڑھاتا ہے، وہ اس کو ہلاکت کے جہنم کی طرف لے جاتا ہے اس کی ساری قوتیں خود اس کے خلاف بغاوت کر دیتی ہیں، اور اس کے اپنے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ مَکْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِیْنَ (۲۷: ۵۱)

اس اقبال و ادبار کا ایک مکمل نقشہ ہم کو آل فرعون اور بنی اسرائیل کے قصے میں ملتا ہے اہل مصر ترقی کے انتہائی مدارج کو پہنچ گئے تو انہوں نے ظلم و سرکشی پر کمر باندھی ان کے بادشاہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا، اور ایک کمزور قوم بنی اسرائیل کو جو حضرت یوسف کے زمانے میں وہاں جا کر آباد ہو گئی تھی، حد سے زیادہ جور و ستم کا تختہ مشق بنایا آخر جب اس کی اور اہل مصر کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو خدا نے ارادہ کیا کہ ان کو نیچا دکھائے اور اسی ضعیف قوم کو سربلند کرے جس کو وہ ہیچ سمجھتے تھے، چنانچہ اللہ کا ارادہ پورا ہوا اس ضعیف قوم میں حضرت موسیٰ پیدا کئے گئے، ان کو خود فرعون کے گھر میں خود اس کے ہاتھوں سے پرورش کرایا گیا اور انہیں اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائیں۔ انہوں نے فرعون کو نرمی کی راہ سے سمجھایا، مگر وہ باز نہ آیا، خدا کی طرف سے فرعون اور اس کی قوم کو مسلسل تنبیہیں کی گئیں قحط پر قحط پڑے طوفان پر طوفان آئے، خون برسا، ٹڈی دل ان کی کھیتیوں کو چاٹ گئے۔ جوؤں اور مینڈکوں نے ان کو خوب ستایا، مگر ان کے

تکبر میں فرق نہ آیا۔ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۷: ۱۶) جب تمام مہلتیں ایک ایک کرکے ختم ہو چکیں تو عذاب الٰہی کا فیصلہ نافذ ہو گیا۔ خدا کے حکم سے حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لیکر مصر سے نکل گئے فرعون اپنے لشکروں سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا اور مصر کی طاقت ایسی تباہ ہوئی کہ صدیوں تک نہ ابھر سکی۔ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ۔ (۲۸: ۴)—

پھر بنی اسرائیل کی باری آئی۔ مصری قوم کو گرانے کے بعد کائنات کے حقیقی فرمانروا نے اس قوم کو زمین کی حکومت بخشی جو دنیا میں ذلیل و خوار تھی وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا (۷: ۱۶) اور اس کو دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت عطا فرمائی وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲: ۶)

مگر یہ فضیلت اور وراثت ارضی حسن عمل کی شرط کیساتھ مشروط تھی۔ حضرت موسیٰ کی زبان سے پہلے ہی کہو ادیا گیا تھا کہ تم کو زمین کی خلافت دی تو ضرور جائیگی۔ مگر اس بات پر بھی نظر رکھی جائے گی کہ تم کیسے عمل کرتے ہو (كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ) اور یہ وہ شرط ہی جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ جس قوم کو بھی زمین کی حکومت دی جاتی ہو اس پر یہی شرط لگادی جاتی ہو۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰: ۲)

پس جب بنی اسرائیل نے اپنے رب سے سرکشی کی، اس کے کلام میں تحریف کی، حق کو باطل سے بدل دیا حرام خواری، جھوٹ، بے ایمانی اور عہد شکنی کا شیوہ اختیار کیا، زرپرست، حریص، بزدل اور آرام طلب بن گئے اپنے انبیاء کو قتل کیا، حق کی طرف بلانے والوں سے دشمنی کی، ائمۂ خیر سے منہ موڑا، ائمۂ شر کی اطاعت اختیار کی تو رب العالمین کی نظر ان کی طرف سے بھی پھر گئی۔ ان سے زمین کی وراثت چھین لی گئی۔ ان کو عراق، یونان،

اور روم کے جابر سلاطین سے پامال کرایا گیا، ان کو گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔ ان کو ذلت و خواری کے ساتھ ملک ملک کی خاک چھنوائی گئی، اور حکومت کا استحقاق ہمیشہ کے لئے ان سے چھین لیا گیا۔ تین ہزار برس سے وہ خدا کی لعنت میں ایسے گرفتار ہوئے ہیں۔ کہ دنیا میں ان کو کہیں عزت کا ٹھکانا نہیں ملتا۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللهِ (۲ : ۷)

آج اسی سنت الٰہی کا اعادہ پھر ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے جس شامت اعمال میں پچھلی قومیں گرفتار ہوئی تھیں اسی شامت نے آج مغربی قوموں کو آن پکڑا ہے جتنی تنبیہیں ممکن تھیں وہ سب ان کو دی جا چکی ہیں۔ جنگ عظیم کے مصائب، معاشی مشکلات، بے کاری کی کثرت، امراض خبیثہ کی شدت، نظام عائلی کی برہمی، یہ سب کھلی ہوئی روشن آیات ہیں، جن سے وہ اگر آنکھیں رکھتے تو معلوم کر سکتے تھے کہ ظلم، سرکشی، نفس پرستی، اور حق فراموشی کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان آیات سے سبق نہیں لیتے حق سے منہ موڑنے پر برابر اصرار کئے جا رہے ہیں۔ ان کی نظر علتِ مرض تک نہیں پہونچتی۔ وہ صرف آثار مرض کو دیکھتے ہیں۔ اور انہی کا علاج کرنے میں اپنی ساری تدبیریں صرف کر ڈالتے ہیں۔ اس لئے جوں جوں دوا کی جاتی ہے مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اب حالات کہہ رہے ہیں کہ تنبیہوں اور حجتوں کا دور ختم ہونے والا ہے۔ اور آخری فیصلے کا وقت قریب ہے۔

قدرت الٰہی نے دو زبردست شیطان مغربی قوموں پر مسلط کر دیے ہیں۔ جو ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف کھینچے لئے جا رہے ہیں۔ ایک قطع نسل کا شیطان ہے اور دوسرا جنگ کا شیطان۔ پہلا شیطان ان کے افراد پر مسلط ہے اور دوسرا ان کی قوموں اور سلطنتوں پر۔ پہلے نے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کی عقلیں خراب کر دی ہیں۔ وہ خود ان کے اپنے ہاتھوں سے ان کی نسلوں کا استیصال کرا رہا ہے۔ وہ انھیں منع حمل کی تدبیریں سکھاتا ہے، اسقاط حمل پر آمادہ کرتا ہے، عمل تعقیم Sterilisation کے فوائد بتاتا ہے جس سے وہ اپنی

قوت تولید کا بیج ہی مار دیتی ہیں انھیں تناشقی القلب بنا دیتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو آپ ہلاک کرتے ہیں۔ غرض یہ شیطان وہ ہے جو تدریج ان سے خودکشی کرا رہا ہے۔

دوسرے شیطان نے ان کے بڑے بڑے سیاسی مدبروں اور جنگی سپہ سالاروں سے صحیح فکر اور صحیح تدبیر کی قوت سلب کر لی ہے۔ وہ ان میں خودغرضی، مسابقت، منافرت، عصبیت، اور حرص وطمع کے جذبات پیدا کر رہا ہے اور ان کو مختلف متخاصم اور معاند گروہوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ انھیں ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھایا جا رہا ہے کہ یہی عذاب الٰہی کی ایک صورت ہے اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (۶:۸) وہ ان کو ایک بڑی زبردست خودکشی کے لئے تیار کر رہا ہے، جو تدریجی نہیں بلکہ آنی ہوگی۔ اس نے تمام دنیا میں باروت کے مغزانے جمع کر دیے ہیں۔ اور جگہ جگہ خطرے کے مرکز بنا رکھے ہیں۔ اب وہ صرف ایک وقت کا منتظر ہے۔ جونہی وہ اس کا وقت آیا وہ کسی ایک خزانۂ باروت کو شابہ دکھادے گا۔ اور پھر آن کی آن میں وہ تباہی نازل ہوگی جس کے آگے تمام پچھلی قوموں کی تباہیاں ہیچ ہو جائیں گی۔

یہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے بلکہ یورپ امریکہ اور جاپان میں آئندہ جنگ کے لئے جس قسم کی تیاریاں کی جا رہی ہیں، ان کو دیکھ دیکھ کر خود ان قوموں کے اہل بصیرت لرز رہے ہیں، اور اس جنگ کے نتائج کا تصور کر کے ان کے حواس باختہ ہوئے جاتے ہیں۔ حال میں سرجل نیومان (Sergei Neumann) نے جو پہلے امریکہ کے ملٹری اسٹاف کا ایک رکن تھا، آئندہ جنگ پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ آئندہ جنگ محض فوجوں کی لڑائی نہیں ہوگی بلکہ اسے ایک قتل عام کہنا چاہئے جس میں عورتوں اور بچوں تک کو نہ چھوڑا جائیگا۔ سائنس دانوں کی عقل نے جنگ کا کام سپاہیوں سے چھین کر گویا مرکبات اور بے روح آلات کے سپرد کر دیا ہے۔ جو مقاتل (Combatant) اور غیر مقاتل (Non Combatant) میں تمیز کرنے سے قاصر ہیں اب محاربین کا تو

کی لڑائی، میدانوں اور قلعوں میں نہیں بلکہ شہروں اور بستیوں میں ہوگی کیونکہ جدید نظریہ کے مطابق غنیم کی اصلی قوت فوجوں میں نہیں بلکہ اس کی آبادیوں، اس کی تجارتی منڈیوں اور صنعتی کارگاہوں میں ہے۔

اب ہوائی جہازوں سے طرح طرح کے بم برسائے جائیں گے جن سے آتش فشاں مادے زہریلی ہوائیں اور امراض کے جراثیم نکل کر وقت واحد میں ہزاروں لاکھوں کی آبادی کو نیست و نابود کر دیں گے ان میں سے ایک قسم کے بم (Lewisite Bombs) ایسے ہیں جن کا ایک گولہ لندن کی بڑی سے بڑی عمارت کو پارہ پارہ کر سکتا ہے۔ ایک زہریلی ہوا (Green Cross gass) کے نام سے موسوم ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کو سونگھے گا وہ ایسا محسوس کریگا کہ گویا پانی میں ڈوب گیا ہے۔ ایک دوسری قسم کی زہریلی ہوا (Yellow Cross) میں سانپ کے زہر کی سی خاصیت ہے، اور اس کے سونگھنے سے بالکل وہی اثرات ہوتے ہیں۔ جو سانپ کے کاٹنے سے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کی بارہ زہریلی ہوائیں اور بھی ہیں جو تقریباً غیر مرئی ہیں۔ اُن کے اثرات ابتداً بالکل محسوس نہیں ہوتے، اور جب محسوس ہوتے ہیں تو پھر علاج کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ ان میں سے ایک خاص ہوا ایسی ہے جو بہت بلندی پر پہنچ کر پھیل جاتی ہے اور جو ہوائی جہاز اس کے حلقہ سے گذرتا ہے اس کا چلانے والا یکایک اندھا ہو جاتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس قسم کی ہوائیں اگر ایک ٹن کی مقدار میں شہر پیرس پر چھوڑ دی جائیں تو ایک گھنٹہ کے اندر اس کو کلیتہً تباہ کیا جا سکتا ہے اور یہ ایسا کام ہے جس کو انجام دینے کے لئے صرف ۱۰۰ ہوائی جہاز کافی ہیں۔

حال میں ایک برقی آتش فشاں گولہ ایجاد کیا گیا ہے جس کا وزن صرف ایک کیلوگرام ہوتا ہے مگر اتنے سے گولہ میں یہ قوت ہے کہ جب کسی چیز سے اس کا تصادم ہوتا ہے تو دفعتہً تین ہزار درجہ فارن ہیٹ کی حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس سے ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے جو کسی چیز سے بجھائی نہیں جا سکتی۔ پانی اس سے

پیشوا ثابت ہوا ہے اور ابھی تک سائنس اس کے بچانے کا کوئی طریقہ دریافت نہیں کر سکا ہے۔ خیال یہ ہے کہ ان گولوں کو شہروں کے بڑے بڑے بازاروں پر پھینکا جائے گا تاکہ اس سرے سے اس سرے تک آگ لگ جائے، پھر جب لوگ سراسیمہ ہو کر بھاگنے لگیں گے تو ہوائی جہازوں سے زہریلی ہواؤں کے بم برسائے جائیں گے، جن سے تباہی کی تکمیل ہو جائے گی۔

ان ایجادات کو دیکھ کر ماہرین فن نے اندازہ لگایا ہے کہ چند ہوائی جہازوں سے دنیا کے بڑے سے بڑے اور محفوظ دارالسلطنت کو دو گھنٹوں میں پیوند خاک کیا جا سکتا ہے۔ لاکھوں کی آبادی کو اس طرح مسموم کیا جا سکتا ہے کہ رات کو اچھے خاصے سوئیں اور صبح کو ایک بھی زندہ نہ اٹھے۔ زہریلے مادوں سے ایک پورے ملک میں پانی کے ذخائر کو مسموم، مواشی اور حیوانات کو ہلاک، کھیتوں اور باغوں کو غارت کیا جا سکتا ہے۔ ان تباہ کن حملوں کی مدافعت کا کوئی مؤثر ذریعہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا ہے بجز اس کے کہ دونوں محارب فریق ایک دوسرے پر اسی طرح حملے کریں اور دونوں ہلاک ہو جائیں۔

یہ آیندہ جنگ کی طیاریوں کا ایک مختصر بیان ہے۔ اگر آپ تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہوں تو کتاب (**What would be the Character of a New war**) ملاحظہ کیجئے، جو جنیوا کی انٹر پارلیمنٹری یونین نے باقاعدہ تحقیقات کے بعد شائع کی ہے۔ اس کو پڑھ کر آپ اندازہ کریں گے کہ مغربی تہذیب نے کس طرح اپنی ہلاکت کا سامان اپنے ہاتھوں فراہم کیا ہے۔ اب اس کی عمر کا امتداد صرف اعلان جنگ کی تاریخ تک ہے، جس روز دنیا کی دو بڑی سلطنتوں کے درمیان جنگ چھڑی اسی روز سمجھ لیجئے کہ مغربی تہذیب کی تباہی کے لئے خدا کا فیصلہ صادر ہو چکا۔ کیونکہ دو بڑی سلطنتوں کے میدان میں اتر آنے کے بعد کوئی چیز جنگ کو عالمگیر ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ اور جب جنگ عالمگیر ہو گی تو تباہی بھی عالمگیر ہی ہو گی

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۳۰: ۵) ۔ لوگوں کے اپنے ہاتھوں سے کئے ہوئے کرتوتوں نے خشکی اور تری میں فساد رونما ہو گیا ہے تاکہ انہیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے ۔ شاید وہ اب بھی رجوع کریں

بہرحال اب قریب ہے کہ وراثت ارضی کا نیا بندوبست ہو، اور ظالمین و مسرفین کو گرا کر کسی دوسری قوم کو جو غالباً مستضعفین ہی میں سے ہوگی ۔ زمین کی خلافت پر سرفراز کیا جائے ۔ دیکھنا ہے کہ اس مرتبہ حضرت حق کی نظر انتخاب کس پر پڑتی ہے ۔

ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آیندہ کونسی قوم اٹھائی جائے گی ۔ یہ اللہ کی دین ہے جس سے چاہتا ہے چھینتا ہے ۔ اور جس کو چاہتا عطا کرتا ہے ۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ (۳: ۳) مگر اس معاملہ میں بھی اس کا ایک قانون ہے جسے اس نے اپنی کتاب عزیز میں بیان فرما دیا ہے ۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک قوم کو جب وہ اس کے بُرے اعمال کی وجہ سے گراتا ہے، تو اس کی جگہ کسی ایسی قوم کو اٹھاتا ہے جو اس مغضوب قوم کی طرح بدکار اور اس کے مانند سرکش نہ ہو ۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ (۴۷: ۴) اگر تم نے روگردانی کی تو وہ تمہارے بجائے کسی اور قوم کو اٹھائے گا ۔ پھر وہ لوگ تمہاری طرح نہ ہوں گے ۔

اس لئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو کمزور اور مغلوب النفس قومیں مغربی تہذیب کی نقالی کر رہی ہیں ۔ اور فرنگی اقوام کے محاسن کو (جو تھوڑے بہت ان میں باقی رہ گئے ہیں) اختیار کرنے کے بجائے ان معائب کو اختیار کر رہی ہیں جو ان کے مغضوب ہونے کی علتیں ہیں ان کے لئے آیندہ انقلاب میں کامیابی و سرفرازی کا کوئی موقع نہیں ہے ۔

اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی

(۶)

زندگی کا نصب العین

یہاں تک دو امور کی تشریح کی جاچکی ہے۔ ایک یہ کہ اسلام نے کس چیز کو زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے؟ دوسرے یہ کہ وہ کن وجوہ سے ایک بہترین نصب العین ہے؟ اب ہمیں اس مسئلہ کے تیسرے پہلو کی طرف نظر کرنی چاہئے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کو ایک مخصوص تہذیب بنانے میں اس نصب العین کا کیا حصہ ہے اور اس نے اس تہذیب کو کونسی خصوصی شان بخشی ہے؟

طریقوں کے امتیاز میں مقصد کی تعیین کا اثر پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جس طرح مقصد کی تعیین ضروری ہے، اسی طرح طریقِ حصولِ مقصد کی تعیین بھی ضروری ہے۔ اور طریقہ کی تعیین، مقصد کی مناسبت کے سوا کسی اور بنیاد پر نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی شخص کے پیش نظر نفس سلوک سیر کے سوا کوئی متعین شے مقصود نہ ہو اور وہ محض راستوں اور گلیوں کی خاک چھانتا پھرے تو ہم اس کو مجنون یا آوارہ گرد کہتے ہیں۔ اور اگر وہ مقصد تو رکھتا ہو لیکن اس کی تحصیل کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقہ کا پابند نہ ہو، بلکہ ہر اس طریقہ پر چلنے کے لئے تیار ہوجائے جس پر اسے موصل الی المقصود ہونے کا گمان ہو، تو اس کو بھی ہم احمق قرار دیتے ہیں کیونکہ از روئے عقل ایسا شخص کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا جو ایک مقام کی طرف جانے کے لئے دس مختلف راستوں پر چلنے کی کوشش کرتا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنا مقصود تو کسی چیز کو قرار دے اور راستہ ایسا اختیار کرے جو اس کے مخالف سمت میں جانے والا ہو، تو اس کو بھی ہم صاحب عقل نہیں سمجھتے کیونکہ وہ اس اعرابی کے مانند ہے جو کعبہ کی طرف جانے کے لئے ترکستان کی راہ پر چل رہا ہو پس انسان کی عملی

کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سلوک کے لئے پہلے ایک مقصد متعین کرے، پھر اپنی نیتوں اور کوششوں کا رخ اسی مقصد کی طرف پھیر دے، اور اگر اس مقصد تک پہنچنے کے بہت سے رستے ہوں تو ان میں سے ایک رستے کو اختیار کرے جو اس کے نزدیک بہترین ہو، اور اس کے سوا دوسرے تمام راستوں کو چھوڑ دے۔

یہ ترک و اختیار عین مقتضائے عقل ہے اور مقصد کی تعیین کا عقلی نتیجہ یہی ہے کہ جو طریقہ اس مقصد سے خاص طور پر مناسبت رکھتا ہو اس کو اختیار کیا جائے۔ اور دوسرے تمام طریقوں کو ترک کر دیا جائے۔ ایک صاحب عقل آدمی جب سفر کرتا ہے تو اسی ایک راستہ پر چلتا ہے جو ..... منزل مقصود تک پہنچانے والے راستوں میں سب سے بہتر ہو۔ اس کے سوا اور بیسیوں راستے جو اس کو دوران سفر میں ملتے ہیں۔ ان کی طرف وہ التفات بھی نہیں کرتا۔ ایک عقلمند طالب علم اپنے لئے علم کا وہی شعبہ اختیار کرتا ہے جو اس کے نصب العین کی تحصیل میں سب سے زیادہ مددگار ہوتا ہے۔ دوسرے جتنے شعبے اس سے غیر متعلق ہوتے ہیں ان میں اپنا وقت اور اپنا دماغ کھپانا وہ پسند نہیں کرتا ایک زیرک و دانا سوداگر اپنے لئے کاروبار کا وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو اس کے نزدیک حصول مراد کا بہترین وسیلہ ہو سکتا ہو، ہر کام میں اپنا سرمایہ لگانا اور ہر پیشہ میں اپنی محنت صرف کرنا وہ حماقت سمجھتا ہے اس ترک و اختیار کے فعل پر ایک نقاد اگر بحث کر سکتا ہے، تو وہ صرف اس حیثیت سے کہ جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ مقصود تک پہنچانے کے لئے بہترین ہے یا نہیں؟ لیکن نفس ترک و اختیار پر کوئی اعتراض ممکن نہیں ہے۔

یہ اصل جس طرح زندگی کے جزئی معاملات پر منطبق ہوتی ہے، اسی طرح من حیث المجموع پوری زندگی پر بھی منطبق ہوتی ہے اگر انسان اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہ رکھتا ہو، یا بالفاظ دیگر جینے سے اس کا مقصود محض جینا ہو تو وہ آزاد ہے کہ زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ چاہے اختیار کرے۔ اس کے لئے طریقوں کے درمیان اچھے اور برے صحیح اور غلط، اعلیٰ اور اسفل کا امتیاز محض بے معنی ہے۔ وہ اپنی خواہشات اور حاجات کو جس طرح چاہے پورا کر سکتا ہے۔ بیرونی اسباب کسی حد تک اسے ایک خاص طریقہ کی پابندی پر مجبور بھی کریں، تو یہ اس کی زندگی کو

کسی نظم اور ضابطہ کے تحت لانے میں کارگر نہیں ہو سکتے کیونکہ انضباط کا کوئی مبدا اور محرک خود اس کے اپنے نفس میں موجود نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنے پیش نظر زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو، یا زیادہ صحیح الفاظ میں زندگی کے حیوانی طبعی مقصد سے بالاتر کوئی عقلی انسانی مقصد اس کے ذہن میں جاگزیں ہو، تو لازماً وہ طریقوں کے درمیان امتیاز کریگا اور اگر حقیقت میں وہ ایک صاحب عقل انسان ہے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کو جو اس کے مقصد کی تحصیل کے لئے زیادہ مناسب ہو اختیار کرلے۔ ایک مقصد متعین کر لینے کے بعد طریقوں میں وہی آزادی برتنا جو صرف ایک بے مقصد انسان کا حق ہے، اس کے لئے کسی طرح جائز نہ ہوگا۔

اب اس قاعدہ کو ذرا وسیع کیجئے فرد کی جگہ جماعت کو لے کر دیکھیے کہ یہی قاعدہ بالکل اسی طرح مجموعہ افراد پر بھی جاری ہوتا ہے جب تک کوئی جماعت، مدنیت کے ابتدائی مدارج میں ہوتی ہے اور زندگی کے حیوانی طبعی مقاصد سے اعلیٰ وارفع کوئی مقصد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا، وہ اپنے طور طریقوں میں اسی طرح آزاد رہتی ہے جس طرح ایک بے مقصد انسان ہوا کرتا ہے مگر جب ارتقاء عقلی اور نہضت مدنی کے زیادہ اونچے مدارج پر پہنچکر اس میں ایک تہذیب پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ تہذیب اس کے لئے اجتماعی زندگی کا کوئی عقلی مقصد متعین کر دیتی ہے۔ تو یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس مقصد کی مناسبت سے عقاید تصورات، معاملات، اخلاق معاشرت معیشت وغیرہ کے لئے ایک خاص نظام وضع کیا جائے وہ تہذیب اپنے متبعین کو اس نظام کا پابند بنائے اور ان کے لئے اس امر کی آزادی باقی نہ رہنے دے کہ وہ اس کے دائرے میں رہتے ہوے کسی ایسے عقیدہ یا طرز عمل کو اختیار کریں جو اس نظام سے خارج ہو۔

اپنے اس ضابطہ کی حفاظت میں سختی کرنا تہذیب کی فطرت کا عین مقتضا ہے۔ اس باب میں جس تہذیب کی گرفت ڈھیلی ہوگی، اور جس کی قوت ضابطہ میں ضعف اور سستی پائی جائے گی وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتی کیونکہ تہذیب کا وجود منحصر ہے اس کے عقیدہ اور عمل کا جو نظام اس نے وضع کیا ہے، اس کے متبعین اسکی

پابندی کریں جب متبعین ہی اس کی پابندی ہی نہ ہونگی اور اس نظام سے باہر کے تصورات اور طور طریقے ان کے ذہن اور ان کی عملی زندگی پر قابض ہوجائیں گے تو تہذیب کا کوئی واقعی وجود باقی نہ رہے گا لہٰذا ایک تہذیب اپنے متبعین سے اپنے وضع کردہ نظام کی پابندی کا مطالبہ کرنے، اور دوسرے خارجی نظامات سے علیٰحدگی پر اصرار کرنے میں بالکل حق بجانب ہے۔ نقاد اگر کچھ کلام کرسکتا ہے تو اس کے مقصد کے صحیح یا غلط ہونے پر کرسکتا ہے، یا اس پر کرسکتا ہے کہ اس مقصد کے لئے یہ خاص طریقہ مناسب ہے یا نہیں یا اس پر کرسکتا ہے کہ اس نظام کی پابندی تمام حالات میں ممکن ہے یا نہیں لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس تہذیب کو اپنے متبعین سے اپنے وضع کردہ نظام کی پابندی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

پھر جب یہ قاعدہ مسلم ہوچکا ہے کہ ذہنی اور عملی زندگی کے لئے جو خاص طریقے اور مناہج متعین کئے جاتے ہیں، ان کی تعیین دراصل مقصد کی نوعیت پر مبنی ہوتی ہے اور مقاصد کے اختلاف سے طریقوں اور منہجوں کا مختلف ہونا ضروری ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جو تہذیبیں اپنے مقاصد میں مختلف ہوں ان کے اعتقادی اور عملی نظامات لازمی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہونے چاہئیں یہ ممکن ہے کہ وہ نظام اپنے بعض اجزا میں باہم متشابہ ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نظام میں بعض جزئیات دوسرے نظام سے آگئی ہوں لیکن نہ تو جزئی تشابہات سے کلی موافقت کا حکم نکالا جاسکتا ہے اور نہ جزئیات کے مستعار لینے سے کل کا مستعار ہونا لازم آتا ہے۔ اسی اصل سے دو قاعدے اور نکلتے ہیں۔

ایک یہ کہ ایک خاص مقصد رکھنے والی تہذیب کے نظام کو جانچنے کے لئے دوسری جداگانہ مقصد رکھنے والی تہذیب کے نظام کو معیار نہیں بنایا جاسکتا یعنی تنقید کا یہ طریقہ درست نہیں ہے کہ یہ نظام اگر اس نظام سے مطابقت رکھتا ہے تو صحیح ہے۔ ورنہ غلط۔

دوسرے یہ کہ ایک تہذیب کو بجائے خود باقی رکھتے ہوئے اس کے اعتقادی اور عملی نظام کو دوسرے نظام سے نہیں بدلا جاسکتا اور نہ ایک نظام کے اساسی اجزا دوسرے نظام میں داخل کئے جاسکتے ہیں۔ جو شخص اس قسم کے

غلط ملط کو ممکن یا درست سمجھتا ہے، وہ تہذیب کے اصول سے ناواقف ہے، اور اس کے مزاج کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اس کے نصب العین کا حصہ

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کو ایک بالکل جداگانہ اور مخصوص تہذیب بنانے میں اس کے نصب العین کا کیا حصہ ہے؟

پچھلے مباحث میں یہ بات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے کہ اسلام نے زندگی کا جو نصب العین مقرر کیا ہے وہ دوسرے ادیان اور دوسری تہذیبوں کے نصب العین سے اصلاً مختلف ہے اور یہ ابھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ مقصد کے اختلاف سے اعتقاد و عمل کے نظام میں بنیادی اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے نصب العین نے اس کو ایک ایسی مخصوص تہذیب بنا دیا ہے جو بنیادی طور پر دوسری تہذیبوں سے مختلف ہے، اور جس کا اعتقادی و عملی نظام، دوسرے نظامات سے اساسی اختلاف رکھتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس نظام کے بعض اجزاء دوسرے نظامات میں بھی پائے جاتے ہوں۔ لیکن یہاں وہ اجزاء بعینہٖ اُس حیثیت سے مندرج نہیں ہیں جس حیثیت سے وہ دوسرے نظامات میں مندرج ہیں۔ کسی نظام میں مندرج ہونے کے بعد جزو اپنی شخصی طبیعت کو گم کر کے کل کی طبیعت اختیار کر لیتا ہے، اور جب ایک کل کی طبیعت دوسرے کل سے مختلف ہو تو لازماً اس کے ہر جزو کی طبیعت بھی دوسرے کے ہر جزو کی طبیعت سے مختلف ہو گی، خواہ اس کے بعض اجزاء اپنی ظاہری شکل میں دوسرے کے بعض اجزاء سے کتنی ہی مشابہت رکھتے ہوں۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اسلام نے انسان کو دنیا میں خدا کا نائب قرار دیا ہے۔ اور اس کی زندگی کا مقصد یہ متعین کیا ہے کہ جس آقا کا وہ نائب ہے اس کی خوشنودی حاصل کرے۔ یہ مقصد چونکہ تمام اس کی زندگی کا مقصد ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے تمام اعمال کا رخ اسی مقصد کی طرف پھر جائے، اس کے نفس اور اس کے جسم کی تمام قوتیں اسی مقصد کی راہ میں صرف ہوں۔ اس کے

خیالات، و تصورات اور حرکات و سکنات پر اسی مقصد کی حکومت ہو، اس کا جینا اور مرنا، اس کا سونا اور جاگنا، اس کا کھانا اور پینا، اس کے معاملات اور تعلقات، اس کی دوستی اور دشمنی۔ اس کی معیشت اور معاشرت، غرض اس کی ہر چیز اسی ایک مقصد کے لئے ہو، اور یہ مقصد اس کے اندر اس طرح ساری و جاری ہو جائے کہ گویا وہی اس کی وہ روح ہے جس کی بدولت وہ زندہ اور متحرک ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی زندگی کا یہ مقصد رکھتا ہو، اور اسی مقصد کے لئے زندہ ہو، وہ اس شخص کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا جس کے پیش نظر کوئی مقصد نہ ہو، یا اگر ہو بھی تو اس خاص مقصد سے مختلف ہو۔ یہ مقصد تو اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان کو ایک عامل اور کارکن ہستی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ایسا عامل اور کارکن جو زندہ ہی صرف اس لئے کہ اپنی زندگی کے مقصد کو حاصل کرے۔

پس یہ مقصد متعین کرنے کے بعد اسلام زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے ایک خاص طریقہ کو انتخاب کرتا ہے اور انسان کو مجبور کرتا ہے کہ اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ پر چل کر اپنے عزیز وقت اور اپنی قیمتی طاقتوں کو ضائع نہ کرے۔ وہ اس مقصد کی طبیعت و فطرت کے مطابق عقاید اور اعمال کا ایک جداگانہ نظام وضع کرتا ہے، اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس خاص نظام سے کسی حالت میں باہر نہ جائے۔ وہ اس نظام کو سراسر اطاعت اور عین انقیاد قرار دیتا ہے، اس لئے اس کا نام ہی "دین" رکھ دیتا ہے جس کے معنی اطاعت اور انقیاد کے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (۳: ۲) دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے،

اسی دین کی بنیاد پر وہ اپنے متبعین اور غیر متبعین کے درمیان خط امتیاز کھینچتا ہے جو لوگ اس خاص مقصد کے تحت اس نظام دینی کا اتباع کرتے ہیں ان کو وہ "مسلم" (اطاعت کرنے والے) اور "مومن" (ماننے والے) کہتا ہے اور جو اس مقصد سے متفق نہیں ہیں اور اس نظام دین کا اتباع نہیں کرتے ان کو "کافر"[1] (انکار کرنے والا) قرار دیتا ہے۔ وہ نسل، قوم، زبان، وطن، اور ایسے ہی دوسرے تمام

[1] لفظ کافر کے استعمال میں بھی بے نظیر بلاغت سے کام لیا گیا ہے۔ لغت عرب میں "کفر" کے معنی چھپانے کے ہیں

امتیازات کو مٹا کر اولاد آدم میں صرف اسی ایک کفر و ایمان کے امتیاز کو قائم کرتا ہے۔ جو کوئی اس کے نظام کا اتباع کرے وہ اس کا اپنا ہے خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ اور جو اس کے نظام کا اتباع نہ کرے وہ غیر ہے، خواہ وہ عین کعبہ کی دیوار ہی کے نیچے کیوں نہ رہتا ہو، اور اس کی ہڈی بوٹی مکہ کی کھجوروں اور زمزم کے پانی ہی سے کیوں نہ بنی ہو۔

جس طرح اس نے عقائد اور اعمال کی بنا پر انسانوں کے درمیان "کفر" اور "ایمان" کا امتیاز قائم کیا ہے، اسی طرح زندگی بسر کرنے کے طریقوں اور دنیا کی تمام چیزوں کے درمیان بھی اس نے حرام اور حلال جائز اور ناجائز، مکروہ اور مستحسن کا امتیاز قائم کیا ہے۔ جو اعمال اور طور طریقے اس مقصد کی تحصیل اور فرائض خلافت کی بجا آوری میں مددگار ہیں وہ اپنے درجہ کے لحاظ سے مستحسن ہیں یا حلال ہیں یا جائز اور جو اس میں مزاحم اور مانع ہیں وہ اپنے مرتبہ کے لحاظ سے مکروہ ہیں یا ناجائز یا حرام۔ جو مومن اس خط امتیاز کا احترام کرے وہ "متقی" (پرہیزگار) ہے اور جو اس کا احترام نہ کرے وہ "فاسق" (حدود سے نکل جانے والا) ہے۔ اللہ کی پارٹی کے لوگوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز مال و دولت، یا حسب و نسب، یا مراتب معاشرت یا رنگ کی سیاہی و سپیدی پر نہیں ہے، بلکہ صرف "تقویٰ" کی بنا پر ہے۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹ : ۲)

اس طرح تصورات و افکار، اخلاق و خصائل، معیشت و معاشرت، تمدن و عمران، سیاست و حکومت غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تہذیب کا راستہ دوسری تہذیبوں کے راستہ سے الگ ہو جاتا

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۰) اسی لئے رات کو "کافر" کہا جاتا ہے کہ وہ چیزوں کو چھپا دیتی ہے۔ اور کسان کو بھی کافر کہتے ہیں کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے اور خوشہ کو کافور کہتے ہیں کہ وہ پھل کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے پھر استعارہ کے طور پر نعمت کے چھپانے اور اس کا شکر ادا نہ کرنے کو "کفر" اور "کفران" کہا گیا۔ اسلام نے اس لفظ کو ایمان کی ضد قرار دیا ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں وہ دراصل اپنی فطرت اور جبلت پر پردہ ڈالتے ہیں۔

ہے زندگی کے متعلق اسلام کا نظریہ دوسری تہذیبوں کے نظریہ سے الگ ہے۔ زندگی کا مقصد اسلام کے نزدیک اس مقصد سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے متعین کیا ہے۔ لہذا اسلام اپنے نظریہ کے مطابق دنیا اور مافیہا سے جو معاملہ برتتا ہے، اور اپنے مقصد کی تحصیل کے لئے دنیوی زندگی میں جو طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ بھی بنیادی طور پر اس معاملہ اور اس طریقہ سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے اختیار کیا ہے، ذہن کے بہت سے افکار و تصورات، نفس کے بہت سے میلانات و رجحانات اور زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے ایسے ہیں جن کا اتباع دوسری تہذیبوں کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ بسا اوقات لازمۂ تہذیب ہے۔ مگر اسلام ان کو ناجائز، مکروہ اور بعض حالات میں حرام قرار دینے پر مجبور ہے۔ اس لئے کہ وہ ان تہذیبوں کے تصور حیات سے عین مطابقت رکھتے ہیں اور ان کے مقصد زندگی کی تحصیل میں مددگار ہوتے ہیں، مگر اسلام کے تصور حیات سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں، اور اس کے مقصد زندگی کی تحصیل میں وہ مانع ہیں۔ مثال کے طور پر فنون لطیفہ دنیا کی بہت سی تہذیبوں میں جو جان تہذیب ہیں۔ اور ان فنون میں اعلیٰ مہارت رکھنے والوں کو قومی ہیرو کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر اسلام ان میں سے بعض کو حرام، بعض کو مکروہ اور بعض کو ایک حد تک جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے قانون میں ذوق لطیف کی پرورش، اور جمال مصنوعی سے لطف اندوزی کی اجازت صرف اس حد تک ہے جہاں انسان اُس کے ساتھ ساتھ خدا کو یاد رکھ سکے۔ اس کی رضا جوئی کے لئے عمل کر سکے۔ اپنے منصب خلافت کے فرائض بجا لا سکے مگر جب مقام پر پہنچ کر یہ ذوق لطیف، احساس فرض پر غالب آ جاتا ہو، جہاں لطف اندوزی کا انہماک انسان کو خدا پرست کے بجائے حسن پرست بنا دیتا ہو جہاں فنون لطیفہ کی چاشنی سے انسان کو عیش پسندی کا چسکا لگ جاتا ہو۔ جہاں ان فنون کے اثر سے جذبات و داعیات نفس اس قدر قوت و شدت حاصل کر لیتے ہوں کہ عقل کی گرفت ڈھیلی ہو جائے، ضمیر کی آواز کیلئے دل کے کان بہرے ہو جائیں، اور فرض کی پکار کے لئے سمع و طاعت باقی نہ رہے، تو اس سرحد پر اسلام عدم جواز، کراہت اور حرمت کے موانع قائم کر دیتا ہے اس لئے کہ اس کا مقصد تان سین اور بندا دین، مانی اور بہزاد، چارلی چپلن، اور میری پکفورڈ پیدا کرنا نہیں ہے

بلکہ وہ ابوبکرؓ صدیق اور عمرؓ فاروق علیؓ بن ابی طالبؓ اور حسینؓ ابن علیؓ ابوذرؓ غفاری اور ان جیسے پیدا کرنا چاہتا ہے

یہی حال معاشرت اور تمدن کے اور بہت سے معاملات میں بھی ہے جن کی تفصیلات کو اوپر کی مثال پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ عورتوں اور مردوں کے تعلقات، نادار اور مفلس کے معاملات، راعی اور رعیت کے روابط اور انسانی طبقات کے باہمی برتاؤ کے متعلق اسلام کا طریقہ تمام قدیم اور جدید تہذیبوں کے طریقہ سے اصولی طور پر مختلف ہے۔ اس باب میں دوسری تہذیبوں کے نظام کو معیار قرار دینا اور اسلام کے نظام کو اس پر جانچنے کی کوشش کرنا اصلاً غلط ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ سطح بین اور حقیقت نا آشنا ہیں۔ (باقی)

دنیا قرآنی دنیا کب ہوگی؟

اے حاکم مطلق خدا! تیری وہ شانِ حاکمیت کب ظاہر ہوگی جبکہ روئے زمین کے سارے حکمران اور ان کی ساری رعیت تیرے حکموں پر چلے گی، تیرے آسمانی قوانین پر سر جھکائے گی اور صرف تیری محکومیت کا دم بھرے گی؟

اے معبود مطلق خدا! وہ وقت کب آئے گا جبکہ ہر فرد انسان تیری اور صرف تیری پرستش و عبادت اور صرف تیری عبادت کرتا نظر آئے گا؟

اے سراپا جمال خدا! آخر وہ جلوہ نمائی کب ہوگی جبکہ بنی آدم کو تیری اور فقط تیری محبت ہوگی اور ان کے پاس جو کچھ ہوگا وہ سب تجھ پر نثار کرنے کے لئے ہوگا؟

اے میرے خدا! دنیا قرآنی دنیا کب ہوگی؟ کیونکہ جو کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ تیری اسی پاک کتاب کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔

"مصلح"

ظل و نور

از جناب ذوقی شاہ صاحب

انسان جب اپنے اصلی رنگ میں ہوتا ہے تو اپنی ہی بولی بولتا ہے۔ ہر فن میں کلام کرنے والا جب اپنے فن میں کلام کرتا ہے تو اسی زبان میں مقید رہتا ہے جو اس فن کے لئے مختص ہے۔ ایک معمولی شخص معمولی طور پر یہی کہیگا کہ "زید کو اس وقت تیز بخار ہے" مگر ایک ڈاکٹر جب اپنی زبان میں بات کریگا تو یوں کہیگا کہ "زید کا ٹمپیریچر اس وقت ایک سو پانچ ہے"۔ الفاظ بظاہر مختلف مگر بباطن ہم معنی ہیں۔ اگر فرق ہے تو بس اسی قدر کہ پہلے فقرہ میں اجمال ہے اور دوسرے میں کسیقدر تفصیل۔

ایک دوست کے اصرار پر میں بھی اس وقت "ظل و نور" کے متعلق صوفیانہ رنگ میں مختصراً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تصوف کے مضامین کا حق تصوف ہی کی زبان کچھ ادا کر سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض ناظرین میرے اس مضمون کو چیستان سے زیادہ وقعت نہ دیں لیکن غور و خوض کرنے والی طبیعتیں یقیناً اس سے محظوظ ہوں گی اور پانے والی بات کو پالیں گی۔

ظہور کائنات سے قبل ایک زمانہ تھا جس پر نہ زمانہ کا اطلاق ہوتا تھا نہ وقت کا۔ اس وقت نہ زمان تھا نہ مکان۔ نہ ازل نہ ابد۔ نہ تحت نہ فوق۔ نہ ارکان تھے نہ عناصر۔ صرف ذات مطلق تھی اور کچھ نہ تھا۔ كَانَ اللّٰهُ وَ لَمْ يَكُنْ مَعَهٗ شَيْئًا۔

تخلیق کائنات کی جب پو پھٹی، ظہور کائنات کا جب آفتاب طلوع ہوا، تو جملہ اشیاء عدم سے وجود میں آئیں۔ اشیاء کو ظلمت عدمی سے نور وجود کی جانب لانے ہی کا نام تخلیق ہے۔ صوفیاء کرام کی

اصطلاح میں جملہ ظہورات وتعینات کو، وجود اضافی کو جو اعیانِ ممکنات تعینات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، معدومات ظاہرہ کو جو انوار الٰہی کی چمک سے ظہور پکڑتے ہیں، ظلّ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور نور وہ روشنی وہ چمک وہ قوت، وہ قدرت ہے جس سے یہ معدومات وجود میں آکر ظاہر ہوتے ہیں۔ نور ایک اسم ہے اسمارِ الٰہی میں سے جو تقریباً مترادف ہے۔ اسم الظاہر کے احکام ممکنات جو در اصل معدومات سے ہیں۔ اسم نور سے ظاہر ہوئے۔ اس ظہور کو وجود اضافی اور وجود خارجی کہتے ہیں۔ یہ اضافی یا خارجی وجود معدومات میں ظلمتِ عدمی ہے وہ نور جو صور معدومات میں ظاہر ہوا ظلّ ہے۔ کیونکہ موہوم ہے اور منقول ہے اور سفی نفسہا معدومات کی عدمیت ہے۔ تو گویا جن معدومات کا ظہور ہوا۔ وہ بھی ظلّ ہیں۔ اور جس نور کے سبب ان کا ظہور ہوا وہ نور بھی ظلّ ہے۔

عالم کو حق تعالیٰ سے وہی نسبت ہے جو سایہ کو اس شخص سے ہے جس کا کہ وہ سایہ ہے۔ عالم جس کہ غیر حق کا اطلاق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ظلّ ہے۔ یہ ظلّ الٰہی جسے کہ عالم کہتے ہیں اعیان ممکنات میں ظاہر اور ممتد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ فرقان میں فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔ کیا تونے اپنے رب کی طرف نظر نہیں کی کہ اس نے وجود اضافی کو ممکنات پر کس طرح پھیلایا؟ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا اور اگر وہ چاہے تو اُسکا کن کر دے یعنی وجود اضافی کو اپنی ذات میں بالفعل سے بالقوہ کر دے۔ گویا حق تعالیٰ کی ہستی ایسی نہیں کہ جب وہ ممکنات میں تجلی فرماوے تب ظاہر ہو اور تجلی نہ فرمانے کی صورت میں مثل ممکنات کے ہو جاوے جن کا کوئی عین ہی وجود میں ظاہر نہیں۔ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا پھر ہم نے اس سایہ پر آفتاب کو دلیل و رہنما بنایا۔ آفتاب سے ظلّ نمائی ظہور میں نہ آتی تو آفتاب کی روشنی کو کوئی نہ پہچانتا اگر آفتاب ایک ہی حالت پر قائم رہتا اور صبح شام نہ ہوتی اور سایہ کی طوالت میں کمی بیشی نہ واقع ہوتی رہتی تو نہ کسی کو نور کا شعور ہوتا نہ کوئی اس نور کو آفتاب سے نسبت دیتا۔ گویا آفتاب کے نور سے سایہ پہچانا جاتا ہے۔ اور سایہ سے آفتاب کا نور۔ وہ آفتاب اسم نور ہے جس سے وجود ظلّی

کی شناخت ہوتی ہے، ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا۔ پھر ہم اس کو اپنی طرف تھوڑا تھوڑا اور آہستہ آہستہ کرکے لیتے ہیں یہ اس لئے کہ وہ اسی کا ظل ہے اور اسی کی طرف جملہ امور پلٹتے ہیں کیونکہ وہ ہر چیز کی اصل ہے پس جملہ تعینات باعتبار ہویت حق کے حق تعالیٰ ہی کا وجود ہے اور باعتبار صورتوں کے اختلاف کے وہ سب تعینات اعیان ممکنات ہیں۔ جس طرح صورتوں کے اختلاف سے ظل کا نام اس سے دور نہیں ہو سکتا اسی طرح اس اختلاف کی بنا پر عالم اور غیر حق کے نام بھی اس سے دور نہیں ہو سکتے۔

جب عالم ایک ظل یا مجموعۂ ظلال ہے تو عالم کا وجود اصلی نہیں بلکہ ظلی وہمی خیالی اور اعتباری ہے حقیقت سے ناواقف خیال کرتا ہے کہ عالم حق تعالیٰ سے خارج ایک شئے زاید ہے، نیز یہ کہ عالم قائم بنفسہٖ ہے حالانکہ دراصل ایسا نہیں۔ سایہ کو اصل سے جو اتصال ہے اس کا ٹوٹنا محال ہے۔ کوئی چیز سایہ کو اصل سے جدا نہیں کر سکتی۔ ہر شخص اپنے عین کو پہچاننے کی کوشش کرے تو اسے معلوم ہو جائیگا کہ وہ کون ہے؟۔ اوس کی ہویت کیا ہے؟ کس اعتبار سے اس پر کون سا اسم صادق آتا ہے؟ جہت حق اس کی کونسی ہے اور جہت خلق کونسی؟ اس معرفت کی کمی و بیشی پر عارفوں کی بصیرت کی کمی و بیشی کا تفاوت ہے اس کی و بیشی کی مثال یہ ہے کہ ایک آئینہ خانہ متصور کرو جس میں بے شمار چھوٹے اور بڑے سیدھے اور ٹیڑھے صاف اور دھندلے، سپید اور رنگ برنگ کے آئینے لگے ہوئے ہیں۔ جن پر ایک ہی رنگ کی روشنی پھینکی جارہی ہے۔ دیکھنے والے کی نگاہ میں آئینہ کی رنگت اور صورت کے مطابق وہ روشنی بھی رنگ و صورت اختیار کرلیتی ہے۔ حالانکہ اس روشنی کا اصلی رنگ و صورت وہ نہیں۔ چھوٹے آئینے میں چھوٹی اور بڑے آئینہ میں بڑی صورت نظر آتی ہے۔ سیدھے میں سیدھی اور ٹیڑھے میں ٹیڑھی۔ صاف آئینہ میں صاف اور دھندلے میں دھندلی نظر آتی ہے۔ اسی طرح جو بندہ بوجہ اپنی صفائی کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ متحقق ہو جاتا ہے اس میں حق تعالیٰ کے مظاہر زیادتی کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ حق تعالیٰ ان کے لئے سمع و بصر و کلام اور کل قویٰ و جوارح بن جاتا ہے

لیکن باوجود اس قرب واتصال کے بندہ ظل ہی رہتا ہے۔ یہ بندہ بوجہ اپنی صفائی کے ایک ایسا شیشہ ہوتا ہے کہ اسے ظلِ نوری کہتے ہیں ہر شخص بوجہ ظل ہونے کے محض خیال ہوتا ہے اور اس بندہ کے علاوہ مدرکات اور یہ تمام موجودات جن پر غیر حق کا اطلاق ہوتا ہے۔ خیال در خیال ہے۔ وجود حق باعتبار اپنی ذات وعینیت کے اللہ ہی ہے نہ کہ باعتبار اسمار کے جن میں کثرت ہے ہستی میں احدیت ہے اور خیال میں کثرت جو کثرت میں قائم رہا وہ عالم میں اسمار الٰہیہ اور اسمار کونیہ کا قرین رہا اور جو احدیت پر قائم رہا اسے اس ذات اقدس کی معیت حاصل ہوئی جو غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ ہے یہ استغنار اسمار سے بھی ہے اور مسمیات سے بھی۔ اللہ تعالیٰ کی وہ احدیت جو باعتبار اسمار الٰہیہ کے ہے احدیت الکثرت کہلاتی ہے۔ اور وہ احدیت جو ان اسمار سے مستغنی ہونے کی جہت سے ہے احدیت عینی کہلاتی ہے۔ ان دونوں جہتوں پر اسم احد کا اطلاق ہوتا ہے۔

ظلال ہی کی بدولت اور ظلال کے داہنے بائیں کروٹ میں لینے کے سبب سے بندہ کی رہنمائی ہوتی ہے اور بندہ پہچاننے لگتا ہے کہ اس کو حق تعالیٰ سے اور حق تعالیٰ کو اس سے کیا نسبت ہے؟ ماسوا کیوں فقر و ناداری ونیستی سے متصف ہے اور حقیقت الٰہیہ کی جانب اسے کیونکر احتیاج کلی ہے؟ اور حق تعالیٰ کے لوگوں اور عالموں سے مستغنی ہونے کی کیا حقیقت ہے؟

عالم اللہ کا محتاج ہے بسبب اسمار الٰہیہ کے اور اسمار الٰہی وہ اسمار ہیں جن کے تحت میں عالم کے لوگ اور عالم کی چیزیں باہم ایک دوسرے کی محتاج ہیں یا عین ذات حق تعالیٰ کی محتاج ہیں کیونکہ ہمارے اسمار یا ہماری ذات بھی اللہ ہی کے اسمار ہیں۔ اور ہمارے اعیان نفس الامر میں اسی کے ظل ہیں۔ اور اس کے غیر نہیں۔ باعتبار حقیقت کے وہ ہماری ہویت ہے لیکن باعتبار تقید کے وہ ہماری ہویت نہیں لہٰذا وہ من وجہٍ بندہ کی ہویت ہے اور من وجہٍ بندہ کی ہویت نہیں۔

اب ذرا آیت نور کی بھی سیر فرمالیجئے جس کو اس مضمون سے قوی تعلق ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ (النور ع ۵)	اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اس کے نور کی مثال مانند طاق کے ہے جس کے بیچ میں چراغ ہو۔ وہ چراغ شیشہ کی قندیل میں ہے شیشہ کی وہ قندیل گویا کہ تارہ ہے چمکتا ہوا روشن کیا جاتا ہے۔ وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت سے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ نزدیک ہے کہ تیل اس کا روشن ہو جاوے۔ اگرچہ نہ لگے اس کو آگ۔ نور پر نور ہے اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی جانب ہدایت فرماتا ہے۔ اور بیان فرماتا ہے مثالیں واسطے لوگوں کے

اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے:۔

سموات سے یہاں ارواح مراد ہیں اور ارض سے اجساد۔ مشکوٰۃ جسم انسانی ہے۔ مصباح روح ہے۔ جو مثل چراغ کے روشن اور روشن کنندہ ہے۔ زجاجہ قلب عبد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نور وجود سے آسمانوں اور زمین کا اشراق فرمایا بعد اس کے کہ جو حجابات اس کے اور ان کے درمیان تھے انھیں وہ اٹھا چکا تھا۔ حجابات کے اٹھا دینے سے یہ مراد ہے کہ آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان میں ہے ان میں اللہ تعالیٰ نے اپنا نور قبول کرنے کی صلاحیت پیدا فرما دی جس طرح کہ آئینہ میں صیقل کر دینے سے صورتوں کے قبول کرنے کی آئینہ میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے

اللہ تعالیٰ کے نور کے اس عالم میں ہونے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ روح انسانی بدن انسانی میں مصباح یعنے روح ہے۔ یہ روح قلب یعنے زجاجہ میں ہے شجرۃ مبارکۃ سے نفس انسانی مراد ہے انواع و اقسام کے فیوض قبول کرنے کی قابلیت۔ لاشرقیت سے اشارہ ہے عالم مجردات کی جانب

نیز یہ اشارہ بھی ہے کہ اس میں کمالات بالفعل ہیں۔ اور لا غربیۃ سے مراد ہے کہ وہ اجسام کثیفہ ظلمانیہ میں سے نہیں۔ یکاد زیتہا سے یہ مراد ہے کہ اس میں خود ہی چمک اٹھنے کی استعداد موجود ہے ولو لم تمسسہ نار یعنی حرارت غریزہ کا روح انسانی کے ساتھ کوئی مدبرانہ تعلق نہ ہو۔ نورٌ علی نور سے وہ نور مراد ہے۔ جو اس نور انسانی کے مافوق ہے اور وہ نور الٰہی ہے۔ یہدی اللہ لنورہ من یشاء اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے اس نور کی جانب رہنمائی فرماتا ہے۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں ویضرب اللہ الامثال للناس۔ یہ صرف مثالیں ہیں جو لوگوں کے لئے اس غرض سے بیان کی گئی ہیں کہ حقیقت حال تک پہنچنے میں لوگوں کو ذرا مدد ملے ورنہ حقیقت تو ان سے ماوریٰ ہے۔ واللہ بکل شیٔ علیم۔ اور ہر قسم اور ہر چیز کے پورے پورے علوم یعنی جمیع علوم ظاہری و باطنی کا خزانہ حق تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ وہ اس میں سے جتنا جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

جن حضرات کی مدت خریداری ماہ جمادی الاخریٰ میں ختم ہو رہی ہے ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے مجلس تحریک قرآن کی امداد کے لئے اس رسالہ کا چندہ گزشتہ سال دس روپے ادا کیا تھا۔ اگر وہ چاہیں تو یہی امداد کو آئندہ سال کے لئے بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔ ان کے چندہ میں سے پانچ روپے رسالہ کی قیمت میں وضع کرکے باقی پانچ مجلس تحریک قرآن کو بھیج دئے جائینگے جس کی باقاعدہ رسید مجلس کے دفتر سے ان کو پہنچ جائیگی

مینجر

گوسالۂ سامری

از

مولانا عبداللہ العمادی

(۲)

یہ سچ ہے کہ قوم سامرین کا زمانہ حضرت موسیٰ کے ہم عہد نہیں لیکن کیا ایک نام کا ایک ہی شخص ہوا کرتا ہے؟ تورات میں سامر کا نام کئی جگہ آیا ہے[۱]۔ ممکن ہے تغیر لہجہ سے عبری کا سامر عربی میں سامری بن گیا ہو لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سامری قوم سامرہ ہی کا ایک فرد تھا جب بھی کوئی مضایقہ نہیں۔ سید احمد خان لکھتے ہیں۔

"بنی اسرائیل کے بارہ سبط تھے اور سب ایک سلطنت کے ماتحت تھے۔ مگر جب رجعام بادشاہ ہوا تو بنی اسرائیل کے دس سبط نے اس سے بغاوت کی اور یاربعام پسر نباط کو اپنا بادشاہ بنایا۔ اس نے اپنے ملک میں بمقام بیت ایل اور دان کے سونے کے بچھڑے بنائے (دیکھو اول سلاطین باب ۱۲۔ آیت ۲۸ و ۲۹) اور ان کی پرستش شروع کی جب کہ عمری ان لوگوں پر بادشاہ ہوا تو اس نے کوہ شمرون کو اس کے مالک سے جس کا نام شمر تھا خرید لیا (سلاطین میں بجائے شمر کے سامر لکھا ہے) اور وہاں شہر بنایا جو دار الخلافہ ہو گیا (دیکھو اول سلاطین۔ باب ۱۶۔ آیت ۲۳ لغایتہ ۲۵) اور اسی سبب سے وہ لوگ سامرتن یا شامری یا سامری مشہور ہوئے۔ وہ قوم جس میں کے ایک شخص نے بنی اسرائیل کے لئے بچھڑا بنایا تھا قرآن مجید کے بہت پہلے سے سامری کے نام سے کہلاتی تھی قرآن مجید میں السامری کہنے سے صرف یہ اشارہ ہے کہ اس کا بنانے والا اس قوم میں سے تھا جنہوں نے آخر کار یاربعام کی اطاعت کر کے سونے کے بچھڑوں کی پرستش کی تھی

۱؎ اخبار الایام (اول تواریخ) باب ۷ آیت ۳۴ و باب ۸۔ آیت ۱۲۔

اور جو لوگ سامری یعنی سامرتن کے لقب سے مشہور ہیں۔

(۵)

اس واقعہ کے متعلق توراۃ کا بیان حسب ذیل ہے:-

"جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑ سے اترنے میں دیر کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اُسے کہا کہ اٹھ۔ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلیں کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔ ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے کہا کہ سونے کے زیور جو تمہاری بیویوں بیٹوں اور بیٹیوں کے کانوں میں ہیں اُتار اُتار کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ زیوروں کو جو ان کے پاس تھے اُتار اُتار کے ہارون کے پاس لائے۔ اس نے ان کو ہاتھوں سے لیا۔ اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکی کے اوزار سے درست کی۔ انہوں نے کہا کہ اے بنی اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر سے نکال لایا۔ جب ہارون نے یہ دیکھا تو اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی۔ ہارون نے یہ کہکر منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں۔ سلامتی کی قربانیاں گزرانیں۔ لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اٹھے۔ تب خداوند نے موسیٰ کو کہا کہ اتر جا کیونکہ تیرے لوگ جنہیں تو مصر کے ملک سے چھڑا لایا خراب ہو گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جو میں نے انہیں فرمائی جلد پھر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے ڈھلا ہوا بچھڑا بنایا۔ اسے پوجا اور اس کے لئے قربانی ذبح کر کے کہا اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے۔ پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے۔ اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے۔ اور میں ان کو بھسم کروں۔ میں تجھ سے ایک بڑی قوم بناؤنگا۔ موسیٰ نے اپنے خداوند خدا کے آگے منت کر کے کہا کہ اے خداوند کیوں تیرا غضب اپنی گروہ پر جنہیں تو زوری اور زبردستی کے ساتھ ملک مصر سے نکال لایا بھڑکتا ہے۔۔۔۔ تب خداوند اس بدی سے جو اس نے سوچا تھا کہ اپنے لوگوں سے کرے پچھتایا۔ موسیٰ پھر کے پہاڑ سے اتر گیا۔ شہادت کی دو لوحیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ جو لکھا ہوا سو خدا کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا۔ جب یشوع نے

لوگوں کی آواز جو پکار رہے تھے سنی تو موسیٰ سے کہا کہ لشکر گاہ میں لڑائی کی آواز ہے۔ موسیٰ بولا۔ یہ تو نہ فتح کے شور کی آواز نہ شکست کے شور کی آواز ہے بلکہ گانے کی آواز میں سنتا ہوں؛ جب وہ لشکر گاہ کے پاس آیا اور بچھڑا اور ناچ رانگ دیکھا تب موسیٰ کا غضب بھڑکا اس نے تختیں اپنے ہاتھوں سے پھینکدیں۔ پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالیں۔ اس بچھڑے کو جسے انہوں نے بنایا تھا لیا۔ اس کو آگ سے جلایا۔ پیس کر خاک سا بنایا اور اس کو پانی پر چھڑک کر بنی اسرائیل کو پلایا۔ موسیٰ نے ہارون سے کہا کہ ان لوگوں نے تجھ سے کیا کیا کہ تو ان پر ایسا بڑا گناہ لایا۔ ہارون نے کہا کہ میرے خداوند کا غضب نہ بھڑکے۔ تو اس قوم کو جانتا ہے کہ بدی کی طرف مائل ہے سو انہوں نے مجھے کہا کہ ہمارے لئے ایک معبود بنا جو ہمارے آگے چلے کہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے چھڑا لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا تب میں نے انہیں کہا کہ جس کے پاس سونا ہو وہ اتار لاوے۔ سو انہوں نے مجھے دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈالا سو یہ بچھڑا نکلا جب موسیٰ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ بے قید ہو گئے کہ ہارون نے انھیں ان کے مخالفوں کے روبرو اُن کی رسوائی کے لئے بے قید کر دیا تھا۔ تب موسیٰ لشکر گاہ کے دروازے پر کھڑا ہوا اور کہا جو خداوند کی طرف ہو وہ میرے پاس آئے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوئے۔ اس نے انہیں کہا کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے۔ ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکر گاہ میں گذرتے پھرو۔ ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک شخص اپنے عزیز قریب کو قتل کرے۔ بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریب تین ہزار کے مارے پڑے۔۔۔ دوسرے دن صبح کو یوں ہوا کہ موسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ تم نے بڑا گناہ کیا۔ اب میں خداوند کے پاس اوپر جاتا ہوں۔ شاید میں تمہارے گناہ کا کفارہ کروں۔۔۔ خداوند نے ان کے بچھڑے بنانے کے سبب سے جسے ہارون نے بنایا تھا۔ لوگوں پر طاعون بھیجا؛[1]

[1] خروج باب ۳۲۔ آیت اول لغایتہ ۳۵؛

(۶)

تورات کا افسانہ اگر صحیح ہے تو اس کے لازمی نتائج یہ ہوں گے:۔

الف۔ بچھڑے کا بنانے والا سامری نہ تھا۔ خود حضرت ہارون اس کے بنانے والے تھے۔

(ب) ہارون کو خدا نے مقدس بنایا تھا۔ تقدس کا خلعت دیا تھا۔ روحانی نعمتیں عنایت کی تھیں نسلاً بعد نسل ان کے خاندان میں اس تقدس کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ حضرت موسیٰ کو ان کے (یعنی ہارون کے) اور ان کی اولاد کے متعلق بہت سی وصیتیں کی تھیں۔ بایں ہمہ نہ تو ہارون نے خدا کی رحمتوں کا خیال کیا اور نہ اپنے فرائض پر نظر کی۔ حضرت موسیٰؑ نے انہیں اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا مگر بجائے اس کے کہ وہ عوام کو گمراہی سے بچاتے خود ہی اس کی بنیاد قائم کر دی۔

(ج) لازم تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل پر خدا نے جس قدر عذاب نازل کیا تھا اس سے بہت زیادہ عذاب ہارون پر نازل ہوتا۔ اس لئے کہ یہی حضرت اس گمراہی کے بانی تھے لیکن بیچارے عامیوں سے تو اتنا سخت بدلہ لیا گیا کہ سب لوگ اپنے عزیز ترین دوستوں اور رشتہ داروں کو قتل کرنے اور کٹ مرنے پر مجبور کئے گئے مگر ہارونؑ کا بال تک بیکا نہ ہوا اور مواخذہ تو درکنار خدا کی جانب سے انھیں تنبیہ بھی نہیں کی گئی۔

(د) تورات کے بیانات قابل تسلیم نہیں ہیں اس لئے کہ جا بجا ہارونؑ کی عظمت بھی بیان کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ عظمت ہارون کے خاندان میں قائم رہے گی۔ اور پھر یہی بتایا جاتا ہے کہ خدائے اسرائیل نے بنی اسرائیل کی ہدایت و اصلاح کے متعلق ان پر جو اعتماد کیا تھا وہ حق بجانب نہ تھا۔ کیونکہ ایک وقت میں انھوں نے حد درجہ کی شرک و گمراہی میں حصہ لیا تھا۔ خود بھی گمراہ ہوئے تھے۔ اور تمام قوم کو بھی ضلالت میں پھنسایا تھا۔

لہ۔ خروج باب ۲۸ از اوّل تا آخر۔

یہ وہ نتائج ہیں جن سے ممکن ہے کہ سرسری نظر والی خوش اعتقاد طبیعتوں میں کوئی تذبذب نہ پیدا ہو لیکن حقیقت شناسی کا وجود اگر دنیا میں باقی ہے تو ہارونؑ کی عزت۔ توراۃ کی سچائی خدا کی خدائی۔ ان سب میں کوئی چیز بھی الزام سے بری نہیں ہو سکتی۔ اس حالت میں دو ہی صورتیں تھیں۔

(الف) توراۃ کو سچ مانتے ہیں تو خدائے بنی اسرائیل کی کبریائی اور ہارونؑ کی عزت میں فرق آتا ہے۔

(ب) خدا کی کبریائی اور ہارون کی عزت پر نظر پڑتی ہے تو توراۃ کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔

اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ان میں اکثر کا فیصلہ قرآن کریم سے ہو جاتا ہے۔ سورۂ نمل میں نہایت بلند آواز سے اس دعویٰ کی منادی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ	بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل کی اکثر باتوں (کی حقیقت
اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۔ وَاِنَّهٗ	واقعی) کو جن میں اختلاف کرتے ہیں۔ ان پر ظاہر کرتا ہے
لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ اِنَّ رَبَّكَ	اور بے شک یہ قرآن ایمان والوں کے حق میں (از سر
يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ	تا پا) ہدایت و رحمت ہے (اے پیغمبر) کچھ شک نہیں کہ
(جزو ۲۰ سورہ ۲۷۔ آیت ۷۷)	تمہارا پروردگار (قرآن کو نازل کر کے) اپنے حکم سے ان

کے آپس کے اختلافات کا فیصلہ فرماتا ہے۔ اور وہ زبردست (اور سب کچھ) جانتا ہے۔

یہ دعویٰ تھا اور اس کی دلیل یہی گوسالہ سامری کا واقعہ ہے، قرآن کریم نے صاف بتا دیا کہ موجودہ تورات میں یہودیوں نے اس واقعہ کو غلط پیرایہ میں درج کر دیا ہے ہارونؑ جیسے عظمت و شان کے بزرگ کا یہ شیوہ نہ تھا کہ وہ گوسالہ بنا کر پوجتے۔ اور خلق کو گمراہ کرتے۔ یہ تو سامری کا کام تھا۔

―――(۷)―――

توراۃ کی اصلاح و تصحیح کرنے والوں کو ہارون کے متعلق غلط فہمی پیدا ہونے کے غالباً دو سبب ہوئے ہوں گے۔

(الف) کوہ طور پر جاتے وقت حضرت موسیٰ اپنے بھائی ہارون کو بنی اسرائیل کا محافظ مقرر کر گئے تھے۔ محافظ کے لئے عبرانی زبان میں سامر یا شامر کا لفظ استعمال ہوا کرتا ہے۔ بعض لیکن و مترجمین توراۃ نے جب "سامری" کا قصہ پڑھا ہوگا تو وہ سمجھے ہوں گے کہ یہ کسی شخص کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس سے وہ شخص مراد ہے جو بنی اسرائیل کا محافظ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ محافظت کی خدمت ہارونؑ ہی کو تفویض ہوئی تھی۔

(ب) حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور سے واپس آئے تو انہوں نے ہارونؑ کو بڑی سختی سے ملامت کی کہ تم نے اپنے فرض میں کس لئے کوتاہی جائز رکھی اور لوگوں کو گمراہ ہونے دیا ظاہر ہے کہ یہ ملامت فرض ان کے فرائض محافظت پر مبنی تھی اسی طرح جیسے کہ سرکار عالی کی جانب سے عوام کی بدعنوانیوں کی پرسش قوم کے سرگروہوں سے کی جاتی ہے۔ لیکن یہودی مصنفین یہ دیکھکر کہ توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کا لہجہ ہارون کی نسبت نہایت سخت اور ملامت آمیز ہے یہ سمجھے کہ ہارونؑ ہی نے وہ بچھڑا بنایا تھا۔

یہ ہے وہ ان واقعات کی جن میں کئی ہزار برس سے اختلاف چلا آتا ہے۔ ناظرین کو اختیار ہے کہ قرآن کریم کے فیصلہ کو سچ مانیں یا توراۃ کی غلطیوں پر جمے رہیں۔

(۸)

سامری کو حضرت موسیٰؑ نے جن الفاظ میں بددعا دی تھی وہ یہ تھے۔

فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ۔ چل دور ہو۔ اس زندگی میں تیری یہ سزا ہے کہ تو کہتا پھرے گا (دیکھو مجھے کوئی چھو نہ جانا ورنہ ہم دونوں کو تپ آ جائے گی)۔

یہ ترجمہ مفسرین کی عام روایت کے مطابق ہے اور لا مساس کے لفظ نے اس کی بنیاد ڈالی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لا مساس کے معنی ملنے جلنے سے ممانعت کے ہیں۔ سامری کی ضلالت دیکھ کر حضرت موسیٰ نے اس کو منع کر دیا تھا کہ خبردار! اب زندگی بھر کسی سے نہ ملنا جلنا۔ [۱] کیونکہ ظاہر ہے کہ گمراہی کا مرض اسی صورت میں متعدی ہوا کرتا ہے۔ تپ کے آنے نہ آنے سے نہ اس کو کوئی تعلق ہے نہ قرآن کریم اس قصہ کا مؤید ہے۔ اور نہ صحیح تاریخی روایتیں اس کی حامی ہیں۔ ذالک قولہم بافواہہم۔

[۱] تفسیر کبیر۔ جلد ۶ صفحہ ۶۹ (دیجنانی)

اگر آپ اپنا مقام تبدیل کریں تو اپنے جدید پتہ کی اطلاع دفتر ترجمان القرآن کو ضرور دے دیا کریں۔ ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری اس دفتر پر نہ ہوگی

منیجر

ہمارا قرآن اور ہم

از

مولانا الحاج ابوالخیر محمد خیر اللہ صاحب قوسی القادری المحمدی (ورنگل)

اصلاح حال امت کے بہت سودے ہیں جو بہی خواہان قوم کے سروں میں سمائے ہوئے ہیں بہت سی نارسا فکریں ہیں جو بلا انتظار نتائج محو تفاخر بھی ہیں۔ آج بعض شناسان علالت قومی نے اپنی جگہ بہت سے نسخے تجویز کر رکھے ہیں جن کو یورپ کے قرابادین سے تلاش کیا گیا ہے اور وہ اس مریض بے درمان کو بار بار حل کر کے پلائے بھی گئے مگر دوا و مسیحائی نہ ملنی تھی نہ ملی کیونکہ وہ موافق مزاج ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ شافی مطلق نے جو نسخہ شفا اس مریض کے لئے ازل سے تجویز فرمایا تھا۔ وہ وہی تھا جس نے اپنا مفید و مجرب ہونا ساری دنیا کو تسلیم کرا دیا تھا۔ وہ چشمۂ رحمت الٰہی کا جرعۂ جان بخش تھا جس کو پی کر لاکھوں مردے زندہ ہو چکے تھے۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔

ہماری بدحواسی کا کیا ٹھکانا ہے کہ ہم اپنی صحت و عافیت کے لئے اس آزمودہ اور مجرب نسخہ کی جانب بھولے سے بھی توجہ کرنا نہیں چاہتے۔ اگر کبھی کوئی متوجہ کرا دے تو اس کی اس ہمدردی کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ سبب عارض و مرض لاحق سے اس نسخۂ شفا کو کوئی تعلق یا نسبت ہی نہیں ہے۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔

یہ داستان غم طویل اور دردناک ہے اور یہ مختصر مضمون اس طول داستان کا تحمل بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس جگہ خراش سلسلہ سے قطع نظر کر کے کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

ہماری آیندہ ترقی کے خواب اگر اپنی کوئی صحیح تعبیر ہمکو بتا سکتے ہیں ۔ تردد فلاح و فکر اصلاح اگر اپنے صحیح معیار پر قائم ہو سکتے ہیں تو اس کی صرف یہی ایک راہ ہے کہ ہم اپنی نشاۃ اولیٰ پر پورے انہاک کے ساتھ نظر رکھیں اور یہ دیکھیں کہ ہماری ابتدا کس طرح ہوئی تھی ہم اس پر غور کریں کہ ایک بے آب و گیا ریگستان، ایک لق و دق دشت و بیابان کے بسنے والے خانہ بدوش۔ اُمّی نا آشنائے تہذیب و تمدن مٹھی بھر عرب آناً فاناً کیسے ساری دنیا پر چھا گئے؟ وہ کیا تھا جس نے قیصر و کسریٰ کے تخت کو تاراج کر دیا؟ اینٹ سے اینٹ بجا دی؟ سارے عالم پر اپنا سکہ بٹھا دیا؟ وہ کس کی ہیبت و صولت تھی جس سے مشرق و مغرب کانپ اٹھے تھے؟ وہ کونسا عمل تسخیر تھا جس کو پڑھکر عرب کے چرواہوں نے دنیا پر حکومت کرنا سیکھا تھا؟ اور دنیا والوں کو جہانداری و جہانگیری کے گُر بتائے تھے؟ وہ کونسی تعلیم تھی جس نے دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا؟ وہ کونسا گھر تھا جس میں طفل تہذیب نے جنم لیا تھا؟ وہ کونسا کالج تھا جس کی تربیت و تعلیم و تمدن آفریں ثابت ہوئی؟ وہ کس کی آغوش ناز تھی جس میں پرورش پاکر ترقی عالم کا یہ موجودہ سلسلہ یوں دم خم دکھا رہا ہے؟ وہ کونسا خاندان ہے جس سے دنیا کی اس تہذیب کا سلسلہ نسب جا ملتا ہے؟ ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے کہ معدودے چند بادیہ نشین جنہوں نے زمین و آسمان کو ہلا دیا تھا وہ کس زمین کے نشو و نما یافتہ تھے کس کی سرکردگی میں اُن سے یہ کارنامے ظاہر ہوئے؟ کس قانون نے ان سے یہ نظام قائم کرایا؟ کس ضابطہ نے ایک صحرائی اور وحشی زندگی کو یوں مہذب بنا دیا؟ کیا اس کا جواب قرآن! قرآن!! قرآن!!! کے سوا تاریخ عالم کچھ اور دے سکتی ہے۔؟

پھر ہم خود یہ کیا کہے جا رہے ہیں کہ اسلام عروج و ترقی کا حامی نہیں ہے۔ اس کے قوانین کی حکم برداری مانع ترقی و تمدن ہے۔ ہم جب تک احکام اسلام کے جوئے کو اپنی گردن سے نہ اتار پھینکیں اس وقت تک یہ دنیا ہماری نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ جا چکا ہے وہ اسی مجبوری سے کھویا گیا اور جو باقی ہے وہ بھی اسی قفس کی بدولت حوالۂ دستبرد زمانہ ہونے کو ہے وغیرہ۔

اگر یہ صحیح ہے تو اسلامیت نے دنیا پر اس قدر مدت مدید تک اسی قانون الٰہی کے تحت کیسی پرشوکت وعظمت حکومت کی تھی؟ کس طرح سارے عالم میں اپنا اجالا پھیلایا تھا؟ کس طرح تقویم پارینۂ عالم کو شاکر زندگی کا ایک نیا پروگرام دنیا کے سامنے پیش کیا تھا؟ اور کس قوت پر یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ تا قیام دنیا اس کے اصول وضوابط مسلمانوں کی قومی دینی اور دنیوی کے کفیل رہیں گے؟

کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ اسی قرآن حکیم کے ایک شاگرد رشید فاروق اعظمؓ نے اسی قانون وضابطۂ الٰہی کے سامنے زانوے ادب تہہ کر کے اس کے تیس پاروں کی روشنی میں سیاست دانی کا وہ عملی ثبوت دیا تھا جس کی نظیر آج تاریخ میں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتی؟ صرف دس بیس سال کے اندر تعلیم قرآنی کے تحت تاریخ عالم کا الٹ دینا ساری دنیا کو تو انگشت بدندان کر سکتا ہے۔ مگر کیا یہ اندھیر نہیں ہے کہ مسلمانوں کی آنکھیں آج اسے دیکھ بھی نہیں سکتیں؟

دور حاضر کے تمدن اور عہد رواں کی تہذیب نے ایسے کتنے سر رشتے اور صیغے حکمرانی کے بنائے ہیں جن کی داغ بیل حضور فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں نہیں ڈالی تھی۔ سیاست مدن نظم ونسق ملکت قواعد وضوابط سلطنت غرض وہ دستور فاروقی جو آج آپ کی سوانح طیبہ میں بتفصیل موجود ہے کس تعلیم کا نتیجہ تھا؟ کیا وہ اس قرآنی یونیورسٹی کے سوا کسی اور تعلیم گاہ کا رہین منت ہے؟ کیا حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا وہ کسی اور تربیت کا شرمندۂ احسان ہے؟

کیا عزم وثبات اجرت واستقلال فاروقی کے سبق کسی اور معلم سے ملے تھے؟ ایثار وصبر وقومی تعمیر کے درس کیا قرآن کے سوا کسی اور کتاب نے دنیا کو سکھائے تھے؟

البتہ رونا ہے تو اس کا کہ آپ نے قرآن میں ان خزاین السمٰوت والارض کو دیکھا ہی نہیں آپ کا معاملہ تو اس خصوص میں ہے لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا واقع ہوا ہے یعنی دل ودماغ موجود ہیں مگر غور وفکر کا مادہ سلب ہو چکا

ہے۔ کان بھی ہیں آنکھیں بھی ہیں مگر دیکھے اور سنے کون؟

حیرت ہے کہ ہم اپنے دنیا کے کاروبار کے ذرا ذرا سے معاملہ میں اسی دل و دماغ اسی آنکھ کان اور اسی فہم و فراست سے وہ وہ کام لیتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو ہماری عقل و دانش پر رشک ہونے لگتا ہے۔ مگر ان سے کام نہیں لیتے تو اپنے دین و آخرت کے معاملہ میں خاموش ہیں تو تعلیم قرآن کے بارے میں۔

افسوس صد افسوس! آج ہم اس نعمت قرآنی دولت ایمانی ثروت و دجہانی کے ساتھ جس بے اعتنائی کو برت رہے ہیں جس غفلت میں مبتلا ہوگئے ہیں وہ عالم اسلام کا ایک حادثہ عظیم ہے۔ ان آنکھوں کو کہاں تلاش کیجئے جو اس رنج وغم میں اشک ریز ہوں؟ وہ ہاتھ کہاں ملیں گے جو اس ماتم میں سینہ کوبی کے نقشے دکھا سکیں؟ وہ مجلسیں کہاں ہیں جو ضیاع ملت میں صف آرائے عزا ہو سکیں؟ پھر آہ وہ دستِ تدبیر کہاں ہے جو ہماری آنکھوں سے اس پردہ غفلت کو الٹ دے؟ اس طبیب مہربان کا کیا پتہ ہے جو مرہم زخم جراحات جگر ہو سکے؟ وہ کونسا دماغ ہے جس میں اس مرہم سامانی کے لئے کوئی فکر و تردد کا قرینہ ہو وہ ناخن تدبیر کہاں۔ جو گرہ کشائے کار ثابت ہو جائے؟

ہمارے فساد کار کا بھی ایک موجب اور زوال قومی کا بھی واحد باعث ہے کہ ہم نے خدا کی دی ہوئی قرآنی تعلیم کو چھوڑ دیا۔ مگر کیا اس سے کوئی کیونکر انکار کر سکتا ہے کہ جب سے ہم نے اسے چھوڑا ہے زمانہ نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ جب سے ہم نے اس مولیٰ کے کلام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس نے بھی ہم کو بھلا دیا۔

حدیث میں ارشاد ہے کہ ساری عبادتوں سے بہتر عبادت تلاوت قرآن ہے جب کہ وہ نماز میں کھڑے ہو کر کی جائے جناب علیؓ مرتضیٰ فرماتے ہیں۔ جو شخص کھڑا ہو کر نماز میں قرآن پڑھے اس کو ہر حرف کے بدلے سو سو ثواب ملیں گے۔ اور بیٹھکر پڑھنے والے کے لئے ۵۰۔ اور نماز کے سوا باوضو

قرآن پڑھنے والے کو ۲۵ - بے وضو (قرآن کو بلا چھوئے) پڑھنے والے کو دس دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ پھر فرماتے ہیں کہ جب سودا کرنا ہی ہے تو زیادہ نفع کا کیوں نہ کیا جائے۔ حضورؐ والا نے ارشاد فرمایا کوئی فرشتہ یا پیغمبر قیامت کے دن خدا کے ہاں قرآن سے زیادہ شفیع نہیں ہوگا۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا دلوں میں لوہے کی طرح زنگ لگ جاتا ہے۔ صحابۂ کرام نے بادب عرض کیا یا رسول اللہؐ پھر وہ چھوٹنا کس طرح ہے؟ فرمایا عطا ہو قرآن پڑھنے اور موت کو یاد کرنے سے۔

فرمایا جو بندہ تلاوت قرآن میں مصروف ہو کر دعا نہ مانگ سکے خداوند تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اس کو (اس مصروفیت کے طفیل میں) بے مانگے اتنا دوں گا جتنا مانگنے والوں کو نہیں ملتا۔

جب وہ ہادی کونین (صلعم) دنیا سے پردہ فرمانے لگا تو ہمیں یوں وصیت فرمائی تھی۔

ترکت فیکم الواعظین صامتًا وناطقًا الصامت الموت والناطق القرآن (الحدیث)

یعنے میں اپنے پیچھے تم لوگوں میں دو واعظوں کو چھوڑے جا رہا ہوں جن میں ایک خاموش واعظ "موت" اور دوسرا گویا واعظ "قرآن" ہے۔

واعظ خاموش موت کی تو ہم ایک نہیں سنتے حالانکہ اس کے وقت کا کچھ ٹھیک نہیں ہے وہ کہکر نہیں آتی۔ وہ دھوکے سے شکار کھیلتی ہے خلاف توقع جس کو لوگ غلطی سے "بے وقت" کہتے ہیں) آدبوچتی ہے یہ ممکن ہے کہ ابھی آجائے یا شام تک۔ وہ ہم سے بہت قریب بلکہ سر پر سوار ہے مگر ہم اس سے بہت بے خبر اور تغافل شعار ہیں۔ جب تک ہم کسی عزیز قریب کا جنازہ نکلتے نہ دیکھ لیں اس کا کوئی کھٹکا ہی نہیں ہوتا اور جو ہوتا بھی ہے تو چند لمحوں سے زیادہ کا نہیں۔

رہا وہ دوسرا بولتا چالتا واعظ "قرآن" افسوس صد افسوس کہ اس سے ہمارا کوئی علاقہ ہی نہ رہا ہے تو اس کو طاق نسیان کا گلدستہ بنا رکھا ہے وہ تو اس وقت تک مخمل و کمخواب کے غلافوں سے باہر نہیں نکلتا جب تک گھر کے کسی مرنے والے کے سرہانے یاسین خوانی کی ضرورت داعی نہ ہو۔ یا اس کے

سوم وچہلم میں ایصال ثواب کی نہ ٹھیرے۔ یا نورنظر ولخت جگر کی بیماری میں اس کو ہوا دینے اور دم کرنے کی حاجت در پیش نہ ہوجائے یا قرۂ بصر کے دفع آسیب کے لئے کسی آیت کو تعویذ بنانے کی یا کھیعص کا فتیلہ جلانے کی ضرورت نہ پڑ جائے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

غرض کسی وجہ سے کبھی کچھ پڑھ بھی لیا تو معنی ومطلب سے کوئی واسطہ ہوتا ہے نہ غور وتدبر سے کوئی سروکار۔ حالانکہ اس فرمان واجب الاذعان کا نازل فرمانے والا بار بار پکارے جارہا ہے کہ تم اسے سمجھو اور غور کرو کہ اس کے نزول کی غرض محض تمہارا استفادہ اور اصلاح حال ہے۔ اور اسی لئے ہم نے اس کو آسان کردیا ہے پھر کوئی ہے جو اس کو سمجھے اور فائدہ اٹھائے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ اس ارشاد باری کی ہماری نظروں میں کوئی وقعت ہی نہ رہی سارے فساد کی یہی جڑ اور ساری خرابیوں کا یہی ایک سرچشمہ ہے نہ ہم اس سے بے اعتنائی کرتے نہ یہ روز بد دیکھتے۔ آج ترجموں اور تفسیروں کی کمی نہیں ہے۔ کمی ہے تو ہماری توجہ کی۔ کمی ہے خانہ برباد غفلت سے ہمارے بیدار ہونے کی۔ قرآن نے عین نزول کفار کی شان میں فرمایا تھا۔

"اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا" کیا یہ لوگ قرآن کے مطالب پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہیں۔

مگر وائے بدقسمتی کہ یہ سوال آج خود ہم مسلمانوں کے مقابلہ میں ہونے لگا ہے نیرنگی دوران تماشا ہے کیا کر دیا۔ شکر بجالانے کی یہ بھی کوئی حد ہے کہ قلب ماہیت ہی ہو کر رہے (اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ

---(٭)---

قرآن کے اسماء

از جناب ابوالمعالی لئیق احمد صاحب فائق نعمانی۔ نظام آباد

قرآن مجید کی امتیازی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے جتنے نام وحی الٰہی نے رکھے ہیں وہ سب ایک خاص معنوی شان رکھتے ہیں۔ اور اس کے مقصدِ تنزیل اور اس کی تعلیم کی نوعیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ نیز ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس مقدس کلام کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی ضروریات دینی و دنیوی کی تکمیل فرمائی ہے۔ اس جگہ میں قرآن مجید و فرقان حمید کے انہی اسماء کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو خود قرآن میں وارد ہوئے ہیں۔ اور جن میں سے ہر ایک اسم میں اس کتاب کے کسی نہ کسی خاص کمال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۔ سب سے پہلا نام قرآن ہے جس سے یہ پاک کتاب ساری دنیا میں عام طور پر مشہور ہے یہ نام وحی الٰہی کے اندر متعدد مرتبہ آیا ہے:۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ

تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتَابِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ۔

قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَءَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

اِنَّهٗ قُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ۔

نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔

لفظ قرآن قرء سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کے ہیں یعنی اکٹھا کرنا یا ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانا اور چونکہ پڑھنے میں حروف کو ایک دوسرے کے ساتھ ملایا جاتا ہے اس لئے قرء کے معنی پڑھنے کے بھی ہیں۔ اور اس معنی کے لحاظ سے اس کتاب کا نام قرآن فرمایا اور اس پر خود قرآن کریم شاہد ہے کیونکہ سب سے پہلی وحی جس میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا ہے۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ یعنی اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔ پس سب سے پہلا لفظ وحی نبوت کا اِقْرَأْ ہے اور اسی کے مطابق اس پاک وحی کا نام قرآن فرمایا یعنی جو چیز پڑھی جاتی چاہئے۔

مگر قرآن کے معنی اسی حد تک محدود نہیں ہیں۔ لفظ قرآن کے اندر اس کتاب کے ہمیشہ پڑھے جانے کی پیش گوئی بھی ہے کون کہہ سکتا تھا کہ یہ کلام جو آقائے نامدار حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہا ہے دنیا میں ایسی قوت حاصل کریگا کہ ساری دنیا اس کو پڑھے گی اور اسی صورت میں پڑھے گی جس صورت میں وہ نازل ہوا پھر کیسی صفائی سے پیش گوئی آج پوری ہو رہی ہے۔ قرآن کو پڑھے جانے کے لحاظ سے ایک ایسا امتیاز دیا گیا ہے جو کسی اور کتاب کو حاصل نہیں۔ اگر دوسری کتابیں بھی قرآن کی طرح پڑھی جاتیں یا اسی طرح پڑھے جانے کے قابل سمجھی جاتیں تو وہ بھی اسم قرآن کی مستحق ہو جاتیں لیکن خدائے بزرگ و برتر نے اس لفظ کو صرف ایک ہی کتاب کے لئے مخصوص فرمایا ہے اور اسی کو یہ فخر حاصل ہے کہ ساری دنیا میں کوئی کتاب نہیں جو قرآن کے برابر پڑھی جاتی ہو کوئی آبادی ایسی نہیں جو اس کی قرأت سے خالی ہو کوئی ملک کوئی شہر ایسا نہیں جو اس کے پڑھنے والوں سے خالی ہو۔ جب سے قرآن پاک کا نزول ہوا ہے اسی وقت سے اس کو یہ عزت حاصل ہو گئی کہ پڑھے جانے میں اس کی برابری کوئی دوسری کتاب نہ کریگی پس یہ کیسا پر معنی کیسا پر حکمت لفظ ہے جو اس کتاب کے نام کے لئے مخصوص ہوا۔ ایسی عزت تو عالم

ون وفساد میں کسی کتاب کو بھی میسر نہ ہوئی۔

(۲) دوسرا عظیم الشان نام قرآن حکیم کا الکتاب ہے چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدا ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ الٓمٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ یہ نام بھی قرآن حکیم کئی بار آیا ہے اور کتب سے مشتق ہے جس کے معنی لکھنے کے ہیں گویا اس میں اس کے لکھے جانے کی طرف اشارہ تھا چنانچہ جب سے حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول شروع ہوا اسی وقت سے آپ نے اس کے لکھنے کا بھی اہتمام فرمایا بلکہ اس کے لکھنے والوں کے متعلق بھی ایک پیش گوئی ہے۔ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ۔ یعنی اس کے لکھنے والے بڑے بڑے مرتبوں پر پہنچیں گے چنانچہ اس کے اول کاتب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے انسان تھے جن کو صدیق کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ اور جن کو مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت افضل البشر بعد النبی کہتی ہے۔ ان کے علاوہ جس قدر بڑے آدمیوں نے قرآن کریم کی کتابت کی ہے ایسے معزز آدمیوں نے دنیا میں کسی کتاب کی کتابت نہیں کی بڑے بڑے عظیم الشان بادشاہ بھی قرآن حکیم کی کتابت کرتے رہے جیسے عمر بن عبد العزیز۔ نصیر الدین محمود غازی محی الدین اورنگ زیب۔

۳۔ ایک نام قرآن کریم کا الذکر ہے اور بعض جگہ دوسری صورت میں ذکریٰ اور تذکرہ بھی آیا ہے جیسے فرمایا۔ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ ذکر کے معنی عربی زبان میں یاد دلانے اور نام وری اور شرف کے ہیں اول معنی کے لحاظ سے اس نام کے رکھنے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس کی تعلیم ان باتوں کو یاد دلاتی ہے جو انسان کی فطرت کے اندر مستور ہیں گویا اس نام میں اسلام کے فطری مذہب ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے الذکر میں اس کتاب کے شرف و عزت حاصل کرنے اور تمام کتابوں میں سربرآوردہ اور نامور ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ اشارہ بھی ہے کہ اس کو قبول کرنے والے اور اس کی نصائح پر عمل کرنے والے دنیا میں شرف حاصل کریں گے جیسا کہ ایک جگہ

فرمایا وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ۔

۴۔ ایک نام الفرقان ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ فرقان کے معنی فرق کردینے والے کے ہیں اور مراد اس سے یہ ہے کہ یہ کتاب حق و باطل میں فرق کردینے والی ہے۔ اس کی تعلیم ایسی کھلی کھلی ہے کہ حق و باطل میں کھلا کھلا فرق کردیتی ہے اس لئے یوں بھی فرمایا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ دین اسلام میں کوئی جبر و زبردستی نہیں کیونکہ رشد و گمراہی یعنی حق و باطل کھلے کھلے الگ ہوگئے ہیں۔

۵۔ ایک نام الھدیٰ ہے یہ بھی کثرت کے ساتھ قرآن میں آیا ہے چنانچہ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ اور قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ یعنی اے پیغمبران سے کہدو کہ یقیناً اللہ کی ہدایت ہی الھدیٰ ہے۔ یعنی انسان کے لئے حقیقی اور سچی ہدایت قرآن پاک ہے۔ ہدایت سے مراد یہ ہے کہ انسان کو راہ دکھاکر اس کے کمال تک پہونچاتا ہے۔

۶۔ ایک نام التنزیل ہے وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ گویا یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ منجانب اللہ وحی ہے۔

۷۔ ایک نام حکم ہے اور حکیم محکم اور حکمۃ بھی فرمایا۔ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ان اسمار میں یہ اشارہ ہے کہ قرآن کریم مضبوط فیصلے کرتا ہے اور اس کے اندر دانائی اور حکمت کی باتیں ہیں

۸۔ ایک نام الموعظۃ ہے مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ اس میں لوگوں کے لئے وعظ اور نصیحت کی باتیں ہیں۔

۹۔ ایک نام الشفاء ہے هُدًى وَّشِفَاءٌ سارے اخلاقی اور روحانی امراض کا علاج ہے بلکہ ہر ایک بیماری کا علاج ہے جو انسانوں اور قوموں کو تباہ کردیتی ہے۔

۱۰۔ ایک نام الرحمۃ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے۔

(۱۱) ایک نام الخیر ہے یعنی انسان کی کل بھلائی کی باتیں اس کے اندر جمع کر دی ہیں ایسا کہ سراسر بھلائی ہی بھلائی اس میں ہے اور کوئی نقصان پہونچانے والی اور تکلیف پہونچانے والی بات نہیں ہے۔

۱۲۔ ایک نام الروح ہے کَذٰلِكَ اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کو حقیقی زندگی اسی کلام سے ملتی ہے۔

(۱۳) ایک البیان ہے او مبین بھی فرمایا یعنی اس کے اندر ہر ایک ضروری بات کھول کر بیان کر دی گئی ہے اور اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے۔ کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ کوئی بات تشنہ نہیں ہے۔ حق پر جتنے پردے تھے سب ہٹا دیئے گئے ہیں۔

۱۴۔ ایک نام البرہان ہے قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس کے اندر نرے دعوے ہی دعوے نہیں بلکہ دلائل بھی ہیں گویا جس امر کا دعویٰ کیا ہے اس کی دلیل بھی ساتھ ہی دی ہے۔

۱۵۔ ایک نام الحق ہے یعنی سچائی گویا سب سچائیاں اس کے اندر ہیں اور جو کچھ اس کے اندر ہے سب حق ہے الحق نام میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دنیا میں مضبوط پاؤں جمائے گی اور کوئی چیز اسے اکھیڑ نہیں سکتی۔

۱۶۔ ایک نام القیم ہے یعنی قائم رکھنے والی۔ درحقیقت اسی کے ذریعہ سے دنیا کا قیام ہے کیونکہ اگر اس کے ذریعہ سے دنیا میں روشنی پھیلتی تو دنیا تباہ ہو جاتی پھر یہ صداقت کو بھی قائم رکھتی ہے اور ہر ایک انسان کو بھی سیدھی راہ پر قائم رکھتی ہے اس کے اندر کوئی ٹیڑھا پن نہیں ہے۔

۱۷۔ ایک نام المهیمن ہے یعنی حفاظت کرنے والی وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتٰبَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ یعنی کل سابقہ کتابوں کی جو اس سے پہلے آچکیں حفاظت کرنے والی ہے ہر ایک صداقت جو ان کتابوں میں اس قابل تھی کہ اسے باقی رکھا جائے اس کی حفاظت قرآن حکیم نے کر دی۔

۱۸۔ ایک نام المبارک ہے جس کے معنے ہیں کثیر خیر والا پر برکت یعنی وہ برکت جو کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ جہاں توریت اور انجیل کے ذکر کے ساتھ قرآن کریم کا ذکر کیا ہے وہاں کوئی ایسا لفظ بھی بڑھایا ہے یہ بتلانے کے لئے کہ اس کتاب کی خیر و برکت ہمیشہ تک ہے پہلی کتابوں کی طرح منقطع نہ ہو جائیگی۔

۱۹۔ ایک نام حبل اللہ ہے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا۔ یعنی یہ اللہ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے کیونکہ حبل کے معنی ذریعہ کے ہیں۔

۲۰۔ ایک نام اس کا مصدق بھی ہے کیونکہ دنیا میں یہی ایک کتاب ہے جس نے دنیا کے سارے نبیوں کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔

۲۱۔ ایک نام اس کا النور بھی ہے وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا نور وہ چیز ہے جس سے امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی جو روشنی ڈالی اس نے سب چیزوں میں امتیاز کر دیا۔ کھرا کھوٹا۔ کامل ناقص۔ بھلا برا۔ نیک و بد۔ ضلالت و ہدایت۔ نور ظلمت سب الگ الگ نظر آگئے اور یہ وہ نور ہے جس نے دنیا کی ساری تاریکیوں کو دور کیا۔

شرک کی ظلمت۔ توہمات کی ظلمت۔ بت پرستی کی ظلمت۔ انسان پرستی کی ظلمت۔ حرص و ہوا کی ظلمت رسم و رواج کی ظلمت۔ غرض سب ظلمتوں کے پردے چاک کر دیے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی اسماء قرآن کریم کے آئے ہیں۔ بسر دست اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے ان اسماء سے بھی ظاہر ہے کہ کس طرح خدائے بزرگ و برتر نے اس کتاب پاک کے مختلف نام رکھکر یہ بتا دیا ہے کہ ہر ایک قسم کی ضرورت اس کے اندر پوری کر دی گئی۔

اگر ایک طرف اَكْمَلْتُ کا دعوی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ سے دین کو ہم نے کامل کر دیا تو دوسری طرف اس کے کمال کے مختلف پہلوؤں کو بھی مختلف اسماء میں ظاہر کر دیا ہے۔

حقیقت شرک

(از)

از جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز (ہوم ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی)

کرسمس کی تعطیلات میں میں دہلی سے پنجاب کیطرف جارہا تھا۔ جاڑے کی شدت۔ رات کا سفر۔ منہ سر لپیٹے اوپر کے تختے پر لیٹا ہوا تھا۔ کچھ تو غنودگی اور کچھ برق رفتار فرنٹیر میل کا شور۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد کوئی اسٹیشن قریب آیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے سے شور میں قدرے تخفیف ہوی تو یہ آواز میرے کان میں آئی۔

"تو حضرت! اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ اللہ میاں بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کا نام لیوا کسی اور کا نام بھی لے"۔

"بیشک۔ میاں! کیا تم نے دنیا کے بادشاہوں کو نہیں دیکھا۔ ایک کی رعایا کسی اور کا خیال دل میں لائے۔ گردن اڑا دی جاتی ہے یا نہیں!"

"قبلہ معاف رکھئے۔ یہ تو انسانی جذبات ہیں جنھیں اللہ میاں سے منسوب کرنا کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا"

"لاحول ولا قوۃ......

گاڑی رکنے کے جھٹکے سے یہ آخری جملہ پورا نہ ہو سکا۔ میں نے اٹھکر لحاف سے منہ باہر نکالا۔ دیکھتا ہوں تو معترض صاحب ایک نوجوان انگریزی لباس پہنے ہوے ہیں۔ اور مجیب صاحب ایک پرانی وضع کے متشرع بزرگ ہر دو حضرات اسی اسٹیشن پر اتر گئے۔

وہ تو اس بحث کو یوں ادہورا چھوڑ کر چل دیے اور میرے لئے۔ بقول علامہ اقبال۔

دکھلاکے اک جھلک وہ تو پردے میں چھپ گئے
اور کہہ گئے نگاہ سے ڈھونڈا کرے کوئی

باقی ماندہ سفر کے زادراہ کا سامان فراہم کر گئے۔

میں نے گردوپیش نظر دوڑائی تو دیکھا کہ اجتناب شرک کے لئے عام طور پر وہی توحید پیش کی جاتی ہے جو ان بزرگ صاحب نے اپنے جواب میں پیش کی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ایک شرک پر ہی کیا موقوف ہے۔ ذہن انسانی کی افتاد ہی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ ماورا سرحد ادراک کو بھی کھینچ تان کر محسوسات کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کی چشم نظارہ جو حقیقت مستور کو لباس مجاز میں دیکھنے کی اس قدر متمنی ہو کہ وہ اس تصور کے بغیر جبین نیاز کے سجدہ ہائے بیتاب کو اذن نقوش آرائی ہی نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کو جو اپنی صفات لم یزلی سے متعارف کیا تو لامحالہ زبان بھی انسانوں کی ہی استعمال میں آئی اس لئے کہ خدا اور عام انسانوں کے درمیان اور کوئی ذریعہ فہم وتفہیم نہیں ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ محسوسات کا خوگر ذہن انسانی فوراً انسانوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور اس غلو وشدت سے کہ تنزیہ وتجسیم کی لامتناہی بحثیں معرض وجود میں آگئیں اور لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ اور سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ کی لم نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو مالک الملک قرار دیکر زمینوں اور آسمانوں کی بادشاہت کو جو اپنے اور صرف اپنے لئے مخصوص فرمایا تو انسانی ذہن نے اللہ میاں کا تصور ایک مطلق العنان۔ خودمختار بادشاہ کا سامنے لاکھڑا کیا۔ اور اس کی سطوت وجبروت اور شوکت وعظمت کو بھی کچھ ایسا ہی رنگ دیا گیا۔ اور اسی لئے یہ بھی قرار پا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو من دون اللہ کی غلامی سے منع فرمایا ہے، اور اس شد ومد سے اس کے لئے وعید فرمائی ہے۔ اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح وہ ذات ایزدمتعال بھی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کا نام لینے والا کسی اور کا خیال بھی دل میں لائے" حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کی قوت واستیلا کا راز اس جماعت کی قوت بازو میں مضمر ہوتا ہے جو اس بادشاہ کو اپنا بادشاہ

سمجھتی ہے۔ اور اس کی سلطنت کی نشاء وبقا منحصر ہوتی ہے اس جماعت کی قلت وکثرت پر۔ اس لئے اس کو ہر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا ہے کہ اس کی رعایا میں سے کسی کے دماغ میں کسی اور بادشاہ کا خیال نہ آجائے لیکن اس کے برخلاف اس مالک حقیقی اس احکم الحاکمین کی حکومت وسلوت انسانی دست وبازو کی رہین منت نہیں۔ اگر تمام دنیا کے انسان اس کی درگاہ صمدیت میں انقیاد واطاعت گذاری کے طوق گردنوں میں ڈالکر سر نیاز کو خم کردیں تو اس کی ازلی وابدی سلطنت میں ایک ذرہ کا اضافہ نہیں ہو سکتا اور اگر تمام دنیا کے انسان اپنی اوندھی کھوپڑی کے تتبع کی بدولت اس بارگاہ بے نیاز سے سرکشی و تمرد اختیار کرکے راندۂ درگاہ ہوجائیں۔ تو اس کی حکومت میں ایک ذرہ بھر کی کمی نہیں آسکتی۔ اس کے ایوان سلطنت کی تحسین وتزئین میں کسی کے قشقۂ جبین کی سرخی سے کچھ رنگینی نہیں بڑھ سکتی اور سجود نیاز کی قلت سے اس کے سنگ آستان کی درخشندگی میں کچھ کمی نہیں واقع ہوسکتی۔ اس لئے کہ وہ اس وقت بھی بایں ہمہ جبروت وسلوت مالک ملک تھا۔ جبکہ کوئی اس کا نام لینے والا مخلوق نہ ہوا تھا۔ اور اس کی سلطنت اس وقت بھی اسی شان وشوکت سے باقی رہے گی۔ جبکہ اسے پوجنے والا کوئی انسان باقی نہ رہے گا۔

وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

اس نے انسانوں کو اگر اپنی غلامی (عبودیت) کا حکم دیا ہے تو اس لئے نہیں کہ اس سے اس کی قوت واستیلاء میں اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ محض اس لئے کہ اس میں خود انسانوں کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔ اسلام نے تمام عبادات کی لِم اسے قرار دیا ہے کہ۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا (جاثیہ ۱۵) جس نے نیک عمل کیا تو اپنے لئے کیا۔ اور اگر برا کام کیا تو اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۔ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (لقمان)

جس نے شکر کیا اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کے لئے ہے اور جس نے (اس کے آگے سر نیاز خم ہونے سے) انکار کیا (تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑ سکتا) وہ تو بے نیاز اور بلند و بالا تر ذات ہے۔

گویا افعال جوارح یا اعمال قلوب سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع یا نقصان مقصود نہیں وہ ذات انسانی اعمال کے نتائج سے بے نیاز ہے۔ ان کے نتائج تو خود انسان کی ذات کے لئے ہیں۔ دنیاوی بادشاہوں کی طرح وہ انسانی عبادت گذاریوں کا محتاج۔ اور اس کے لئے ممنون احسان نہیں اس نے تو نبی کریم سے فرما دیا کہ:۔

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ـ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ ـ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ـ (حجرات ۱۷)

یہ لوگ احسان دھرتے ہیں کہ اسلام قبول کر لیا؟ حالانکہ در اصل اللہ تم پر احسان کرتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی طرف رہنمائی کی (اس کا تم اقرار کرو گے) اگر تم سچے ہو۔

جب اسلام کے نزدیک تمام عبادات کی یہی لم ہے۔ تو عقیدہ توحید (جو فی الحقیقت قلب کی ایک اساسی عبادت ہے) بھی اسی اصول پر مبنی ہوگا۔ اس کا راز ہمیں انسانی خلقت کے اندر ملے گا۔

قرآن کریم نے تخلیق آدم کا مقصد ہی تفویض خلافت و نیابت الٰہی قرار دیا ہے۔ یعنی انسان پیدا ہی اس غرض سے کیا گیا ہے کہ وہ تمام مخلوقات ارضی و سماوی سے خدمت لے اور اس کائنات پر اپنے آقا کے مقرر کردہ قوانین کے ماتحت حکومت کرے۔ اس کی شہادت میں قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ کہیں لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ سے اس کی عزت و تکریم کی طرف اشارہ ہے اور کہیں وَفَضَّلْنٰهُمْ تَفْضِيْلًا سے اس کی فضیلت و بزرگی کا اظہار مقصود ہے۔ کسی جگہ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ کہا جا کر اس کی حکومت کی شہادت دی گئی ہے اور کہیں اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جَمِيعًا آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے۔ اس کو تمہارے تابع فرمان کردیا ہے۔ (۴۵: ۱۲)

اب ظاہر ہے کہ انسان اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے سرنیاز جھکا کر اپنے تذلل و تعبد کا ثبوت دیگا تو وہ یا تو کوئی دوسرا انسان ہوگا یا ماوراء الانسان کوئی اور مخلوق جملہ مخلوقات کے متعلق تو خالق حقیقی کا یہ ارشاد ہمارے سامنے موجود ہے کہ وہ پیدا ہی اس لئے کی گئی ہیں کہ انسان ان سے خدمت لے۔ تو جو چیزیں کسی کی خادم پیدا کیگئی ہوں انھیں مخدوم بنا لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اب رہے دوسرے انسان، تو پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ سو اپنے برابر کے سامنے جھکنا یہ انسانی خودداری کے منافی ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ انسانی عبودیت کے اظہار کے لئے اگر کوئی ہستی ہو سکتی ہے تو وہ تمام مخلوقات سے بلند و بالا حتیٰ کہ انسانوں سے بھی اعلیٰ و ارفع ہستی ہونی چاہئے اور یہی وہ ہستی ہو سکتی ہے جس کی غلامی کا طوق انسانوں کے لئے موجب ذلت و رسوائی نہیں بلکہ باعث صد شرف و افتخار ہے۔ وہ ہستی جس کے ایک ارادہ سے تمام مخلوقات عدم سے وجود میں آجائے اور جس کی مشیت کے ماتحت تمام موجودات عدم میں تبدیل ہو جائے جو نیست سے ہست اور ہست سے نیست کرنے پر قادر ہو نہ کہ وہ جو خود اپنی فنا و بقا میں کسی دوسرے کے دست قدرت کی محتاج ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ هَلْ مِن شُرَكَائِكُم مَّن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ قُلِ اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۔ (یونس ۳۴) پوچھئے ان سے کہ جن کو تم اللہ کا شریک بناتے ہو ان میں سے کوئی ہے جو خلقت کو عدم سے وجود میں لائے اور مارنے کے بعد پھر زندہ کر سکے؟ خلقت کے مبدا و معاد کا اگر اختیار ہے تو صرف اللہ کو ہے

انسان فطرۃً خوددار پیدا کیا گیا ہے لیکن اگر دنیا میں یہ اپنی خودداری کو بیچتا ہے تو صرف دو چیزوں کے لئے ایک جلب منفعت اور دوسرے دفع مضرت اسباب و واقعات کا تجزیہ کرتے چلے جاؤ لیکن انسانی

خود واریوں کی شکست کے لیے یہی دو خوفناک چٹانیں نظر آئیں گی۔ خوف یا امید۔ تاریخ کے صفحات کو الٹتے جاؤ جہاں کہیں انسان نے انسان کے سامنے یا دیگر مخلوقات کے حضور اپنا سر جھکایا ہے۔ انہی دو متناطیسی کششوں کی بدولت۔ اپنے اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں تک نگاہ کو لے جاؤ (کہ فی انفسکم افلا تبصرون)۔ جس بچہ پہ شیر نیستاں، روباہ مزاج ہوتا ہے وہیں یہ دونوں مہیب و خوفناک غار نظر آئیں گے۔

لیکن اگر لغزش کے یہی دونوں مقام تمام سطح ارض و سما سے کہیں اوپر لے جاکر رکھ دیے جائیں تو پھر انسانی سرفرازیوں کی وسعت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ (یونس ۱۸)

وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی پوجا کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔

لیجئے ۔۔۔ تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہوگئے۔

مخلوقات محکوم۔ اور انسان برابر کا۔ ضرر رسانی و منفعت بخشی کی کس میں طاقت ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ۔ (سبا ۴۴)

کہیے ان لوگوں سے کہ خدا کے سوا جن کو تم معبود سمجھ رہے ہو ان کو پکار دیکھو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ بھر چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں۔

یہی وہ چیز تھی کہ توحید کے واعظ اول حضرت خلیل اکبر علیہ السلام کو جب ان کی قوم نے کہا تم ان بتوں کی اصلاح تکذیب کرتے ہو۔ ان کے جلال سے ڈرو تو اس ثنا سائے اسرار حقیقت نے بے خوف و خطر کہہ دیا کہ

كَيْفَ اَخَافُ مَا اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ

جن چیزوں کو تم خدا کا شریک بناتے ہو ان سے میں کیسے ڈروں؟ حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک کیا ہے جن کی شرکت کی

بِهٖ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (انعام ۔ ۸۲) اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری ڈرنا تو تم کو چاہئے جو خدا کے ساتھ اوروں کو شریک بناکر ایک ایک چیز سے خوف کھاتے ہو اگر تم کچھ عقل و شعور رکھتے ہو تو خود ہی سوچو کہ ہم دونوں میں سے کون بے خوف ہونے کا زیادہ حقدار ہے ۔

یعنی وہ جو ان تمام چیزوں سے ڈرتا پھرے جو کچھ نفع و نقصان نہیں پہونچا سکتیں ۔ یا وہ جو صرف ایک ذاتِ مطلق کا خوف دل میں رکھکر تمام دنیا کے خوف و خطر سے بے نیاز ہو جائے ۔

اقوام گذشتہ و ملل سابقہ کے احوال سامنے لانے سے خود معلوم ہو جائے گا کہ جن قوموں نے عناصر طبعی کو اپنا خدا بنائے رکھا ۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکیں ۔

اندرا اگنی ۔ وائیو کے پجاریوں کو دیکھئے مادی ترقیوں میں کہیں پیش پیش نظر نہیں آئیں گے ۔ اور مخلوقات سے آگے بڑھکر جنھوں نے انسانوں کو اپنا معبود بنالیا ان کی روحیں کبھی آزادی کی اس فضاے بسیط میں نہیں اڑ سکیں جو ان کا حقیقی نشیمن و مسکن تھا ۔ اس لئے کہ افراد کے اعمال کی طرح اقوام کے اعمال بھی ویسے ہی نتائج پیدا کیا کرتے ہیں ۔ اور ان کا جائزہ بھی اس طرح ہی لیا جایا کرتا ہے ۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے لِیَجْزِیَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۔ اور ہر قوم کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ ملے گا اور ہر ملت كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ (جاثیہ ۱۴) اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی ۔

اس لئے ایک توحید پرست کے لئے اس قدر شاندار الفاظ میں پیش گوئی کر دی گئی کہ اِنَّا كَفَیْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِیْنَ الَّذِیْنَ یَجْعَلُوْنَ ان مذاق اڑانے والوں یعنے ان لوگوں پر جنھوں نے مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (حجر ۹۵-۹۶) خدا کے ساتھ اوروں کو بھی معبود بنا رکھا ہے ہم آپکو یقیناً غلبہ دیں گے ۔ اور یہ عنقریب خود دیکھ لیں گے ۔

قرآنی عقاید کا مفہوم ہی یہی ہے کہ قلب مومن سے خوف و ہراس ۔ امید و بیم کے تمام مزعومہ خطرات دور ہو جائیں ۔ وہ دنیا میں کسی گوشہ کو اپنی آرزؤں کا کعبۂ مقصود اور کسی جائے پناہ کو اپنا مامن

لجانہ بنائے۔ وہ ایک کاہو کر (جو فی الحقیقت اس کا سزاوار ہے کہ خوف و امید کے حالتوں میں انسانی قلوب کا مرجع و ماوٰی بن سکے) تمام دنیا سے بے نیاز ہو جائے۔ اس نے خوف و حزن دور کرنے کے لئے افواج قاہرہ کے اجتماع اور بروج مشیدہ کی تعمیر کو ہی کافی نہیں سمجھا کیونکہ یہ تمام مادی جسم انسانی کی حفاظت کر سکتے ہیں بلکہ ان اسباب کو ثانوی چیز قرار دیا۔ اور اولین ضرورت اس قلب کی حفاظت کی سمجھی کہ جس کے بدل جانے سے ہر ایک چیز کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اس نے فرمایا کہ

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (۳: ۱۳۳) ہمت نہ ہارو اور رنج نہ کرو تمہیں دنیا میں سب سے بلند تر ہو بشرطیکہ (اپنے دل کو خوف من دون اللہ سے پاک کر کے) صاحب ایمان ہو جاؤ۔

اسلام نے دنیا سے جسمانی غلامی کی زنجیروں کو ہی نیست و نابود نہیں کیا بلکہ ذہنی غلامی کے طوق و سلاسل کو بھی کاٹ کر دور پھینک دیا کہ جس میں نسل انسانی مختلف النوع طریقوں سے گرفتار ہو کر اس فضیلت انسانی کو کھو بیٹھی تھی جو ان کے لئے مایہ امتیاز قرار دی گئی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے جس کی رگ و پے میں غلامی سرایت کر چکی تھی۔ دین و دنیا کی صلاح و سرخروئی کی دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فلاح کا وعدہ تو یقینی ہے بشرطیکہ یہ اس نبی امی صلعم کی پیروی کریں جس کی بعثت مبارک کا مقصد منجملہ دیگر مقاصد عالیہ یہ ہے کہ:—

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (اعراف ۱۵۷) وہ پاکیزہ چیزیں ان کے لئے حلال کرے گا اور ناپاک خبائث سے انہیں منع کرے گا۔ اور وہ بوجھ اور زنجیریں جن میں یہ جکڑے ہوئے ہوں گے ان سے انہیں نجات دلائے گا

چنانچہ بعثت نبوی صلعم کے وقت یہود و نصاریٰ کی یہ حالت تھی کہ ان کے احبار و رھبان ان کے دل و دماغ پر اس طرح چھا رہے تھے کہ ان کی اپنی ذہنیتیں بالکل مفلوج ہو کے رہ گئی تھیں۔ قرآن کریم نے صاف

صاف بیان فرما دیا کہ ان مذہبی رہنماؤں کو تم نے اس طرح سے خدا بنا رکھا ہے۔ یہ صریحاً شرک ہے۔ انھوں نے تمہارے دماغوں پر جو بیجا تسلط جما رکھا ہے یہ محض ان کے ذاتی مفاد کے لئے حیل و مکائد ہیں۔ ان کو الگ کر کے پھینک دو تاکہ تمہاری روحیں نشوونما پا سکیں۔ اور آزادی کی فضا میں سانس لے کر اپنے اندر قوت تمیز پیدا کر سکیں۔

اسلام اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے خالص توحید الہی کا ایک ایسا بلند مطمح نگاہ سامنے رکھا کہ اس سے قبل دنیا کے کسی گوشہ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے۔ یا دیگر مخلوقات کی عبودیت سے ہی نجات دلائی ہو۔ بلکہ اس نے تو انسان کو خود اپنی خواہشات کا تابع بھی نہیں ہونے دیا۔ فرمایا۔

أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰىهُ (۲ جاثیہ) کیا تم نے اس (راہ گم کردہ) کو بھی دیکھا کہ جس نے خود اپنی خواہشات کو ہی اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ اللہ اکبر اسلام نے کس قدر بلند مقصد پیش نظر رکھا ہے اور غلامی و تعبد کی کس قدر باریک سے باریک اور غیر مرئی و غیر محسوس زنجیروں کو کاٹ کے پھینک دیا ہے گویا دوسروں کی ہوائے نفس کا اتباع تو ایک طرف خود اپنے نفس کی خواہشات کا غلام بننا بھی شرک قرار دیدیا۔ اور اپنے تمام ارادوں اور خواہشوں کو اس بزرگ و بالاتر ہستی کی مشیئت و مرضات کے تحت کر دیا کہ جسے "خداوند" ہونے کا بجا حق حاصل ہے۔ گویا عبد مومن کا جو قدم دنیا میں اٹھتا ہے یا اس کے دل میں جو ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ کسی مخلوق کے لئے کسی انسان کے لئے حتیٰ کہ خود اپنے لئے بھی نہیں۔ بلکہ وہ اس خدا کے لئے ہوتا ہے جس کا یہ اپنے آپ کو بندہ کہتا ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ۔ (۶ : ۱۶۳)	کہدیجئے کہ میری نماز میری قربانی میری زندگی میری موت سب اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے ہے جو تمام عالموں کا پروردگار ہے۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے

اور میں سب سے پہلا اطاعت شعار بندہ ہوں" اور اگر اس کے ارادے ۔ اس کے اعمال اس مطمع نظر کے خلاف ہیں تو وہ مشرک ہے ۔ توحید نہیں ۔

رہ مدہ اقبال را در کعبہ اے شیخ حرم   ہر زمان در آستیں دارد خداوندِ دگر

آج وہ قومیں جو مادی ترقی میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں اسی خوفناک غلطی کی وجہ سے کہ انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے ۔ ایسے دردناک عذاب میں مبتلا ہیں کہ انہیں ایک لمحے کے لئے بھی اطمینان قلب نصیب نہیں ہے ۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ (۱۰۴)   اللہ کی وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں ۔

یہ ہے وہ شرک کہ جس سے اسلام نے اس شدت سے منع فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی گناہ ہو بھی نہیں سکتا قرآن حکیم نے اس تمام تفصیل کو ایک لفظ کے اندر بند کر کے رکھ دیا ہے فرمایا کہ

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان ۱۴)   درحقیقت شرک بہت بڑا ظلم ہے ۔

ظلم کے اصلی معنی ہیں تصرف شئ فی غیر محلہ ۔ یعنی کسی چیز کا بے محل و بیجا استعمال ۔ شرک کو ظلم عظیم اس لئے کہا کہ انسانی تخلیق کا مقصد تو یہ تھا کہ انسان تمام موجوداتِ عالم پر حکمرانی کرے اور ایک خدا کا نائب اور بندہ ہو کر اس کی مخلوقات سے خدمت لے ۔ تو جو سر حکومت و سرفرازی کے لئے بنایا گیا ہو وہ اگر محکوم کے آگے جھکنے لگ جائے تو اس سے بڑھ کر اس سر کا بے جا و بے محل استعمال اور کیا ہو سکتا ہے ؟ شرک سے اجتناب کا مقصد یہ نہیں کہ اگر غیر خدا کو خدا کا شریک بنا دیا جائے گا ۔ تو اس سے خدا کی خدائی میں ضعف پیدا ہو جانے کا احتمال ہے ۔ بلکہ یہ ہے کہ غیر خدا کے سامنے جھکنا تخلیق انسانی کے مقصد کے خلاف ہے اور اس سے انسانی خودی کی شکست لازم آتی ہے ۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۚ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ (۹۵) ۔   ہم نے تو انسان کو سب مخلوقات سے بہتر پیدا کیا ۔ اور بدبخت اپنے اعمال کی بدولت ذلیل سے ذلیل بننے کی کوشش کرتا رہتا ہے

مذاکرۂ علمیہ

مسئلہ جبر و قدر

(۳)

نظریہ کی حدتک یہ بات معقول ہے لیکن اصلی دقت یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے ہم انسان کے کردار میں فطرت اصلیہ، خارجی احوال اور غیر مقدر اختیار کے حصے الگ الگ متعین کرسکیں، اگر ہم اپنے اخلاقی احکام کو صرف تیسرے حصے کی حدتک محدود رکھیں اگر اخلاقی قدر وقیمت کا انحصار صرف اسی عنصر کی مقدار پر ہو تو ہمارے لئے کسی شخص کے متعلق نیک یا بد ہونے کا حکم لگانا قطعاً ناممکن ہے کہ کسی آلہ سے ناپ کر کسی ترازو سے تول کر کسی طریق تحلیل سے تجزیہ کرکے ہم یہ معلوم نہیں کرسکتے کہ ایک نیک آدمی کس حدتک پیدائشی نیک ہے کس حدتک احول کا بنایا ہوا نیک ہے، اور کس حدتک اپنے غیر مقدر اختیار کی بنا پر نیک ہے اور ایک برا آدمی کہاں تک مجبوراً برا ہے، اور کہاں تک بالارادہ و بالاختیار برا۔ پس قدریت کے اس نظریہ کو تسلیم کرنے سے ہمارے تمام اخاقی احکام معطل ہوجاتے ہیں۔ اور صرف اخلاقی احکام ہی نہیں، بلکہ اس کے بعد تو ضروری ہوجاتا ہے کہ ہم اپنے تعزیری قوانین منسوخ کردیں، اپنی عدالتوں کو برخاست کریں اور جیل خانوں کو توڑ دیں کیونکہ جن مجرموں کو ہم پکڑتے ہیں، اور جن پر ہمارے جج سزا کے فیصلے صادر کرتے ہیں، اور جن کو ہم جیلخانوں میں ٹھونس دیتے ہیں، ان کے متعلق ہمارے بڑے سے بڑے فاضل جج کو بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے جرم میں ان کے اپنے غیر مقدر اختیار کا کس حدتک دخل ہوتا ہے اور جب یہ بنیادی چیز غیر معلوم ہے، تو کسی طرح ممکن نہیں کہ سزا کی مقدار، مجرم کے اختیار کی مقدار کے مطابق ہو۔

اس مرحلہ پر قدریت ایک ایسی سرزمین میں پہنچ جاتی ہے جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ وہ راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کرے، مگر چند قدم بھی ٹھوکروں اور لغزشوں سے بچ کر نہیں چل سکتی۔ آخر وہ پلٹ کر جبریت سے کہتی ہے کہ اگر تیرے نظریہ سے اخلاقی احکام معطل ہو جاتے ہیں۔ اور عدالت کا نظام نہیں چل سکتا، تو یہی بلکہ اس سے زیادہ برا نتیجہ تیرے نظریہ سے بھی حاصل ہوتا ہے تیرے نظریہ کی رو سے تو انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار ہی نہیں ہے پھر حسن و قبح کے احکام کس بنا پر؟ مدح و ذم کس چیز کی؟ سزا و تعزیر کے فیصلے کس وجہ سے؟ ایک غیر ذمہ دار آدمی کا نیک یا بد ہونا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا مریض یا تندرست ہونا۔ پھر جب ایک شخص کو اس بنا پر سزا نہیں دی جاتی کہ اسے بخار کیوں ہے، تو ایک دوسرے شخص کو اس بنا پر کیوں سزا دی جائے کہ اس نے چوری کیوں کی؟

اس سوال کا جبریت کے پاس بھی کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وہ کہہ سکتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر عمل اپنے کچھ قدرتی نتائج رکھتا ہے جس طرح بیماری کا طبعی نتیجہ تکلیف ہے اور تندرستی کا طبعی نتیجہ لذت و راحت۔ اسی طرح نیک چلنی کا طبعی نتیجہ مدح اور انعام ہے۔ اور بدچلنی کا طبعی نتیجہ ذم اور سزا۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ کا جل جانا ضروری ہے۔ اسی طرح جرم کرنے سے کسی نہ کسی طرح کی سزا پانا بھی ضروری ہے خواہ آدمی پر اس فعل کی کچھ ذمہ داری نہ ہو لیکن یہ جواب صرف اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم انسان کو ایک عقلی و نفسی وجود کے بجائے محض ایک مادی وجود تسلیم کر لیں، اور یہ مان لیں کہ انسان میں عقل، نفس، روح کوئی چیز نہیں ہے صرف طبیعت ہے جو ایک لگے بندھے قانون کے مطابق کام کئے جا رہی ہے اور انسان اسی طرح اس کے زیر اثر ہے جس طرح درخت، دریا، پہاڑ، اور دوسری موجودات ہیں۔ مگر انسانی زندگی کے مظاہر کی یہ میکانکی تعلیل کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ اس کے براہین (جن پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے) انتہا درجہ کمزور ہیں، اور اس کے تسلیم کر لینے کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ قانون، اخلاق، مذہب سب بے قدر و قیمت ہو جائیں اور خود انسان بحیثیت انسان ہونے کے دوسری موجودات کے مقابلہ میں کسی شرف عقلی و نفسی کا حامل نہ رہے۔

اخلاقیات کی ناکامی اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ علم الاخلاق جبریت اور قدریت کے درمیان فیصلہ کرنے میں ناکام رہا ہے، اور خالص اخلاقی دلائل و شواہد سے ہم کو قطعی طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انسانی سیرت و کردار کے متعلق جبری نظریہ درست ہے یا قدری نظریہ؟ جتنے قوی دلائل انسان کو ذمہ دار اور فاعل مختار قرار دینے کے حق میں ہیں۔ قریب قریب اتنے ہی زبردست دلائل اس کو غیر ذمہ دار اور قطعاً بے اختیار قرار دینے کے حق میں بھی ہیں۔

اب اس مسئلہ کا آخری پہلو باقی رہ گیا ہے، اور وہ دینی پہلو ہے۔

دینی نقطۂ نظر دینیات میں یہ مسئلہ قریب قریب اسی حیثیت سے آتا ہے جس حیثیت سے فلسفہ میں اس پر بحث کی گئی ہے، مگر یہاں مشکلات اس سے بہت زیادہ ہیں۔ فلسفہ کی نظر تو صرف امور ماورائے طبیعت پر ہے، اور انسان کی عملی زندگی سے اس کو وہ تعلق نہیں ہے جو حکمت عملی یا اخلاقیات کو ہے مگر دینیات نے کسی نہ کسی طرح سے حکمت عملی اور امور ماورائے طبیعت دونوں پر نظر کی ہے، اور اپنی تعلیمات میں دونوں کو جمع کیا ہے۔ ایک طرف تو ادیان نے انسان کو اوامر و نواہی کا مخاطب ٹھیرایا ہے، اور طاعت پر جزا اور عصیان پر سزا کے مترتب ہونے کا قانون پیش کیا ہے جس کے لئے انسان کا اپنے اعمال میں ذمہ دار اور کسی نہ کسی حد تک مختار ہونا ضروری ہے۔ اور دوسری طرف وہ ایک ایسی ہالاتر ہستی یا ایک ایسے بالاتر قانون کا تصور بھی پیش کرتے ہیں۔ جو انسان سمیت تمام کائنات کو محیط ہے، اور جس کی گرفت میں سارا عالم کون و فساد جکڑا ہوا ہے۔ پس دینیات میں یہ مسئلہ، فلسفہ طبیعیات، اور اخلاقیات، تینوں سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ یہ تینوں تو معاملہ کے محض کسی ایک پہلو کا اثبات کرتے ہیں، اور دوسرے پہلو کو اس کے موافق کرنے کی خاطر توڑنے مروڑنے کے لئے آزاد ہیں۔ لیکن مذہب بیک وقت دونوں کا اثبات کرتا ہے اور وہ اپنے اس طریقہ کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کے لئے مجبور ہے کہ ان دونوں متعارض باتوں میں موافقت کی کوئی متوسط صورت نکالے۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے کہ دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس مشکل کو حل کرنے کی کیا صورت

اختیار کی ہے کیونکہ مجھ سے سوال صرف اسلام کے متعلق کیا گیا ہے، اور اختصار کی خاطر بھی یہ ضروری ہے کہ میں اپنی بحث کو صرف اسی کی حد تک محدود رکھوں۔

صحیح اسلامی مسلک جن مسائل کا تعلق امور ماوراء الطبیعت سے ہے۔ ان کے بارے میں اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہے کہ جس چیز کا جاننا اور جس حد تک جاننا ضروری تھا وہ اللہ اور اس کے رسول نے بتا دی ہے اس سے زیادہ کا کھوج لگانا، اور ایسی باتوں میں خوض کرنا جن کے متعلق یقینی معلومات حاصل کرنے، یا جن کی کنہ کو سمجھنے کے ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں، اور جن کے جاننے سے ہمکو کسی قسم کا نقصان بھی نہیں ہے، لاحاصل بھی ہے، اور خطرناک بھی۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو جن کو اگر تم پر ظاہر کیا جائے تو تم کو برا معلوم ہو۔ (۵: ۱۰۱) اور اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (جو کچھ رسول نے تم کو دے دیا ہے وہ لے لو اور جس سے منع کیا ہے اس سے باز آجاؤ ۵۹: ۷)

اور اسی لئے احادیث نبوی میں کثرت سوال اور فضول باتوں میں تکلف کرنے کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِنَّ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ[1] (آدمی کے اسلام کی بہتری اس میں ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے)۔

یہ تقدیر کا مسئلہ بھی من جملہ انہی مسائل کے ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید فرمائی ہے کہ اس مسئلہ میں بحث کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ ایک مرتبہ صحابہ آپس میں اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے اتنے میں آنحضرت تشریف لے آئے اور یہ باتیں سن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کیا انہی باتوں کا تم کو حکم دیا گیا ہے؟ کیا اسی لئے میں تم میں بھیجا گیا ہوں؟ ایسی ہی باتوں سے پچھلی قومیں ہلاک ہوئی ہیں میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم اس بات میں جھگڑا نہ کرو[2]۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا جو شخص

---

[1] یہ حدیث امام زہری نے امام زین العابدینؓ کے واسطے سے روایت کی ہے۔ (ترمذی) [2] یہ حدیث مختلف طریقوں سے حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔ (دیکھو ترمذی و ابن ماجہ)

تقدیر کے بارے میں گفتگو کرے گا اس سے تو قیامت کے دن سوال کیا جائے گا۔ مگر جو خاموش رہے گا اس سے کچھ سوال نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ یہ مسئلہ ان معاملات میں سے تو ہے نہیں کہ شرعاً تم پر ان کے بارے میں کلام کرنا ضروری ہو۔ لہٰذا اگر تم اس پر کوئی گفتگو نہ کرو تو قیامت میں تم سے کوئی سوال نہ ہوگا۔ لیکن اگر تم نے کلام کیا تو لامحالہ یا وہ غلط ہوگا یا صحیح۔ اور غلط ہونے کی صورت میں تم ایک ایسی بات میں پکڑے جاؤ گے جس سے بحث کرنے کی تم کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ پس بولنے میں نقصان کا احتمال ہے۔ اور نہ بولنے میں کوئی نقصان نہیں۔ ایک اور موقع پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم رات کے وقت حضرت علی اور حضرت فاطمہ علیہما السلام کے مکان پر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ تم لوگ نماز تہجد کیوں نہیں پڑھتے؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ "یا رسول اللہ ہمارے نفس اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ چاہے گا کہ ہم اٹھیں تو اٹھ جائیں گے۔ یہ سن کر حضور فوراً واپس ہوگئے۔ اور ران پر ہاتھ مار کر فرمایا۔ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے)[۲]

یہی وجہ ہے کہ محدثین اور فقہاء کے گروہ نے صرف وَالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ مِنَ اللهِ۔ کے مجمل اعتقاد پر اکتفا کیا ہے۔ اور وہ اس بات میں زیادہ کھوج لگانے والوں اور جبر یا قدر کا قطعی حکم لگانے والوں کی سخت مذمت کرتے رہے ہیں لیکن رسول اکرم اور بزرگان سلف کی ممانعت کے باوجود دوسری قوموں کے مسائل فلسفہ وطبعیات کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے یہ مسئلہ مسلمانوں میں بھی پیدا ہوا اور اس کثرت سے اس پر بحث کی گئی کہ آخر کار یہ اسلامی علم کلام کے مہمات مسائل میں داخل ہوگیا۔

متکلمین اسلام کے مذاہب

متکلمین اسلام کے اس کے اس بارے میں دو مشہور مذہب ہیں جو قدریہ اور جبریہ کہلاتے ہیں۔ یہاں ان کی تمام بحثوں کو نقل کرنا تو بہت مشکل ہے، کہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی

---

[۱] یہ حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے (ابن ماجہ) [۲] اس حدیث کو زہری نے امام زین العابدین سے اور انہوں نے امام حسین ابن علی علیہم السلام سے روایت کیا ہے (بخاری و نسائی) محدثین نے آنحضرت کے واپس پلٹ جانے اور یہ آیت پڑھنے کی مختلف توجیہیں کی ہیں مگر میں اس کے صاف معنی یہ سمجھتا ہوں کہ عملی زندگی کے مسائل میں تقدیر کے مسئلہ سے استدلال کرنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسند نہیں فرماتے تھے۔

وسعت درکار ہے تاہم میں ان کے مقالات کا ایک واضح خلاصہ یہاں پیش کروں گا

مذہب قدریہ معتزلہ اور بعض دوسرے فرقوں کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا، اس کو افعال پر قدرت بخشی، اور نیکی و بدی کا اختیار اسی کو تفویض کر دیا۔ اب وہ خود اپنی قدرت کے مطابق اور اپنی مشیت کے موافق، استقلال کے ساتھ اچھے اور برے افعال کرتا ہے۔ اور اپنے اسی اختیار کی بنا پر دنیا میں مدح و ذم اور آخرت میں ثواب و عذاب کا مستحق ہوتا ہے اللہ کی طرف سے نہ اس کو کفر و معصیت پر مجبور کیا گیا ہے، اور نہ ایمان و طاعت پر۔ بلکہ وہ اپنے رسولوں کو بھیجتا ہے۔ کتابیں نازل کرتا ہے نیکی کا حکم اور بدی سے منع فرماتا ہے صحیح اور غلط، حق اور باطل کو واضح طور پر ممیز کرتا ہے اور انسان کو خبردار کر دیتا ہے کہ اگر سیدھا راستہ اختیار کرو گے تو نجات پاؤ گے اور غلط راستہ پر چلو گے تو اس کا برا نتیجہ دیکھو گے۔

اس مذہب کے قواعد سب سے پہلے واصل بن عطاء الغزال نے مقرر کئے تھے جس کا قول تھا کہ باری تعالیٰ الحکیم عادل ہے، اس کی طرف شر اور ظلم کی اضافت جائز نہیں ہے، اور نہ یہ جائز ہے کہ اپنے بندوں کو جن اوامر و نواہی سے مکلف کیا ہے، ان کے خلاف اعمال کے صدور کا ارادہ کرے، اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ بندوں کو کسی ایسے فعل پر سزا دے جس کا ارتکاب انہوں نے خود اس کے حکم سے کیا ہو لہٰذا بندہ ہی فاعل خیر و شر ہے، وہی ایمان و کفر اور طاعت و معصیت اختیار کرتا ہے۔ اور اللہ نے ان سب کاموں کی قدرت اس کو عطا کر دی ہے۔ ابراہیم بن سیار النظام نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ خدا صرف خیر پر قدرت رکھتا ہے۔ شرور و معاصی اس کی قدرت سے خارج ہیں۔ معمر بن عباد السلمی اور ہشام بن عمرو الفوطی نے اس میں اور زیادہ شدت اختیار کی اور القدر خیرہ و شرہ من اللہ کا اعتقاد رکھنے والے کو کافر اور گمراہ ٹھیرایا کیونکہ یہ اعتقاد ان کے نزدیک باری تعالیٰ کی تنزیہ کے خلاف ہے، اور اس کی رو سے حق تعالیٰ ظالم ٹھیرتا ہے۔ ان کے بعد جاحظ، خیاط، کعبی، جبائی، قاضی عبدالجبار وغیرہ جتنے بڑے بڑے معتزلہ گذرے ہیں سب نے پورے زور کے ساتھ یہ حکم لگایا ہے کہ خدا اپنے بندوں کے افعال کا خالق نہیں ہے بلکہ خود بندے

ان کے خالق ہیں، اور یہ کہ خدا کے لئے تکلیف مالا یطاق جائز نہیں ہے۔

قرآن مجید سے قدریکا استدلال اس مذہب کی تائید میں معتزلہ نے قرآن مجید کی بہت سی آیات سے استدلال کیا ہے۔ مثلاً

وہ آیات جن میں بندوں کے افعال خود بندوں کی طرف منسوب کئے گئیں جیسے کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ (۲:۳) فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتَابَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ (۲:۹) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۸:۷) مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ (۴:۱۸) کُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا کَسَبَ رَھِیْنٌ (۵۲:۲)

وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ انسان کے اپنے اعمال پر جزا و سزا مترتب ہوگی۔ جیسے۔ اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ (۴:۲) اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۵:۴)۔ ھَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۷:۷)۔

وہ آیات جن میں شر اور ظلم اور مذمومات سے باری تعالیٰ کے فعل کو منزہ قرار دیا گیا ہے جیسے۔ اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲:۱) اور ظاہر ہے کہ کفر اچھی چیز نہیں ہے۔ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۵:۶) اور مسلم ہے کہ کفر حق نہیں ہے وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (۴۱:۶) وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ (۳:۱۱)۔

وہ آیت جن میں کافروں اور گنہگاروں کو ان کے برے افعال پر ملامت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کو ایمان و طاعت سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ جیسے وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا

لہ اطناب سے بچنے کے لئے آیات کا ترجمہ نہیں دیا گیا ہے تاہم سورۃ اور رکوع کا نمبر دیدیا گیا ہے۔ جو اصحاب چاہیں حوالے کے مطابق آیات نکال کر کسی مترجم قرآن مجید میں ترجمہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدٰى (۷ : ۱۱) مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ (۳۸ : ۵) فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (۸۴ : ۱) لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۳ : ۱۰) اگر فی الواقع خدا نے ان لوگوں کو ایمان لانے سے روکا ہوتا اور انہیں کفر و معصیت پر مجبور کیا ہوتا تو ان سے اس قسم کے سوالات کرنے جائز نہ ہوتے۔ اگر کوئی شخص کسی کو حجرے میں بند کر دے اور کہے کہ تو کیوں نہیں نکلتا تو یہ ایک غیر معقول سوال ہوگا۔ پھر خدا کی طرف یہ بات کیسے منسوب کی جا سکتی ہے۔ کہ ایک طرف تو ان کو حق سے پھیر دے اور پھر کہے کہ تم کہاں پھرے چلے جا رہے ہو؟ (اَنّٰى تُصْرَفُوْنَ) خود ان کو بھٹکائے اور پوچھے کہ تم کدھر بھٹکے جا رہے ہو۔؟ (اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ) ان میں کفر خلق کرے اور پھر پوچھے کہ تم کیوں کفر کرتے ہو؟ (لِمَ تَكْفُرُوْنَ) انہیں حق کو باطل سے چھپانے پر مجبور کرے اور پھر کہے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ (لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ)۔

وہ آیات جن میں ایمان اور کفر کو بندوں کی مشیت سے متعلق کیا گیا ہے جیسے فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸ : ۴) فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۷۳ : ۱) یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے کفر و معصیت کو مشیت الٰہی کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسے سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكْنَا (۶ : ۱۸) وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ۔ (۱۶ : ۵)۔

وہ آیات جن میں بندوں کو حسن عمل کی طرف دعوت دی گئی ہے مثلاً وَسَارِعُوْا إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۳ : ۱۴) اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ (۴۶ : ۴) وَاَنِيْبُوْا إِلٰى رَبِّكُمْ (۳۹ : ۶) ظاہر ہے کہ طاعت کا حکم دینا اور اس کی طرف دوڑنے اور لپکنے کی تاکید کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جب تک کہ مامور میں اس کی قدرت نہ ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی اپاہج سے کہا جائے کہ اٹھ اور دوڑ

وہ آیات جن میں بیان کیا گیا ہے کہ بندے ایسے افعال کرتے ہیں جن کا خدا نے ان کو حکم نہیں دیا ہے جیسے۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا إِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ

(۲:۹) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (۷: ۳) ۔ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (۳۹:۱) ۔
وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ (۹۸)

وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ لوگ اپنے کیے کی سزا بھگتتے ہیں جیسے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (۳۰: ۵) وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲: ۴) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۰:۵) وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۲۸:۶) ۔

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہدایت اور گمراہی پر مجبور نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے اختیار سے کوئی ایک راستہ منتخب کرتا ہے مثلاً ۔ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (۴۱: ۲) فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۔ (۱۰: ۱۰) ۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (۲: ۳۴)

وہ آیات جن میں انبیا نے اپنے قصوروں کا اعتراف کیا ہے اور ان کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے، مثلاً حضرت آدم کہتے ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا (۷: ۲) حضرت یونس کہتے ہیں۔ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۱: ۶) حضرت موسیٰ کہتے ہیں رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ (۲۸: ۳) حضرت نوح کہتے ہیں رَبِّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ (۱۱: ۴)

(باقی)

نرخنامہ و قواعد اشتہارات

ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ	مقدار
۸۰	۴۰	۲۵	۱۰	ایک صفحہ
۴۵	۲۵	۱۵	۶	نصف صفحہ
۲۵	۱۵	۱۰	۴	ربع صفحہ

۱۔ کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کئے جائیں گے جو اس رسالہ کی وضع و ہیئت کا لحاظ رکھ کر تیار کئے گئے ہوں۔

۴۔ نرخنامہ میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جائے گی۔

۵۔ ٹائیٹل کے صفحات کی اجرت عام نرخنامہ کی بہ نسبت ۵۰ فیصدی زیادہ ہوگی۔

Registered No. M 2950

رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۲۰)

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا
مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں۔
ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی
ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے لہذا کوئی صاحب رعایت
کا مطالبہ نہ کریں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے
لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔
لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شایع کرے

منیجر "ترجمان القران"

خیریت آباد (حیدرآباد دکن)

باہتمام مولوی ابو محمد مصلح صاحب اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں چھپا

جلد (۳) عدد (۱) ۷۸۶ رجب ۱۳۵۲ھ

مجلس تحریک قرآن کا ماہوار رسالہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ صہ بیرون ہند کے لئے ۱ے قیمت فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

اشارات

ہماری روزمرہ کی بول چال میں بعض ایسے الفاظ، اور فقرے رائج ہیں جن کو بولتا تو ہر شخص ہے مگر سمجھتے بہت کم ہیں۔ کثرت استعمال نے ان کا ایک اجمالی مفہوم لوگوں کے ذہن نشین کر دیا ہے، بولنے والا جب ان الفاظ کو زبان سے نکالتا ہے تو وہی مفہوم مراد لیتا ہے اور سننے والا جب انہیں سنتا ہے تو اسی مفہوم کو سمجھتا ہے لیکن وہ گہرے معانی جن کے لئے واضع نے ان الفاظ کو وضع کیا تھا، جہلا تو درکنار، اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہوتے۔

مثال کے طور پر لفظ "اسلام" اور "مسلمان" کو لیجئے کس قدر کثرت سے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اور کتنی ہمہ گیری کے ساتھ انہوں نے ہماری زبانوں پر قبضہ کر لیا ہے؟ مگر کتنے بولنے والے ہیں جو ان کو سوچ سمجھ کر بولتے ہیں؟ اور کتنے سننے والے ہیں جو انہیں سنکر وہی مفہوم سمجھتے ہیں جس کے لئے یہ الفاظ وضع کئے گئے ہیں؟ غیر مسلموں کو جانے دیجئے۔ خود مسلمانوں میں ۹۹ فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ آدمی ایسے ہیں جو اپنے آپ کو "مسلمان" کہتے اور اپنے مذہب کو "اسلام" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر نہیں جانتے کہ "مسلمان" ہونے کے معنی کیا ہیں اور لفظ "اسلام" کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

آئیے آج تھوڑا سا وقت ہم انہیں الفاظ کی تشریح میں صرف کریں۔

اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے اگر آپ لوگوں کے احوال پر نگاہ ڈالیں تو عموماً تین قسم کے لوگ آپ کو ملیں گے۔ ایک قسم ان لوگوں کی جو علانیہ آزادی رائے اور آزادی عمل کے قائل ہیں۔ ہر معاملہ میں: داپنی

رائے پر اعتماد کرتے ہیں صرف اپنی عقل کے فیصلوں کو صحیح سمجھتے ہیں، اور وہی طریق کار اختیار کرتے ہیں جو ان کے اپنے خیال میں صحیح ہوتا ہے۔ کسی مذہب کی پیروی سے ان کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

دوسری قسم ان لوگوں کی جو بظاہر کسی مذہب کو مانتے ہیں، مگر حقیقت میں پیروی اپنے ہی خیالات کی کرتے ہیں وہ اپنے عقائد اور قوانین عمل کے لئے مذہب کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ خود اپنی طبیعت کے رجحان یا دلچسپی یا اغراض وحاجات کے لحاظ سے کچھ عقائد اپنے ذہن میں جا لیتے ہیں، عمل کے کچھ طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں، اور پھر کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کو ان کے مطابق ڈھال لیں گویا درحقیقت وہ مذہب کے پیرو نہیں ہیں بلکہ مذہب ان کا پیرو ہے۔

تیسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو خود اپنی سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔ اپنی عقل کو معطل رکھتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے دوسروں کی تقلید کرنے لگتے ہیں خواہ وہ ان کے باپ دادا ہوں یا ان کے ہم عصر۔

پہلا گروہ آزادی کے نام پر مرتا ہے مگر نہیں جانتا کہ اس کے صحیح حدود کیا ہیں؟ فکر و عمل کی آزادی بلاشبہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر جب وہ اپنی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو گمراہی بن جاتی ہے۔ جو شخص ہر معاملہ میں صرف اپنی رائے پر اعتماد کرتا ہے، ہر مسئلے میں صرف اپنی عقل کو حکم بناتا ہے، وہ دراصل اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کے علم اور اس کی عقل نے دین اور دنیا کے تمام امور کا احاطہ کر لیا ہے۔ کوئی حقیقت اور مصلحت اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہر منزل کی رسم و راہ سے وہ باخبر ہے۔ ہر مسلک کی پیچیدگیوں کا اسے علم ہے۔ ہر رستے کی انتہا کو بھی وہ اسی طرح جانتا ہے جس طرح اس کی ابتدا کو۔ یہ علم اور ہوشمندی کا زعم درحقیقت ایک زعم باطل ہے اور اگر انسان صحیح معنوں میں خود اپنی عقل کو حکم بنائے تو خود عقل ہی یہ کہدے گی کہ میرا اندھا معتقد مجھ کو جن صفات سے متصف سمجھتا ہے، ان سے میں حقیقتہً متصف نہیں ہوں۔ مجھ کو اپنا واحد رہنما سمجھنے والا صرف میری رہنمائی میں زندگی کی راہ طے کرنے والا ٹھوکروں، لغزشوں، گمراہیوں اور ہلاکتوں سے کبھی محفوظ

نہیں رہ سکتا۔

اس قسم کی حریت فکر و عمل، تمدن و تہذیب کے لئے بھی مہلک ہے۔ حریت کا اقتضا یہ ہے کہ ہر شخص وہی اعتقاد رکھے جو خود اس کے اپنے خیال میں صحیح ہو اور اسی راہ پر چلے جو اس کی اپنی عقل کے مطابق درست ہو۔ تمدن و تہذیب کا اقتضا یہ ہے کہ ایک نظام تمدن میں جتنے لوگ ہوں وہ سب چند بنیادی عقائد و افکار میں متفق ہوں، اور اپنی عملی زندگی میں ان مخصوص اصول و آداب اور قوانین کی پیروی کریں جو حیات اجتماعی کی تنظیم کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ پس حریت فکر و عمل اور تمدن و تہذیب میں کھلی ہوئی منافات ہے۔ حریت' افراد میں خود سری' بے قیدی' انارکی پیدا کرتی ہے۔ تمدن ان سے اتباع' پیروی اور تسلیم و اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ جہاں کامل حریت ہوگی۔ وہاں تمدن نہ ہوگا۔ اور جہاں تمدن ہوگا وہاں افراد کو ایک بڑی حد تک حریت فکر و عمل سے دست کش ہونا پڑے گا۔

دوسرے گروہ کا حال پہلے گروہ سے زیادہ برا ہے۔ پہلا گروہ صرف گمراہ ہے۔ دوسرا گروہ اس کے ساتھ جھوٹا، منافق، دھوکہ باز اور بدنیت بھی ہے۔ اگر تاویل کے جائز حدود میں رہ کر ایک شخص اپنے مذہب اور اپنے تخیلات اور رجحانات میں موافقت پیدا کر سکتا ہو تو حریت فکر و عمل کے ساتھ مذہب کا اتباع ممکن ہے۔ اگر اس کے اپنے رجحانات مذہب کے خلاف ہوں اور اس کے باوجود وہ مذہب کو صحیح اور اپنے رجحانات کو غلط سمجھتا ہو، تب بھی ایک حد تک اس کا یہ دعوی صحیح ہوگا کہ وہ واقعی اس مذہب کو مانتا ہے جس کی پیروی کا وہ دعوی کر رہا ہے۔ لیکن اگر مذہب کی واضح تعلیمات سے اس کے عقائد اور اعمال صریحاً مختلف ہوں، اور وہ اپنے انہی عقائد و اعمال کو صحیح بھی سمجھتا ہو، اور پھر اپنے آپ کو مذہب کے دائرے میں شامل رکھنے کے لئے مذہبی تعلیمات کو اپنے خیالات اور طور طریقوں کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہو تو ایسے شخص کو ہم کیوں نہیں کہیں گے؟

کیوں کہ کوون سے اتنی ہوشیاری کا کام کہاں بن آتا ہے ؟ ہمیں مجبوراً اس کو بے ایمانی کہنا پڑیگا۔ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ اس میں مذہب سے علانیہ بغاوت کرنے کے لئے کافی اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ اس لئے منافقت کی راہ سے مذہب کا پیرو بنتا ہے۔ ورنہ کونسی چیز اس کیلئے ایک ایسے مذہب کو چھوڑنے میں مانع ہے جس کی تعلیمات اس کی عقل کے فیصلوں کے خلاف ہیں، اس کے حقیقی افکار و عقائد کی ضد واقع ہوئی ہیں اور اسے ان طریقوں پر چلنے سے روکتی ہیں جن پر وہ سچے دل سے چلنا چاہتا ہے۔ اور واقع میں چل بھی رہا ہے۔

تیسرا گروہ اپنے مرتبہ عقلی کے لحاظ سے سب سے زیادہ فروتر ہے۔ پہلے دونوں گروہوں کی غلطی تو یہ ہے کہ وہ عقل سے اتنا کام لیتے ہیں جتنا وہ نہیں کر سکتی۔ اور اس گروہ کی غلطی یہ ہے کہ یہ سرے سے عقل سے کام ہی نہیں لیتا یا لیتا ہے تو اتنا کم کہ نہ لینے کے برابر۔ ایک صاحب عقل انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی عقیدہ کا معتقد ہو اور اس اعتقاد کے حق میں اس کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہ ہو کہ اس کے باپ دادا بھی یہی اعتقاد رکھتے تھے، یا فلاں قوم جو بڑی ترقی یافتہ ہے، وہ بھی اسی عقیدہ کی معتقد ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے دینی یا دنیوی معاملات میں بعض طریقوں کی صرف اس لئے پیروی کرتا ہو کہ باپ دادا سے وہی طریقے چلے آتے ہیں، یا بعض طریقوں کو صرف اس بنا پر اختیار کرتا ہو کہ اس کے عہد کی غالب قوموں میں وہی طریقے رائج ہیں، وہ دراصل اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ خود اس کے بھیجے میں دماغ اور دماغ میں سوچنے کی قابلیت نہیں ہے۔ اس کے پاس خود کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس سے وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتا ہو۔ اتفاقاً وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہو گیا۔ اس لئے ہندو مذہب کو صحیح سمجھتا ہے۔ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوتا تو اسلام کو برحق مانتا۔ مسیحی کی اولاد ہوتا تو عیسائیت پر جان دیتا۔ اسی طرح یہ بھی اتفاق ہے کہ اس کے عہد میں فرنگی قومیں برسر اقتدار ہیں اس لئے وہ فرنگی طور طریقوں کو معیار تہذیب سمجھتا ہے۔ اگر چینی برسر اقتدار ہوتے تو یقیناً اس کے نزدیک چینی طور طریقے معیار تہذیب ہوتے، اور اگر آج دنیا پر افریقہ کے حبشیوں کا تسلط ہو جائے تو کوئی شک نہیں کہ یہ حضرت انہی

انسان حیثیت کو انسانیت کا عطر سمجھنے لگے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لئے یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ بزرگوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے یا دنیا میں آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دنیا میں تو پہلے بھی حماقتیں ہوئی ہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ ہمارا کام ان حماقتوں کی اندھا دھند پیروی کرنا نہیں ہے ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے قدیم یا جدید زمانے کے ہر طریقے کی پیروی کرنے لگیں۔ ہر رہرو کے دامن سے دامن باندھ کر چل کھڑے ہوں خواہ وہ کانٹوں کی طرف جا رہا ہو یا خندق کی طرف ہمیں خدا نے عقل اسی لئے دی ہے کہ دنیا کے اچھے اور برے میں تمیز کریں، کھوٹے اور کھرے کو پرکھ کر دیکھیں، کسی کو رہنما بنانے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لیں کہ وہ کدھر لے جانے والا ہے۔

اسلام ان تینوں گروہوں کو غلط کار ٹھیراتا ہے۔

پہلے گروہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ: نہ تو یہ لوگ کسی روشنی والے کو ہادی و رہنما مانتے ہیں نہ ان کے پاس خود ہی حق کا نور ہے کہ اس کے اجالے میں راہ طے کریں، ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو اندھیرے میں محض اندازے اور اٹکل سے چل رہا ہو ممکن ہے کہ کہیں سیدھے رستے چلے، اور ممکن ہے کہ کہیں گڑھے میں جا پڑے۔ اس لیے کہ اندازہ کوئی یقینی چیز نہیں ہے۔ اس میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے۔ بلکہ زیادہ تر امکان غلطی ہی کا ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۱۰: ۶)	جو لوگ خدا کے سوا دوسرے شرکا کو پکارتے ہیں، جانتے ہو کہ وہ کس طریقے کے پیرو ہیں؟ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور محض اندازے پر چلتے ہیں۔
اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْــــًٔا (۵۳: ۲)	وہ محض گمان پر چلتے ہیں، اور گمان کا حال یہ ہے کہ وہ حق کی ہدایت سے ذرہ برابر بھی بے نیاز نہیں کرتا۔
اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ	وہ گمان اور اپنے نفس کی خواہشات کے سوا کسی اور چیز کی

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰی۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی (۵۳ : ۱)

پیروی نہیں کرتے حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔ کیا انسان کے لئے وہی حق ہے جس کی وہ تمنا کرے؟

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (۴۵ : ۲۳)

کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنے نفس کی خواہشات کو اپنا خدا بنا لیا ؟ باوجودیکہ وہ علم رکھتا ہے مگر اللہ نے اسے گمراہ کردیا، اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگادی، اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اب اللہ کے بعد کون ہے جو اس کی رہنمائی کرے گا ؟

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۲۸ : ۵)

اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی ہدایت کے بجائے اپنے نفس کی خواہش کی پیروی کی ؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی ہدایت نہیں دیتا۔

نزول قرآن کے زمانے میں دوسرے گروہ کے نمائندے بنی اسرائیل تھے اپنے آپ کو موسوی اور متبع توراۃ کہا کرتے تھے۔ مگر عقائد اور معاملات میں اکثر و بیشتر موسیٰ علیہ السلام کے طریقے اور توراۃ کی تعلیم کے خلاف تھے اس پر لطف یہ تھا کہ اپنے اس انحراف پر نادم بھی نہ تھے۔ بجائے اس کے کہ اپنے خیالات اور اعمال کو توراۃ کے مطابق ڈھالتے وہ توراۃ میں لفظی و معنوی تحریفیں کر کے اس کو اپنے افکار و اعمال کے مطابق ڈھال لیا کرتے تھے توراۃ کی اصلی تعلیمات کو چھپا کر اپنے خیالات کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ گویا وہی دراصل توراۃ کی تعلیمات ہیں خدا کے جو بندے انھیں اس گمراہی پر تنبیہ کرتے، اور ان کی خواہشات کے خلاف کلام الٰہی کے اتباع کی طرف دعوت دیتے تھے۔ ان کو وہ گالیاں دیتے، جھوٹا قرار دیتے حتیٰ کہ قتل تک کر دیتے تھے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا

وہ الفاظ کو ان کے مواقع سے پھیر دیتے ہیں اور انہوں نے

حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ
عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ
(۵ : ۳)

بہت سی ان نصیحتوں کو بھلا دیا ہے جو انھیں کی گئی تھیں تجھے برابر ان کی کسی نہ کسی چوری کی اطلاع ملتی رہتی ہے سب خیانت سے ان کے بہت کم آدمی بچے ہوئے ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۳ ، ۶۳)

اے اہل کتاب تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے اور کیوں جانتے بوجھتے حق پر پردہ ڈالتے ہو؟

كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ
أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ
(۵ : ۱۰)

جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ایسا پیغام لے کر آیا جو ان کے نفس کی خواہشوں کے مطابق نہ تھا، تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا۔

اور پھر ان سے صاف کہدیتا ہے کہ :-

لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ
وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ (۵ : ۱۰)

تم ہرگز کسی راہ راست پر نہیں ہو تا وقتیکہ تورات اور انجیل قائم نہ کرو اور اس کتاب کو نہ مانو جو تمہارے رب کے پاس سے تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ (یعنی قرآن)۔

تیسرے گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے :-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا
بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ
آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ
(۲ : ۲۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ اس ہدایت پر چلو جو اللہ نے اتاری ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا وہ اس صورت میں بھی اپنے باپ دادا کی پیروی کریں گے جب کہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں اور راہ راست پر نہ ہوں؟

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۵:۱۰۴)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف، تو انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا وہ طریقہ اس صورت میں بھی ان کے لئے کافی ہے جبکہ ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور راہ راست پر نہ ہوں؟

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۶:۱۱۶)

اور اگر تونے بہت سے ان لوگوں کی پیروی کی جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے رستے سے بھٹکا دیں گے۔ یہ لوگ تو محض گمان پر چلتے ہیں اور ان کا طریقہ بالکل اٹکل اور اندازے پر ہے۔

جو لوگ خود اپنی عقل وفہم سے کام نہیں لیتے، خود کھوٹے اور کھرے کو نہیں پرکھتے، آنکھیں بند کر کے دوسروں کی تقلید کرتے ہیں، ان کو قرآن اندھا، گونگا، بہرا، بے عقل قرار دیتا ہے۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۲:۱۷۱) اور انھیں جانوروں سے تشبیہ دیتا ہے بلکہ ان سے بھی بدتر کیونکہ جانور تو عقل رکھتا ہی نہیں، اور وہ عقل رکھتے ہیں مگر اس سے کام نہیں لیتے۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷:۱۷۹)۔

ان تینوں گروہوں کو، جن کے طریقے افراط اور تفریط پر مبنی ہیں، رد کر دینے کے بعد قرآن ایسے لوگوں کا ایک گروہ بنانا چاہتا ہے جو اعتدال اور توسط کی راہ پر ہوں، "أُمَّةً وَسَطًا ہوں" قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ ہوں۔

یہ اعتدال اور توسط کی راہ کیا ہے؟ یہ کہ پہلے تم ان سب پردوں کو چاک کر دو جو قدیم پیدا وار

اور جدید تعلیمات نے تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈال رکھے ہیں عقل سلیم کی صاف روشنی میں آنکھیں کھول کو اور دیکھو کہ کیا چیز حق ہے اور کیا چیز باطل؟ دہریت صحیح ہے یا خدا پرستی؟ توحید صحیح ہے یا شرک؟ انسان راہ راست پر چلنے کے لئے خدا کی ہدایت کا محتاج ہے یا نہیں ہے؟ انبیاء علیہم السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے تھے یا معاذ اللہ جھوٹے؟ قرآن جس طریقے کو پیش کرتا ہے وہ سیدھا ہے یا ٹیڑھا؟ اگر تمہارا دل گواہی دے کہ خدا کو ماننا انسانی فطرت کا عین مقتضیٰ ہے، اور خدا حقیقت میں وہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے اگر تمہارا ضمیر تسلیم کرے کہ انسان اپنی رہنمائی کے لئے خدا کی بخشی ہوی روشنی کا یقیناً محتاج ہے، اور یہ روشنی وہی ہے جو نوع بشری کے سچے رہبر انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کو دیکھ کر تم کو یقین آجائے کہ اس اعلیٰ سیرت کا انسان ہرگز دنیا کو دھوکہ نہیں دے سکتا اور انہوں نے جب رسول خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو وہ ضرور اپنے دعوے میں سچے ہیں، اگر قرآن کا مطالعہ کر کے تمہاری عقل یہ فیصلہ کردے کہ انسان کے لئے اعتقاد اور عمل کا سیدھا راستہ وہی ہے جو اس کتاب نے پیش کیا ہے۔ اور یہ کتاب یقیناً کلام الٰہی ہے۔ تو تمام دنیا کی ملامت و مخالفت سے بے خوف ہو کر، ہر نقصان کے ڈر اور فائدے کے لالچ سے دل کو پاک کر کے اس چیز پر ایمان لے آؤ جس کی صداقت پر تمہارا ضمیر گواہی دے رہا ہے۔

پھر جب تم نے عقل سلیم کی مدد سے حق اور باطل میں تمیز کرلی، اور باطل کو چھوڑ کر حق پر ایمان لے آئے تو عقل کے امتحان اور اس کی تنقید کا کام ختم ہوگیا۔ ایمان لانے کے بعد فیصلہ کرنے اور حکم دینے کا اختیار عقل سے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی طرف منتقل ہوگیا۔ اب تمہارا کام فیصلہ کرنا نہیں بلکہ ہر اس حکم کے آگے سر جھکا دینا ہے جو خدا اور اس کے رسول نے تم کو دیا ہے۔ تم اپنی عقل کو ان احکام کے سمجھنے ان کی باریکیوں اور حکمتوں تک پہنچنے، اور ان کو اپنی زندگی کے جزئیات پر منطبق کرنے میں استعمال کر سکتے ہو

اگر کسی حکم خداوندی میں چون و چرا کرنے کا تم کو حق نہیں ہے۔ خواہ کسی حکم کی مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے خواہ کوئی حکم تمہاری عقل کے معیار پر پورا اترے یا نہ اترے، خواہ اللہ اور اس کے رسول کا کوئی فیصلہ تمہیں اپنی دنیوی اغراض کے لحاظ سے مفید نظر آئے یا غیر مفید، خواہ اللہ کا ارشاد اور رسول کا فرمان دنیا کے رسم و رواج اور طور طریقوں کے مطابق ہو یا منافی، تمہارا کام بہرحال اس کے آگے سر جھکا دینا ہے۔ کیونکہ جب تم نے خدا کو خدا مان لیا، رسول کو خدا کا رسول تسلیم کر لیا اور یہ یقین کر لیا کہ خدا کا رسول جو کچھ پیش کرتا ہے، خدا کی طرف سے پیش کرتا ہے۔ اپنے دل سے گھڑی ہوئی کوئی بات پیش نہیں کرتا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ، تو اس یقین و اذعان کا عقلی نتیجہ یہ ہے کہ تم خود اپنی عقل کے فیصلوں پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے فیصلوں کو ترجیح دو، اور جو عقائد یا امر و نہی کے احکام خدا کی طرف سے خدا کے رسول نے بیان کئے ہیں۔ ان کو اپنی عقل، اپنے علم، اپنے تجربات، یا دوسرے اہل دنیا کے افکار و اعمال کے معیار پر جانچنا چھوڑ دو۔ جو شخص کہتا ہے کہ میں مومن ہوں اور پھر چون و چرا بھی کرتا ہے، وہ اپنے قول کی آپ تردید کرتا ہے، وہ نہیں جانتا کہ ایمان اور چون و چرا میں کھلا ہوا تضاد ہے۔ اور اس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ڈسپلن صرف ماننے اور اطاعت کرنے سے قائم ہوتا ہے۔ چون و چرا کا دوسرا نام انارکی ہے۔

اسی اعتدال اور توسط کے طریقہ کا نام "اسلام" ہے، اور جو گروہ اس راستہ پر چلتا ہو اس کا نام "مسلم" ہے۔

اسلام کے معنے انقیاد، اطاعت، اور تسلیم کے ہیں۔ اور "مسلم" وہ ہے جو حکم دینے والے کے امر اور منع کرنے والے کی نہی کو بلا اعتراض تسلیم کرے۔ پس یہ نام خود ہی اس حقیقت کا پتہ دے رہا ہے کہ ان تینوں گروہوں اور ان کے طریقوں کو چھوڑ کر یہ چوتھا گروہ ایک نئے مسلک کے ساتھ اسی لئے قائم کیا گیا ہے کہ یہ خدا اور رسول کے حکم کو مانے اور اس کے آگے سر جھکا دے۔ اس گروہ کا کام یہ نہیں ہے کہ ہر معاملے میں

صرف اپنی عقل کی پیروی کرے، نہ یہ ہے کہ احکام الٰہی میں سے جو کچھ اسکی اغراض کے مطابق ہو اس کو مانے اور جو اغراض کے خلاف ہو اس کو رد کر دے، نہ یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کو چھوڑ کر انسانوں کی اندھی تقلید کرے خواہ وہ انسان مردہ ہوں یا زندہ۔

اس باب میں قرآن مجید کی تصریحات بالکل صاف ہیں وہ کہتا ہے کہ جب کسی معاملہ میں خدا اور رسول کا حکم آجائے تو مومنوں کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار باقی نہیں رہتا:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِيْنًا (۳۳ : ۵)

کسی مومن اور مومنہ کا یہ کام نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو ان کے لئے اپنے اس معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

وہ کہتا ہے کہ کتاب اللہ میں سے کچھ ماننا اور کچھ کو رد کر دینا، دنیا و آخرت میں رسوا کن ہے۔

أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ، فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ إِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲ : ۱۰)

کیا تم کتاب کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ تم میں سے جو کوئی ایسا کرتا ہے اس کی سزا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کی رسوائی ہو۔ اور آخرت میں ایسے لوگ شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں ہے۔

وہ کہتا ہے کہ فیصلہ صرف کتاب الٰہی کے مطابق ہونا چاہئے، خواہ وہ لوگوں کی خواہشات کے

مطابق ہو یا نہ ہو :—

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵: ۷) تو ان کے درمیان اسی کتاب کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتاری ہے اور جو کچھ تیرے پاس حق تعالی کی طرف سے آیا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

وہ کہتا ہے جو شخص کتاب اللہ کے موافق فیصلہ نہیں کرتا وہ فاسق ہے وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۵: ۷) اور ہر فیصلہ جو کتاب الٰہی کے خلاف ہے۔ جاہلیت کا فیصلہ ہے۔ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۵: ۷)

وہ کہتا ہے کہ "اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو۔ اور اگر تم حقیقت میں اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو تو جس کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع پیدا ہو، اس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ یہی بہتر طریقہ ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی یہی اچھا ہے۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوی کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تیری جانب بھیجی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے بھیجی گئی تھیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نافرمان انسان کو اپنے معاملہ میں حکم بنائیں حالانکہ انھیں اس کے چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان تو یہ چاہتا ہی ہے کہ انھیں بھٹکا کر راہ راست سے دور ہٹا لے جائے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ آؤ اس کتاب کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تو نے منافقین کو دیکھا کہ وہ تجھ سے کنی کاٹ جاتے ہیں۔ .... ہم نے جو رسول بھیجا ہے، اسی لئے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔ .... نہیں! تیرے پروردگار کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ وہ اپنی باہمی اختلافات میں تجھ کو حکم نہ بنائیں۔ اور یہ بھی کافی نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ جو فیصلہ تو کرے اس پر وہ اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور بےچون و چرا اس کے آگے سر

جھکا دیں" (۴: ۸-۹)۔

ان تصریحات سے "اسلام" اور "مسلم" کی وجہ تسمیہ معلوم ہو گئی۔ اب ہم سب لوگوں کو جنہوں نے مردم شماری میں اپنے آپ کو "مسلمان" لکھوایا ہے، غور کرنا چاہئے کہ ہم پر لفظ "مسلم" کا اطلاق کس حد تک ہوتا ہے اور جس طریقہ پر ہم چل رہے ہیں اس کو "اسلام" سے تعبیر کرنا کہاں تک درست ہے؟

محرم کے پرچہ میں ایک مدرسۃ القرآن کے قیام کی تجویز کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ الحمد للہ کہ وہ تجویز اب عملی صورت میں آیا چاہتی ہے۔ نصاب تعلیم تیار کر لیا گیا ہے، اور اہل الرائے حضرات کے پاس مشورے کے لئے بھیج دیا گیا ہے۔ جب وہ ایک آخری شکل اختیار کر لیگا تو ناظرین ترجمان القرآن کی اطلاع کے لئے شائع کر دیا جائیگا۔ تجویز یہ ہے کہ مدرسہ میں ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ لے جائیں جو بی۔ اے۔ کے درجہ تک انگریزی زبان و جدید علوم کی تحصیل کر چکے ہوں اور اس کے ساتھ عربی زبان سے بھی واقف ہوں۔ ان کو قرآن مجید کی تعلیم بالکل نئے انداز میں دی جائیگی۔ مطمح نظر یہ ہوگا کہ قرآن کریم کی مدد سے ان میں فکر اسلامی پیدا کی جائے۔ وہ اسلامی نظر سے دنیا اور اس کے تمام معاملات کو دیکھیں۔ اسلامی طریق پر سوچیں۔ اور اسلامی طریق پر زندگی کے مسائل کو حل کریں۔ تعلیم میں حدیث، فقہ، کلام، فلسفہ، تاریخ اسلام، سیاسیات، معاشیات وغیرہ تمام ضروری علوم ہوں گے، مگر سب کا مرکز قرآن ہوگا۔

درس میں ہر وہ طالب علم شریک ہو سکے گا جو اپنی زندگی اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے پر آمادہ ہو اور جس کا مقصد حیات محض دنیا طلبی نہ ہو۔ مگر خاص طور پر ایسے طلبہ کا انتخاب پیش نظر ہے جو انگریزی، عربی اور اردو جاننے کے ساتھ ہندوستان کی بڑی بڑی دیسی زبانوں میں سے بھی کوئی زبان اچھی طرح جانتے ہوں، مثلاً بنگالی، مرہٹی، گجراتی، تلنگی، تامیل وغیرہ۔ کیونکہ آگے چل کر ان لوگوں سے ہندوستان کی دیسی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ کا کام لینا مقصود ہے۔ اس غرض کے لئے مختلف دیسی زبانیں جاننے والے ۱۲ طلبہ منتخب کئے جائینگے اور ان کے جملہ مصارف کا تکفل خود مدرسہ

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۷)

ایمان

نظریہ حیات، اور مقصدِ حیات سے گذر کر اب ہمارے سامنے تیسرا سوال آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام نے انسانی سیرت کی تعمیر کس بنیاد پر کی ہے؟

سیرت اور اس کی ذہنی بنیاد انسان کے جملہ اعمال و افعال کا سرچشمہ اس کا ذہن ہے۔ مبدأ افعال ہونے کی حیثیت سے ذہن کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ اس میں کسی خاص قسم کے خیالات راسخ نہ ہوں، مختلف پراگندہ اور منتشر خیالات آتے رہیں، اور ان میں سے جو خیال بھی قوی ہو وہی عمل کے لئے محرک بن جائے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ وہ پراگندہ خیالی کی آماجگاہ نہ رہے، بلکہ چند مخصوص خیالات اس میں اس طرح راسخ ہو جائیں کہ اس کی عملی زندگی مستقل طور پر انہی کے زیر اثر ہو، اور اس سے منتشر اعمال سرزد ہونے کے بجائے مرتب اور منضبط اعمال صادر ہوا کریں۔ پہلی حالت کو ہم ایک سڑک سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو ہر آیند و روند کے لئے کھلی ہوئی ہے، کسی وارد و صادر کی اس میں تخصیص نہیں۔ اور دوسری حالت ایک ایسے سانچے کی سی ہے جس میں سے ہمیشہ ایک متعین شکل و ہیئت کے پرزے ڈھل کر نکلتے ہیں۔ جب انسان کا ذہن پہلی حالت میں ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کوئی سیرت نہیں ہے۔ وہ شیطان بھی ہو سکتا ہے اور فرشتہ بھی۔ اس کی طبیعت میں تلون ہے۔ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے کب کس قسم کے افعال صادر ہوں۔ بخلاف اس کے، جب وہ دوسری حالت میں آجاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ اپنی ایک سیرت رکھتا ہے، اس کی عملی زندگی میں ایک نظم ہے، ایک ترتیب ہے، اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کن حالات میں کی

فعل کرے گا۔

تنظیم عمل کی پہلی شرط | پس معلوم ہوا کہ انسان کی عملی زندگی کا ایک قابل اعتماد نظم و ترتیب اختیار کرنا منحصر ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل سیرت بن جائے، اور سیرت کے بننے کا انحصار اس پر ہے کہ انسان کا ذہن پراگندہ خیالی کی حالت سے نکل جائے، چند مخصوص خیالات اس کے اندر متمکن ہوجائیں، اور ان خیالات میں اتنا رسوخ، اتنا جماؤ، اتنی مضبوطی ہو کہ کسی دوسری طرح کے خیالات کو آنے اور ذہن کی دنیا میں برہمی پیدا کرنے کا موقع نہ دیں۔ یہ خیالات جتنے زیادہ گہرے جمے ہوئے ہوں گے، سیرت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی اور انسان کی عملی زندگی اتنی ہی زیادہ مرتب، منظم اور قابل اعتماد ہوگی۔ برعکس اس کے ان میں جتنی کمزوری ہوگی، مخالف خیالات کو راہ دینے کی جتنی زیادہ صلاحیت ہوگی، اتنی ہی سیرت بھی کمزور رہوگی، اور عملی زندگی بھی اسی قدر بے نظم اور ناقابل وثوق ہوجائیگی۔

ایمان کے معنی | قرآن کی اصطلاح میں انسانی سیرت کی اسی ذہنی بنیاد کا نام "ایمان" ہے۔ ایمان کا لفظ مادۂ "امن" سے نکلا ہے۔ امن کے اصلی معنی نفس کے مطمئن اور بے خوف ہوجانے کے ہیں۔ اسی سے امانت ہے جو ضد ہے خیانت کی۔ یعنے امانت وہ ہے جس میں خیانت کا خوف نہ ہو۔ امین کو امین اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی نیک معاملگی پر دل ٹھک جاتا ہے وثوق ہوتا ہے کہ وہ بد معاملگی نہ کرے گا۔ جو اونٹنی غریب اور مطیع ہوتی ہے اس کو اَمُون کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے سرکشی اور شرارت کا خوف نہیں ہوتا۔ اسی مادے کا باب افعال "ایمان" ہے اس سے مراد یہ ہے کہ نفس میں کوئی بات بر بنائے تصدیق و یقین اس طرح جم جائے کہ اب اس کے خلاف کسی بات کے راہ پانے اور داخل ہوجانے کا خوف ہی باقی نہ رہے۔ ایمان کا کمزور ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ نفس اس بات پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا، قلب کو پوری طرح سکون نہیں ہوا۔ اس کے خلاف باتوں کو بھی ذہن میں داخل ہوجانے کا موقع مل گیا۔ اسی سے سیرت کمزور ہوی۔ اور اسی نے عملی زندگی میں بے نظمی پیدا کردی۔ ایمان کا قوی اور مضبوط ہونا اس کا عکس ہے مضبوط ایمان کے معنی یہ ہیں کہ سیرت بالکل ٹھوس

اور یقینی بنیادوں پر قائم ہوگئی۔ اب اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ اعمال ٹھیک ٹھیک اس تخیل اور اس تصور کے مطابق و مناسب صادر ہوں گے جو دل میں جم گیا ہے۔ اور جس سے سیرت کا سانچہ تیار ہوا ہے۔

تہذیب کی تاسیس میں ایمان کا مرتبہ

اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقائد و افکار پر ایمان رکھتے ہوں، اور ان کی سیرتیں مختلف و متضاد بنیادوں پر قائم ہو جائیں تو کوئی اجتماعی حیثیت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہوگی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتھر بکھرے پڑے ہوں۔ ہر پتھر بلاشبہ اپنی جگہ مضبوط ہے، مگر ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک تخیل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی کا رابطہ ان کو ایک قوم بنا دیگا۔ گویا وہی پتھر جو بکھرے پڑے تھے چونے سے جوڑ دیے گئے۔ اور ایک مضبوط دیوار قائم ہوگئی۔ اب ان کے درمیان تعامل اور تعاون شروع ہو جائیگا جس سے ترقی کی رفتار تیز اور تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی اور ان کے اعمال میں ایک رنگی پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص تمدن پیدا ہوگا، ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہوگی، ایک نئی قوم نئی سیرت نئی ذہنیت، نئے خیالات نئے طریق عمل کے ساتھ اٹھے گی اور اپنی حضریت کا قصر ایک نئے ہی انداز پر تعمیر کرے گی۔

اس تقریر سے آپ نے سمجھ لیا کہ ایک تہذیب میں اس اساسی تخیل کا کیا مرتبہ ہے جو اجتماعی طور پر اس تہذیب کے متبعین میں ایمان بن کر راسخ ہو جاتا ہے۔

ایمان کی دو قسمیں

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ایمان کے اعتبار سے دنیا کی مختلف تہذیبوں کا کیا حال ہے۔ ایمان کا لفظ اصل میں تو ایک مذہبی اصطلاح ہے۔ مگر چونکہ یہاں ہم اس کو اساسی تخیل کے معنی میں بول رہے ہیں اس لئے اس معنی میں ایمان کی دو قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ ایک وہ ایمان جو مذہبی نوعیت رکھتا ہو۔ اور دوسرا وہ جو دنیوی نوعیت رکھتا ہو۔ مذہبی نوعیت کا ایمان صرف اس تہذیب کی اساس بن سکتا ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو کیونکہ اس صورت میں ایک ہی ایمان دین اور دنیا دونوں پر حکمران ہوتا ہے مگر جس تہذیب کی بنیاد

مذہب پر منحصر ہیں دنیوی ایمان مذہبی ایمان سے الگ ہو جاتا ہے اور مذہبی ایمان کا شخصی و قومی زندگی پر کوئی اثر باقی نہیں رہتا

مذہبی ایمان مذہبی ایمان عموماً ایسے امور پر ہوتا ہے جو انسانی سیرت کو روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرتے ہیں، مثلاً ایک یا متعدد معبود جن کو مخصوص صفات سے متصف کیا گیا ہو، کتابیں جن کا الہامی ہونا تسلیم کر لیا گیا ہو اور پیشوا جن کی تعلیم پر اعتقاد و عمل کی بنیاد رکھی گئی ہو۔ دینی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر خاص دنیوی نقطۂ نظر سے اس قسم کے ایمان کی کامیابی دو چیزوں پر منحصر ہے۔ ایک یہ کہ مذہب نے جن امور کی تصدیق کرنے اور جن پر یقین رکھنے کا مطالبہ کیا ہے وہ عقلی اعتبار سے قابل تصدیق ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ ایسے امور ہوں جن کی بنیاد پر انسانی سیرت کی تعمیر صحیح طور سے ہو سکتی ہو یعنی وہ سیرت کو اس طرح سے بنائیں کہ اس کی روحانیت ایک اعلیٰ درجہ کے نظام اخلاق کی تاسیس کرنے والی ہو، اور اس کا اخلاق اپنی پاکیزگی و طہارت کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں بھی انسان کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے مستعد کرنے والا ہو۔

پہلی شرط اس لئے ضروری ہے کہ اگر ایمانیات محض اوہام کا مجموعہ ہوں، یا ان میں اوہام زیادہ اور معقولات کم ہوں، تو انسان کے ذہن پر ان کا استیلا، کلیۃً جہالت و نادانی کا زیر بار منت رہیگا جو نہی کہ ارتقائے عقلی کے بلند مدارج کی طرف انسان نے قدم اٹھایا۔ اور بس اوہام باطلہ کا طلسم ٹوٹنا شروع ہو گیا ایمان کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ اور اس کے ساتھ ہی روحانیت اور اخلاق کا وہ سارا نظام بھی درہم برہم ہوتا چلا گیا جس پر شخصی اور قومی سیرت کی بنیادیں اٹھائی گئی تھیں۔ اس کی مثال میں ہم ان عقائد کو پیش کر سکتے ہیں جو مختلف مذاہب نے دیوتاؤں، معبودوں، خداؤں اور پیشواؤں کے متعلق پیش کئے ہیں۔ ان کو جن صفات سے متصف کیا گیا ہے، جو افعال ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، جو فسانے ان کے متعلق گھڑے گئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ عقل سلیم ان کی تصدیق کرنے اور ان پر ایمان لانے سے انکار کرتی ہے اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ ان پر اعتقاد رکھنے والی قوم دنیا میں ترقی اور غلبہ حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتی۔ باطل اوہام اس کے ذہن پر ایسا بڑا اثر ڈالتے ہیں کہ عمل کی بہترین قوتیں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں۔ نہ حوصلوں

میں بلندی پیدا ہوتی ہے، نہ عزائم میں شدت، نہ نگاہ میں وسعت، نہ دماغ میں روشنی، نہ دل میں جرأت آخرکار یہی چیز اس قوم کے لئے دائمی نکبت، ذلت، مقہوری اور غلامی کا سبب بن جاتی ہے۔ برعکس اس کے جن قوموں پر کچھ دوسرے اسباب سے ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں وہ عقل وعلم کے اعتبار سے جتنی ترقی کرتی جاتی ہیں اپنے خداؤں، معبودوں، اور پیشواؤں پر سے ان کا اعتقاد اٹھتا جاتا ہے۔ اول اول نظام اجتماعی کی حفاظت کے لئے ان غلط ایمانیات کو محض مصلحتاً برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے خلاف دل اور دماغ کی بغاوت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ آخرکار قوم کے ذہن پر ان کے لئے کوئی گرفت باقی نہیں رہتی۔ صرف ایک مختصر سا روحانی گروہ ان پر یقین رکھنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے، اور باقی ساری قوم کے نفس وروح پر ایک دوسرے ایمان کا تسلط ہو جاتا ہے جس کو ہم نے دنیوی ایمان سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری شرط کا ضروری ہونا بالکل ظاہر ہے۔ جو ایمانیات انسان کو دنیوی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں کر سکتے ان کا اثر محض روحانی اور اخلاقی زندگی تک محدود رہتا ہے، مادی زندگی تک نہیں پہنچنے پاتا۔ نتائج کے اعتبار سے یہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو ان کی بدولت وہ قوم ترقی ہی نہ کرے گی جو ان کی معتقد ہوگی۔ یا ترقی کرے گی تو بہت جلدی ان کی گرفت سے نکل جائے گی۔ مذہب کا ایمان تہذیب کے ایمان کے لئے جگہ خالی کر دے گا، اور جب مادی زندگی کی سعی وعمل میں قوم کا انہماک بڑھے گا تو اخلاق وروحانیت بھی مذہبی ایمانیات کے اثر سے آزاد ہو جائیں گے۔

میں عمداً کسی مذہب کی تنقیص کرنی نہیں چاہتا۔ اس لئے تفصیل کے ساتھ مختلف مذاہب کے ایمانیات پر کوئی کلام نہ کروں گا۔ آپ مذاہب کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح بعض مذاہب کے ایمانیات نے ان کے معتقدین کو دنیوی زندگی میں ترقی کرنے سے روکا ہے اور کس طرح بعض کے ایمانیات علم وعقل کی ترقی کا ساتھ نہ دے سکے۔ پھر یہ بھی آپ دیکھیں گے کہ دوسری قوموں نے تنزل کی حالت میں اپنی مذہبی معتقدات پر ایمان رکھا اور ترقی کی حالت میں ان کو چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ایمان

میں سب سے زیادہ مضبوط اس وقت تھے جب وہ دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے، اور ان کے ایمان میں کمزوری آئی تو اس وقت جب کہ وہ عقل میں، علم میں، دنیوی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور دوسری قومیں ان پر غالب آگئیں۔ آج مسلمان انتہائی تنزل کی حالت میں ہیں اور اس کے ساتھ ضعف ایمانی کے مرض میں بھی شدت کے ساتھ مبتلا ہیں۔ اب سے ہزار بارہ سو برس پہلے وہ انتہائی ترقی کی حالت میں تھے، اور اس کے ساتھ اپنے مذہبی ایمان میں انتہا درجہ کے مضبوط بھی تھے۔ بخلاف اس کے یورپ کے مسیحی اور جاپان کے بودھی جب پکے مسیحی اور بودھی تھے تو حد درجہ تنزل کی حالت میں تھے اور جب انہوں نے ترقی کی تو مسیحیت اور بودھیت پر ان کا ایمان نہ رہا۔ یہ اسلام کے ایمانیات اور دوسرے مذاہب کے ایمانیات کا ایسا نمایاں فرق ہے جس کو ادنیٰ تامل کے ساتھ ہر صاحب عقل و بصیرت انسان محسوس کر سکتا ہے۔

دنیوی ایمان اب دوسری طرف ان ایمانیات پر نظر ڈالئے جن کو ہم دنیوی ایمانیات سے تعبیر کر رہے ہیں ان میں کوئی مذہبی عنصر شامل نہیں ہے۔ نہ یہاں کوئی خدا ہے، نہ کوئی مذہبی پیشوا، نہ کوئی الہامی کتاب، نہ کوئی ایسی تعلیم جو انسانی سیرت کو روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرنے والی ہو۔ یہ خالص دنیوی امور ہیں

ان میں سب سے بڑی چیز "قوم" ہے جسے ایک خاص رقبے کے رہنے والے لوگ معبود بنا کر پورے خلوص و انہماک کے ساتھ پوجتے ہیں، تمام "قوم پرست" اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ قوم ان کے جان و مال کی مالک ہے، اس کی خدمت و حفاظت فرض ہے، اس کی خدمت میں جان دینا اور اس پر تن من دھن نثار کر دینا عین سعادت ہے، اور یہی نہیں بلکہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ انہی کی قوم برحق ہے، وہی زمین کی وارث اور مستحق ہے، دنیا کی تمام زمینیں اور دنیا کی ساری قومیں اس کے لئے غنائم اور رعایا کی حیثیت رکھتی ہیں، ہر شخص کا فرض ہے کہ سارے جہان میں اپنی قوم کا علم بلند کرے۔

دوسرا معبود ملک کا "قانون" ہے جس کو وہ خود بناتے ہیں اور پھر خود ہی اس کی عبادت کرتے ہیں۔ یہی عبادت ان کے اجتماعی ضبط و نظم کی ضامن ہے،

تیسرا معبود ان کا اپنا "نفس" ہے جس کی پرورش، جس کی حاجات و ضروریات کی تکمیل، اور جس کے داعیات و خواہشات کی تحصیل ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی ہے۔

چوتھا معبود "علم و حکمت" ہے جس پر وہ ایمان لاتے ہیں، جن کی روشنی میں چلتے ہیں، اور جن کی رہنمائی میں ترقی کی راہ پر گام زن ہوتے ہیں۔

یہ ایمانیات یقیناً دنیوی زندگی کے لئے ایک حد تک مفید ہیں مگر قطع نظر اس کے کہ حق اور صداقت کے اعتبار سے ان کا کیا مرتبہ ہے، خالص دنیوی نقطۂ نظر سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا فائدہ نہ حقیقی ہے، نہ پائدار۔ ان کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں کوئی روحانی و اخلاقی عنصر شامل نہیں ہوتا اسلئے مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹتے ہی اخلاقی مفاسد کا طوفان امڈ آتا ہے۔ قومیت کا یہ منصب نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں حاسۂ اخلاقی پیدا کرے اور صحیح اصول اخلاق کا کوئی معیار قائم کر دے۔ نہ اس میں اتنی قوت ہے کہ شخصی و اجتماعی زندگی میں اخلاق کی حفاظت کر سکے، اس کا اثر اور دائرۂ عمل بس محدود ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ وہ قانون جس کو لوگ خود بناتے ہیں، اس معاملہ میں اور بھی زیادہ بے وقع ہوا ہے۔ اس لئے کہ ایسے قانون کی گرفت کو تنگ اور ڈھیلا کرنا تو لوگوں کے اپنے اختیار میں ہے جتنی جتنی آزادیٔ عمل کی خواہش لوگوں میں بڑھتی جاتی ہے، پرانی اخلاقی بندشیں تنگ اور ناقابل برداشت محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اور جب کسی اخلاقی بندش کے متعلق یہ احساس عام ہو جاتا ہے، تو رائے عام کا دباؤ قانون کو اپنے بند ڈھیلے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اخلاق کے سارے بند کھل جاتے ہیں، ایک عام اخلاقی انحطاط شروع ہو جاتا ہے اور اخلاقی انحطاط وہ چیز ہے جس کے مہلک اثرات کو نہ دولت کی فراوانی روک سکتی ہے، نہ حکومت کا زور، نہ مادی وسائل کی قوت، نہ علم و حکمت کی تدابیر، یہ ایک گھن ہے جو اندر سے لگنا شروع ہوتا ہے۔ اور مضبوط سے مضبوط عمارت کو اس کے تمام ساز و سامان سمیت لے بیٹھتا ہے۔

ان کے علاوہ قوم پرستی اور نفس پرستی کے جو دوسرے مفاسد ہیں وہ اتنے نمایاں ہیں کہ ان کے بیان میں کچھ زیادہ تفصیل کی حاجت نہیں ہے۔ اب تو ان کو سمجھنے کے لئے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں

یہی وہ نظریات سے گذر کر محسوسات و مشاہدات کے درجہ میں آگئے ہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج انہی کی بدولت ایک بہت بڑی تہذیب ہلاکت و بربادی کے سرے پر پہنچ گئی ہے۔ اور وہ انہی کے نتائج ہیں جن کے یقینی ظہور کا اندیشہ آج تمام دنیا کو لرزہ براندام کیے ہوئے ہے

چند اصول کلیہ اس تمام بحث سے چند اصول کلیہ مستنبط ہوتے ہیں جن کو آیندہ مباحث کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے ایک ترتیب صحیح کے ساتھ ذہن نشین کر لینا چاہئے۔

(۱) انسانی اعمال کا منضبط اور منظم ہونا منحصر ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل اور متعین سیرت بن جائے۔ کسی مستقل سیرت کے بغیر انسان کی عملی زندگی پراگندہ، متلوّن، اور ناقابل وثوق رہتی ہے۔

(۲) سیرت کی بنیاد ان تصورات پر ہے جو ذہن میں پوری قوت کے ساتھ راسخ ہو جائیں، اور اتنا غلبہ حاصل کر لیں کہ انسان کی ساری عملی قوتیں انہیں کے زیر اثر رہ کر کام کرنے لگیں۔ اس رسوخ کا اصطلاحی نام "ایمان" ہے، اور اس طرح راسخ ہو جانے والے تصورات کو ہم "ایمانیات" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۳) سیرت کی اچھی اور بری، صحیح اور غلط، مضبوط اور کمزور تشکیل، کلیۃً انہی "ایمانیات" کی نوعیت اور ان کے رسوخ ایمانی پر منحصر ہے۔ ایمانیات صحیح ہوں تو سیرت بھی صحیح ہوگی، ایمان مضبوط ہو تو سیرت بھی مضبوط ہوگی۔ ورنہ معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ لہٰذا انسان کی زندگی کو ایک صحیح اور اعلیٰ درجہ کے نظم میں لانے کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کی سیرت کو ایک صحیح اور مضبوط ایمان پر قائم کیا جائے۔

(۴) جس طرح شخص واحد کے اعمال حیات کو پراگندگی سے نکال کر ضبط اور نظم کے تحت لانے کے لئے ایمان کی ضرورت ہے اسی طرح بہت سے اشخاص کو انتشار اور تفرقہ کی حالت سے نکال کر ایک منظم اور متحد جمعیت بنا دینے کے لئے ضروری ہے کہ ان سب کے دلوں میں ایک ہی مشترک ایمان بٹھا دیا جائے یعنی تمدن کا مفاد اس کا مقتضی ہے کہ ایمان کا معاملہ محض شخصی نہ رہے، بلکہ قومیت کا رشتہ اتحاد بن جائے

۵۔ جب ایک مشترک ایمان کے زیر اثر بہت سے افراد میں ایک مشترک قومی سیرت بن جاتی ہے، اور اس سیرت کے اثر سے ان کی زندگی کے اعمال میں ایک طرح کی یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے، تو ایک خاص طرز و انداز کی تہذیب وجود میں آتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر تہذیب کی تاسیس اور تشکیل میں ان ایمانیات کا بڑا دخل ہے جو قومی سیرت کو بناتے اور پختہ کرتے ہیں۔

(۶) جس قوم کے ایمانیات روحانی امور پر مشتمل ہوتے ہیں اس کا مذہب اور اس کی تہذیب دونوں ایک ہوتے ہیں، اور جس کے ایمانیات دنیوی امور پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کی تہذیب اس کے مذہب سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس دوسری صورت میں شخصی اور قومی زندگی پر مذہب کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

(۷) تہذیب کا مذہب سے آزاد ہو جانا آخر کار اخلاقی انحطاط اور تباہی کا موجب ہوتا ہے۔

(۸) تہذیب کا مذہب کے زیر اثر رہنا منحصر ہے اس پر کہ مذہب کے ایمانیات ایسے روحانی امور پر مشتمل ہوں جو ادنیٰ مدارج سے لیکر بلند ترین مدارج تک انسان کے ارتقائے عقلی کا ساتھ دے سکیں اور جن سے انسانی سیرت کی تشکیل اس طرح پر ہو کہ وہ بیک وقت اعلیٰ درجہ کا دیندار بھی ہو اور دنیادار بھی، بلکہ اس کی دنیاداری عین دینداری ہو اور دین داری، عین دنیاداری۔

(۹) جس قوم کا مذہب و تہذیب دونوں ایک ہوں، اس کا ایمان نرا مذہبی ایمان ہی نہیں ہوتا بلکہ بعینہٖ دنیوی ایمان بھی ہوتا ہے۔ اس کے ایمان کا متزلزل ہونا اس کے مذہب اور اس کی تہذیب دونوں کے لئے غارت گر ہے، اس کی دنیا اور اس کے دین دونوں کے لئے تباہ کن ہے۔

یہی وہ اصول کلیہ ہیں جن کے لحاظ سے ہم کو ایمان کے متعلق اسلام کے موقف پر تنقیدی نظر ڈالنی ہے۔ (باقی)

کرشمۂ قدرت

از مولانا عبداللہ العمادی

کائنات کی ہر چیز اپنی قدرت و اقتدار کی نمائش چاہتی ہے مگر مبدع کائنات کی قدرت کاملہ کی نموداریوں کو دیکھتی ہی نہیں، اور اگر غلط انداز نظروں سے دیکھ بھی لیا تو آمادۂ تکذیب ہوگئے آج کی صحبت میں اسی قدرت کاملہ کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے جس کو سمجھنے اور جس سے عبرت حاصل کرنے کے لئے پہلے آپ سورۂ رحمان کی تلاوت کر لیجئے اور پھر اُس رحمان رحیم کی قدرت دیکھئے۔

(۱)

سورۂ رحمان میں جا بجا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ کا تنبیہی فقرہ وارد ہوا ہے جس کے معنی بتائے جاتے ہیں "اے جماعت جن و انسان تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے" اس فقرہ کا نسق اس طرح واقع ہوا ہے کہ پہلے خدا کی نعمتیں مذکور ہیں۔ پھر ان پر تنبیہ کیا گیا ہے۔ مثلاً۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ فِیْهَا فَاکِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَکْمَامِ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ۔	اور (اسی خدا نے) خلقت کے (فائدہ کے) لئے زمین بنا دی ہے کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن (کی گیلوں) پر (قدرتی) غلاف چڑھے ہوتے ہیں اور (طرح طرح) کے اناج جو (بھوسی کے) خول میں

ہوتے ہیں اور خوشبودار پھول ہیں۔ تو (اے جماعت جن و انسان) تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہوگے؟

لیکن مشکل یہ ہے کہ اس فقرہ کے قبل جا بجا ایسی ترہیب و تہدید کی آیتیں بھی وارد ہیں جن سے نعمت و رحمت کا مفہوم مشکل سمجھ میں آسکتا ہے۔ مثلاً:۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَا الثَّقَلٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۔ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ (آیت ۱۵-۲۲)	اے دونو گروہو عنقریب ہم تمہاری طرف کلیۃً متوجہ ہونے والے ہیں۔ تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں سے تم دونوں مکرتے رہوگے۔ اے گروہ جن و انس اگر تم سے ہوسکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں (ہوکر کہیں کو) نکل بھاگو تو نکل دیکھو مگر کچھ ایسا ہی زور ہو تو نکلو (اور وہ تم میں نہ ہے اور نہ ہو) تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ تم پر آگ کی کچی پکی لو برسائی جائیگی کہ تم (اس کو) دفع نہ کرسکوگے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں سے مکرتے رہوگے پھر جب (قیامت کے دن) آسمان پھٹا اور تیل کی طرح (اس کی رنگت) لال ہوئی (وہ آخری فیصلہ کا دن ہوگا) تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ تو اس دن نہ تو گنہگار سے گناہ کی بابت کسی آدمی سے پوچھا جائیگا اور نہ کسی جن[1] سے تو اے دونو گروہو تم خدا کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے؛ اس دن گنہگار

[1] یہ ترجمہ ہم نے سب سے الگ ہو کر اس لئے کیا ہے کہ امام رازی نے اس آیت کی ترکیب میں ایک مشکل پیدا کر دی ہے۔ بقیہ صفحہ ۲۶

ان کی صورت سے پہچان لیا جائے گا۔ پھر (ان کے) پٹھے اور پاؤں پکڑے جائیں گے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ یہ ہے وہ جہنم جس کو گنہگار لوگ جھٹلاتے ہیں (اور قیامت کے دن) اس میں اور کھولتے ہوئے پانی میں (بیقرار پڑے) پھریں گے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے "۔

اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے کوشش ہونے لگی کہ جس طرح ہوسکے وعید آخرت و عذاب جہنم وغیرہ سے بھی نعمت کی شان پیدا کی جائے اور ثابت کیا جائے کہ لوگ جس چیز کو عذاب سمجھ رہے ہیں اس میں بھی نعمت و رحمت کی ادائیں ہیں۔ اس بنا پر تاویلات ذیل غور طلب ہیں:۔

الف جن و انس کی جانب عذاب و ثواب پہونچانے کے لئے خدا کا متوجہ ہونا خود ہی نعمت ہے۔ اس سے بڑی اور نعمت کیا ہوگی کہ مطیع کو ثواب اور منکر کو عذاب دیا جائے گا۔ [۱]

(ب) آسمان و زمین کے دائرہ سے باہر نکل جانے کی دھمکی بھی نعمت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے جن و انس کے درمیان اس بات میں برابر کی نعمت عطا فرمائی ہے کہ اس کے ارادات و احکام کے خلاف نہ جن کوئی کام کر سکتے ہیں اور نہ انسان۔ [۲]

(ج) آگ کی کچی پکی لو برسائی جانے اور آسمان پھٹنے اور لال ہونے میں کوئی تاویل نہ چل سکی اور نعمت کا مفہوم ان چیزوں میں کسی طرح نہ نکل سکا۔ اس لئے علامہ ابن جریر نے اس آیت میں نعمت کی تاویل نظر انداز کر دی [۳]، مگر دوسرے مفسرین یہی کہتے چلے جاتے ہیں اور نعمت کا مطلب نکالنے کے باب میں خاموش

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵) اس کے دو جواب دئے ہیں۔ پہلا جواب ان کی رائے میں معمولی ہے اور دوسرے جواب کی نسبت کہتے ہیں۔ "وثانیہما وہو الادق و بالقبول احق ان جعل ما بعد الیہ الضمیر قبل الفعل مقال تقدیرہ" فالمذنب یومئذ لا یسأل عن ذنبہ انس ولا جان "۔ ملاحظہ ہو جلد ۸ صفحہ ۲۵۔

[۱] ابن جریر۔ جلد ۲۷۔ آخر صفحہ ۷۱۔

[۲] ابن جریر جلد ۲۷۔ آخر صفحہ ۷۲، و اول صفحہ ۷۱۔

[۳] ابن جریر۔ صفحہ ۷۴۔

ہو جاتے ہیں۔

(د) گنہگار کے گناہ کی بابت کسی دوسرے سے سوال نہ ہونا اس لئے نعمت ہے کہ صرف گنہگار پر عذاب ہوگا اور بے گناہ بری رہیں گے

(ھ) گنہگاروں کی پہچان قائم رہنا اور ان کی پکڑ دھکڑ ہونا بھی نعمت ہے کہ انہیں کی ذلت واہانت ہوئی اور دوسرے بچ گئے [۲]۔

(و) گنہگاروں کا جہنم سپرد کرنا اور انھیں کھولتے پانی میں ڈالنا بھی نعمت ہے اس لئے کہ وہ اسکے مستحق تھے۔ [۳]

(ز) نعمتیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔

ایک نعمت ضروریات زندگی کا پیدا کرنا ہے مثلاً زمین جس پر ہم رہتے ہیں۔ اس کا پیدا کرنا بھی نعمت ہے یہ نہ ہوتی تو جگہ رہنے کے لئے کہاں سے آتی۔

نعمت کی دوسری قسم میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کو بلا واسطہ ضروریات زندگی میں داخل کرنا تو مشکل ہے۔ مگر ہماری ضرورتوں میں کاربرآری کے لئے اُن کا ہونا بھی لازمی ہے مثلاً نظام شمسی کی حرکت اور سیاروں کی چال کہ بغیر ان کے نہ موسم بدل سکتے ہیں۔ اور نہ غلہ پیدا ہو سکتا ہے۔

تیسری قسم کی نعمت وہ ہے کہ گو محتاج الیہ نہ سہی مگر مفید ضرور ہے مثلاً دریاؤں کا پیدا کرنا اور کشتیاں چلانا۔

چوتھی قسم کی وہ نعمت ہے کہ چاہے مفید نہو۔ مگر ان سے ایک طرح کی آرایش ہو جایا کرتی ہے۔ جیسے لعل گوہر یہ چاروں نعمتیں تو قوائے جسمانی کے متعلق ہوئیں۔ پانچویں نعمت جو سب سے بڑی ہے یہ ہے کہ خدا نے یہ جسمانی نعمتیں بھی انسان کو عنایت کیں اور ان سب سے اعلیٰ ایک روحانی نعمت بھی عطا فرمائی یعنی علم

---

[۱] ابن جریر صفحہ ۷۵؛ [۲] ابن جریر۔ صفحہ ۷۵؛ [۳] ابن جریر صفحہ ۷۶۔

تعلیم (الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان)

یہی وہ تاویلیں جن کی بنا پر فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن میں لفظ "آلاء" کو نعمتوں کا مرادف ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن کیا اس حد تک پہنچ کر تحقیق کا خاتمہ ہوگیا اور آگے کے لئے کوئی بات باقی نہیں رہی اس کی تنقیح کے لئے ایک ذرا تامل کرنا چاہئے۔

——— (۲) ———

ان تاویلات کے متعلق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے اس لئے کہ منکروں پر عذاب ہونا ممکن ہے کہ مطیع بندوں کے لئے رحمت و نعمت ہو کہ بارے اس بلا و مصیبت میں وہی مبتلا ہوے جو اس کے مستحق تھے غیر مستحق بچ تو رہے لیکن سوال یہ ہے کہ عذاب جہنم کی وعید تو صرف منکروں سے مخصوص ہے مطیع و مومن کو اس سے کیا تعلق آگ کی کچھ بچی تو انھیں جن وانس پر برسائی جائے گی جنھیں خدا کی خدائی سے انکار تھا اور دنیا میں وہ اس کی عظمت و جبروت کو جھٹلایا کرتے تھے۔ آیات میں انھیں منکروں سے خطاب بھی ہے اور انھیں کو ڈرایا بھی گیا ظاہر ہے کہ انکا گرفتار بلا ہونا دوسروں کے لئے نعمت ہو تو ہو خود ان کے لئے کسی طرح بھی نعمت نہیں۔ اور دوسروں کا جب یہاں تعلق ہی نہیں تو یہ بیل منڈھے چڑھے تو کیونکر؟ خطاب ہو منکرین و مکذبین سے مستحق عذاب ہوں منکرین و مکذبین۔ عذاب میں خود ان کے لئے کسی قسم کی نعمت و رحمت کا شائبہ نہو۔ بایں ہمہ صرف پرائی نعمت کو یاد دلا دلا کے ان پر مار پڑے یہ ہی شل ہوئی کہ ہمسایہ کو خلعت ملا اور ما رجھ پر پڑی کہ تو اس نعمت کی قدر نہیں کرتا اور احسان نہیں مانتا۔ رہی نعمتوں کی فیلسوفانہ تقسیم۔ تو اس میں ہزار نکتے نکالے جائیں۔ مگر یہ باتیں اسی وقت مفید ہو سکتی ہیں جب پہلے یہ ثابت ہوے کہ منکروں کا آگ میں جلایا جانا خود ان منکروں کے لئے زحمت نہیں ہے رحمت ہے۔ یہ کیا کہ رحمت کا تعلق ہو مومنین سے ہو اور اس کا احسان کفار پر جتایا جائے یہ تو لسان الغیب کی داد خواہی ہوی کہ ؎

ؔ تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۵

خدا یا داد من بستاں از وائے شحنۂ مجلس
کہ مے با دیگراں خوردست و با من سرگراں دارد

(۳)

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ہر آیہ اور ہر سورہ اپنے ماقبل و ما بعد سے مربوط و منظم ہے۔ سورۂ رحمٰن سے پہلے سورۂ قمر ہے جس میں چاند جیسے عظیم الشان کرّہ کے پھٹنے۔ فضائے آسمان کے پٹ کھولنے اور بڑی بڑی جبار اقوام کے پامال و فنا کر دینے کے اشارے ہیں اور ان سب کے تذکرہ سے خدا نے بندوں پہ اپنی عظمت و جلال و قدرت کا سکہ بٹھایا ہے۔ سورہ رحمٰن کے بعد سورہ واقعہ ہے جس میں قیامت ہونے زمین کے ہل اٹھنے۔ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے بہشتیوں اور دوزخیوں پر رحمت اور عذاب ہونے سڑی گلی ہڈیوں پہ گوشت و پوست پہنا کر آدمی بنانے مخلوقات کی شکل و ہیئتی بدل دینے وغیرہ کے تذکرے ہیں اور ان کی بھی یہی غرض ہے کہ کُند ذہن و خود غلط انسان کو جناب باری کی عظمت و اقتدار کا اندازہ ہو سکے۔ ان دونوں کے بیچ میں سورۂ رحمٰن ہے جس کا افتتاح اس پہ ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ خَلَقَ	اس بڑے رحم والے معبود نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو
الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ اَلشَّمْسُ وَ	پیدا کیا۔ اُسے بولنا سکھایا۔ سورج اور چاند ایک حساب کے
الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ	ساتھ (گردش میں) ہیں۔ اور بوٹے اور درخت سر

لہ "نجم" ستارہ کو بھی کہتے ہیں اور بوٹیوں کی جھاڑی کو بھی لیکن ستارے کی نسبت درخت کے ساتھ مل ہونے کو زیادہ مناسب اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس و سعید و سُدّی و سفیان سے یہی روایت بھی کی ہے کہ اس آیت میں شجر سے مراد درخت ہے اور نجم سے بوٹیوں کی جھاڑی۔ خود ابن جریر بھی اختلاف کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں۔ واولی القولین قول من قال عنی بالنجم ما نجم عن الارض من نبت لعطف الشجر علیه فکان بان یکون معناه لذلک ما قام علی ساق وما لا یقوم علی ساق یسجدان للّٰه بمعنی انه تسجد له الاشیاء کلها المختلفات الہیٔات من خلقه (یعنی نجم کے معنی میں ستارہ اور بوٹوں کی جھاڑی کے دو قول جو ہیں تو ان دونوں میں یہ قول زیادہ صحیح و مناسب ہے کہ "نجم" سے مراد وہ نباتی جھاڑیاں ہیں جو زمین سے اگتی ہیں۔ اس لئے کہ لفظ "شجر" اسی پہ معطوف ہے گویا مطلب یہ ہے کہ درخت جو ساق دار ہوتا ہے اور جھاڑی جو بے ساق کی ہوتی ہے دونوں خدا کے آگے سربسجود ہیں یعنی اس کی مخلوقات میں تمام چیزیں جن کی شکل و ہیئات خواہ کتنی ہی مختلف ہو سب اس کی فرمانبرداری کے لئے حاضر ہیں، تفسیر ابن جریر ج ۲۷ ص ۶۲

يَسْجُدَانِ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَ	بسجود ہیں[1]۔ اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور ترازو بنا دی
وَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي	ہے کہ تم لوگ تولنے میں (حد اعتدال سے) تجاوز نہ کرو۔ اور
الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ	انصاف کے ساتھ سیدھی تول تولو اور کم نہ تولو۔ اور
وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ وَالْأَرْضَ	اسی نے خلقت کے (فائدہ کے) لئے زمین بنا دی ہے کہ
وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ فِيهَا فَاكِهَةٌ	اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن (کی گیلوں)
وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ وَالْحَبُّ	پر (قدرتی) غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ اور (طرح طرح کے) اناج
ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ فَبِأَيِّ	جو (بھوسی کے) خول میں ہوتے ہیں۔ اور خوشبودار پھول ہیں۔ تو
آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ خَلَقَ	(اے جن و انسان کے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی
الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ	کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ اسی نے انسان (اول)
وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ	کو ٹھیکری کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو آگ کی لو
فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ رَبُّ	سے۔ تو (اے دونو گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں
الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ فَبِأَيِّ	سے مکرتے رہوگے۔ (وہی جاڑے اور گرمی میں) آفتاب کے نکلنے کے
آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ	دو (مختلف مقاموں) اور (ایسے ہی) ڈوبنے کے دو (مختلف)

[1] سجدہ سر جھکانے کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ نہ درخت سر جھکاتے اور نہ جھاڑیاں سجدہ کرتیں۔ لیکن علامہ ابن جریر طبری نے ابو رزین و سعید سے روایت کی ہے کہ ظلہما سجودھما۔ (یعنی درختوں اور جھاڑیوں کا سجدہ یہی ہے کہ ان کا سایا پڑا پھرتا ہے۔ ابن جریر صفحہ ۶۲) اصل میں سجدہ کے مفہوم میں غایت انکسار و تذلل و فرماں برداری مضمر ہے۔ اس لئے آیت میں سجدہ سے سر جھکانے کی ہیئات مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم مقصود ہے۔ علامہ ابوالسعود صفحہ (۲۰۲) میں لکھتے ہیں:- "یسجدان ای ینقاد له تعالیٰ فیما یرید بهما طبعًا انقیاد الساجدین من المکلفین طوعًا" (طبعہ) درخت اور جھاڑیاں سجدہ کرتی ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا جس بات کو چاہتا ہے۔ وہ قدرتی طور پر اس امر میں حکم الٰہی کی مطیع رہتی ہیں اور یہ اطاعت ان کی اسی رنگ کی ہے جس رنگ میں کہ خدا کے مکلف بندے اظہار اطاعت کے لئے سجدہ کرتے ہیں۔

يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۱-۱۳)

مقاموں کا مالک ہے۔ تو (اے دونو گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے" اسی نے دو (طرح کے) دریا نکالے کہ آپس میں ملتے ہیں (اور پھر بھی) دونوں میں ایک پردہ (رہتا) ہے کہ (اس سے ایک دوسرے کی طرف) بڑھ نہیں سکتے۔ تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہوگے نکلتے ہیں ان دونوں میں سے بڑے اور چھوٹے موتی۔ تو اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے" اور اسی کے ہیں جہاز جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے (دکھائی دیتے) ہیں تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ اس کرۂ زمین پر جتنے متنفس ہیں سب فنا ہونے والے ہیں اور (صرف) تیرے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی جو بڑی عظمت والی اور بزرگ ذات ہے۔ تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔

لے دو دریا نکالنے کے متعلق عجیب عجیب اختلافات پیدا ہوگئے ہیں۔ مشکل پسند طبیعتوں کے نزدیک معمولی دریاؤں میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی کہ قرآن میں ان کا تذکرہ ہوتا اس لئے بات یہ پیدا کی کہ دو دریاؤں سے ایک وہ دریا مراد ہے جو آسمان میں ہے اور ایک وہ جو زمین ہے۔ یہ دونوں سال میں ایک مرتبہ ملجایا کرتے ہیں۔
دوسرے فریق نے غالباً یہ سمجھ کر کہ بحر فارس و بحر روم سے مسلمانوں کے تعلقات نہایت وسیع ہیں تعیین کر دی کہ "مرج البحرین" میں خدا نے انہیں دونوں دریاؤں کا ارادہ کیا ہے۔
ابن جریر نے صفحہ ۶۸ میں یہ دونوں روایتیں نقل کی ہیں۔ اور خود ان کی رائے میں پہلی روایت کو ترجیح ہے لیکن اس مشکل پسندی میں پھنسنے کی ضرورت کیا ہے۔ جس چیز کا تعین خدا و رسولؐ نے نہ کیا ہو اور عقل و علم بھی اس کے حامی نہ ہوں اس کو ماننا کیا ضرور ہے۔ کیوں نہ وہ تمام دریا اس سے مراد ہوں جو باہم ملتے ہیں اور پھر بھی جدا رہتے

(۴)

تاریخ شاہد ہے کہ عجمیت کے غلبے نے عربیت کے خط وخال تک بدل دیے اس طوفان میں عربی زبان اور اس کے اسلوب کا برقرار رہنا کچھ آسان نہ تھا، الفاظ تو وہی رہے، مگر معانی تبدیل ہوگئے لغویین نے کہ سب کے سب عجمی تھے اِلّا ماشاء اللہ، نئے بنے ہوئے معانی لغت میں ثبت کر دیے کس کو فرصت کہ کلام جاہلیت کا تتبع کرے اور دیکھے کہ کلام اللہ جس زبان میں نازل ہوا اس کے کلمات کا مفہوم اس زبان میں کیا تھا۔

یہی دیکھیے کہ لفظ آلاء کے معنی سب نے نعمتوں کے قرار دیئے ہیں۔ علامہ زمخشری عربی زبان کے ایک مشہور ادیب ہیں اور عربیت میں ان کی دستگاہ مسلم ہے، مگر اپنی تفسیر میں وہ بھی اس سے قدم نہیں ہٹاتے

سے بقیہ صفحہ ۳۱۔ کمال اتصال پر بھی ایک دوسرے سے ممتاز ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر زیادتی کا موقع نہ ملے۔

سے امام رازی نے یہ مانکر کہ آیت مذکورہ میں دو دریاؤں سے میٹھے اور کھارے پانی کے دو دریا مراد ہیں۔ خود ہی یہ اعتراض کیا ہے کہ ان دونوں قسم کے دریاؤں سے موتی کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں۔ موتی تو بعض دریائے شور میں پیدا ہوتے ہیں میٹھے پانی کے سمندر میں تو پیدا نہیں ہوتے اس اعتراض کا امام صاحب نے کئی طرح سے جواب دیا ہے۔

(۱) قرآن جب دعوی کر رہا ہے کہ دونوں قسم کے سمندروں سے موتی نکلتے ہیں تو اس کے خلاف انسانی تجربہ ناقابل تسلیم ہے

(۲) بالفرض دریائے شور ہی میں موتی پیدا ہوتے ہوں لیکن آخر پیدا تو صدف کے اندر مینہ کے قطرہ ہی سے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مینہ کو آسمان ہی کے دریا سے تعلق ہے۔

(۳) دونوں دریاؤں سے موتی پیدا ہونے کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہوں تو دونوں میں ہوں۔ کسی ایک میں بھی اگر پیدا ہوں تو مطلب نکل آیا۔ محاورہ میں کہتے ہیں خرج فلان من بلاد کذا۔ وخل بلاد کذا۔ بلاد بلد کی جمع ہے۔ حالانکہ اس شخص کا داخلہ یا خروج کسی ایک خاص شہر سے ہوا کرتا ہے (تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۰۵)

ان تاویلوں کے متعلق دریافت طلب یہ ہے کہ:۔ (۱) قرآن نے کب اور کہاں یہ دعوی کیا کہ مرج البحرین میں "بحرین" سے دریائے شور و دریائے شیریں مراد ہیں اور ان دونوں سے موتی پیدا ہوتے ہیں۔ (۲) صدف میں مینہ کے قطرے سے موتی کا پیدا ہونا خلاف تحقیق ہے۔ (۳) آخری تاویل قرین قیاس ہے بشرطیکہ تاویل کا مبنی ضعیف نہ ہو۔

سے محاورہ عرب میں بڑے موتیوں کو لؤلؤ اور چھوٹے کو مرجان کہتے ہیں۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس اور قتادہ وضحاک کی روایتیں بھی اس کی تائید میں نقل کی ہیں (تفسیر ابن جریر جلد ۲۷ صفحہ ۶۹)

اہل لغت میں صاحبِ لسان العرب کا خاص پایہ ہے مگر وہ بھی آگے نہیں بڑھتے۔[1]
اکیلے ایک ابن جریر طبری ہیں کہ آلاء کے معنی "قدرة" لکھتے ہیں۔

لیکن اس معرکۂ جدل میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کلام اللہ جس زبان میں نازل ہوا ہے اسی زبان اور اسی صدی کی زبان میں دیکھیں کہ اہل زبان اس کے کیا معنی سمجھتے تھے۔

کمیت اپنے گھوڑے کی صفت کرتا ہے۔

فرضیت "الاء" الکمیت فمن یدع | فرسا فلیس جوادنا بمباع[2]

حماسی اپنے ممدوح ولید بن ادہم کے اقتدار کا مرثیہ خوان ہے:۔

اذا ما امرؤ اثنی بآلاء میّت | فلا یبعد اللہ الولید بن ادھما

فضالہ فقر کی برائیاں گنتا ہے:۔

وفی الفقر ذلٌّ للرقاب، وقلّما | رأیتُ فقیراً غیر نکس مُذمّم
یلام وان کان الصواب بکفّه | وتُحمد "الاء" البخیل المدرھم[3]

لطف یہ ہے کہ خود صاحب لسان العرب نے مادہ "نبه" میں طرفہ کا یہ شعر نقل کیا ہے:۔

کاملٌ یجمع "الاء" الفتی | نبهٌ سیدُ ساداتٍ خضم[4]

کلام میں تدبر کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں "الاء" کو قدرت واقتدار کے معنے میں استعمال کرتے تھے جو نعمت وعذاب دونوں پر یکساں حاوی ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اوصاف مراد لیتے تھے یہی معانی کلام عرب سے مترشح ہیں اور کلام اللہ میں ٹھیک اترتے ہیں۔

(۵)

---

[1] لسان العرب ج ۱۸ ص ۴۴ [2] کتاب الاقتضاب للبطلیوسی ص ۴۵ [3] کتاب المعمرین ۸۵

[4] لسان العرب ج ۱۷ ص ۴۴۴۔

ایک بات کہنے سے رہ گئی تھی انشاء اللہ نابغہ کا یہ شعر تھا۔

هم الملوك وابناء الملوك لهم　　فضل على الناس في الآلاء والنعم

عجمی اہل لغت "نعم" پر "آلاء" کو قیاس کر کے دونوں کو مترادف سمجھے اور اس ترادف کو درست باور کرنے کے لئے پورا دیوان عجم بھرا پڑا تھا!

فردوسی کہہ چکا ہے :-

بہ پنج انگبیں ریزی و شہد ناب

سمجھے کہ انگبین و شہد ایک ہے تو "آلاء" اور "نعم" کیوں نہ ایک ہوں! اسلوب عرب سے اگر آگاہ ہوتے تو مترادفات کا خیال ہی نہ آتا جس سے ادب عرب کو سروکار ہی نہ تھا۔ جاہلیت کا کوئی دیوان دیکھئے ایک بیت میں ایک معنے کے لئے دو لفظ کبھی نہ لائیں گے اگر کسی نے یہ غلطی کی تو ساقط الاعتبار ہو گیا! نابغہ کا مطلب صاف ہے کہ "آلاء" یعنے اقتدارات اور نعمات دونوں میں اس کے ممدوحین کی فضیلت مسلم ہے۔

حاشیہ۔ آلاء جمع ہے اور إلیٰ واحد و احد کی صورت میں جب کسور الا ذل لاتے ہیں تو اس سے عہد و پیمان مراد لیتے ہیں۔ اعشیٰ کہتا ہے۔

ابیض لا یرهب الهزال "ولا"　　یقطع رحماً ولا یخون "إلا"

جمع کی صورت میں جب الار کو غیر ممدود لاتے ہیں تو اس سے ایک درخت مراد لیتے ہیں جس کے پھل دیکھنے میں تو خوش مزہ مگر چکھنے میں بہت تلخ ہوتے ہیں بشر بن ابی خازم کہتا ہے۔

فانكم ومدحكم بجيرًا　　ابا لجاء كما امتدح "الالاء"

نعمت سے آلار کی تاویل بھی خوش منظر ہے، لیکن اہل ذوق کو اندیشہ ہے آلار کی طرح یہ بھی تلخ نہ ہو

(۶)

مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو کہ سورۂ رحمان کی ابتدا احسان خدا کی جہت سے ہوئی ہے کہ سابق ولاحق کی جلال وجبروت کی باتوں سے انسان مرعوب ہو کر از خود رفتہ نہ ہو جائے۔ وہیں ساتھ کے ساتھ ایسے واقعات بھی یاد دلائے ہیں جو قدرت خداوندی کے عظیم الشان نمونے ہیں اور جن وانس کو ان پر تنبیہ کیا ہے کہ وہ قادر مطلق جس کی قدرت اس قدر وسیع ہو اُس کے کون کون سے اقتدار سے کر سکتے ہو۔ علامہ ابن جریر فرماتے ہیں۔

حدثني يونس قال اخبرنا ابن وهب قال قال ابن زيد في قوله "فبای الآء ربكما تكذبان" قال "الآلاء" القدرة فبای الائه تكذب خلقكم كذا وكذا فبای قدرة الله تكذبان ايها الثقلان الجن والانس[1]	مجھ سے یونس نے روایت کی کہ ابن وہب نے انھیں اطلاع دی کہ یہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ کے متعلق ابن زید کہتے ہیں کہ یہ "آلآء" کے معنے قدرت کے ہیں۔ یعنی خدا نے تمھیں اس طرح پیدا کیا۔ تم اے جماعت جن وانس خدا کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔[1]

امام رازی خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ انسان کو جو نعمتیں خدا نے دی ہیں جب ان کا گنانا مقصود تھا تو "جن" کے پیدا کرنے میں کون سی نعمت ٹھیری۔ اس اعتراض کے تین جواب دئے ہیں، اور آخر میں لکھتے ہیں۔

إن الآية مذكورة لبيان القدرة لا لبيان النعمة[2]	یہ آیۃ نعمت کا تذکرہ کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ قدرت کا تذکرہ کرنے کے لئے ہے[2]

ایک دوسرے مقام پر یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (ان دو طرح کے دریاؤں

---

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۲۷ صفحہ ۶۵

[2] تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۴۔

میں سے بڑے چھوٹے موتی نکلتے ہیں، کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

ای نعمۃ عظیمۃ فی اللؤلؤ والمرجان حتی یذکرھما اللہ تعالیٰ مع نعمۃ تعلیم القرآن وخلق الانسان ؟	بڑے چھوٹے موتی میں کون ایسی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تعلیم اور انسان کی آفرینش کے ساتھ میں اس کا بھی تذکرہ کیا؟

اس اعتراض کے دو جواب دئے ہیں۔ ایک وہ جس میں نعمتوں کی تقسیم کی ہے اور جس کو حرف رزہ کے تحت ہم نقل کرچکے ہیں۔ دوسری توجیہ حسب ذیل ہے:۔

ھذہ بیان عجائب اللہ تعالیٰ لا بیان النعم[1]	یہ اللہ تعالیٰ کے عجائب قدرت کا بیان ہے نعمتوں کا بیان نہیں ہے۔

آلاء کو قدرت کا مماثل مان لینے کے بعد کسی تاویل کی حاجت نہیں رہتی۔ رحمت و نعمت و عذاب ان سب کا مفہوم اسی قدرت کے تحت آجاتا ہے؟

[1] تفسیر کبیر، صـ۱۵۔

منظر الکرام

تالیف

سید منظر علی اشہر

حیدرآباد دکن کے زندہ اکابر و مشاہیر کا تذکرہ ہے جدید حیدرآباد کی اعلیٰ شخصیتوں کے متعلق اس سے بہتر ذخیرہ معلومات اب تک مرتب نہیں ہوا۔ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی نے اسکو حوالہ کی ایک عمدہ کتاب قرار دیکر دفاتر و مدارس تحت کو اس کے خریدنے کی ہدایت کی ہے۔ قیمت ۲ روپیہ۔ مؤلف سے نظام والنیرز کلب خیرت آباد حیدرآباد دکن کے پتہ پر طلب کیجئے۔

اسلامی قومیت

یہ مضمون اعلیٰ حضرت خسرو دکن نواب میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہ کی سالگرہ مبارک کے موقع پر جریدہ "صبح دکن" کے سالگرہ نمبر کے لئے لکھا گیا تھا چونکہ آج کل اسلامی دنیا میں وطن، نسل اور زبان کی بنا پر نئی نئی قومیتیں قائم کرنے کی وبا پھیل رہی ہے اور اسلامی قومیت کے اصول مسلمانوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہوگئے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی ہدایت کے مطابق اسلام کے اصول قومیت، غیر اسلامی قومیتوں کے اصول سے الگ کر کے بتا دیئے جائیں جو لوگ حقیقت میں اسلام کے پیرو ہیں ان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کافی ہے اور جو اپنے اہواء اور تخیلات کا اتباع کرتے ہیں۔ وہ آزاد ہیں کہ جن راہوں میں چاہیں بھٹکتے پھریں۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نورا فما لہ من نور۔ (ایڈیٹر)

وحشت سے مدنیت کی طرف انسان کا پہلا قدم اٹھتے ہی ضروری ہو جاتا ہے کہ کثرت میں وحدت کی ایک شان پیدا ہو اور مشترک اغراض و مصالح کے لئے متعدد افراد آپس میں مل کر تعاون اور اشتراک عمل کریں تمدن کی ترقی کے ساتھ اس اجتماعی وحدت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسی مجموعہ افراد کا نام "قوم" ہے۔ اگرچہ لفظ "قوم" اور "قومیت" اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں حدیث العہد ہیں مگر جس معنے پر ان کا اطلاق ہوتا ہے وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود تمدن قدیم ہے، "قوم" اور "قومیت" جس ہیئت کا نام ہے، وہ بابل، مصر، روم اور یونان میں بھی ویسی ہی تھی جیسی آج فرانس، انگلستان، جرمنی اور اٹلی میں ہے۔

قومیت کے غیر منفک لوازم اس میں شک نہیں کہ قومیت کی ابتدا ایک معصوم جذبہ سے ہوتی ہے یعنی اس کا مقصد اول یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص گروہ کے لوگ اپنے مشترک مفاد و مصالح کے لئے مل کر عمل کریں، اور اجتماعی ضروریات کے لئے ایک "قوم" بن جائیں، لیکن جب ان میں "قومیت" پیدا ہو جاتی ہے، تو لازمی طور پر "عصبیت" کا رنگ اس میں آجاتا ہے، اور جتنی جتنی "قومیت" شدید ہوتی جاتی ہے اسی قدر "عصبیت" میں بھی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب کبھی ایک قوم اپنے مفاد کی خدمت اور اپنے مصالح کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کرے گی یا بالفاظ دیگر اپنے گرد قومیت کا حصار کھینچ لے گی تو لازماً وہ اس حصار کے اندر اور باہر والوں کے درمیان اپنے اور غیر کا امتیاز کرے گی۔ اپنے کو ہر معاملہ میں غیر پر ترجیح دے گی۔ غیر کے مقابلہ میں اپنی کی حمایت کرے گی۔ جب کبھی دونوں کے مفاد و مصالح میں اختلاف واقع ہوگا تو وہ اپنے مفاد کی حفاظت کرے گی اور اس پر غیر کے مفاد کو قربان کر دے گی۔ انہی وجوہ سے ان میں صلح بھی ہوگی اور جنگ بھی۔ مگر رزم اور بزم دونوں میں قومیت کی حد فاصل دونوں گروہوں کے درمیان قائم رہے گی۔ اسی چیز کا نام عصبیت و حمیت ہے۔ اور قومیت کی یہ وہ لازمی خصوصیت ہے جو اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔

قومیت کے عناصر ترکیبی قومیت کا قیام، وحدت و اشتراک کی کسی ایک جہت سے ہوتا ہے، خواہ وہ کوئی جہت ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس میں ایسی زبردست قوت رابطہ و ضابطہ ہونی چاہئے کہ جسام کے تعدد اور نفوس کے تکثر کے باوجود وہ لوگوں کو ایک کلمۂ ایک خیال، ایک مقصد، اور ایک عمل پر جمع کر دے، قوم کے مختلف اور کثیر التعداد اجزاء کو قومیت کے تعلق سے اس طرح لبستہ و پیوستہ کر دے کہ وہ سب ایک ٹھوس چٹان بن جائیں، اور افراد قوم کے دل و دماغ پر اتنا غلبہ و تسلط حاصل کرلے کہ قومی مفاد کے معاملہ میں وہ سب متحد ہوں اور ہر قربانی کے لئے آمادہ رہیں۔

یوں تو اشتراک اور وحدت کی جہتیں بہت سی ہونی ممکن ہیں، لیکن آغاز عہد تاریخ سے آجتک

دنیا میں جتنی قومیتیں بنی ہیں، ان سب کی تعمیر بجز ایک اسلامی قومیت کے حسب ذیل اشتراکات میں سے کسی ایک قسم کے اشتراک پر ہوی ہے۔ اور اس عنصر کے ساتھ چند دوسرے اشتراکات بھی بطور مددگار کے شریک ہوگئے ہیں ا۔

اشتراکِ نسل جس کو "نسلیت" کہتے ہیں۔

اشتراک مرزوبوم جس کو "وطنیت" کہتے ہیں۔

اشتراک زبان جو وحدت خیال کا ایک زبردست ذریعہ ہونے کی وجہ سے قومیت کی تعمیر میں خاص حصہ لیتا ہے۔

اشتراکِ رنگ جو ایک رنگ کے لوگوں میں ہم جنسی کا احساس پیدا کرتا ہے اور پھر یہی احساس ترقی کرکے انکو دوسرے رنگ کے لوگوں سے احتراز واجتناب پر آمادہ کردیتا ہے۔

معاشی اغراض کا اشتراک جو ایک معاشی نظام کے لوگوں کو دوسرے معاشی نظام والوں کے مقابلہ میں ممتاز کرتا ہے۔ اور جس کی بنار پر وہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں اپنے معاشی حقوق ومنافع کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

نظام حکومت کا اشتراک۔ جو ایک سلطنت کی رعایا کو اس کی وفاداری کے رشتہ میں منسلک کرتا ہے، اور دوسری سلطنت کی رعایا کے مقابلے میں حدود فاصلہ قائم کردیتا ہے۔

قدیم ترین عہد سے لیکر آج بیسویں صدی کے روشن زمانے تک جتنی قومیتوں کے عناصر اصلیہ کا آپ تجسس کریں گے۔ ان سب میں آپ کو یہی مذکورۂ بالا عناصر ملیں گے۔

اب سے دو تین ہزار برس پہلے کی یونانیت، رومیت، اسرئیلیت، ایرانیت وغیرہ بھی انہی بنیادوں پر قائم تھیں جن پر آج کی المانیت، فرنساویت، انگریزیت، جاپانیت وغیرہ قائم ہیں۔

شر اور فساد کا سرچشمہ | یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ بنیادیں جن پر دنیا کی مختلف قومیتیں تعمیر کی گئی ہیں

انہوں نے بڑی قوت کے ساتھ جماعتوں کی شیرازہ بندی کی ہے مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ اس قسم کی قومیتیں بنی نوع انسانی کے لئے ایک شدید مصیبت ہیں۔ انہوں نے عالم انسانی کو سینکڑوں ہزاروں حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور حصے بھی ایسے کہ ایک حصہ فنا کیا جا سکتا ہے۔ مٹا دیا جا سکتا ہے۔ مگر دوسرے حصے میں کسی طرح تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نسل دوسری نسل میں نہیں بدل سکتی۔ ایک وطن دوسرا وطن نہیں بن سکتا۔ ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبان کے بولنے والے نہیں بن سکتے ایک رنگ دوسرا رنگ نہیں بن سکتا۔ ایک قوم کی معاشی اغراض بعینہ دوسری قوم کی معاشی اغراض نہیں بن سکتیں۔ ایک سلطنت دوسری سلطنت نہیں بن سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو قومیتیں ان بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہیں، ان کے درمیان مصالحت کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ قومی عصبیت کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے خلاف مسابقت، مزاحمت اور منافست کی ایک دائمی کشمکش میں مبتلا رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کو پامال کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ آپس میں لڑ لڑ کر فنا ہو جاتی ہیں اور پھر انہی بنیادوں پر دوسری قومیتیں ایسے ہی ہنگامے برپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ دنیا میں فساد، بدامنی، اور شرارت کا ایک مستقل سرچشمہ ہے۔ خدا کی سب سے بڑی لعنت ہے شیطان کا سب سے زیادہ کامیاب حربہ ہے جس سے وہ اپنے ازلی دشمن انسان کا شکار کرتا ہے۔

عصبیت جاہلیہ اس قسم کی قومیت کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ وہ انسان میں جاہلانہ عصبیت پیدا کرے۔ ایک قوم کو دوسری قوم سے مخالفت کرنے اور نفرت برتنے پر صرف اس لئے آمادہ کرتی ہے کہ وہ دوسری قوم کیوں ہے؟ اسے حق، صداقت، دیانت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ صرف یہ بات کہ ایک شخص کالا ہے۔ گورے کی نظر میں اسے حقیر بنا دیتی ہے۔ صرف اتنی سی بات کہ ایک انسان ایشیائی ہے۔ مغربی کی نفرتوں، جابرانہ درازدستیوں اور حق تلفیوں کو اس کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ آئن شٹائن جیسے فاضل کا اسرائیلی ہونا اس کے لئے کافی ہے کہ المانی اس سے نفرت کرے۔ ٹشکیدی[1] کا محض

[1] یہ بچوانالینڈ کے بامنگ وانو قبیلہ کا سردار ہے جس کو حال میں ایک یورپین پر سزائے تازیانہ جاری کرنے کے جرم میں معزول (؟) کیا گیا۔

سیاہ فام حبشی ہونا۔ اس کو جائز کر دیتا ہے کہ ایک یورپین کو سزا دینے کے جرم میں اس کی ریاست چھین لی جائے۔ امریکہ کے مہذب باشندوں کے لئے یہ قطعاً جائز ہے کہ وہ حبشیوں کو پکڑ کر زندہ جلا دیں کیونکہ وہ حبشی ہیں۔ المانی کا المانی ہونا اور فرنساوی کا فرنساوی ہونا اس بات کے لئے بالکل کافی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کریں اور دونوں کو ایک دوسرے کے محاسن یک سر معائب نظر آئیں۔ سرحد آزاد کے افغانیوں کا افغانی ہونا اور دمشق کے باشندوں کا عرب ہونا۔ انگریز اور فرنسیسی کو اس کا پورا حق بخش دیتا ہے کہ وہ ان کے سروں پر طیاروں سے گولے برسائیں اور ان کی آبادیوں کا قتل عام کریں خواہ یورپ کے مہذب شہریوں پر اس قسم کی گولہ باری کتنی ہی وحشیانہ حرکت سمجھی جاتی ہو۔ غرض جنسی امتیاز وہ چیز ہے جو انسان کو حق اور انصاف کی طرف سے اندھا بنا دیتی ہے، اور اس کی وجہ سے عالمگیر اصول اخلاق و شرافت بھی قومیتوں کے قالب میں ڈھل کر کہیں ظلم اور کہیں عدل، کہیں سچ اور کہیں جھوٹ، کہیں کمینگی اور کہیں شرافت بن جاتے ہیں۔

کیا انسان کے لئے اس سے زیادہ غیر معقول ذہنیت اور کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک نالائق بدکار، اور شریر آدمی کو ایک لائق، صالح اور نیک نفس آدمی پر صرف اس لئے ترجیح دے کہ پہلا ایک نسل میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا کسی اور نسل میں؟ پہلا سپید اور دوسرا سیاہ۔ پہلا ایک پہاڑ کے مغرب میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس کے مشرق میں؟ پہلا ایک زبان بولتا ہے اور دوسرا کوئی اور زبان؟ پہلا ایک سلطنت کی رعایا ہے دوسرا کسی اور سلطنت کی؟ کیا جلد کے رنگ کو روح کی صفائی و کدورت میں کوئی دخل ہے؟ کیا عقل اس کو باور کرتی ہے کہ اخلاق و اوصاف انسانی کے صلاح و فساد سے پہاڑوں اور دریاؤں کا کوئی تعلق ہے؟ کیا کوئی صحیح الدماغ

بقیہ صفحہ ۲۴۔ سلطنت برطانیہ نے حقوق ریاست سے محروم کر دیا تھا۔ حالانکہ دیسی باشندوں کے ساتھ اُن کے افسوسناک برتاؤ کا خود برٹش ہائی کمشنر کو بھی اعتراف تھا۔ بعد میں غریب سیکیدی کو صرف اس وقت بحال کیا گیا جبکہ اس نے ہمیشہ کے لئے یہ عہد کر لیا کہ وہ کبھی کسی ایسے مقدمہ کا فیصلہ نہ کریگا جس کا کوئی تعلق کسی یورپین سے ہو۔ مگر ایسی کوئی شرط اس عہد نامہ میں نہ رکھی گئی کہ یورپین حضرات دیسی باشندوں کی جان و مال اور عزت و آبرو سے تعرض نہ فرمائیں گے۔

انسان تسلیم کر سکتا ہے کہ مشرق میں جو چیز حق ہو وہ مغرب میں باطل ہو جائے؟ کیا کسی قلب سلیم میں اس چیز کے تصور کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ نیکی، شرافت، اور جوہر انسانیت کو لوگوں کے خون، زبان کی بولی مولد و مسکن کی خاک کے معیار پر جانچا جائے؟ یقیناً عقل ان سوالات کا جواب نفی میں دیگی۔ مگر نسلیت وطنیت اور اس کے بہن بھائی نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہاں ایسا ہی ہے۔

قومیت کے عناصر پر ایک عقلی تنقید تھوڑی دیر کے لئے اس پہلو سے قطع نظر کر لیجئے۔ یہ جتنے اشتراکات آج قومیت کی بنیاد بنے ہوئے ہیں ان کو خود ان کی ذاتی حیثیت سے دیکھئے اور غور کیجئے کہ آیا یہ بجائے خود کوئی مضبوط عقلی بنیاد بھی رکھتے ہیں یا انکی حقیقت محض ایک سراب تخیل ہے۔

نسلیت نسلیت کیا ہے؟ محض خون کا اشتراک۔ اس کا نقطۂ آغاز ماں اور باپ کا نطفہ ہے جس سے چند انسانوں میں خونی رشتہ پیدا ہوتا ہے یہی نقطہ پھیل کر خاندان بنتا ہے پھر قبیلہ، پھر نسل۔ اس آخری حد یعنے نسل تک پہنچتے پہنچتے انسان اپنے اس باپ سے جس کو اس نے اپنی نسل کا مورث اعلیٰ قرار دیا ہے، اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کی مورثیت محض ایک خیالی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ نام نہاد "نسل" کے اس دریا میں بیرونی خون کے بہت سے ندی نالے آکر مل جاتے ہیں۔ اور کوئی صاحب عقل وعلم انسان یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ یہ دریا خالص اسی پانی کا ہے جو اپنے اصلی سرچشمہ سے نکلا تھا۔ پھر اگر اس خلط ملط کے باوجود خون کے اشتراک کی بناء پر انسان ایک "نسل" کو اپنے لئے مادۂ اتحاد قرار دے سکتا ہے۔ تو کیوں نہ اس خون کے اشتراک کو بناء وحدت قرار دیا جائے جو تمام انسانوں کو ان کے پہلے باپ اور پہلی ماں سے ملاتا ہے؟ اور کیوں نہ تمام انسانوں کو ایک ہی نسل اور ایک ہی اصل کی طرف منسوب کیا جائے؟ آج جن لوگوں کو مختلف نسلوں کا بانی و مورث قرار دے لیا گیا ہے ان سب کا نسب اوپر جا کر کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مل جاتا ہے، اور آخر میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ سب ایک اصل سے ہیں۔ پھر یہ آریت اور سامیت کی تقسیم کیسی ہے؟

وطنیت مرز و بوم کے اشتراک کی حقیقت اس سے بھی زیادہ موہوم ہے۔ انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے اس کا رقبہ یقیناً ایک گز مربع سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس رقبہ کو اگر وہ اپنا وطن قرار دے تو شائد وہ کسی کو اپنا ہم وطن نہیں کہہ سکتا۔ لیکن وہ اس چھوٹے سے رقبہ کے اردگرد میلوں اور کوسوں تک، اور بسا اوقات سینکڑوں اور ہزاروں میل تک ایک سرحدی خط کھینچ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں تک میرا وطن ہے اور اس سے باہر جو کچھ ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض اس کی نظر کی تنگی ہے۔ ورنہ کوئی چیز اسے تمام روئے زمین کو اپنا وطن کہنے سے مانع نہیں ہے۔ جس دلیل کی بنا پر ایک مربع گز کا وطن پھیل کر ہزار مربع گز بن سکتا ہے، اسی دلیل کی بنا پر وہ پھیل کر پورا کرۂ ارضی بھی بن سکتا ہے اگر آدمی اپنے زاویۂ نظر کو تنگ نہ کرے تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ یہ دریا، پہاڑ، سمندر وغیرہ جن کو اس نے محض اپنے خیال میں حدود و فواصل قرار دے کر ایک زمین اور دوسری زمین میں فرق کیا ہے اس کے سب ایک ہی زمین کے اجزا ہیں۔ پھر کس بنا پر اس نے ان دریاؤں اور پہاڑوں اور سمندروں کو یہ حق دیدیا کہ وہ اسے ایک خاص خطہ میں قید کر دیں؟ وہ کیوں نہیں کہتا کہ میں زمین کا باشندہ ہوں۔ سارا کرۂ ارضی میرا وطن ہے، جتنے انسان ربع مسکون میں آباد ہیں، میرے ہم وطن ہیں، اس پورے سیارے پر میں وہی پیدائشی حقوق رکھتا ہوں جو اس گز بھر زمین پر مجھے حاصل ہیں جہاں میں پیدا ہوا ہوں؟۔

لسانی امتیاز اشتراک زبان کا فائدہ صرف اس قدر ہے کہ جو لوگ ایک زبان بولتے ہیں وہ باہمی تفاہم اور تبادلۂ خیالات کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں۔ اس سے اجنبیت کا پردہ بڑی حد تک اٹھ جاتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے قریب تر محسوس کرتے ہیں۔ مگر ادائے خیال کے وسیلہ کا مشترک ہونا، خود خیال کے اشتراک کو مستلزم نہیں ہے۔ ایک ہی خیال دس مختلف زبانوں میں ادا ہو سکتا ہے اور ان سب کے بولنے والوں کا اس خیال میں متحد ہو جانا ممکن ہے۔ بخلاف اس کے

وہی مختلف خیالات ایک زبان میں ادا ہو سکتے ہیں۔ اور کچھ بعید نہیں کہ اس زبان کے بولنے والے ان خیالات کے معتقد ہو کر باہم مختلف ہو جائیں۔ لہٰذا وحدت خیال جو حقیقۃً قومیت کی جان ہے اشتراک زبان کا محتاج نہیں ہے۔ اور نہ اشتراک زبان کے ساتھ وحدت خیال ضروری ہے۔ پھر ایک بڑا سوال یہ ہے کہ آدمی کی آدمیت، اور اس کے ذاتی حسن و قبح میں اس کی زبان کو کیا دخل ہے؟ ایک جرمن بولنے والے شخص کو ایک فرنچ بولنے والے کے مقابلہ میں محض اس بنا پر کیسے ترجیح دی جا سکتی ہے کہ وہ جرمن زبان بولتا ہے؟ دیکھنے کی چیز اس کا جوہر ذاتی ہے نہ کہ اس کی زبان۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک ملک کے انتظامی معاملات اور عام کاروبار میں وہی شخص مفید ہو سکتا ہے۔ جو اس ملک کی زبان جانتا ہو۔ مگر انسانیت کی تقسیم اور قومی امتیاز کے لئے یہ کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے۔

امتیاز رنگ انسانی جماعتوں میں رنگ کا امتیاز سب سے زیادہ لغو و مہمل چیز ہے۔ رنگ محض جسم کی ایک صفت ہے مگر انسان کو انسان ہونے کا شرف اس کے جسم کی بنا پر نہیں، اس کی روح اس کے نفس ناطقہ کی بنا پر ہے جس کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ پھر انسان اور انسان میں زردی اور سرخی، سیاہی اور سپیدی کا امتیاز کیسا؟ ہم کالی گائے اور سپید گائے کے دودھ میں کوئی فرق نہیں کرتے اس لئے کہ مقصود اس کا دودھ ہے نہ کہ اس کا رنگ۔ لیکن عقل کی بے راہ روی کا برا ہو کہ اس نے ہم کو انسان کی نفسی صفات سے قطع نظر کر کے اس کی جلد کے رنگ کی طرف متوجہ کر دیا۔

معاشی قومیت معاشی اغراض کا اشتراک انسانی خودغرضی کا ایک ناجائز بچہ ہے۔ قدرت نے اس کو ہرگز پیدا نہیں کیا۔ آدمی کا بچہ کام کرنے کی قوتیں ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے جدوجہد کے لئے اس کو ایک وسیع میدان ملتا ہے اور زندگی بسر کرنے کے بے شمار وسائل اس کا استقبال کرتے ہیں۔ مگر وہ اپنی معیشت کے لئے صرف اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ اس کے لئے رزق کے دروازے

کھلیں بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسروں کے لئے وہ بند ہوجائیں۔ اسی خودغرضی میں انسانوں کی کسی بڑی جماعت کے مشترک ہوجانے سے وہ وحدت پیدا ہوجاتی ہے جو انہیں ایک قوم بننے میں مدد دیتی ہے بظاہر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے معاشی اغراض کا ایک حلقہ قائم کرکے اپنے حقوق ومفاد کا تحفظ کرلیا لیکن جب اسی طرح بہت سی جماعتیں اپنے گرد اس قسم کے حصار کھینچ لیتی ہیں تو انسان پر اس کے اپنے ہاتھوں سے عرصۂ حیات تنگ ہوجاتا ہے۔ اس کی اپنی خودغرضی اس کے پاؤں میں بیڑی اور ہاتھ میں ہتھکڑی بن جاتی ہے۔ اور وہ دوسروں کے لئے رزق کے دروازے بند کرنے کی کوشش میں خود اپنے رزق کے دروازوں کی کنجیاں گم کر دیتا ہے۔ آج ہماری آنکھوں کے سامنے یہ منظر موجود ہے کہ یورپ امریکہ اور جاپان کی سلطنتیں اس خودغرضی کا خمیازہ بھگت رہی ہیں، اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان معاشی قلعوں کو کس طرح مسمار کریں جن کو انہوں نے خود ہی حفاظت کا بہترین وسیلہ سمجھ کر تعمیر کیا تھا۔ کیا اس کے بعد بھی ہم یہ نہ سمجھیں گے کہ کسب معیشت کے لئے حلقوں کی تقسیم اور ان کی بنا پر قومی امتیازات کا قیام ایک غیر عاقلانہ فعل ہے خدا کی وسیع زمین پر انسان کو اپنے رب کا فضل تلاش کرنے کی آزادی دینے میں آخر کونسی قباحت ہے؟

سیاسی قومیت | نظام حکومت کا اشتراک بجائے خود ایک ناپائیدار اور ضعیف البنیان چیز ہے، اور اس کی بنا پر ہرگز کسی مستحکم قومیت کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ ایک سلطنت کی رعایا کو اس کی وفاداری کے رشتہ میں منسلک کرکے ایک قوم بنا دینے کا خیال کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ سلطنت جبتک غالب وقاہر رہتی ہے۔ رعایا اس کے قانون کی گرفت میں بندھی رہتی ہے۔ یہ گرفت جہاں ڈھیلی ہوئی اور مختلف عناصر منتشر ہوگئے سلطنت مغلیہ میں مرکزی طاقت کے کمزور ہونے کے بعد کوئی چیز ہندوستان کے مختلف علاقوں کو اپنی الگ الگ سیاسی قومیتیں بنا لینے سے نہ روک سکی۔ یہی حشر سلطنت عثمانیہ کا ہوا۔ آخر زمانہ میں جوان ترک نے عثمانی قومیت کا قصر تعمیر کرنے کے لئے بہت کچھ زور لگایا۔ مگر ایک ٹھیس لگتے ہی سب اینٹ پتھر جدا ہوگئے۔ تازہ ترین مثال آسٹریا ہنگری کی ہے۔ اور تاریخ سے بہت سی مثالیں اور بھی پیش

کی جا سکتی ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد جو لوگ سیاسی قومیتوں کی تعمیر ممکن سمجھتے ہیں۔ وہ محض اپنے تخیل کی شادابی کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

انسانیت و آفاقیت اس تنقید سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نسل انسانی میں یہ جتنی تفریقیں کی گئی ہیں ان کے لئے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔ یہ صرف حسی اور مادی تفریقیں ہیں جن کا ہر دائرہ زاویۂ نظر کی ہر وسعت پر ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کا قیام و بقا جہالت کی تاریکی، نگاہ کی محدودیت، اور دل کی تنگی پر منحصر ہے۔ علم و عرفان کی روشنی جس قدر پھیلتی ہے، بصیرت کی رسائی جس قدر بڑھتی ہے، قلب میں جتنی جتنی وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ مادی اور حسی پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ نسلیت کو انسانیت کے لئے اور وطنیت کو آفاقیت کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ اختلاف رنگ و زبان میں جوہر انسانی کی وحدت جلوہ گر ہوتی ہے۔ خدا کی زمین میں خدا کے سب بندوں کی معاشی اغراض مشترک پائی جاتی ہیں۔ اور سیاسی نظامات کے دائرے محض چند سائے نظر آتے ہیں جو آفتاب اقبال کی گردش سے روے زمین پر چلتے پھرتے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔

اسلام کا وسیع نظریہ ٹھیک یہی بات ہے جو اسلام کہتا ہے۔ اس نے انسان اور انسان کے درمیان کسی مادی اور حسی تفریق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب انسان ایک ہی اصل سے ہیں:۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (۴: ۱)۔
خدا نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتوں کو دنیا میں پھیلادیا۔

تمہارے درمیان مرز و بوم اور مولد و مدفن کا اختلاف کوئی جوہری چیز نہیں ہے اصل میں تم سب ایک ہی ہو۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ
اور وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔

فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ (۶ : ۱۲) ہر ایک کا ایک ٹھکانا ہے اور ایک جگہ اس کے سپرد خاک ہونے کے لئے ہے۔

اس کے بعد نسل اور خاندان کے اختلاف کی بھی یہ حقیقت بتا دی کہ :-

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ (۴۹ : ۲) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

یعنی یہ شعوب و قبائل کا اختلاف محض تعارف کے لئے ہے، آپس کے بغض ایک دوسرے پر تفاخر، ایک دوسرے سے جھگڑنے کے لئے نہیں ہے۔ اس اختلاف میں انسانی اصل کی وحدت کو نہ بھول جاؤ۔ تم میں اگر کوئی حقیقی تفریق ہے تو وہ صدق اور کذب، نیکی اور بدی کی بنا پر ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ گروہوں کی تفریق اور جماعتوں کا اختلاف خدا کا عذاب ہے جو تم کو آپس کی دشمنی کا مزا چکھاتا ہے۔

أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ (۶ : ۸) یا تم کو گروہ گروہ بنا دے اور تمہیں ایک دوسرے کی قوت کا مزا چکھائے۔

اس گروہ بندی کو اس نے من جملہ اُن جرائم کے قرار دیا ہے جن کی بنا پر فرعون لعنت و عذاب کا مستحق ہوا :-

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى ٱلْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا (۲۸ : ۱) فرعون نے زمین میں تکبر کیا اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا [1]

---

[1] یہ آیت اس تاریخی جرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ فرعون نے مصر کے باشندوں میں قبطی اور غیر قبطی کی تفریق قائم کی اور دونوں کے ساتھ مختلف طرز عمل اختیار کیا۔

پھر کہا کہ زمین خدا کی ہے، اس نے نوع انسانی کو اس میں اپنی خلافت سے سرفراز کیا ہے۔ اس کی سب چیزوں کو انسان کے لئے مسخر کیا ہے، کچھ ضرور نہیں کہ انسان ایک خطہ کا بندہ بن کر رہ جائے یہ وسیع زمین اس کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ ایک جگہ اس کے لئے تنگ ہو تو دوسری جگہ چلا جائے جہاں جائیگا، خدا کی نعمتیں موجود پائے گا۔

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (۲:۴) (آدم کی تخلیق کے وقت خدا نے فرمایا کہ) میں زمین میں ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ (۲۲: ۹)۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے تمہارے لئے ان سب چیزوں کو مسخر کر دیا ہے جو زمین میں ہیں۔

أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا (۴: ۱۴) کیا اللہ کی زمین وسیع اور کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً (۴:۱۴) جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں وافر جگہ اور کشایش پائے گا۔

آپ پورے قرآن کو دیکھ جائیے۔ اس میں ایک لفظ بھی آپ کو نسلیت یا وطنیت کی تائید میں نہ ملے گا۔ اس کی دعوت کا خطاب پوری نوع انسانی سے ہے، تمام روے زمین کی انسانی مخلوق کو وہ خیر و صلاح کی طرف بلاتا ہے۔ اس میں نہ کسی قوم کی تخصیص ہے اور نہ کسی سرزمین کی۔ اس نے اگر کسی زمین کے ساتھ خاص تعلق پیدا کیا ہے تو وہ صرف حرم مکہ کی زمین ہے۔ . . . .

. . . . لیکن اس کے متعلق بھی صاف کہدیا کہ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ (۲۲:۳) یعنی مکہ کے اصلی باشندے اور باہر کے آنے والے سب وہاں برابر ہیں[۱]۔ اور جو مشرکین وہاں کے اصلی

[۱] اسی وجہ سے فقہاے اسلام کے ایک بڑے گروہ نے مکہ کی سرزمین پر کسی کے حق ملکیت کو تسلیم نہیں کیا۔ بقیہ صفحہ ۴۹

باشندے تھے ان کے متعلق کہا کہ وہ نجس ہیں۔ ان کو وہاں سے نکال باہر کرو۔ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (۹: ۲۸) اس تصریح کے بعد اسلام میں وطنیت کا کلی استیصال ہو جاتا ہے۔ اقبال نے بالکل سچ کہا ہے۔

پاک ہے گرد وطن سے سر و اماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

اور در حقیقت مسلمان ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ :—

ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ما است

عصبیت اور اسلام کی دشمنی اسلام جب ظاہر ہوا تو اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی نسل و وطن کے تعصبات و امتیازات تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قوم ان تعصبات میں سب سے پیش پیش تھی۔ خاندانوں کے مفاخر اور نسبی و ذاتی وجاہتوں کے تخیلات ان کو صداقت اسلام پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ قرآن اگر خدا کی طرف سے اترتا تو مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر اترتا۔ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳: ۳۱) ابوجہل سمجھتا تھا کہ محمد (صلعم) رسالت کا دعوی کر کے اپنے خاندانی مفاخر میں ایک اور فخر کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا قول تھا کہ "ہم سے اور بنو عبد مناف سے مقابلہ تھا۔ ہم شہ سواری میں ان کے حریف تھے کھانے اور کھلانے میں، عطار اور بخشش میں ان کے برابر تھے اب وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں وحی آنی شروع ہوئی ہے، خدا کی قسم ہم تو کبھی محمدؐ کی تصدیق نہ کریں گے"

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۔ حضرت عمر اہل مکہ کو گھروں کے دروازے بند کرنے سے روکتے تھے تاکہ حجاج دور دور سے آ کر جہاں چاہیں اتریں حضرت عمر بن عبدالعزیز مکہ میں مکانات کے کرایہ لینے سے منع کرتے تھے اور انہوں نے امیر مکہ کو فرمان لکھا تھا کہ لوگوں کو اس سے روکیں بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جس نے اپنے خرچ سے وہاں مکان بنایا وہ اس کا کرایہ لے سکتا ہے مگر میدان اور خرابات اور مکانوں کے صحن پر سب کا حق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مکہ حرام لا یحل بیع رباعها ولا اجور بیوتها۔ ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوا۔ انما ھی مناخ من سبق۔ یہ اس زمین کا حال ہے جس سے اسلام نے خصوصیت پیدا کی۔

یہ صرف ابوجہل ہی کے خیالات نہ تھے بلکہ تمام مشرکین قریش کے نزدیک رسول اللہ کے پیش کردہ دین کا یہی عیب تھا کہ :-

مذہب او قاطع ملک و نسب　　　از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست　　　با غلام خویش بر یک خوان نشست
قدر احرار عرب نشناختہ　　　با کلفتان حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند　　　آبروے دودمانے ریختند

اسی بنا پر قریش کے تمام خاندان بنی ہاشم سے بگڑ گئے۔ اور بنی ہاشم نے بھی قومی عصبیت کی خاطر رسول اللہ کی حمایت کی حالانکہ ان میں سے اکثر مسلمان نہ تھے۔ شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کو اسی لئے محصور کیا گیا، اور تمام قریش نے اسی وجہ ان سے مقاطعہ کر لیا۔ جن مسلمانوں کے خاندان کمزور تھے ان کو شدید مظالم سے تنگ آکر حبش کی جانب ہجرت کرنی پڑی اور جن کے خاندان طاقتور تھے وہ اپنی حق پرستی کی بنا پر نہیں بلکہ خاندانی طاقت کی بنا پر قریش کے ظلم وستم سے ایک حد تک محفوظ رہے۔

عرب کے یہودی انبیائے بنی اسرائیل کی پیش گوئیوں کی بنا پر مدتوں سے ایک نبی کے منتظر تھے۔ انہی کی دی ہوئی خبروں کا نتیجہ تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت شائع ہوئی تو مدینہ کے بہت سے باشندے مسلمان ہو گئے۔ مگر یہودیوں کو اس چیز نے آپ کی تصدیق سے روک دیا کہ آنے والا نبی، بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں کیوں آیا؟ حتیٰ کہ اس تعصب نے ان کو یہاں تک مدہوش کیا کہ وہ موحدین کو چھوڑ کر بت پرستوں کے ساتھی ہو گئے۔ یہی حال نصاریٰ کا تھا۔ آنے والے نبی کے وہ بھی منتظر تھے۔ مگر ان کو توقع تھی کہ وہ شام میں پیدا ہوگا۔ عرب کے کسی نبی کو ماننے کے لئے وہ طیار نہ تھے۔ ہرقل کے پاس جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان پہنچا تو اس نے قریش کے تاجروں

سے کہا کہ "مجھے معلوم تھا کہ نبی آنے والا ہے۔ مگر یہ امید نہ تھی کہ وہ تم میں سے ہوگا" مقوقس کے پاس جب دعوت نامۂ اسلام پہنچا تو اس نے بھی یہی کہا کہ "ابھی ایک نبی آنا باقی ہے۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ مگر مجھے امید تھی کہ وہ شام میں آئے گا"! اسی تعصب کا دور دورہ عجم میں بھی تھا۔ خسرو پرویز کے پاس جب حضور کا نامہ مبارک پہنچا تو کس چیز نے اس کو غضب ناک کیا؟ یہی کہ "ایک غلام قوم کا فرد اور پادشاہ عجم کو اس طرح خطاب کرے"! وہ عرب کی قوم کو ذلیل سمجھتا تھا۔ اپنا ماتحت خیال کرتا تھا۔ یہ بات ماننے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھا کہ ایسی قوم میں کوئی حق کی طرف بلانے والا پیدا ہوگا۔

اسلام کے خلاف اس کے دشمن یہودیوں کے پاس سب سے بڑا کارگر حربہ یہی تھا کہ مسلمانوں میں قبائلی عصبیت پیدا کریں۔ اسی بنیاد پر مدینہ کے منافقین سے ان کا سازباز تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے جنگ بعاث کا ذکر چھیڑ کر انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) میں عصبیت کی ایسی آگ بھڑکائی کہ تلواریں کھنچنے کی نوبت آگئی۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ (۳:) یہی نسل و وطن کا تعصب تھا جس نے مدینہ میں قریش کے نبی کو حکمران دیکھ کر، اور مہاجرین کو انصار کے باغوں اور نخلستانوں میں چلتے پھرتے دیکھ کر، مدینہ کے منافقین کو آتش زیر پا کر رکھا تھا۔ عبداللہ بن اُبی رأس المنافقین کہا کرتا تھا کہ "یہ قریش کے فقیر ہمارے ملک میں آکر پھل پھول گئے ہیں۔ ان کی مثل ایسی ہے کہ کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرتا کہ تجھی کو پھاڑ کھائے" وہ انصار سے کہتا تھا کہ "تم نے انکو اپنے سر چڑھایا ہے، اپنے ملک میں جگہ دی۔ اپنے اموال میں ان کو حصہ دیا۔ خدا کی قسم آج تم ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں گے"۔ اس کی ان باتوں کا جواب قرآن مجید میں اس طرح دیا گیا ہے:-

ھُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا	یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھ والوں پر کچھ خرچ نہ کرو تاکہ یہ تتر بتر ہوجائیں حالانکہ

لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۔ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶۳ : ۱)

آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا اصلی مالک اللہ ہے مگر منافقین اس بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم (جنگ سے) مدینہ کی طرف واپس ہوئے تو جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو وہاں سے نکال دیگا۔ حالانکہ عزت دراصل اللہ اور اسکے رسول اور مومنوں کی ہے مگر منافقین اس بات کو نہیں جانتے

یہی عصبیت کا جوش تھا جس نے عبداللہ بن اُبَی سے حضرت عائشہ پر تہمت لگوائی اور خزرج والوں کی حمایت نے اس دشمن خدا و رسول کو اپنے کئے کی سزا پانے سے بچا لیا۔ (باقی)

آئین محبّت

اے خدا! تیری مرضیات کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ اگر ہم اب تیری مرضی پر چلنا چاہتے ہیں۔ اور تجھکو راضی رکھنا چاہتے ہیں تو قرآن کے علم و عمل کے سوا سب ہوا و ہوس ہے۔

الٰہی تیرے ملنے کا راستہ بتانے کے لئے قرآن ہی نور و ہدایت ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے تاریکی اور گمراہی ہے۔

مالک مجھے تجھ سے ازلی محبت ہے۔ اس لئے تو نے قرآن پاک کو "آئین محبت" کی شکل میں بھیجدیا ہے۔ اور تو دیکھ رہا ہے کہ ہم اس کو سینے سے لگائے ہوئے تیری طرف دوڑ رہے ہیں یا نہیں۔

ابو محمد مصلح

از

مولانا الحاج ابو الخیر محمد خیر اللہ صاحب سنوسی القادری (ورنگل)

قرآن کریم کو بہر نوع مسلمانوں کے دلوں میں اتار دینا جب ہمارا مقصود ہے تو اپنے اردو لٹریچر سے بھی اس سلسلہ میں کام لینا ضروری ہے لٹریچر کو دل و دماغ کی تربیت اور جذبات کی آفرینش میں جو خصوصیت حاصل ہے وہ محتاج تصریح نہیں۔ آج اردو تحریرات اور بول چال میں کتنے انگریزی الفاظ ہیں جو دخیل ہو کر اپنی قوت نفوذ سے نہ صرف انگریزی دان بلکہ عام جہلا کی زبانوں پر بھی چڑھ گئے ہیں ان جاہل زبانوں سے انکا استعمال یہ بتاتا ہے کہ وہ ان کے معنی و مطلب کو سمجھ کر ہی موزوں و مناسب مواقع پر ان کو برت رہے ہیں حالانکہ انگریزی کی ہوا بھی ان کو نہیں لگی۔ غرض کہ زبان کے الفاظ کا زبان زد عوام ہو جانا بھی ناواقفوں کو اس کے معنی و مطلب سے خواہ مخواہ واقف بنا دیتا ہے

اس لحاظ سے میری رائے یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعض مرکب الفاظ اور چھوٹے چھوٹے فقروں کو ہم اردو میں استعمال کرنا شروع کر دیں اور روزمرہ کی موزونیت و مناسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے فقرے کلام پاک سے چن کر "ترجمان القرآن" میں شائع کرتے رہیں۔ اس طریقہ کو سلف نے بھی اپنی فارسی تحریرات و تصنیفات میں ملحوظ رکھا ہے۔ آج بھی کلام پاک کے بعض فقرے جو اردو میں مستعمل ہو گئے ہیں یہ انھیں کا فیضان ہے۔

مولانا ابو الکلام نے بھی الہلال و البلاغ میں اس موزوں مقصد اشاعت قرآن کو نہایت تزک و احتشام و شاندار اہتمام کے ساتھ جاری رکھا تھا جس سے اردو کا اثر و نفوذ بھی پہنچے و مہم

حکمت نے لگا او شوکت کلام نے مولانا کو سارے ہندوستان میں فی الواقع اسم بامسمی تسلیم کرا دیا۔ غرض ہدی اس سعی اہل سے قرآن اور اردو دونوں کی خدمت ہو جائے گی اسی فکر و تردد میں خیال کا اس طرف منتقل ہو جانا تھا کہ آج صبح کی تلاوت میں نے مختلف مقامات سے بعض ایسے الفاظ اور فقروں کو منتخب کر لیا ہے اور ناظرین "ترجمان القرآن" کے ملاحظہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس ذوق حسن سے وہ لوگ بہت زیادہ محظوظ ہوں گے جنہوں نے اہل حرمین شریفین کو اپنی گفتگو و محاورہ میں اس طرح سے قرآن پاک کو استعمال کرتے دیکھا اور سنا ہے۔

بازار مکہ میں ایک عرب سائل نے کچھ مانگا اس کو جو کچھ اس وقت دیا جا سکتا تھا دیا گیا۔ مگر اس نے کچھ زیادہ حاصل کرنا چاہا اور کہا اُدْخُلْ یَدَكَ فِی جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَاءَ یعنی جیب و گریبان یعنی کیسہ میں ہاتھ ڈالو تو سفید سفید (روپے) نکل آئیں گے۔ میں نے بھی قرآن حکیم ہی سے فوراً جو اس وقت یاد آگیا یہ جواب دیا۔ خُذْ مَا اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِیْنَ ــ کو جو کچھ دیا گیا ہے اور خدا کا شکر ادا کرو۔ اس سے وہ بہت محظوظ ہو کر میرا پتہ پوچھتا ہوا روانہ ہو گیا۔ (یہ دونوں فقرے موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہیں)۔ ایک روایت جناب رابعہ بصریہ رحہ کے کلام القرآن کی نسبت بھی اسی طرح مشہور ہے۔

۱۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی	کہیں انسان کو من مانی مراد بھی ملی ہے۔
۲۔ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ	یہ لوگ تو بس گمان پر چلتے ہیں۔
۳۔ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ	وہ تو نری انکلیں دوڑاتے ہیں۔
۴۔ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ	کیا تم بہروں کو سنا سکتے ہو۔
۵۔ مَا لَكُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ	تم کو کچھ اس کا علم نہیں ہے۔
۶۔ زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ	اس کو اپنے برے کام اچھے معلوم ہونے لگے ہیں۔

۷۔ يَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ	جانوروں کی طرح یہ بھی کھاتے پیتے ہیں۔
۸۔ تَعْسًا لَّهُمْ	ان کا برا ہو (ان کا ستیاناس ہو)
۹۔ مَاذَا قَالَ آنِفًا	اس نے ابھی ابھی کیا کہا۔
۱۰۔ آتِنَا غَدَاءَنَا	ہمارا ناشتہ لاؤ
۱۱۔ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ	ارے یہی تو ہم چاہتے ہیں۔
۱۲۔ لَا رَيْبَ فِيهِ	اس میں کوئی شک نہیں ہے۔
۱۳۔ شَيْءٌ عُجَابٌ	بڑی عجیب بات ہے
۱۴۔ شَيْءٌ يُرَادُ	غرض ومطلب کی بات ہے
۱۵۔ إِنْ هٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ	یہ تو ان کی من گھڑت ہے۔
۱۶۔ عَزَّنِي فِي الْخِطَابِ	مجھکو اس نے باتوں میں دبا لیا۔
۱۷۔ حَسْبِيَ اللّٰهُ	میرے لئے خدا کافی ہے۔
۱۸۔ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ	میں نے خدا پر بھروسہ کرلیا ہے۔
۱۹۔ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ	وہ اپنے دونوں ہاتھ ملتا رہ گیا۔
۲۰۔ تَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ	تم سمجھتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔
۲۱۔ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ	تم ان کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لوگے۔
۲۲۔ لَعَرَفْتَهُمْ بِسِيمَاهُمْ	ان کو تم ان کی صورت ہی سے پہچان جاؤگے۔
۲۳۔ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ	کیا خدا اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟
۲۴۔ أُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللّٰهِ	میں اپنے معاملہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔
۲۵۔ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ	صبح اور شام۔

مذاکرۂ علمیہ

مسئلہ جبر و قدر

(۴)

مذہب جبر دوسری طرف جبریہ ہیں جو کہتے ہیں کہ وجود میں کوئی چیز اللہ کے ارادے کے بغیر داخل نہیں ہوتی۔ عام اس سے کہ وہ اشیاء کی ذوات ہوں یا ان کی صفات۔ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ کائنات میں ہر ہر ذرہ کی حرکت اللہ کی قضاء و قدر کے تحت واقع ہوتی ہے، وجود اور ایجاد میں اللہ کے سوا کوئی چیز تاثیر نہیں رکھتی۔ خلق اور ابداع میں اللہ کے ساتھ کوئی چیز شریک نہیں ہے۔ جو کچھ اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو اللہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ کوئی شے اس کے حکم اور اس کی قضاء کے خلاف بال برابر حرکت نہیں کر سکتی۔ اس کے افعال پر حسن یا قبح کا حکم لگانا عقل کے امکان میں نہیں ہے۔ اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے۔ دنیا میں ہم جن حوادث کے صدور کو اسباب کے تحت مشاہدہ کرتے ہیں، وہ محض ظاہر کے لحاظ سے ایسے ہیں۔ ورنہ حقیقتاً سب کا صدور اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے، اور تمام ارضی و سماوی حوادث کا فاعل حقیقی وہی ہے۔

اس اصل سے متعدد فرعی اعتقادات نکلے ہیں جہم بن صفوان اور شیبان بن سلمہ خارجی کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے۔ نہ وہ ارادہ رکھتا ہے۔ اور نہ اختیار، اللہ تعالیٰ جس طرح جمادات نباتات اور دوسری چیزوں میں افعال پیدا کرتا ہے اسی طرح انسان میں بھی پیدا کرتا ہے انسان کی طرف ان کی نسبت محض مجازی ہے۔ رہا ثواب و عقاب تو جس طرح افعال جبری ہیں اسی طرح وہ بھی جبری ہے۔ یعنی جس طرح جبر کی بنا پر انسان اچھے اور برے افعال کرتا ہے اسی طرح جبر

کی بنا پر اسے جزا اور سزا بھی دی جاتی ہے۔ یہ خالص جبریت ہے جو معتزلہ کی خالص قدریت کے مقابلہ میں ہے۔

ایک دوسری جماعت جس میں حسین النجار، بشر بن غیاث المریسی، ضرار بن عمرو حفص الفرد، ابو عبداللہ محمد بن کرام، شعیب بن محمد الخارجی اور عبداللہ بن اباض صاحب اباضیہ وغیرہ شامل ہیں خدا کو انسان کے تمام اچھے اور برے اعمال کا خالق تو قرار دیتی ہے، مگر اس کی رائے میں بندوں کو ایک قدرت وارادۂ حادثہ بھی حاصل ہے جو ان افعال میں ایک طرح کی تاثیر رکھتی ہے۔ اس کا نام انہوں نے "کسب" رکھا ہے۔ اور یہی کسب، ثواب و عقاب کا مقابل اور اوامر و نواہی کی تکلیف کا موجب ہے۔

امام ابوالحسن اشعری نے انسان کے "کسب" کو تسلیم کیا اور اس کے لئے قدرت حادثہ بھی ثابت کی مگر اس قدرت کی تاثیر سے انکار کر دیا۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ اپنے بندے سے جس فعل کے صدور کا ارادہ کرتا ہے، وہ بندہ کی قدرتِ حادثہ کے تحت صادر ہو جاتا ہے لیکن یہ قدرت محض ایک آلہ ہے ارادۂ الٰہی کے فعل میں آنے کا۔ ورنہ حقیقتہً خود اس قدرت میں کوئی تاثیر نہیں ہے جو فعل کے وجود میں آنے کی علت ہو۔

قاضی ابو بکر باقلانی نے اس سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ ان کی رائے میں انسان کے ہر فعل کی دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت اس کے نفس فعل ہونے کی ہے بلا اعتبار حسن و قبح وغیرہ وغیرہ اور دوسری جہت اس کے طاعت اور معصیت ہونے کی ہے۔ مثلاً نماز اور روزہ۔ کہ ان میں ایک جہت تو یہ ہے کہ وہ نفس قیام اور قعود اور ترک غذا اور ترک مباشرت ہے۔ اور دوسری جہت یہ ہے کہ وہ عبادت اور طاعت ہے۔ ان میں سے پہلی جہت باری تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ اور دوسری جہت بندہ کی طرف یہی دوسری جہت ہے جو فعل کے ساتھ قدرت حادثہ کے تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ اور ان میں یقیناً بندے کی قدرت تاثیر رکھتی ہے

اور اسی پر جزا و سزا مترتب ہوتی ہے۔

استاذ ابو اسحٰق اسفرائینی نے اس مسلک سے بھی اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک ذاتِ فعل اور اس کی صفات (یعنی حسن و قبح) دونوں معاً، بندے اور خدا دونوں کی قدرت کے تحت حاصل ہوتے ہیں۔

امام الحرمین نے ان تینوں کے مذہب کو رد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بندے میں قدرت اور ارادہ پیدا کیا ہے۔ پھر اسی قدرت اور ارادہ سے بندے کے مقدورات اور مرادات حاصل ہوتے ہیں۔

آخر میں امام رازی آتے ہیں جو مذہب جبر کے پر زور وکیل ہیں۔ وہ بندہ کی قدرت کے لئے کسی قسم کی تاثیر تسلیم نہیں کرتے "کسب" کو ایک اسم بلا مسمیٰ سمجھتے ہیں۔ خدا کو بندوں کے تمام اعمال کا خالق قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کفر اور ایمان، طاعت اور معصیت، ہدایت اور ضلالت، سب کچھ خدا ہی اپنے بندوں میں پیدا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کسی سے کفر کے صدور کا ارادہ کرے اور وہ مومن ہو جائے۔ خدا کے علم میں کوئی شخص مومن ہو، اور وہ کافر ہو جائے۔ خدا نے کسی میں طاعت پیدا کی ہو اور وہ اس کے خلاف عاصی ہو جائے۔ رہا یہ سوال کہ جب ان سب چیزوں کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے، اور بندوں میں اس کے خلاف چلنے کی طاقت نہیں ہے تو پھر اوامر و نواہی کی تکلیف کیونکر جائز اور معقول ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب امام صاحب یہ دیتے ہیں کہ خدا کے لئے تکلیف ما لا یطاق جائز ہے۔ اور اس کے کاموں میں کیوں اور کس لئے کا سوال نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اشاعرہ اور ان کے ہم خیال حضرات، خواہ کسب کے قائل ہوں یا نہ ہوں، اور قدرتِ حادثہ کے لئے کسی قسم کی تاثیر مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔ ان کے احتجاج کا منطقی نتیجہ خالص جبر ہی ہے

کیونکہ جب خدا اپنے بندوں کا خالق ہے، اور اسی نے ان کے اچھے اور بُرے اعمال کے صدور کا ارادہ کیا ہے تو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہوگی۔ یا تو بندہ میں قضاء الٰہی کے خلاف عمل کرنے کی شکتی ہوگی یا نہ ہوگی۔ صورتِ اول بندے کی قدرت اور اس کے ارادہ کا خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ پر غالب آجانا لازم آتا ہے جو بالاتفاق باطل ہے۔ بصورتِ دوم خدا کی قدرت کے آگے بندے کی قدرت کا بے اثر اور خدا کے ارادہ کے سامنے بندے کے ارادہ کا بے چارہ ہونا لازم آتا ہے، جس کے بعد کسب اور قدرتِ حادثہ کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یہی خالص جبریت ہے، اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جبریت کے مقدمات کو تسلیم کر لینے کے بعد کوئی شخص عقیدۂ جبر کی انتہا کو پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بیچ میں کسی مقام پر ٹھیر جانا اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔[1]

[1] بالکل یہی حال مسیحی متکلمین کا بھی ہے۔ ان کے ایک بڑے گروہ کے عقائد اس باب میں وہی ہیں جو اشاعرہ کے ہیں۔ سینٹ آگسٹائن (St. Augustine) نے جبریت خالصہ سے بچنے کی بہت کوشش کی ہے، مگر خدا کو فاعل حقیقی اور انسان کو محض ایک منفعل ہستی مان لینے کے بعد وہ اپنے مذہب کو خالص جبریت سے نہیں بچا سکا۔ اسکوٹس ایریجنا (Scotus Erigena) جو مدرسیت (Scholasticism) کا بانی اول ہے، خدا کے فاعل اعمال عباد ہونے میں انتہا درجہ کا غلو کرتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا تمام کائنات کی روح ہے، اور وہ خدا ہی ہے، جو زندگی، قوت، نور، عقل بن کر موجوداتِ عالم میں اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ سینٹ آنسلم (St. Anselmus) عام مسیحی اعتقاد کے مطابق انسان کے پیدائشی گناہ اور پھر خدا کے مسیح کی شکل میں نزول کرنے، اور انسان کے گناہ کا کفارہ بننے کا قائل ہے، اور ظاہر ہے کہ اس اعتقاد میں جبر کے سوا کسی اور چیز کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ابیلارڈ (Abelard) اور سینٹ ٹامس اکون (St. Thomas of Aquin) دونوں ارادۂ الٰہی کو وجوبی و جبری قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک خدا ہی بندوں کے تمام اعمال کا خالق ہے۔ بلکہ موخر الذکر نے تو اشاعرہ سے تکلیف مالایطاق کے جواز کا عقیدہ بھی اخذ کر لیا ہے۔ ممتاز مدرسین میں صرف ایک ڈنس اسکوٹس (Duns Scotus) ایسا شخص ہے جس نے معتزلہ کی طرح قدریت کا مذہب اختیار کیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کو ارادہ کرنے یا نہ کرنے اور اپنے ارادہ کو فعل میں لانے یا نہ لانے کا پورا اختیار حاصل ہے، اور خدا کی قدرت انسان کی آزادی اختیار میں مانع نہیں ہے۔

قرآن مجید سے جبریہ کا استدلال لطف یہ ہے کہ جبریہ بھی اپنے مذہب کے حق میں قرآن مجید ہی سے ثبوت پیش کرتے ہیں، اور ایک دو نہیں سینکڑوں آیتیں ایسی پیش کر دیتے ہیں جو قدرت کی مخالف اور جبریت کی زبردست مؤید ہیں۔ مثلاً۔

وہ آیات جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام قوت کا مالک خدا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کا خالق ہے دنیا میں اس کے اذن کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ـ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ـ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ـ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ـ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ـ

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر واقعہ کے متعلق خدا کا فیصلہ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی فیصلہ کے مطابق ہوتا ہے۔ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ، وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ـ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ ـ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ ـ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ـ

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ہر چیز کے لئے ایک تقدیر مقرر کر دی ہے، رزق، عزت و ذلت، راحت و مصیبت، موت و حیات، سب اسی تقدیر کے مطابق ہیں اس میں کمی و بیشی ممکن نہیں ہے۔ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ـ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ـ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ـ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ـ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ ـ

لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کی مشیت خدا کی مشیت کے تابع ہے بندے کو کچھ اختیار نہیں۔ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ انسان اپنی تدبیر سے خدا کے فیصلوں کو بدلنے کی قوت نہیں رکھتا۔ وَمَا تَشَاۤءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَاۤءَ اللّٰهُ۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ۔ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَاۤءَ اللّٰهُ۔ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ۔ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ۔ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَّلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا۔

وہ آیات جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت کا سررشتہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا۔ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ۔ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْاۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَاۤءَ اللّٰهُ۔

وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ خدا کی مشیت ہی یہ نہ تھی کہ سب لوگ ایمان لے آئیں اور اختلاف نہ کریں، ورنہ خدا چاہتا تو سب ایمان لے آتے اور دین کے معاملہ میں کوئی جھگڑا باقی

ربتنا۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ ـــ وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا، اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ـــ اس ضمن میں وہ آیات بھی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ بہت سے لوگ دوزخ ہی کے لئے پیدا کیے گئے ہیں۔ مثلاً وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔

وہ آیات جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے کافروں اور منافقوں کو ایمان اور حسن عمل سے روک دیا ہے اور ایسے لوگ راہ راست پر آ ہی نہیں سکتے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ وہ اوامر و نواہی کے لئے مکلف قرار دئے گئے ہیں اور سرتابی و سرکشی کے عوض انکو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ـــ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ـــ وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا ـــ وَلٰکِنْ کَرِہَ اللّٰہُ انْبِعَاثَھُمْ فَثَبَّطَھُمْ ـــ وَنَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ۔

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کو جن برے اعمال کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں مبتلائے عذاب کیا جاتا ہے۔ وہ خدا ہی کے حکم اور ارادے کے تحت ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّھْلِکَ قَرْیَۃً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْھَا فَفَسَقُوْا فِیْھَا ـــ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا فِیْ کُلِّ قَرْیَۃٍ اَکٰبِرَ مُجْرِمِیْھَا لِیَمْکُرُوْا فِیْھَا ـــ زَیَّنَّا لَھُمْ اَعْمَالَھُمْ فَھُمْ یَعْمَھُوْنَ ـــ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ۔

وہ آیات جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا ہی نے ان شیطانی ہستیوں کو انسان پر مسلط کیا ہے جو اس کو بہکاتی رہتی ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّھُمْ اَزًّا ـــ وَجَعَلْنَا

أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ — وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ

متکلمین کی ناکامی متکلمین اسلام کے ان دونوں گروہوں کی تقریریں دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مسئلۂ جبر و قدر کو حل کرنے میں دونوں کو ناکامی ہوئی ہے مگر اس ناکامی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے قرآن سے ہدایت حاصل کرنی چاہی تھی اور قرآن نے انکی ہدایت نہیں کی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن سے استفسار کرنے کے بجائے فلسفیانہ طریق پر فکر کی اور دو متخالف پہلوؤں میں سے ایک پہلو اختیار کر لیا، پھر اپنے اعتقاد کی تائید میں دلائل ڈھونڈھنے کے لئے قرآن مجید پر نگاہ ڈالی جو آیات اپنے موافق مطلب نظر آئیں ان کو لے لیا، اور جو آیات اپنے اعتقاد کے خلاف نظر آئیں ان کو تاویل کے خراد پر چڑھا دیا — دونوں فریقوں کی جانب سے جو آیات پیش کی گئی ہیں ان کو آپ نے دیکھ لیا۔ بعض آیات صریح قدر کا حکم لگاتی ہیں جن سے جبر کا پہلو نکالنا ممکن نہیں ہے، مگر جبریہ پھر بھی ان کی تاویل کرتے ہیں اور ایسے معنی پہناتے ہیں جن کو عقل سلیم کسی طرح قبول نہیں کرتی۔ یہی حال قدریہ کا ہے۔ وہ جبر کا صریح حکم لگانے والی آیات کو قدر کے مطلب پر ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس میں ان کو یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ آیت کے الفاظ کیا کہہ رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر گروہ کی بحثوں سے صرف وہی شخص مطمئن ہو سکتا ہے جو پہلے سے ایک اعتقاد قائم کر چکا ہو اور قرآن مجید سے صرف اس کی تائید چاہتا ہو۔ رہا وہ شخص جس نے خود پہلے سے کوئی رائے قائم نہ کی ہو، اور جس کی خواہش یہ ہو کہ قرآن حکیم کے مطالعہ سے کسی نتیجہ تک پہنچے تو وہ جبریہ اور قدریہ کی بحثوں کو پڑھ کر ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کچھ عجب نہیں کہ وہ خود قرآن مجید ہی کی طرف سے بدعقیدہ ہو جائے۔ اس لئے کہ جس طرح دونوں فریقوں نے آیات قرآنی کو لے کر ان سے دو بالکل متخالف عقیدوں پر استدلال کیا ہے، اس کو دیکھ کر ایک ناواقف آدمی اس بدگمانی سے محفوظ نہیں رہ سکتا کہ قرآن مجید کے بیانات میں معاذ اللہ تناقض و تعارض ہے۔ (باقی)

نقد و نظر

موازنۂ ہلال و صلیب از جناب نکہت شاہجہاں پوری بی اے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔

مسلمانوں نے اپنے دور تمدن میں علم و تہذیب کی جو خدمت کی تھی، جہالت و غفلت نے اس پر توبرتو پردے ڈالدیئے ہیں۔ یورپ نے بڑی بلند آہنگی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ علم و تہذیب کے احیاء و ارتقاء میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں، اور ہم اس کے علوم و اکتشافات، ایجادات و صنائع، اور سیاسی استیلا سے مرعوب ہوکر اس قول مزخرف پر ایمان لے آئے۔ جہلاء اور متفرنجین کا ذکر نہیں۔ وہ لوگ بھی جو علم سے بہرہ ور ہیں کما حقہ آگاہ نہیں کہ انہی کے نامور اسلاف کا علم و تمدن تہذیب حاضر کی اساس ہے۔

جناب نکہت نے اسی حقیقت کو اپنوں کی زبان سے نہیں، کہ اس دور مرعوبیت میں اپنوں کی بات قبول کرنے کے لئے لوگ طیار نہیں۔ یورپ کے حق پسند اہل العلم کی زبان سے بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ مغرب زندگی کے مختلف شعبوں میں حاملان قرآن کے علم و تمدن کا کس قدر رہون منت ہے، اور یہ کہ علوم و آداب مغرب میں مسلمانوں کے عہد اقبال کے اثرات اب تک باقی ہیں۔ کتاب سترہ ابواب پر منقسم ہے اور ہر باب کے تحت محنت و کاوش سے قابل قدر معلومات فراہم کی ہیں۔ زبان و بیان دلپذیر ہے۔

دعوت عمل مرتبہ مولوی عبدالحامد صاحب قادری بدایونی حجم ۵۰ صفحات قیمت ۲ر ملنے کا پتہ عابد الحلوری الحسی مکتبہ دارالاشاعت بدایوں ۔ یوپی

قرآن مجید کی تعلیمات اور اس کے احکام کو الگ الگ ابواب کے تحت جمع کیا گیا ہے۔ ہر آیت کے مقابل اس کا سلیس ترجمہ دے دیا گیا ہے جس کو معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ عوام و خواص سب کے لئے کار آمد ہے اور خاص کر بچوں کو پڑھانا۔ اور روزانہ ایک ایک دو دو آیتیں مع ترجمہ کے یاد کرا دینا بہت مفید ہے۔

نرخنامہ و قواعد اشتہارات

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
یک صفحہ	۱۰	۲۵	۴۵	۸۰
صف صفحہ	۶	۱۵	۲۵	۴۵
بع صفحہ	۴	۱۰	۱۷	۲۵

۱۔ کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کئے جائیں گے جو اس رسالہ کی وضع وہیئت کا لحاظ رکھ کر تیار کئے گئے ہوں۔

۴۔ نرخنامہ میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جائے گی۔

۵۔ ٹائیٹل کے صفحات کی اجرت عام نرخنامہ کی بہ نسبت ۵۰ فیصدی زیادہ ہوگی۔

Registered No. M 2950

رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۲۰)

قواعد

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا
مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں۔
ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی
ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے لہذا کوئی صاحب رعایت
کا مطالبہ نہ کریں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے
لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔
لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شایع کرے

منیجر "ترجمان القران"

خیریت آباد (حیدرآباد دکن)

باہتمام مولوی ابو محمد مصلح صاحب اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا

جلد (۳) عدد (۳) — رمضان ۱۳۵۲ھ

۶۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ) — بیرون ہند کے لئے (سے) — قیمت فی پرچہ ۸/

فہرست مضامین

۵۰۶

اشارات

(افسوس ہے کہ اس مرتبہ عین وقت پر جب کہ پرچہ کی طیاری کا زمانہ تھا، میں دردِ شقیقہ میں مبتلا ہو گیا اور آٹھ دس روز تک کسی دماغی محنت کے قابل نہ رہا۔ اس حالت میں اپنے فرائض ادارت بتمام وکمال انجام دینا میرے لیئے مشکل تھا۔ میں جناب ذوقی شاہ صاحب کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے میری اعانت فرمائی اور اس پرچہ کے لیئے اشارات تحریر فرما دیئے۔ جزاہ اللہ عنی خیر الجزاء)

ایڈیٹر

اِنسان ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کرتا ہے تو اس کی سلامتی کے لیے ایک مناسب تنظیم عمل میں لاتا ہے، قواعد و ضوابط کو ترتیب دیتا ہے، تقسیم اوقات اور ترتیب کاروبار کا تعین کرتا ہے، دستورالعمل بناتا ہے، اور اپنے فہم و بصیرت کے مطابق ہر قسم کی جزوی و کُلّی ضرورت کو ملحوظ رکھکر ہر قسم کا ضروری سامان پہلے سے فراہم کر رکھتا ہے یا اُس کے لیے کوئی مناسب انتظام اپنے ذہن میں سوچ لیتا ہے۔ مگر انسان بوجہ اپنی ناتجربہ کاری، نادانی، کم علمی، کوتاہ نظری اور دیگر کمزوریوں کے اُن معاملات میں اکثر غلطیاں بھی کرتا ہے۔ ٹھوکریں بھی کھاتا ہے، نقصان بھی اُٹھاتا ہے اور اپنے جدید تجربوں کی بنا پر اپنے کارخانہ کی تنظیم اور اس کے دستورالعمل میں وقتاً فوقتاً ترمیم و اصلاح کرتا رہتا ہے۔ مگر ہستیٔ مطلق اِن جملہ نقائص سے پاک ہے۔ حق تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے وہ ٹھیک ہوتا ہے، درست ہوتا ہے، اور کسی ترمیم و اصلاح کا محتاج نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ نے بھی اس عظیم الشان کارخانۂ قدرت کے وجود میں لانے یعنی تخلیق کائنات سے قبل ہی سے اپنے

علم ازلی میں کائنات کے تمام جزوی اور کلی امور پر نگاہ ڈالکر ہر چیز کے مناسب حال انتظامات کا تعین فرمالیا ہے۔ ایک ترتیب قرار دے لی ہے۔ قواعد و ضوابط مرتب فرمائے ہیں۔ کارخانے کے مختلف کُل اور مختلف پرزوں کے لیئے مختلف خدمات کی تخصیص فرمادی ہے۔ اُن کے بگڑنے، ٹوٹنے، زنگ آلود ہونے اور بیکار ہوجانے کی صورت میں اُن کی مرمت، اصلاح اور درستی کی تدابیر کا بھی تعین فرمارکھا ہے۔ حضرتِ انسان کو اُس کارخانۂ عظیم کی افسری، مہتممی، مینیجری، انجینیری کے لیئے مخص فرمادیا ہے اور اُس کے سپرد یہ خدمت کررکھی ہے کہ وہ اپنے مالک کی مرضی کے مطابق اس کارخانہ کو چلائے۔ یہ خدمت کوئی ایسی ویسی خدمت نہ تھی جسے ہر کس و ناکس بلا کسی تیاری کے بہ آسانی انجام دے سکے۔ بہت نازک اور بڑی ذمہ داری کی خدمت تھی۔ اس خدمت کی انجام دہی کے لیے خاص قسم کی قابلیت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انسان میں وہ قابلیت پیدا کرنے کیلیئے جن جن باتوں کی ضرورت تھی اُن کا بھی پورا پورا انتظام فرمادیا گیا یہ حقیقتاً حق تعالیٰ کا اپنے بندے پر بہت بڑا احسان تھا کہ وہ اوسے عدم سے وجود میں لایا۔ اُسے بہت بڑا مرتبہ عنایت فرمایا یعنی اس زمین پر اُسے اپنا نائب، اپنا خلیفہ، اپنا وائسرائے بنایا۔ حق نیابت ادا کرنے کی قابلیت اپنے میں پیدا کرنے کی اُسے صلاحیت بخشی۔ اوس صلاحیت کو ترقی دینے کی اُسے راہیں سوجھائیں، اُس میں خرابیاں واقع ہوجائیں تو اونہیں دور کرنے کی تدبیریں بتائیں۔ اور اُس کے لیے ایک ایسا دستور العمل مرتب فرمادیا کہ صحیح طور پر پابندی کے ساتھ اُس پر عمل کرنے سے انسان اس جہان میں بھی سرفرازی حاصل کرسکتا ہے اور اُس جہان میں بھی۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ اپنے مالک، اپنے خالق، اپنے پروردگار اپنے اللہ کی خوشنودی بھی حاصل کرسکتا ہے۔ یہ دستور العمل چونکہ حق تعالیٰ کا مقرر کردہ ہے اس لیئے ہر قسم کی غلطیوں اور لغزشوں سے پاک ہے اور اس سے مستغنی ہے کہ تجربات مابعد کی روشنی میں اس میں کسی ترمیم یا تغیر و تبدل یا اصلاح کی گنجائش پیدا ہو۔ ایسا عجیب و غریب اور ہمتا عظیم الشان دستور العمل نازل فرماتے وقت حق تعالیٰ کی توجہ خاص اور نظر شفقت اپنے بندوں کی جانب ہوئی اور

اس رحمت خاص کے مبذول ہونے کا وقت نہایت برکت والا قرار پایا اور اس شفقت و رحمت و برکت کی شکر گذاری بندوں پر لازم ہوگئی۔ وہ واجب التعمیل دستور العمل قرآن پاک ہے اور وہ بابرکت وقت جبکہ حق تعالیٰ کی شفقت رحمت اور محبت کی نظر اپنے بندوں پر پڑی ماہ رمضان ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

(۲ : ۲۳)

آیت مندرجۂ بالا میں ایک تو یہ بات بتلائی گئی ہے کہ قرآن هُدًى لِّلنَّاس ہے سب کے لیئے ہدایت ہے۔ نئی دنیا کے رہنے والے ہوں یا پرانی دنیا کے، ترکی ہوں یا تاتاری، زنگی ہوں یا فرنگی، چینی ہوں یا عرب، ایشیا والے ہوں یا یورپ والے، تعلیم قدیم کے پختہ مغز ہوں یا تعلیم جدید کے جدت پسند، فلسفی ہوں یا سائینس داں، قرآن سب کے لیے ہدایت ہے اور اس قرآن میں سب کے لیئے حق و باطل میں امتیاز کرنے کی بہت ہی نمایاں روشنی موجود ہے۔ دوسری بات اس آیت میں یہ بتلائی گئی ہے کہ اس کا نزول ماہ رمضان میں ہوا۔ احادیث میں اس کی صراحت کردی گئی ہے کہ پورا قرآن لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر بجملةٍ واحدةٍ ماہِ رمضان میں نازل ہوا، پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا ۲۳ سال تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوتا رہا یہاں تک کہ اس مدت میں وہ پورا نازل ہوگیا۔ لوحِ محفوظ کی حقیقت اور آسمان دنیا کی حقیقت اور قرآن کے لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر جملةً واحدةً نازل ہونے کی حقیقت سے اس وقت بحث نہیں نہ اس بحث کا یہ موقع ہے۔ یہاں تو بحث اس امر سے ہے کہ ماہ رمضان وہ مبارک مہینہ ہے جس میں حق تعالیٰ کی نظر عنایت اپنے بندوں پر خاص طور سے مبذول ہوئی اور اس نظر عنایت کے نتیجہ میں بنی نوع انسان کے ہاتھ ایک عظیم الشان دولت آگئی جس سے سرفرازی دارین اور رضائے الٰہی خریدی جاسکتی ہیں۔

تعین ماہ کے ساتھ تخصیص وقت بھی فرما دی گئی ہے۔ قرآن مجید ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ماہ رمضان کے کس حصہ میں نزول قرآن واقع ہوا اور وہ وقت کیسا برکت والا ہے اور ہر سال جب وہ وقت آتا ہے تو اُس میں کیا کچھ ہوا کرتا ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ○ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ○ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ○ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ○ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ○

بنی نوع انسان کے لیے یہ عجیب و غریب دستور العمل، حاکم حقیقی کا اپنے محکوموں کے نام یہ فرمان شاہی، عاشقان الٰہی کے جلے بھنے دلوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا یہ نامۂ محبوب، اُس بارگاہ وراء الوراء سے اُن ہی کے پہنائے ہوئے الفاظ کے لباس میں آراستہ ہو کر لیلۃ القدر میں نازل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ ہم نے اسے نازل کیا۔ قربان آپ پر اور آپ کے نازل فرمائے ہوئے پیام حیات پر در پر کس آن بان سے پیام آتا ہے اور کس آن بان سے اُس کے آنے کی خبر دی جاتی ہے کہ ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل فرمایا اور جانتے بھی ہو کہ لیلۃ القدر کس قدر و قیمت کی شب ہے جس میں ہم نے تمہیں اپنی ایک ادائے خاص سے دیکھا یہ ایسی برگزیدہ اور بابرکت شب ہے کہ ہر سال جب یہ آتی ہے تو ہماری جانب متوجہ ہونے والوں کی اس ایک شب کی عبادت سے اُنہیں اس قدر عظیم الشان فائدہ پہنچتا ہے کہ ایک ہزار مہینوں تک متواتر عبادت کرتے رہنے سے بھی اتنا فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ کا فرمودہ ہے۔

خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ کلمات الٰہی ہیں۔ ذرا حساب لگا کر دیکھیے تو معلوم ہو جائیگا کہ ایک ہزار مہینوں کے تراسی سال چار مہینے ہوئے یعنی اگر کوئی عابد و زاہد و متقی و پرہیزگار شخص تراسی

سال چار مہینے مسلسل عبادت کرتا رہے تو اُسے اوتنا فائدہ نہ پہنچیگا جتنا کہ لیلۃ القدر کے شب بیدار کو اس ایک شب کی عبادت سے فائدہ پہچانے کا حق تعالےٰ نے خود وعدہ فرمالیا ہے۔

دنیا کی حکومتوں کی طرح حکومتِ الٰہی میں بجٹ کی کمی پوری کرنے اور آمد و خرچ کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھنے کے لیے تخفیف عمل میں نہیں آتی۔ ملازموں کی تنخواہیں کم نہیں کی جاتیں۔ اونہیں بلا وجہ برخاست نہیں کیا جاتا قبل از وقت پنشن دیکر نکالا نہیں جاتا۔ عہدہ داروں کے الاونس بند نہیں کئے جاتے۔ اُس کی بارگاہ میں نہ کسی نعمت کی کمی ہے نہ بخل کو دخل ہے۔ اُس کی فیاضی کی کوئی انتہا نہیں۔ اُس کی رحمت کی وسعت لامحدود ہے۔ وہ دیتا ہے تو واپس نہیں لیتا۔ بخشش شروع کرتا ہے تو ہاتھ نہیں روکتا۔ نوازشات و عنایات کا سلسلہ جاری فرماتا ہے تو اُسے بند کرنے کا پھر نام نہیں لیتا۔ قرآن کو لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل فرماتے وقت اُس کی نظر لطف جو بندوں پر ہوئی تھی وہ ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر سال جب یہ برکت والی شب آتی ہے تو نزول رحمت الٰہی میں پھر وہی شان پیدا ہو جاتی ہے اور یہ شان ایسی عجیب و غریب ہوتی ہے کہ اس کی سیر کے لیے جبرئیل علیہ السلام اور دیگر ملائکہ بھی اس زمین پر نزول کرتے ہیں۔ اور یہ نزول کوئی چوری چھپے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فیاضیاں اُس شب میں اس قدر زوروں پر ہوتی ہیں کہ خود اُسے بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں چنانچہ وہ جبرئیل اور ملائکہ کو حکم دیتا ہے کہ جاؤ تم بھی زمین پر جاکر دیکھو کہ میرے بندے میری یاد میں کیسے مصروف ہیں اور میں اون پر کیسی کیسی رحمتیں اور کیسے کیسے انعامات برسا رہا ہوں بلکہ تم چونکہ میری بارگاہ سے میرے بندوں کے پاس جا رہے ہو اس لیے تم بھی وہاں خالی ہاتھ نہ جاؤ بلکہ میری جانب سے میرے بندوں کے لیے سلامتی کا تحفہ لیکر جاؤ۔ چنانچہ اس شب میں ذاکرین و عابدین کے لیے سلامتی برستی ہے۔ اُن کی عبادتیں بھی مقبول ہوتی

ہیں۔ اون کی دعائیں بھی مقبول ہوجاتی ہیں اور وہ خود بھی مقبول ہوجاتے ہیں اور یہ سب کچھ طلوع فجر تک ہوتا رہتا ہے

اللہ تعالیٰ نے یہ تو فرمادیا کہ قرآن ماہ رمضان میں نازل ہوا۔ دوسرے موقعہ پر یہ بھی فرمادیا کہ لیلۃ القدر میں نازل ہوا جس سے یہ نتیجہ نکالنا تو آسان ہوگیا کہ لیلۃ القدر یقیناً ماہ رمضان ہی میں واقع ہوتی ہے۔ مگر یہ نہ ارشاد فرمایا کہ رمضان کی کونسی شب لیلۃ القدر ہے۔ احادیث صحیحہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس مبارک شب کو رمضان کے آخری دہے کی طاق شبوں میں مخفی رکھا گیا ہے۔ اس اخفا میں بھی بڑی مصلحت ہے۔ لیلۃ القدر کے اس طرح مخفی فرمادینے میں حق تعالیٰ کا یہ منشا ہے کہ اس شب کی تلاش میں لوگ کئی شب جاگیں۔ یہ اخفا گویا دعوت ہے متعدد شبوں میں جاگنے اور مصروف عبادت رہنے کی۔ لیلۃ القدر میں بندوں پر اس قدر عظیم الشان اور اتنے عجیب وغریب قسم کا انعام ہوتا ہے کہ جیسا اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام اور دوسرے فرشتوں کو حکم ہوتا ہے کہ وہ جاکر اس کی سیر کریں۔ فرشتے تو اپنی ملکوتی بصیرت سے اس سیر کا کافی طور پر لطف حاصل کرسکتے ہیں۔ مگر انسان جو کہ کثافت کا پتلا اور ماسوائے اللہ میں جکڑا ہوا ہے اپنی کثافت جسمانی اور غیر اللہ میں انہماک کی تاریکی اور مادی نظر کے غلبہ کی نحوست سے کیونکر ان انعامات لطیفہ کا لطف حاصل کرسکتا ہے۔ کیسے تماشے کی بات ہوگی اگر فرشتے تو انسان پر نوازشات کی بارش کی سیر کریں اور خود انسان جس پر وہ بارش ہورہی ہے نوازشات کے لطف اوراک سے محروم رہے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ لیلۃ القدر کے وقوع کے چند روز قبل سے انسان میں وہ تغیرات روحانی پیدا کیے جائیں جن سے انسان کی ملکوتیت تیز ہوجائے۔ چنانچہ اوسے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ماہ رمضان کا چاند دیکھتے ہی سال کے بارہ مہینوں میں صرف ایک مہینے کے لئے تو ملائکہ سے حتی الوسع مشابہت پیدا کرے۔ اخلاق ذمیمہ سے معمول سے زیادہ اجتناب کرے۔ معصیت سے ہمیشہ سے زیادہ کنارہ کش رہے۔ جھوٹ نہ بولے

غیبت نہ کرے۔ لہو ولعب سے پرہیز کرے۔ فضول اور بیہودہ چیزوں سے اجتناب کرے دل کو ماسوی اللہ
سے ہٹائے۔ دن میں روزے رکھے رات میں جاگے اور اللہ کو بہت یاد کرے۔ دن میں کلام الٰہی کی
تلاوت اور رات میں اس کی سماعت سے اپنے قلب کو اللہ کے رنگ میں رنگے۔ توبہ و استغفار سے
تزکیۂ نفس پر زور دے۔ ماسوائے اللہ سے آنکھیں بند کرکے کلمۂ طیبہ کی کثرت اور حق تعالیٰ کے اسماء
تنزیہی و تقدیسی کے مراقبات سے عالم قدس سے اپنی مناسبت کو کئی دن پہلے سے بڑھانا شروع
کرے اور لیلۃ القدر کو مختلف شبوں میں ٹٹولتا رہے تاکہ جب لیلۃ القدر آئے تو اس مبارک شب کی
دلچسپیوں سے محظوظ ہونے کی اپنے میں صلاحیت پائے اور اللہ کے انعام کی قدر کرسکے اور اس سے
فائدہ اٹھاسکے۔

انسان اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب صنعت کا تنہا نمونہ ہے۔ وہ جامع اضداد ہے۔ اس میں
علویت بھی ہے اور سفلیت بھی۔ وہ ملکوتیت اور بہیمیت سے مرکب ہے۔ روح اور جسم کا مجموعہ ہے۔
اس کی ترقی کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کی ہر صنعت کو صحیح طور پر نشو ونما دی جائے۔ اس کے اجزائے
ترکیبی کا ہر جز ترقی کرے۔ اور اس کے مختلف الخاصیت اجزا میں ایک تناسب اور اعتدال قائم رہے۔
بدن انسانی عالم اجسام کی چیز ہے اور اپنے قیام کے لیے غذائے جسمانی اور دیگر ضروریات دنیوی کا محتاج
ہے۔ روح عالم ملکوت کی چیز ہے اور اپنی ترقی اور سرسبزی کے لیئے غذائے ملکوتی کی محتاج ہے جو لوگ ایک
ہی جانب متوجہ رہتے ہیں اور دوسری جانب سے غفلت برتتے ہیں وہ انسانیت کا حق ادا کرنے سے قاصر رہتے
ہیں اور حق تعالیٰ کی جانب سے جس خدمت پر اس دنیا میں مامور کیئے گئے ہیں اس کے انجام دینے کی قدرت
اپنے میں نہیں پاتے۔ اس لیئے ان کی اس دنیا کی زندگی بھی ناکام زندگی ہوتی ہے۔ دنیا میں آکر دنیا
کی نجاستوں سے محفوظ رہنا ہر کس وناکس کے لیئے آسان بات نہیں۔ چنانچہ فطرت انسانی کی اس کمزوری

نظر ڈاکٹر طبیب حقیقی نے طب الٰہی میں سال کا بارھواں حصہ وہ اقل مدت قرار دیا ہے جس میں خواہشات نفسانی اور لذات جسمانی کی جانب فطرتاً مائل ہونے والا انسان کم از کم اس مدت میں یعنی سال میں ایک مہینہ تو روح کو اوس کی مطلوب اور مرغوب غذا پہنچانے میں منہمک رہے تاکہ حق انسانیت بھی کچھ پورا ہو اور نرے جانوروں ہی میں اس کا شمار نہ ہونے لگے۔ یاد رکھیئے کہ قرآن اور وہ برکتیں جو لیلۃ القدر میں نازل ہوتی ہیں انسانوں ہی کے لئے مختص ہیں۔ جانوروں کے لیے ان میں کوئی حصہ نہیں۔

روح چونکہ عالم لطیف یعنی عالم ملکوت کی چیز ہے جب اس عالم کثیف یعنی دنیا میں آتی ہے تو بوجہ ملکوتیت کے اُس پر ایک حُزن طاری ہوتا ہے اور اس خاصیتِ غم کا غلبہ روح پر موت کے وقت تک مسلط رہتا ہے۔ یہی سبب ہے جو انسان پر خوشی کا اثر بالعموم دیرپا نہیں ہوتا حالانکہ حزن و ملال کے آثار اُس پر نسبتاً دیر تک قائم رہتے ہیں اور اُسے افسردہ اور شکستہ خاطر رکھتے ہیں۔ چنانچہ روح کو اس دنیا میں جس قدر خواہشات دنیا سے پاک کیا جائیگا اوسی قدر ملکوتیت کی شگفتگی اُس میں ترقی کریگی۔ اور انسان جس اصل کا ذرہ ہے اوس اصل کے ساتھ تعلق میں زیادتی محسوس کریگا۔ بخلاف اس کے طالب دنیا اور خواہشاتِ نفس کے پورا کرنے میں جو شخص جس قدر زیادہ انہماک رکھیگا وہ اوسی قدر زیادہ اپنی روح پر بارِ غم محسوس کریگا۔ خواہشات دنیا سے نے تعلق پیدا کرنے اور مقتضیاتِ بشری کو روکنے کی مشق بہم پہنچانے کے لیے جملہ اقسامِ عبادات میں روزہ موثر ترین عبادت ہے۔ روزہ میں موت کی چاشنی کا لطف آجاتا ہے موت کے بعد انسان کو ترک لذات پر مجبور رہنا پڑیگا۔ خواہشات نفس کے پورا کرنے پر اوسے قدرت نہوگی۔ روزہ میں باوجود قدرت و اختیار کے برقرار رہنے کے انسان اپنی خوشی سے یہ ترک و اجتناب اپنے اوپر نافذ کرکے عالم بالا سے ایک مناسبت پیدا کرتا ہے اور صمدیت کی انعکاسی صفات سے کچھ عرصہ کے لیے موصوف ہو کر حق سبحانہٗ تعالیٰ کے آثار کا اپنے میں مشاہدہ کرتا ہے۔ بشری خواہشوں سے جدا ہوتا ہے

اور خدا کی ذات کی حقیقتوں تک پہنچنے کے لیے اپنے میں ایک جنبش پاتا ہے۔

روزہ انسان کو اوس کی اگلی پچھلی حالت کے متعلق بھی نشان دہی کرتا رہتا ہے جسم میں آنے سے قبل روح میں کسی قسم کی خواہش نہ تھی۔ جسم سے نکل جانے کے بعد بھی اُس میں کوئی خواہش نہ رہیگی۔ جسم میں آکر البتہ اُسے خواہشات کی چاٹ پڑجاتی ہے جب وہ جسم سے نکلتی ہے تو ہمنشینیٔ جسم کے زمانہ میں جن خواہشات کی وہ عادی ہوچکی ہے اُن کے اثرات اُس میں کچھ عرصہ تک باقی رہتے ہیں جو اُس وقت روح کے لیے نہایت درجہ تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ روزہ میں چونکہ خواہشات کو عارضی طور پر روکا جاتا ہے اِس بات پر غور کرنے کا موقعہ ملتا ہے کہ ہم کسی زمانہ میں ایسے تھے کہ کسی قسم کی خواہش نہ رکھتے تھے اور کسی زمانہ میں ایسے ہوجائیں گے کہ کسی خواہش کی ضرورت ہی نہ رہیگی۔ اِن امور پر غور کرنے سے خواہشات کی بے وقعتی اور ان کا تکلیف دہ ہونا آشکارا ہوجاتا ہے۔

روزہ ایک روحانی مسہل ہے۔ ایک باطنی غسل ہے جو سال بھر کی بے اعتدالیوں کے مضر اثرات کو زائل کر دیتا ہے اور انسان کو کثافت آمیز ناسوتیوں کی صف سے نکال کر تھوڑی دیر کے لیۓ ملکوتیوں کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔ روزہ کی حالت میں بندہ کو فرشتوں سے ایک مماثلت پیدا ہوجاتی ہے۔ فرشتے کچھ کھاتے نہیں۔ پیتے نہیں۔ ہر وقت خدا کی عبادت اور فرماں برداری میں منہمک رہتے ہیں۔ روزہ کی حالت میں بندہ بھی کچھ کھاتا پیتا نہیں اور خدا ہی کی عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف کھانے پینے کا ترک کر دینا اور خدا کی عبادت میں مشغول نہ ہونا روزہ کے حقیقی مفاد سے انسان کو محروم رکھتا ہے۔ غیر اللہ میں انہماک اور کذب وغیبت اور لہو ولعب اور دیگر بیہودگیوں میں مبتلا رہنا گویا روزہ کے ساتھ تمسخر کرنا ہے۔ ایسا بے ثمر روزہ رکھنا حقیقتاً روزہ نہیں ہے بلکہ فاقہ ہے۔ خواجہ فرید الدین

علامہؒ فرماتے ہیں ؎

روزہ حفظ دل است از خطرات
بعد ازاں از مشاہدہ افطار

روزہ کے روحانی اور حقیقی فوائد کے متعلق تو اشارات مندرجۂ بالا میں کسی نہ کسی حد تک روشنی ڈالدی گئی ہے مگر آج کی صحبت برخاست ہونے سے قبل میں دو دو باتیں اُن حضرات سے بھی کرلینا چاہتا ہوں جو نئی روشنی کے دلدادہ اور تحقیقات جدیدہ پر فریفتہ ہیں اور اسلام کی ہر بات کو اپنی ہی عینک سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ یہ دنیا بھی عشاق کا اکھاڑہ ہے۔ یہاں ہر شخص کسی نہ کسی لیلیٰ کا متوالا ہے جو لیلےٰ جسم پر عاشق ہیں اُنہیں آج کل کی مہذب زبان میں پالیٹکس کا مجنون کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ کے پالیٹکس کو صرف جسم ہی سے سروکار ہے۔ پولٹیکل لیلیٰ کے دیوانے ہر چیز کو اپنی ہی عینک سے دیکھتے ہیں مطلب نہی مطلوب تک رسائی کا اُسے ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس سے تجاوز کرنا اپنی مصلحت کے خلاف خیال کرتے ہیں۔ ہر مفید چیز میں اُن کی نظر پولیٹیکل یا جسمانی مفاد ہی میں اٹک کر رہ جاتی ہے اور ہر مُضر چیز میں اونہیں صرف پولٹیکل یا جسمانی مضرت ہی کھٹکتی رہتی ہے۔ **نماز** میں اُن کے نزدیک صرف یہی خوبی ہے کہ اس کی بدولت محلہ کے مسلمان دن میں پانچ بار اکٹھے ہوجاتے ہیں جس سے اُنہیں تبادلۂ خیالات اور قومی معاملات میں مشاورت اور مشارکت کا بہت اچھا موقعہ ہاتھ آسکتا ہے۔ **جمعہ کی نماز** کے طفیل شہر کے مسلمانوں کی ہفتہ وار کانفرنس ہوجاتی ہے **عیدین** کے موقعوں پر گردو نواح کے مواضعات کے مسلمان بھی کانفرنس میں آکر شامل ہوجاتے ہیں۔ **زکواۃ** سے پبلک یا قومی فنڈ کو تقویت پہنچتی ہے۔ **حج** کا فلسفہ اُن کے نزدیک بس اسی قدر ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سالانہ کانفرنس منعقد ہوجاتی ہے جس میں ملکی اور ملی مصالح کی گتھیاں مشورہ باہمی سے سلجھا لینے کا نہایت اچھا

موقع ہے۔ روزہ سے اونہیں اس لیئے اتفاق ہے کہ اُس کے ذریعہ اُن کی صحت جسمانی کو فائدہ پہنچتا ہے
بھوکوں کی تکلیف کا ذاتی احساس لوگوں میں پیدا ہوتا ہے، اور کسی آڑے وقت ضرورت پیش آجائے تو
بھوک پیاس کی حالت میں بھی قومی مفاد کے امور میں عملی حصہ لینے کی عوام کو مشق بہم پہنچتی رہتی ہے مگر وہ
یہ کہیں کہ منجملہ دیگر بڑے بڑے فوائد کے یہ بھی ایک فائدہ ہے جو جسم سے متعلق ہے تو ہمیں اُن کی بات کے مان
لینے میں ممکن ہے کہ کوئی عذر نہ ہو۔ لیکن جب وہ اپنی ہی لیلیٰ کے گرد طواف کیے جاتے ہیں اور دیگر اہم تر
مصلحتوں کی نفی کر کے اِن ارکان مذہبی کی صرف پولٹیکل مصلحتوں ہی کے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اپنی
ہی بات پر اڑے رہتے ہیں تو ہم یہہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ع

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

وہ بیچارے اپنی حدِ نظر سے آگے بڑھنے سے مجبور رہیں۔ اُن کی لیلیٰ کا اون پر پورا تسلط ہو گیا ہے
اور دنیا کی ہر چیز اونہیں صرف ان کی لیلیٰ ہی کی جانب رہنمائی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ چادر کے کونے میں
موتی باندھکر ایک گنوار سے پوچھا گیا کہ بتاؤ اس چادر میں کیا بندھا ہے؟ اُس نے ٹٹول کر جواب دیا کہ چنے
بندھے ہیں۔ وہ گنوار بیچارہ اس جواب پر مجبور تھا۔ اُس کی نگاہ چنوں سے آگے جا ہی نہ سکتی تھی۔ موتیوں کا
وجود اس کے نزدیک عدم ہے۔

اعتذار

میری ناسازی مزاج کا سلسلہ پوری طرح ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یکایک ایک رفیق کار کے نقض عہد نے ایسے
حالات پیدا کر دئے جن سے ترجمان القرآن کی زندگی خطرے میں پڑ گئی اور اس ناخوشگوار قضیہ نے پورا ایک ہفتہ
ضائع کر دیا اسی وجہ سے یہ پرچہ بہت تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے میں شکر گزار ہونگا اگر ناظرین کرام اس عذر کو
قبول فرمائیں گے۔ الحمد للہ کہ اب خطرات دور ہو گئے ہیں اور پرچہ محفوظ ہو چکا ہے

ابوالاعلیٰ

از

مولانا عبداللہ العمادی

(۱)

کلام عرب میں "سعد" سے یمن وبرکت اور "نحس" سے اُس کا جانب مقابل مراد لیتے ہیں اسی طرح "نحوست" کی نقیض "سعودت" ہے "سعادت" نہیں ہے، محاورہ میں "سعادت" کے مخالف "شقاوت" ہے، سعادت کے ساتھ نحوست نہ کہینگے، سعودت کہینگے۔

"سعد" اُس پانی کو بھی کہتے ہیں جو آب پاشی کے وقت نالیوں کے باہر بہنے لگتا ہے، جاہلیت میں اس کا آبیانہ بھی دینا پڑتا تھا اسلام نے ممانعت کردی، حدیث میں ہے:۔

کُنا نکری الارض بما علی السواقی وما سعد من الماء فیھا فنھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلک۔

ایک طریقہ سعد کرنے کا بھی تھا جسے "اسعاد" کہتے تھے، کوئی مرجاتا تو گھروالیوں کے ساتھ نوحہ کرنے کے لیے ہمسائیاں آتیں اور بین میں شریک ہوجاتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی منع فرمایا کہ لا اسعاد ولا عقر فی الاسلام

دس کواکب قمر بھی ہیں جنھیں "سعد" کہتے تھے۔

"سعد" کے ایک معنی کلام اللہ میں بھی ہیں:۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا - الآیہ (یعنی وہ لوگ جو سعد ہوئے) مطلب یہ ہے کہ توفیق الٰہی نے جن کی اعانت کی۔

"نحس" کے معنی بھی ملاحظہ ہوں۔

کسی اچھی چیز کا کسی پر بُرا اثر پڑتا تو اُس کو "نحس" کہتے۔

ابلغ جذاما ولخما أنّ اِخوتهُم

طيّاً وبهراءَ قومٌ نصرهم نحس

گرد و غبار پر بھی نحس کا اطلاق ہوتا۔

اذا هاج نحسٌ ذو عَثانين والتقت

سَبارِيتُ اَغفالٍ بها الآلُ يمصَعُ

"تند و تیز ہوا بھی "نحس" تھی

وفی شَمُولٍ عُرِضتْ للنحس

شدید سردی کا نام بھی نحس تھا

كأنّ هُداهمةً عُرِضت لنحس

يحيل شفيفُها الماءَ الزلالا

——— ۲ ———

جن بے عقلی کی باتوں کو وقتاً فوقتاً مذاہب کے دامن میں پناہ ملتی رہی ہے اور دوست نما دشمنوں کی عنایت سے اسلامی شائستگی پر حملہ کرنے کے لیے جو اسلحہ فراہم کیے گئے۔ اُنھیں میں سعد و نحس کا ایک مسالہ بھی ہے۔ شریف گھرانوں میں سعد و نحس کا جس قدر لحاظ ہوتا ہے اور عورتیں اور اُن کے ماتحت مرد جس طرح اس ضابطہ کی پابندی فرض سمجھتے ہیں وہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے جس کے نتائج نظر انداز ہو سکیں شادی کے لیے سبھ لگن کی تلاش ہوتی ہے۔ نیک گھڑی دیکھی جاتی ہے۔ زائچہ ولادت (جنم پترا) کے حساب سے دولھا دولہن کے مزاج کے موافق پنڈت جی اچھی ساعت بچارتے ہیں۔ جناب قبلہ و کعبہ

ایام سعد و نحس کی گھڑیاں اور تاریخیں ملاحظہ فرماتے ہیں۔ دیکھنا کہیں قمر در عقرب نہ ہو ورنہ غضب ہی آجائے گا۔ سفر میں نکلنا ہو تو سمت سفر کی اچھی طرح تحقیق کرو۔ راستے میں رجال الغیب تو نہیں پڑتے۔ اگنی اور نیرت اور بائب کے گوشے دیکھ لینے چاہئیں۔ راہ میں کسی جگہ پاتراب رکھوا دو۔ پھر دوسرے دن سفر کو نکلو۔ نئے کپڑے بنوانے۔ بچہ کا دودھ چھڑانے عقیقہ کرنے۔ مکتب میں بٹھانے مکان کی نیو ڈالنے۔ شادی بیاہ رخصتی۔ غرض کہ دنیا کا کوئی ایسا کام دھندا نہیں ہے جس میں کسی قسم کی اہمیت ہو اور پھر اُس کے لیے دن۔ تاریخ۔ گھڑی نہ دیکھی جائے اور سعد و نحس کی تحقیق نہ ہو۔ یہ رواج اس قدر عام ہے۔ کہ جنتریوں میں اس کے لیے خاص جدولیں ہوتی ہیں اور وہی تقویمیں نامی و علمی سمجھی جاتی ہیں جن میں سال بھر کے پتھرا اور لگن کا پورا پورا احساب ہو۔ ناممکن ہے کہ قمر در عقرب یا چاند گرہن اور سورج گرہن میں کوئی تقریب ہونے پائے۔ ہالی کا دنبالہ (ہالی کومٹ) نمایاں ہوا اور گھروں میں نحوست کی جھاڑو پھر گئی۔ ملک بھر میں ڈر کے مارے تمام تقریبیں بند ہوگئیں کہ نہ معلوم کیا نحوست پھیلے اور دم دار تارے کی شومی کیا رنگ دکھائے۔ ادبیات کے ذریعہ سے اِن خیالات کی توسیع میں اور بھی مدد ملی اور گو پہلے یہ باتیں محض ایک انوکھی بات سمجھ کر نظم ہوتی تھیں مگر حقیقی اسلامی تعلیم کی روشنی جس قدر کم ہوتی گئی اور تاریکی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اُسی قدر عام رائے میں یہ توہمات راسخ ہوتے گئے اور اب تو بالکل محال ہے کہ منحوس تاریخ میں کوئی نیک تقریب ہو سکے' یہ باتیں عام عقائد میں داخل ہوگئی ہیں اور اگر جزو اسلام نہیں تو اسلامی رسم و رواج کے ایک نہایت طاقتور جزو ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا۔

اِن توہمات کے ثبوت میں حسب ذیل دلائل پیش کئے جاتے ہیں :۔

(الف) خود قرآن میں سعد و نحس کا تذکرہ ہے۔

(ب) حدیثیں نحوست کی قائل ہیں۔

(ج) مذہبی روایتیں بعض دنوں کے اچھے بُرے ہونے کے حق میں ہیں۔

(د) سعادت ونحوست کی واقعیت پر مسلمانوں کا عام اجماع ہے اور اس عقیدہ کی تاریخ صدیوں سے متجاوز ہے۔ بیرزا صاحب لکھتے ہیں:۔

زخال گوشۂ ابروئے یار می ترسم ازیں ستارۂ دنبالہ دارے ترسم

لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:۔

دی درمیان زلف بدیدم رُخِ نگار بر ہیأتے کہ ابر محیط قمر شود
گفتم کہ ابتدا کنم از بوسہ گفت نی بگزار تا کہ ماہ زعقرب بدر شود

امام رازی جو علوم اسلام کے نامور علامہ اور ممتاز ترین مفسر تھے۔ سورۂ حم فصلت[۲۱] کے پندرھویں آیہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

استدل الاحکامیون[۱] من المنجمین بھذہ الایۃ علی ان بعض الایام قد یکون نحسا وبعضھا قد یکون سعدا وقالوا ھذہ الایۃ صریحۃ فی ھذا المعنی۔ اجاب المتکلمون بان قالوا "ایام نحسات" ای ذوات غبار وتراب ثائر لا یکاد یبصر فیہ ویتصرف۔ وایضا قالوا معنی کون ھذہ الایام نحسات ان اللہ اھلکھم فیھا۔

ستارہ شناسوں میں جو لوگ علم احکام کے عالم ہیں وہ آیت فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ سے اس امر پر استدلال کرتے ہیں۔ کہ بعض دن کبھی سعد ہوا کرتے ہیں کبھی نحس۔ اُن کا قول ہے کہ یہ مطلب اس آیت سے صراحت کے ساتھ نکل رہا ہے۔ متکلمین اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آیت میں نحس دن سے گرد و غبار کے دن مراد ہیں جن میں اتنی خاک اُڑ رہی تھی کہ نہ دیکھ سکتے تھے اور نہ کام کر سکتے تھے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان دنوں کے نحس ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم عاد و ثمود کو انہیں دنوں میں ہلاک کیا تھا۔

[۱] احکامی وہ لوگ جو سیاروں کی رفتار و اثر کے رو سے عالم میں تغیرات کی پیشینگوئی کیا کرتے ہیں۔ منجمین کی اصطلاح میں اس فن کا نام "فن احکام" یا "علم احکام" ہے۔

احاب المستدل الاول بان النحسات في وضع اللغة هي المشئومات لان النحس يقابله السعد والكدر يقابله الصافي. واجاب عن السوال الثاني ان الله تعالى اخبر عن ايقاع ذلك العذاب في تلك الايام النحسات فوجب ان يكون تلك الايام نحسة مغايرًا لذلك العذاب الذي وقع فيها [1]۔

جن لوگوں نے پہلے استدلال کیا تھا وہ اسکا یہ جواب دیتے ہیں کہ لغت میں نحس کا لفظ شوم (نحوس) کے لیے وضع ہوا ہے اس لیے کہ نحس کے مقابلہ میں سعد اور کدورت کے مقابلہ میں صفائی کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ دوسرے سوال کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ عذاب انہیں منحوس دنوں میں واقع ہوا تھا۔ لہٰذا ضرور ہے کہ ان دنوں کا منحوس ہونا اس عذاب (گرد و غبار) کے علاوہ ہو جو ان دنوں میں واقع ہوا تھا (اور جس سے عاد و ثمود کی قومیں جن کا آیت میں تذکرہ ہے ہلاک ہوئی تھیں [1]

ایک دوسرے مقام پر خاص خاص اوقات کے سعد اور بابرکت ہونے کی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

لا يبعد من الفاعل المختار تخصيص وقت معين باحداث العالم فيه دون ماقبله ومابعده. فان بطل هذا الاصل فقد بطل حدوث العالم وبطل الفاعل المختار وحينئذ لا يكون للخوض في تفسير القرآن فائدة وان صح هذا الاصل فقد زال ماذكرتم

خدا جو اپنے کاموں میں ہر طرح سے صاحب اختیار ہے اس سے کیا بعید ہے کہ عالم کو کسی وقت میں پیدا کرے اور اس وقت کو بغیر اس کے کہ قبل و بعد کا لحاظ ہو خاص فرمائے۔ یہ اصل الاصول ہی اگر غلط ٹھہرا تو عالم کا پیدا ہونا بھی غلط ہو جائیگا اور فاعل مختار (اللہ تعالیٰ) کا ثبوت بھی غلط ٹھہریگا۔ ایسی حالت میں قرآن کی تفسیر میں غور و خوض کرنا بیفائدہ ہے۔ اور اگر یہ اصل الاصول صحیح اترا تو تم نے جو اعتراض کیا ہے اسکا ازالہ

[1] تفسیر کبیر۔ جلد ۷ صفحہ ۲۴۳ و ۲۴۴؁

من السؤال - فهذا هو الجواب المعتمد
والناس قالوا لا يبعد ان يخص الله تعالى
بعض الاوقات بمزيد تشريف
حتى يصير ذلك داعيا للمكلف الى
الاقدام على الطاعات فى ذلك الوقت
ولهذا السبب بين انه تعالى اخفاه
فى الاوقات وما عينه لانه اذا لم
يكن معينا جوز المكلف فى كل وقت
معين ان يكون هو ذلك الوقت
الشريف فيصير ذلك حاملا له
على المواظبة على الطاعات فى كل
الاوقات - واذا وقفت على هذا
الحرف ظهر عندك ان الزمان و
المكان انما فازا بالتشريفات الزائدة
تبعا لشرف الانسان فهو الاصل
وكل ما سواه فهو تبع له [1]

ہوگیا۔ یہی جواب قابل اعتماد ہے۔
علاوہ بریں لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ بعید نہیں اگر اللہ تعالیٰ
کسی وقت کو زیادہ بزرگی و شرافت کے ساتھ مخصوص کردے
کہ یا مر اس خاص وقت میں لوگوں کے لیے عبادت کرنیکا
محرک ہوا کرے۔ یہی سبب ہے کہ تمام وقتوں میں برکت
والی رات (شب قدر) کے وقت کو اللہ تعالیٰ نے
چھپا رکھا ہے اور اس کی تعیین نہیں کی ہے۔ کیونکہ
اگر وقت معین نہ ہوگا تو جائز ہے کہ ہر ایک وقت معین
کی نسبت لوگ سمجھیں کہ یہ وہی شریف و سعید وقت ہے،
اور اس بنا پر ہر وقت عبادت کرنیکی تحریک پیدا کریگی
اس مطلب سے واقف ہونے کے بعد تم پر اس کی حقیقت
کھلیگی کہ محض انسان کے شرف کے ضمن میں زمان و مکان بھی شرافت
و سعادت کی زیادتی میں کامیاب ہوئے ہیں۔
اصل انسان ہی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی چیزیں
ہیں سب کی سب انسان کی تابع اور اسی کے
لیے ہیں [1]

اس مسئلہ کو منقح کرنے سے پیشتر ان آیتوں کو بھی سن لینا چاہیئے جن سے سعد و نحس کا مضمون

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۸، صفحہ ۱۳۱۔ مسلمانوں کو امام صاحب کا یہ اصول یاد رکھنا چاہیئے کہ سعد و نحس کا مبنی اصل میں انسان ہی ہے اور اسی کی وجہ سے دوسری چیزیں بھی سعد و نحس سے منسوب ہوتی ہیں۔

پیدا کیا جاتا ہے۔ سورۂ حم السجدہ میں ہے:-

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ۔ فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً؟ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً؟ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ۔ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ

پس اگر (سمجھانے پر بھی) سرتابی کریں تو (اے پیغمبر تم اُن سے) کہدو کہ جیسی کڑک عاد و ثمود پر ہوئی تھی اُسی طرح کی کڑک سے میں تم کو ڈراتا ہوں کہ اُن کے پاس (بھی) اُن کے آگے سے اور اُن کے پیچھے سے (یعنی کثرت سے) پیغمبر آئے (اور پیغمبروں نے اُن کو سمجھایا) کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ وہ لگے کہنے اگر ہمارے پروردگار کو (پیغمبروں کا بھیجنا) منظور ہوتا۔ تو (آسمان سے) فرشتے اُتارتا۔ غرض جو (دین) دیکر تم لوگ بھیجے گئے ہو ہم تو اس کو مانتے نہیں۔ سو (وہ جو قبیلہ) عاد (کے لوگ تھے) لگے ناحق تکبر کرنے اور بولے کہ بل بوتے میں ہم سے بڑھکر اور کون؟ کیا ان کو اتنا نہ سوجھا کہ جس اللہ نے اُنکو پیدا کیا وہ بل بوتے میں اُن سے کہیں بڑھ چڑھکر ہے۔ غرض وہ لوگ ہماری نشانیوں سے انکار کرتے ہی رہے تو ہم نے (بھی) نحوست کے دنوں میں اُن پر بڑے زور کی آندھی چلائی تاکہ دنیا کی زندگی میں اُن کو ذلت کے عذاب کا مزہ چکھائیں اور آخرت کا عذاب تو اُنکو دنیا کے عذاب سے کہیں زیادہ رسوا کرنے والا ہوگا

وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ (سورہ ۴۱۔ رکوع ۲۔ آیت ۱۶) اور اُس وقت اُن کو کسی طرف سے مدد بھی نہیں ملیگی۔

سورۂ قمر میں ہے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ۔ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ؟

(سورہ ۵۴۔ رکوع ۱۔ آیت ۱۰۔ ۱۲)

قوم عاد نے (پیغمبروں کو) جھٹلایا تو ہمارا عذاب اور ہمارا ڈرانا دیکھا اس کا انجام) کیسا ہوا۔ کہ ہم نے ایک منحوس دن میں جس کی نحوست (کسی طرح ٹالے) نہیں ٹلتی تھی ان پر ایک زناٹے کی آندھی چلائی (اور) وہ لوگوں کو (جگہ سے ایسا) اُکھاڑ پھینکتی تھی کہ گویا وہ اُکھڑی ہوئی کھجوروں کے بوتے ہیں[1] تو ہمارا عذاب اور ہمارا ڈرانا دیکھا اُس کا انجام) کیسا ہوا؟

———(۴)———

ان آیتوں میں بلکہ اس تمام مضمون میں صرف دو باتیں قابل تنقیح ہیں:۔

(الف) منحوس دنوں سے قرآن کریم میں کیا مقصود ہے؟

(ب) کیا اسلامی تعلیمات واقع میں عقیدہ سوروخس کے جانبدار ہیں؟

پہلی تنقیح کے جواب میں ذیل کی حدیثیں جن کو علامہ ابن جریر نے مکمل سلسلۂ سند اور مستند راویوں کے وثوق پر روایت کیا ہے۔ قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

عن ابن عباس قوله فی "ایام نحسات" قال ایام متتابعات انزل الله فیهن العذاب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ منحوس دنوں سے مراد پے در پے آنے والے دن ہیں جن میں خدا نے عذاب نازل کیا تھا۔

[1] اردو میں "بوتہ" درخت کے "تنہ" کو کہتے ہیں۔

قال ابن زيد فی قوله "ایام نحسات" قال النحس الشر ارسل علیهم ریح شر لیس فیها من الخیر شیٔ عن عبید قال الضحاک یقول فی "ایام نحسات" قال شداد[1]

حضرت ابن زید "ایام نحسات" (منحوس دنوں) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ نحس شر و برائی کو کہتے ہیں یعنی قوم عاد پر ایسی بری ہوا کا طوفان آیا تھا جس میں کچھ بھی خیر نہ تھی۔ عبید کہتے ہیں کہ میں نے ضحاک کو "ایام نحسات" کی تفسیر میں کہتے ہوئے سنا کہ وہ نحس دن تھے یعنی سخت دن تھے۔[1]

—— (۵) ——

کچھ حدیثیں ایسی بھی ہیں جن میں نحس کے معنی شوم اور نحوست ہی کے لیے گئے ہیں اور خود علامہ ابن جریر بھی اسی کے قائل ہیں۔ لیکن ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:-

قوله "فی یوم نحس مستمر" یقول فی یوم شرٍ وشؤمٍ لهم[2]

آیت "منحوس دن میں جس کی نحوست کسی ٹالے نہیں ٹلی تھی" منحوس دن سے وہ دن مراد ہے جو قوم عاد کے لیے برا اور منحوس تھا۔[2]

حدیثوں میں بھی یہی مضمون ہے مثلاً

عن قتادة فی "ایام نحسات" ایام والله کانت مشؤمات علی القوم عن السدی فی "ایام نحسات" قال ایام مشؤمات علیهم[3]

ایام نحسات (نحوس دنوں) کی تفسیر میں قتادہ کی روایت ہے کہ خدا کی قسم وہ دن عاد کیلئے منحوس تھے سدی ایام نحسات کی تفسیر میں کہتے ہیں۔ کہ وہ دن قوم عاد پر نحس تھے[3]۔

---

[1] تفسیر ابن جریر۔ جلد ۲۴۔ صفحہ ۶۰"

[2] تفسیر ابن جریر۔ جلد ۲۷ صفحہ ۵۲

[3] تفسیر ابن جریر۔ جلد ۲۴۔ صفحہ ۶۰

یہ حدیثیں تین خاص باتیں بتا رہی ہیں :-

(الف) نحوست کے وہ معنی جو آج کل مشہور و معروف ہیں قرآن کریم میں کہیں بھی مستعمل نہیں ہوئے۔

(ب) صحابہؓ و تابعینؒ کسی دن کی نحوست کے قائل نہ تھے۔

(ج) نحوست کا مفہوم اُس زمانہ میں صرف اس قدر تھا کہ اگر کسی شخص یا قوم پر کبھی مصیبت و بلا نازل ہوتی تو اُس مصیبت و ابتلا کی وجہ سے وہ دن مخصوص طور پر اُس قوم کے لیے منحوس دن مانا جاتا تھا۔ یہ مطلب نہ تھا کہ عام طور پر اُس دن میں نحوست آگئی۔ دنیا بھر کے لیئے وہ دن منحوس ہو گیا یا اُس دن کے بعد بھی اُسی نحوست و مصیبت کی مناسبت سے جب جب وہ دن آئے گا ہمیشہ منحوس سمجھا جائیگا۔ ان باتوں کا نام و نشان تک نہیں ملتا نہ اسلام ان کا مؤید ہے نہ بزرگان اسلام ان کے قائل تھے اور نہ اہلِ عرب کے رسم و رواج ہی سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ یہ باتیں اُس وقت کی ہیں جب اسلامی تمدن کمزور ہو چلا تھا اور فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ (اسلام خدا کی فطرت ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے) کی سادگی پر عجمیت کا رنگ روپ چڑھ چلا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چھٹی صدی ہجری سے پہلے کی کتابوں میں موجودہ توہمات کے مطابق سعد و نحس کا کہیں تذکرہ تک نہیں ملتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمات اس باب میں کیا ہیں؟ یہ مسئلہ کسی قدر تشریح طلب ہے بے شبہہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو حدیث نبوی کے الفاظ پر غور نہ کرنے کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی تھی مگر یہ غلطی زیادہ دیر تک نہیں رہنے پائی اور اُنہیں دنوں میں اس کی تصحیح ہو گئی۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

عن عبد اللّٰہ بن عمر انه قال سمعت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ اُنہوں نے

النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے
"انما الشؤم فی ثلاثة فی الفرس	سُنا کہ "نحوست محض تین چیزوں میں ہے
والمرأة والدار"	گھوڑے میں ۔ عورت میں ۔ اور گھر میں"

علامہ عینی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "تمام محققین کا اتفاق ہے کہ عہدِ جاہلیت میں لوگ اس امر کے معتقد تھے ۔ کہ گھوڑے میں ۔ عورت میں اور گھر میں نحوست ہوا کرتی ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انہیں کے اعتقاد کو بیان کیا ہے ۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کو بھی ان چیزوں کی نحوست کا قائل رہنا چاہیئے ۔ حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) نحوست اور بدشگونی کی مطلق قائل نہ تھیں ۔ جاہلیت میں شوال کا مہینا شادی بیاہ کے لیئے منحوس سمجھا جاتا تھا ۔ اسی لیے مدینۂ مبارکہ کی عورتوں میں یہ وہم سمایا ہوا تھا ۔ کہ شوال میں اگر زفاف ہوا تو شوہر کی طرف سے بیوی کو خوش نصیب نہ ہوگی ۔ حضرت عائشہؓ سے اس کا تذکرہ آیا تو آپ نے عورتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ :-

ما تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے شوال
وسلم الا فی شوال ولا بنی بی الا فی	ہی میں بیاہا اور شوال ہی میں زفاف کیا ۔ تباؤ
شوال فمن کان احظی منی عندہ ؟ و	مجھ سے زیادہ آپ کے ہاں کس کی قدر تھی ؟
کان یستحب ان یدخل علی نسائہ	آپ تو شوال میں اپنی بیویوں کے پاس آنا
فی شوال ۔ ؎	مستحب جانتے تھے ۔ ؎

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر معلوم ہوا کہ نحوست اور بدشگونی کی تائید میں ایک صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کر رہے ہیں ۔ آپ اس پر سخت ناخوش ہوئیں اور روایت کی تصحیح کر دی ۔ امام طحاوی فرماتے ہیں :-

---

؎ عینی (عمدة القاری ۔ طبع قسطنطنیہ) جلد ۷ صفحہ ۱۰۲ ؂

عن ابی حسان قال دخل رجلان من بنی عامر علی عائشة فاخبراها ان ابا هریرة یحدث عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال الطیرة فی الدار والمرأة والفرس فغضبت وقالت: "والذی نزل القرآن علی محمد صلی الله علیه وسلم ما قالها رسول الله صلی الله علیه وسلم قط انما قال ان اهل الجاهلیة کانوا یتطیرون من ذلک" [1]	ابو حسان سے روایت ہے کہ قبیلۂ بنی عامر کے دو شخصوں نے حضرت عائشہ کے پاس حاضر ہو کر خبر دی کہ ابو ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کر رہے ہیں کہ "بدشگونی گھر میں، عورت میں اور گھوڑے میں ہوتی ہے" آپ نے ناخوش ہو کر کہا: "قسم ہے اس خدا کی جس نے محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر قرآن اتارا! آنحضرت نے یہ ہرگز نہیں فرمایا تھا۔ آپ نے تو فقط یہ بیان کیا تھا کہ "جاہلیت میں لوگ ان چیزوں سے بدشگونی لیا کرتے تھے" [1]

اس تصریح کے بعد کیا کسی تحقیق پسند و منصف مزاج کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ مذہبی روایتیں سعد و نحس کی جانبدار ہیں۔ یا اسلامی تعلیمات سے اس عقیدہ کی تائید ہوتی ہے؟ یا عوام کے توہمات اور شاعروں کے مفروضات و تخیلات کا اس پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے؟ خدا کسی وقت کو اگر چاہے تو ممکن ہے برکت عطا فرمائے یا منحوس کر دے۔ لیکن اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ اس نے ایسا کیا اور یہ امکان وقوع کے درجہ میں آ گیا۔

—————— (۵) ——————

یہ مسئلہ کہ "نحوست سے یہی نحوست مراد ہے۔ اس لیے کہ عربی زبان میں نحس کے مقابلہ میں سعد کا لفظ استعمال ہوا کرتا ہے" چنداں اہم نہیں ہے۔ کیونکہ لغت میں مرد ہو

---

[1] عینی (عمدۃ القاری۔ طبع قسطنطنیہ) جلد ۷ صفحہ ۱۰۶۔

اور فضائے آسمان کو گھیرے ہوئے گردو غبار کے لیئے بھی نحس کا لفظ وارد ہے اور قرآن کریم کے سیاق سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بداختری و نافرجامی بھی نحس کے معنی بتائے گئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ بعد کے لغت نویسوں کو غالباً عالمگیر توہمات سے مغلوب ہو کر قرآن کی مفروضی تائید کیلیٔے یہ معنے پیدا کرنے پڑے۔ ورنہ ابتدائی کتابوں میں اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ تفسیر کبیر کا یہ اعتراض بیشک وقیع ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے چونکہ خبر دی ہے کہ منحوس دنوں میں قوم عاد پر عذاب ہوا تھا۔ اس لیئے ضرور ہے کہ ان دنوں کی نحوست اُس عذاب کے علاوہ ہو جو انہیں دنوں میں نازل ہوا تھا۔ مگر اہل نظر بھی تو یہی کہتے کہ دن کی نحوست اور چیز تھی اور جو عذاب اُس دن نازل ہوا وہ اور ہی تھا۔ دن کی نحوست تو یہ تھی کہ گرد و غبار سے بھرا ہوا تھا۔ اور عذاب یہ نازل ہوا کہ اسی عالم میں ہولے سرد کے طوفان نے نیا دیں ہلا دیں۔"

جن چیزوں کا مشاہدات سے علاقہ نہیں ہے اُن کی وقعت تسلیم کرنے کے لیے دو ہی صورتیں ہیں۔

(۱) مذہب اُن کا حامی ہو۔

(۲) وہ بات عقل کی رو سے خلاف قیاس نہ ہو۔

پہلی صورت کے متعلق ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ سعد و نحس کے اعتقاد سے مذہب کو ذرا بھی علاقہ نہیں ہے۔ دوسری صورت کی حقیقت یہ ہے کہ تاریخ۔ گھڑی۔ دن۔ رات۔ صبح۔ شام، وغیرہ وغیرہ یہ سب وقت کے خاص خاص حصّوں کے نام ہیں اور وقت ایک ایسی وسیع مدت کا نام ہے جس کے اجزا حیثیت کے آپس میں ملے جلے ہونے چاہئیں۔ لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ اس امتداد کا کوئی ایک جز دوسرے سے اچھا یا بُرا نکلے اور وہ دائرہ جس کا ہر حصّہ متشابہ ہونا چاہیئے کسی تخصیص کی وجہ سے غیر متشابہ ہو جائے۔

حیف ہے کہ مذہب اور عقل دونوں جس کے مخالف ہوں ہم اُس کو اپنی معاشرت کا جزو غالب بنا لیں اور اس حکیمانہ اصول کو بالکل ہی بھول جائیں کہ "سعد و نحس اگر ہے بھی تو انسان کے طرز عمل سے وابستہ ہوگا۔ اصل میں جو کچھ انسان ہی ہے اور سعادت و نحوست اُسی کے کردار کی خوبی یا خرابی سے تعلق رکھتی ہیں"

قصۂ یوسف علیہ السلام

آثار قدیمہ کی روشنی میں

از جناب حکیم عیش ۔ امروہوی صدر جمعیت علمائے برما ۔ (رنگون)

قدیم مصری تاریخ میں صرف ایک ہی ایسا زمانہ آیا ہے جس میں ایک عبرانی غلام منصب وزارت عظمیٰ تک پہونچکر امور مملکت میں پورا متصرف بن گیا ہو۔ یہ شخصیت حضرت یوسف کی تھی۔

عبرانیوں کے ساتھ جب زمانہ سازگار رہا تو مصر اُن کے قبضۂ حکومت میں آگیا۔ ان کا یہ عہد عہد ہکسوس کہلایا۔ عہد تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا زمانہ ۱۶۸۶ سے ۱۵۹۵ قبل مسیح تک تھا آثار قدیمہ نے اس عہد سلطنت ہکسوس کو شباب کا زمانہ ظاہر کیا ہے

ہکسوس (چرواہوں) کی اصل ونسل کا مسئلہ مورخین۔ علمائے عہد قدیم وفضلائے آثار قدیمہ میں ابتک مختلف فیہ چلا آتا ہے۔ بعض انہیں سامی بتلاتے ہیں۔ بعض سیتھیا والے۔ بعض حِتّی (شمالی شام کے قدیم باشندے) بعض اکادی (اکاد علاقہ بابل کے وہ قدیم باشندے جو تورانی النسل تھے جنہوں نے کالدی تمدن کے آثار چھوڑے)، ہم اس اختلاف سے بچنے کے لیئے اسی قدر عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ یہاں ایشیا سے آئے اور مصر میں حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے حکرانی کرتے رہے۔

گھوڑا مصر میں یہی لائے تھے۔ رتھ مصر میں انہیں نے بنائے تھے سواروں کا رسالہ انھیں نے تیار کیا تھا ان سے پہلے مصر میں ان چیزوں کو کوئی بھی نہ جانتا تھا کیونکہ وادیٔ نیل میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی۔ مصر مختلف خاندانوں کی کرونڈ حکومتوں میں منقسم تھا اس لیے جب یہ قوم چرواہان حملہ آور ہوئی تو زبردست وغالب ہوئے

کے سبب ملک مصر پر اس کا قبضہ ہو گیا

شاہان ہکسوس کے قدم سیکڑوں سال تک دریائے نیل کی سطح مرتفع پہ جمے رہے اس سے آگے گو وادی نیل میں مصری خاندانوں کی ریاستیں تھیں مگر وہ بھی اکثر اُن کے اقتدار میں تھیں ان کی قوت کو مانتی تھیں گو ان سے نفرت و بیزار تھیں جب موقع ہاتھ آتا تو اُن کی مخالفت خطرناک بن جاتی آخر انھیں ریاستوں نے چند صدیوں کے بعد دولت ہکسوس کا بیڑا کر ڈالا۔

ہکسوس مصر میں آئے تو یہ کسی ثقافت کے مالک نہ تھے اس لیے مصر کا رنگ ان پر چڑھنے لگا حتیٰ کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ رنگ ایسا چوکھا ہو گیا کہ مصری معاشرت مصری طور طریق۔ انشا، خطاب رسم و رواج سب ان میں آ گئے۔ مصری زبان ان کی زبان بن گئی۔ دفاتر میں دیسی باشندے بھر گئے۔ مصری علم و دانش کو عروج اور مصری ثقافت میں زندگی آ گئی۔ ان میں اور مصریوں میں اگر کوئی فرق و امتیاز تھا تو مذہب کا تھا اور کوئی فرق و امتیاز نہ تھا۔ (قدیم اسرائیل و امم مجاورہ صفحہ ۱۵۸) لہ

کچھ تو اجنبیت اور کچھ اختلاف مذہب ان دو باتوں نے اس اختلاط کے باوجود بھی مصریوں کے دل صاف نہ ہونے دیے۔ چنانچہ ہیاکل مصریہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ہکسوس داہل مواشی کو "عات" کا لقب دے رکھا تھا جس کے عہد عتیق میں معنے ہیں "مکروہ" عہد عتیق میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ "مصریوں کو ہر چرواہا "سے نفرت ہے" (پیدائش ۴۶ : ۳۴)۔

جب حضرت یعقوب علیہ السلام مع برادران یوسف مصر میں سکونت کے لیے داخل ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے انھیں چپکے سے سمجھا دیا تھا کہ :۔

"جب فرعون تم کو بلائے اور کہے کہ تمہارا پیشہ کیا ہے تو تم کہیو تیرے غلام جوانی سے لیکے اب تک چوپانی کرتے رہے ہیں کیا ہم اور کیا ہمارے آبا و تاکہ تم جشن کی زمین میں رہو اسلیے

لہ EARLY ISRAEL AND SURROUNDING NATIONS. PAGES 158. 160.

کہ مصریوں کو ہر چرواہے سے نفرت ہے" (پیدائش ۴۶ : ۳۴) جب فرعون کو معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ہکسوس ہی کی قوم سے ہیں تو ہم قوم ہونے کی وجہ سے انھیں سکونت پذیر ہونے کی اجازت دیدی اگر یوسف علیہ السلام یہ بات نہ سمجھا دیتے تو فرعون انھیں نہ تو خاص رعایتیں دیتا نہ خاص مراتب پیش کرتا اس نے یوسف علیہ السلام سے کہا کہ :۔

"اپنے باپ اور بھائیوں کو اس سرزمین کے ایک مقام میں جو سب سے بہتر ہے انھیں رکھ جشن کی زمین میں انھیں رہنے دے اگر تو جانتا ہے بعضے ان کے درمیان چالاک ہیں تو انکو میرے مواشی پر مختار کر"۔

اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہکسوس اور یوسفؑ کی ایک ہی اصل و نسل تھی۔

جب یوسف علیہ السلام مصری غلام بنائے گئے اُس وقت مصر تحتانی پر خاندان ہکسوس کی حکومت تھی مگر انہیں اس قوم کے کسی رئیس نے نہیں خرید اتھا بلکہ ایک مصری نے خریدا تھا۔ چنانچہ قرآن شریف میں ہے۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ — اور اہلِ مصر میں سے جس نے یوسف کو خریدا تھا اُس نے اپنی بیوی کو کہا کہ اسکو عزت سے رکھ

سے رکھ ۔ کلام پاک میں اس شخص کو اہل مصر سے کہنے کا یہی مطلب ہے کہ اس وقت حکومت اہلِ مصر کی نہ تھی۔

عہد عتیق میں بھی اسے مصری کہا ہے ۔ پیدائش ۳۹ : ۱۔

"و مردے مصری فوطیفار نام کہ خواجہ و سردار افواج خاصۂ فرعون بود و ویرا از دست اسماعیلیان کہ اورا آنجا بردہ بودند خرید"۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مصری فرعون کے جلوداروں کا سردار تھا۔ اور مترجم بائبل

قحط

مصر میں دریائے نیل سے آبیاری کے سبب نہایت شدید قحط پڑنا خیال میں کم آسکتا ہے اور پھر سات سال کا قحط ایک ایسا حادثۂ عظیم ہے کہ ملحدین کے نزدیک اس کے لیے کتب مقدسہ کی شہادت کافی نہیں بلکہ مصر کے آثار قدیمہ میں اس کا ذکر ہونا ضروری ہے۔ ایسے لوگوں کی تشفی کے لیے حال میں اس قحط کا مصدق ایک کتبہ دستیاب ہوگیا ہے۔ یہ کتبہ ایک شخص مسمی بابا کا لکھا ہوا ہے جو "سکوانن رآتا" سوم کی ملازمت میں تھا یہ فوقانی دریائے نیل کی وادی میں اک رئیس تھا اس اطراف میں ہکسوس کا تسلط پورا پورا نہ تھا۔ اس کتبے میں جس قحط کا ذکر ہے اس کا زمانہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ سے مطابق ہے۔

یہہ کتبہ جو بابا کے قبے پر "ال کاب" میں ملا ہے۔ اس میں ہے کہ :۔

"اناج بونے کے وقت میں خود نگراں تھا۔ میں نے اناج فصل کے دیوتا کی رضا سے جمع کیا اور جب کئی سال قحط پڑا تو میں نے ہر سال شہر میں غلہ تقسیم کیا"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب یوسف علیہ السّلام کے غلہ جمع کرنے کی خبریں اڑیں اور تعبیر خواب کی بات پھیلی تو اوروں کے خلاف اُس نے ان پر یقین کر کے یوسف علیہ السّلام کی پیروی کی اور اناج جمع کرتا رہا۔

یہہ بات کہ خود شاہان ہکسوس نے اس عظیم ابتلا کا ذکر کیوں نہیں کیا ان کا لکھوایا ہوا بھی تو کوئی ایسا کتبہ ملنا چاہیئے تھا تو اس کی وجہ غالباً یہہ ہے کہ جب مصریوں نے اپنے ملک سے انہیں نکالدیا تو اپنے تعصب و حقارت کی وجہ سے ان کا کوئی نشان باقی نہ رکھا تاکہ ان کے زمانہ کی ناگوار یاد بھی ان کے آثار کے ساتھ ساتھ رخصت ہوجائے۔

بفرض یہ وہ قحط نہ بھی ہو تو بھی ملک مصر میں اس سے کئی کئی سال قحط کا پڑنا ثابت ہوتا ہے۔ اور یوں عہد یوسف علیہ السلام کے قحط کی تائید اس سے ہوجاتی ہے۔

یوسف علیہ السلام کے مصری خطابات

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے ارض مصر کے خزائن کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اناج کے تمام کھتے ان کے تصرف میں آگئے تو فرعون نے انہیں "صفنات فعنیخ" کا خطاب عنایت کیا۔ عبرانی عہد عتیق میں بعینہ یہ مصری خطاب روایت کیا گیا ہے۔ قدیم عربی و فارسی ترجموں میں بھی اس کو بحال چھوڑ دیا ہے۔ مگر دوسری زبانوں کی بائبل میں اس کا ترجمہ کر دیا گیا ہے اردو بائبل میں اس کے معنے جہاں پناہ کے ہیں۔ جس سے خطاب کا اصلی مفہوم غت ربود ہو جاتا ہے قدیم مصری میں اس کا لفظی مفہوم ہے" صاحب اخذیہ حیات" اصلی زبان کے اندر جن معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اور جو وسیع مطلب اس کا لیا جاتا ہے اس کو صحیح طور پر قرآن شریف نے ادا کیا ہے۔ یہ وہی منصب ہے جو یوسف علیہ السلام خود طلب فرماتے ہیں قال اجعلنی علی خزائن الارض۔ الایہ۔ یوسف نے فرمایا کہ ملکی خزانوں پہ مجھکو مامور کر دو۔ یعنی صاحب خزائن ارض بناؤ۔ یہ خطاب اُسی عہدے کو ظاہر کرنے والا ہے۔

"آب" یوسف علیہ السلام کا یہ بھی ایک خطاب تھا مگر جب تک مصری تحریر کا حل نہ ہوا کسی کو اس کا پتہ نہ چلا۔

عبرانی بائبل میں اس لقب کا ذکر تکوین ۴۵ : ۸ میں ہے۔" اب" قدیم مصری لفظ ہے اور خطاب ہونے کی وجہ سے بعینہ عبرانی بائبل میں روایت ہوا ہے مگر یہ حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مترجمین نے اُسے عبرانی لفظ سمجھ لیا ہے اور اس کا ترجمہ باپ کر کے عجیب اہمال پیدا کر دیا ہے۔ اس غلطی کے سبب سے آیت کا مطلب ایسا خبط ہو جاتا ہے کہ کسی صورت سے کوئی معنی پیدا ہی نہیں ہوتے۔ بائبل کی یہ معنوی تحریف ایسی واضح ہے جس کو تمام محققین بائبل تسلیم کرتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں سے تحدیث نعمت فرمارہے ہیں کہ یہاں مجھے

خدا نے بھیجا ہے۔ اور اُس نے مجھے فرعون کا اَبْ بنایا ہے۔

(عربی) وھُو قد جعلنی آباً لفرعون " (فارسی) " واو مرا پدر بر فرعون ساخت"

(اردو) اور اُس نے مجھے فرعون کے باپ کی جگہ........ بنایا"

اَبْ کا ترجمہ باپ کرنے سے کتنی بے معنی بات ہوگئی بات یہ ہے کہ یہ قدیم مصری لفظ ہے اور اس کا مفہوم منصب ہے جو بادشاہ یعنی فرعون کے بعد ہو اس کا صحیح مرادف عربی میں عزیز ہے جو اصطلاحی لفظ ہے اور مصر کے وزرا کا عربی خطاب ہے۔

قرآن شریف میں یوسف علیہ السلام کے متعلق اس لقب کا اظہار "یا ایہا العزیز" الآیہ۔ میں کیا ہے قرآن شریف کی یہ صحت کتنی ایمان کو تازہ کرنے والی اور بائبل کی غلطی کی نگہبان ہے۔ صدق اللہ العلی العظیم

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (اَلْاٰیۃ)۔ یعنی قرآن پچھلی کتاب کا مہیمن (نگہبان) ہے۔

"ابرق" یوسف علیہ السلام کے قصہ میں ایک اور مصری اصطلاح آتی ہے۔ چونکہ اصطلاح کے لیئے خاص لفظ جو بالکل مطابق ہو دوسری زبان میں بمشکل ملتا ہے۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بضرورت ایسی مصری اصطلاحیں ہی استعمال فرمائی ہیں۔ مگر مترجمین بائبل نے کہیں تو انہیں عبرانی لفظ سمجھ لیا ہے اور کہیں قیاس سے ترجمہ کر ڈالا ہے۔ جیسے اَبْ جس کا ذکر ہو چکا ہے، وہ عبرانی زبان میں بمعنی باپ ہے اور مصری زبان میں بمعنی وزیر۔ اسی طرح اَبرق ہے کہ مصری زبان میں اس کے معنی ہیں "اپنے بائیں طرف" اور عبرانی زبان میں اس کے معنی ہیں "تعظیم کے لیئے جھکنا"

چنانچہ اس لفظ کو عبرانی سمجھ کر بائبل کے ترجموں میں ارتکاب غلط کیا گیا ہے۔ سفر تکوین ۴۱: ۴۳ میں ہے:-

(عربی) ونادوا امامہ اركعوا۔

(فارسی) "پیش رو پیش ندا میکردند کہ زانو زنید"

(اردو) "اور اس (فرعون) نے اُسے (یوسفؑ) کو اپنی دوسری گاڑی میں سوار کر دیا تب اس کے آگے منادی کی گئی۔ سب ادب سے رہو" مصر میں اس وقت سواری کو رستے کے بائیں طرف چلانے کا رواج تھا جیسا کہ آج بھی اکثر ممالک میں ہے حضرت موسیٰ نے یوسفؑ کے حشم اور جلوداری کی تصویر اتاری ہے کہ وہ عزیز مصر ہو کر جب باہر نکلتے تھے تو آگے آگے پیشرو سامنے آنے والوں کی آگاہی کے لئے پکارتے تھے کہ "ابرق" "أبرق" (اپنے بائیں رہو)۔ بائبل کا ترجمہ ادکوا یا زانو زنید صحت کے لحاظ سے درست نہیں ہے۔

تمکین حکومت و اتساع سلطنت

خزائن ارض مصر پر مامور ہونے کے بعد جب سال بسال قحط کی سختی بہت ہی بڑھ گئی تو یوسف علیہ السلام نے اوّل سال نقد کے عوض اناج دیا پھر چوپاؤں کے عوض بائبل ۴۷ : ۱۸-۲۱ میں ہے :-

"جب وہ سال گزر گیا تو وہ دوسرے سال اُس کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد خرچ ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہمارے چوپایوں کے گلے بھی لے لیے سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بدنوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں"

"پس ہم اپنی زمینوں سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں۔ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے۔ اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے اور یوسفؑ نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لیے مول لی کیوں کہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے اُن کو نپٹ تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی رہے لوگ! سو اُس نے اُنھیں شہروں میں مصر کے اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا"

اس سلوک کی اصلی وجہ مجملاً اوپر بھی مذکور ہو چکی ہے یعنی مصریوں کا دل میں قوم ہکسوس کو

کردہ رکھنا اور فوقانی نیل کے تین چار شاہی سلسلوں کا جو حکمرانی کر رہے تھے پورا مطیع نہ بننا اور شورش و بغاوت کرتے رہنا۔

جب یہ لوگ یوسف علیہ السلام کے پاس آئے اور وعدہ کیا کہ اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں آجائیں گے جس سے متبادر ہوتا ہے کہ وہ پورے فرماں بردار نہ تھے تو یوسفؑ نے ان کی زمین لے لی تاکہ ربقۂ اطاعت اس معاملہ سے ان کی گردنوں میں پڑا رہے۔ اس طرح ہکسوس کی سلطنت کو حضرت یوسفؑ کی تدبیر و سیاسی قابلیت کی وجہ سے بڑی تمکین و وسعت حاصل ہوگئی۔ قرآن شریف میں "وکذالک مکنا لیوسف فی الارض" اور ہم نے اسی طرح یوسف کو اس سرزمین میں خوب قوت دی"۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور اُن کی سیاسی قابلیت کا بھی اظہار ہے۔

فضائل و مناقب قرآن

از جناب مولوی اکرم علی صاحب محمدی مدرس مدرسہ دیجا پور

اعجاز قرآن اعجاز مصدر ہے عجز سے جس کے معنی ہیں عاجز کرنا۔ ناتوان کرنا۔ جیسے اَعْجَزْتُ زَیْدًا۔ عاجز کردیا میں نے زید کو۔ وَجَدْتُهٗ عاجزًا۔ میں نے اس کو عاجز پایا وغیرہ وغیرہ۔ مصباح المنیر جلد ۲ صفحہ ۲۰ طبع مصر) میں لکھا ہے کہ مصدر کبھی بمعنی فاعل بھی آتا ہے۔ پس اعجاز کے معنی عاجز کرنے کے بھی ہیں، اور معجزہ یعنی عاجز کرنے والے کے بھی۔ اعجاز القرآن سے مراد یہ ہے کہ تمام دنیا کی کتب ارضی وسماوی من کل الوجوہ قران مجید کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ دنیا بھر کے حکماء کی حکمتیں اس کی حکمت کے مقابلہ میں فرومایہ دنیا بھر کے قانون اس کے قانون کے مقابلہ سے قاصر۔ جملہ فصحا و بلغائے عرب و عجم من حیث المجموع اس کے سامنے خاموش۔ دنیا بھر کے ملکوں کی فصاحت و بلاغت اس کے روبرو ہیچ۔ یہ کلام معجز نظام ایسا سہل ممتنع ہے کہ ہر صاحب عقل و فہم اس کو سمجھ سکتا ہے۔ مگر اس کی ایسی ایک چھوٹی سی آیت بھی نہیں بنا سکتا۔

معجزہ رسالت و نبوت کا خاصہ لازمہ ہے جس کے معنی خرق عادت کے ہیں۔ قوت معجزہ ہر نبی و رسول کو من جانب اللہ عطا ہوتی ہے۔ اور کسی وقت زائل نہیں ہوتی۔ نبی و رسول بحکم الٰہی جب چاہے ناممکن کو ممکن کر دکھائے۔

یوں تو ہر نبی ورسول کو خداوند عالم نے وقت اور حالات کے لحاظ سے خاص خاص معجزے

عطا فرمائے تھے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور عصائے موسیٰ۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کو احیائے موتیٰ وغیرہ۔ مگر ہمارے سردار دو عالم فخر بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی تھے اور آپ کے بعد اور کوئی نبی آنے والا نہ تھا اس لیے آپ کو ایک ایسا معجزہ عطا فرمایا گیا جو ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے، جو ابد الآباد تک اپنی شان اعجاز دکھا کر آپ کی نبوت کا ثبوت پیش کرتا رہیگا۔ حق کو حق اور باطل کو باطل کرکے دکھاتا رہیگا۔ اور جس کی موجودگی میں دنیا کو کسی نبی کی حاجت ہی پیش نہ آئے گی۔ وہ معجزہ یہی قرآن مجید ہے اور اُس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ ۝

شب کو محفل میں ہر اک مہ پارہ گرم لاف تھا
صبح دم خورشید رو نکلا تو مطلع صاف تھا

محققین کی آراء

(۱) بعض فرقۂ معتزلہ کے نزدیک قرآن مجید باعتبار اپنے حسنِ ترتیب و نظم و تسلسل کلام کے معجزہ ہے کیونکہ اس کا اسلوب بیان تمام کلام عرب کے نظم و نثر سے نرالا۔ انوکھا۔ جدت و پاکیزگی لیئے ہوئے ہے اور کیوں نہ ہو آخر اُس شہنشاہ حقیقی کا کلام ہے جس کی شان لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ اور کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ ہے، جیسا وہ سب سے بزرگ و بالا۔ برتر و اعلیٰ ہے ویسا ہی اُس کا کلام بھی بلند پایہ و افضل و ارفع ہے۔

(۲) اشاعرہ اور جاحظ کے نزدیک وجہ اعجاز قرآن اس کی بینظیر فصاحت و بلاغت ہے۔

(۳) بعض متکلمین کے نزدیک غیب کی سچی خبریں دینے کے باعث قرآن مجید معجزہ ہے۔ جیسا کہ آیہ کریمہ غُلِبَتِ الرُّوْمُ سے ظاہر ہے (ملاحظہ ہو الاتقان للسیوطی صـ۱۲۲ ؎)۔

(۴) بعض کے خیال میں وجہ اعجاز قرآن پاک یہ ہے کہ وہ دلوں کے بھید ظاہر کرتا ہے۔ جیسا کہ آیہ کریمہ:۔ اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا الخ

سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ احد میں دو گروہوں نے بزدلی کی تو اللہ برتر نے اُن کی طرف اشارہ فرما دیا۔

(۵) بعض کا خیال ہے کہ قرآن مجید اس لیے معجزہ ہے کہ وہ رسولِ اُمّی صلعم (فداہٗ ابی وامی) کی زبان فیض ترجمان سے نکلا ہے اور بے پایاں خوبیاں رکھتا ہے۔

(۶) بعض کے نزدیک وجہ اعجاز قرآن یہ ہے کہ انسان کے کلام میں حشو و زوائد، نقص و تطویل وغیرہ ہر قسم کا حسن و قبح ہوتا ہے۔ بخلاف قرآن شریف کے کہ وہ باوجود ایک طویل کلام ہونے کے بھی نہایت حُسن صحت سے شروع ہو کر آخر تک ایک ہی سلک میں منسلک ہے۔

(۷) کلام مجید چونکہ نہایت موثر ہے اور اپنے اندر ایک خاص قسم کی جاذبیت رکھتا ہے اس لیے وہ معجزہ ہے

(۸) عند البعض۔ قرآن مجید کے تمام احکام وارشادات نہایت مستحکم اور کلی قوانین ہیں لہذا وہ معجزہ ہے۔

(۹) نظام معتزلی و ابن حزم ظاہری کا مذہب ہے کہ وجہ اعجاز قرآن مجید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام فصحا و بلغائے عرب و عجم سے اس بات کی قوت سلب کر لی تھی کہ وہ فرقان حمید کے مقابلہ میں کچھ اپنا کلام پیش کر سکیں (الفصل فی الملل والنحل لابن حزم صـــــ)

(۱۰) بعض محققین علماء و فضلاء کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں چونکہ تناقض و اختلاف اور کسی قسم کا نقص نہیں ہے اس لیے وہ معجزہ ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی و امام فخر الدین رازی رحمہما اللہ نے نظام معتزلی وغیرہ کے خیالات کی بڑے شد و مد سے تردید کی ہے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ نظام کا مذہب غلط اور سراسر غلط ہے۔ کیونکہ جب خداوند تعالیٰ نے اُن سے قوت معارضہ ہی سلب کر لی تو اللہ معجز ہوا نہ کہ قرآن شریف۔ حالانکہ خداوند تعالیٰ

تو فصحا و بلغائے عرب کو اُن کے دعویدار فصاحت و بلاغت ہونے کی بنا پر چیلنج دیتا ہے۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ○ سُورَۃ بقرہ ع ۳	اور اگر تم لوگ شک میں ہو اس کتاب (قرآن) کی نسبت جو ہم نے اپنے بندے (محمد صلعم) پر اُتاری ہے تو پھر تم اس کی مثل ایک سورت ہی بنا لاؤ اور اپنے حمائتیوں کو بھی بلا لو جو خدا کے علاوہ ہیں اگر تم سچے ہو۔ ۱۲

اور دوسری جگہ تو نہایت زور کے ساتھ صاف صاف فرما دیا۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن على ان ياتو بمثل هذا القران لا ياتون بمثله ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا ○	یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہدیجئے کہ اگر جن و انسان ملکر بھی زور لگائیں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تب بھی ہرگز نہیں لاسکتے اگرچہ وہ اس کام میں ایک دوسرے کے مددگار بھی ہوں۔

اس سے بخوبی ظاہر ہوگیا کہ معتزلہ وغیرہ کے خیالات علمی نقطۂ نظر سے بالکل کمزور ہیں۔ چنانچہ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ بھی الزامی طور پر جواب دیتے ہیں کہ اگر اہل عرب اللہ تعالیٰ کے عاجز کر دینے سے معارضہ کی تاب نہ لاسکے تو اُن کے دلوں میں پھر قرآن شریف کی غایت درجہ عظمت وشان کیوں تھی (نہایۃ الاعجاز نمبر ۲) احقر کے نزدیک اقوال علماء میں تو ضرور اختلاف ہے مگر نفس اعجاز قرآن من حیث ہو ہو کے لحاظ سے جملہ اسلامی فرقے اعجاز قرآن کے قائل ہیں۔ بلکہ اغیار بھی قرآن کی فصاحت و بلاغت وغیرہ کا لوہا مانتے ہیں۔ جیسا کہ ترجمان القرآن میں پہلے شائع ہوچکا ہے۔

عِبَارَاتُنَا شَتَّى وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلٌّ إِلَىٰ ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيرُ

فضائل تلاوت قرآن

حدیث: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلّموا القرآن فاقرءوہ

یعنی پہلے قرآن مجید کا علم حاصل کرو پھر اس کو پڑھو (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجہ)

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قرآن مجید کی ایک آیۃ سمجھکر پڑھے گا اس کو سو رکعت نماز نفل کا ثواب ملے گا۔

(۳) سرور عالم صلعم فرماتے ہیں کہ میری امت کی سب سے افضل عبادت قرآن مجید کی تلاوت ہو۔

(۴) اہل اللہ خاص اہل قرآن ہی ہیں (یعنی قرآن کے پڑھنے اور عمل کرنے والے)

(۵) تم میں سے بہتر وہ شخص ہے کہ قرآن شریف خود سیکھے اور لوگوں کو سکھائے۔

(۶) اللہ تعالیٰ قرآن پڑھنے والے کی طرف سب سے زیادہ توجہ کرتا ہے۔ کیونکہ قاری قرآن گویا خدا سے باتیں کرتا ہے۔

(۷) جس نے قرآن پڑھا اسے ہر حرف پر اتنا ثواب ملیگا جو دوسرے اعمال سے دس حصے زیادہ ہوگا

(۸) رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم قرآن شریف پڑھا کرو جو اپنے پڑھنے والونکی قیامت کے روز شفاعت کریگا۔

(۹) ایک مرتبہ ارشاد نبوی ہوا کہ انسان کے دل میں لوہے کی طرح زنگ آجاتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس کو کیونکر دور کیا جائے۔ فرمایا کہ قرآن کی تلاوت اس کو دور کرتی ہے اور پھر دل کو مجلا کردیتی ہو جیسا کہ تائب توبہ کے بعد پاک و صاف ہو کر اللہ کا مقبول بندہ بن جاتا ہے۔

(۱۰) حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جو شخص نماز میں کلام مجید کھڑے ہو کر پڑھے اس کو ہر حرف کے بدلے سو نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور جو بیٹھکر نماز میں پڑھے اسے پچاس نیکیوں کا اور جو شخص نماز کے علاوہ باوضو پڑھے تو اس کو پچیس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور اگر بے وضو پڑھے تو دس نیکیوں کا۔

(ل) قرآن مجید بے وضو پڑھنا جائز ہے مگر چھونا ممنوع۔ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝ الآیۃ۔ البتہ اگر کپڑے میں ہو تو مضایقہ نہیں عند الفقہا۔

(ب) قرآن مجید بموجب آیۃ کریمہ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ جس وقت پڑھے تو اول اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ پڑھکر تلاوت کرے۔

(ج) قرآن مجید پڑھنے میں اگر مجبوراً کسی سے کلام کرنے کی ضرورت ہو تو بھی اعوذ باللہ الخ پڑھکر آگے کو پڑھے اگر بحالت غیظ و غضب اعوذ باللہ الخ پڑھ لے تو غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے (نسائی)۔

(د) قرآن مجید کو بحالت جنابت چھونا اور پڑھنا منع ہے۔

(۱۱) ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جس دل میں قرآن ہو اُس پر اللہ تعالیٰ عذاب نہیں فرماتا یعنی حافظ قرآن پر بشرطیکہ بے عمل اور مشرک نہ ہو۔

مسئلہ۔ اُجرت پر قرآن مجید پڑھانا درست ہے (لَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا الآیۃ)

(۱۲) حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھو ہر حرف پر دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔

(۱۳) جناب امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خواہ قرآن شریف معنی سمجھکر پڑھا جائے یا معنی معلوم نہ ہوں دونوں حالتوں میں تقرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

(۱۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کی ہر آیۃ جنت کا درجہ رکھتی ہے اور قرآن تمہارے گھر کا چراغ ہے۔ جس گھر میں قرآن پڑھا جاتا ہے وہ گھر نیکیوں سے بھر جاتا ہے۔

(۱۵) حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی قرآن پڑھتا ہے تو فرشتے اُس کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیتے ہیں۔

(۱۶) جو مومن قرآن مجید پڑھا ہوا ہے اس کو دس آیات کم از کم روزانہ پڑھنی چاہئیں۔

مگر افسوس صد افسوس ہمارے آجکل کے اکثر امیر اُمراء اول تو قرآن مجید پڑھے ہوئے نہیں ہیں اور بعض پڑھے بھی ہیں تو وہ پڑھتے ہوئے شرماتے ہیں۔ غربا میں بھی آج کل قرآن شریف کا پڑھنا رسم ہو گیا ہے مثلاً گیارہویں یا بارہویں یا کسی کے پھولوں (زیارت) ہیں۔ دہم چہلم ششماہی برسی ہیں یا کوئی مریض ہو۔ اور وہ بھی ناجائز طریقہ سے کہ کچھ لوگ مسجد یا کسی مکان میں جمع ہو کر باہم چلا چلا کر پڑھتے ہیں جس سے اور گنہگار ہوتے ہیں۔ کیونکہ باری عزاسمہٗ کا تو یہ حکم ہے کہ جب قرآن مجید پڑھا جائے تو تم اُس کو سنو اس میں تمہارے واسطے بہتری ہے۔ (اذا قُرِئَ القران فاستمعوا له وانصتوا) ۔ چنانچہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیۃ کا عام حکم تصور کرکے فاتحہ خلف الامام تک کو منع فرمایا ہے لیکن ہمارے حنفی بھائی من وجہ تو مقلد ہیں اور من وجہ غیر مقلد بلکہ اپنی طبیعت اور اغراض کے بندے ہیں۔ کیونکہ جب سب لوگ آپس میں قرآن پڑھیں گے تو کیونکر سن سکینگے۔

آداب تلاوت قرآن

قرآن مجید کی تلاوت کا سب سے پہلا ادب یہ ہے کہ پڑھنے والا باوضو نہایت ادب کے ساتھ قبلہ رو گردن جھکا کر بیٹھے تکیہ وغیرہ نہ لگائے۔ نشست میں نخوت و غرور کا شائبہ تک نہ ہو۔

(۲) کلام مجید کو رحل یا پاک صاف تکیہ وغیرہ پر رکھے۔ آیات قرآنی کو بالترتیل ٹھہر ٹھہر کر زیر زبر کی صحت کے ساتھ اس طرح پڑھے کہ حروف اپنے صحیح مخارج سے ادا ہوں اور ہر لفظ صاف طور سے سُنائی دے۔

(۳) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سرکار دو عالم نے ارشاد فرمایا کہ قرآن ایک ہفتہ میں ختم کیا کرو

(۴) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہفتہ میں کلام مجید کو اس طرح ختم فرماتے تھے۔ کہ شب جمعہ کو شروع سے سورۂ مائدہ تک شنبہ کی رات کو سورۂ انعام سے سورہ ہود تک۔ یکشنبہ کی شب کو سورۂ یوسف سے سورۂ مریم تک اور دوشنبہ کی رات کو سورۂ طہٰ سے قصص تک سہ شنبہ کی شب کو سورۂ عنکبوت سے لیکر صٓ تک چہارشنبہ کی رات کو زمر سے سورۂ رحمٰن تک پنجشنبہ کی شب کو سورۂ واقعہ سے آخر تک تلاوت

(۵) اب اگر کوئی شخص قرآن مجید کے معنی جانتا ہو یا معنی سمجھنے کی غرض سے ترجمے کے ساتھ

اس سے بھی زیادہ توقف کے ساتھ پڑھے - تو اور بھی زیادہ باعث ثواب و فلاح دارین ہے

(۶) بعض کے نزدیک کم از کم تین روز میں بھی قرآن مجید کو تلاوۃً تراویح وغیرہ میں پڑھنا درست ہے مگر رمضان شریف میں بعض حفاظ شبینہ کے نام سے ہر رات بھر میں قرآن مجید کو ختم کرتے ہیں وہ تکلیف مالایطاق اور بے ثبوت ہے -

(۷) قرآن شریف کی تلاوت میں رونا مستحب ہے حضور اقدس صلعم نے فرمایا ہے کہ قرآن کو پڑھو اور گریہ کرو ورنہ کم از کم رونے کی ہیئت ہی اختیار کرو - خاصکر آیات عذاب تہدید - وعید - عہد و میثاق اور اوامر و نواہی کے وقت کہ خلوص اور عاجزی مترشح ہو - رونا رحمت الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ ہے

(۸) جب سجدے کی آیتوں میں سے کوئی آیۃ آئے تو کمال عجز کے ساتھ ایک سجدہ کرے -

(۹) تلاوت قرآن مجید کی ابتدا اعوذ باللہ الخ سے کرے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اور جب تلاوت ختم کرے تو صدق اللہ العلی العظیم - کہے -

بہرحال تلاوت قرآن خلوص نیت کے ساتھ ہونا چاہیئے - خواہ آواز سے پڑھے - خواہ آہستہ - لیکن ایسے مواقع پر کہ لوگ اپنی باتوں میں ہوں یا سفر ریل وغیرہ میں تو آہستہ پڑھنا ضروری ہے - اگر سامعین قاری کی طرف متوجہ ہوں تو آواز سے پڑھنا چاہیئے - اور تنہائی میں اختیار ہے خواہ آہستہ پڑھے - جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رات کو تلاوت کرتے تھے - خواہ آواز سے پڑھے - جیسا کہ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کو پڑھتے تھے -

(۱۰) حضرت جبریل علیہ السلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سال میں - ایک بار دور کراتے تھے - اور آخر سال میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو مرتبہ قران کا دور کرایا ہے پس اگر ہم امتیان محمد صلعم بھی کم از کم سال میں دو مرتبہ قرآن مجید کو پڑھ لیا کریں کہ ایک بار

رمضان شریف میں اور ایک بار باقی گیارہ میں تو بہت کافی ہے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ۔)

(۱۱) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ قرآن مجید کی تفسیر اور مطلب کو بغیر دریافت کئے حضور انور صلعم سے اپنی طرف سے نہیں فرماتے تھے۔ پس قرآن مجید کے معنی اپنی طرف سے لکھنے سنانے بیان کرنا اور بالخصوص تاویلات کرنا بڑا گناہ ہے۔

مسودہ قانون حقوق ازدواج اہل اسلام

(جناب خلیل الزماں صاحب صدیقی بیرسٹرایٹ لا نے حیدرآباد کی مجلس وضع آئین و قوانین میں مسلمان عورتوں کے حقوق ازدواجی کی حفاظت کے لیئے ایک مسودہ پیش کیا ہے جس کو یہاں بجنسہ درج کیا جاتا ہے۔ اشاعت آئندہ میں اس پر شرعی نقطۂ نظر سے مفصل بحث کی جائے گی۔ ایڈیٹر)۔

تمہید — ہرگاہ قرین مصلحت ہے کہ بعض امور مندرجہ احکام شرع شریف متعلقۂ حقوق زوجین کی مزید وضاحت وصراحت کردی جائے لہٰذا حسب ذیل حکم ہوتا ہے :۔

مختصر نام و تاریخ — دفعہ ۱۔ یہ قانون بنام قانون حقوق ازدواج اہل اسلام موسوم ہوسکیگا۔ اور تاریخ اشاعت جریدہ سے ممالک محروسہ سرکار عالی میں نافذ ہوگا۔

ب ۔ اور ہر ایسے مقدمہ یا کارروائی سے متعلق ہوگا جو تاریخ نفاذ قانون ہذا پر زیر تحقیقات یا تجویز ہو یا نفاذ قانون ہذا کے بعد دائر یا پیش ہو اور جس کا تصفیہ حسب احکام شرع شریعت ہونا چاہیے لیکن کسی ایسے فیصلہ یا تجویز اور اوس کی تعمیل پر موثر نہ ہوگا جو قبل نفاذ قانون ہذا صادر ہو کر قطعی ہو چکی ہو۔

دعاوی فسخ نکاح و تفریق — دفعہ ۲۔ کسی دعوے میں جو زوجہ کی جانب سے فسخ نکاح یا تفریق کی غرض سے دائر کیا جائے حسب ذیل وجوہ بھی انفساخ نکاح یا تفریق کے لیے کافی متصور ہوں گے۔

الف ۔ شوہر ۔ (۱) عنین خصی یا مجبوب ہو۔

(۲) مجزوم یا مبروص ہو یا کسی سخت مرض میں ایک سال سے زاید عرصہ سے

مبتلا ہو کر ادائے حقوق زن و شوئی نہ کر سکے یا تعلق مذکور کا برقرار رکھنا زوجہ کے لیے سخت مضر صحت ہو اور ظلم کی حد تک پہونچتا ہو۔

لیکن شرط یہ ہے کہ جب شوہر بوقت نکاح عوارض صدر سے کسی میں مبتلا تھا اور زوجہ کو اس وقت اس کا علم تھا تو وہ مہر سے دست بردار ہو جائے۔

ب۔ جب شوہر مفقود الخبر ہو یا طویل مدت کے لیے سزا پا کر قید ہو گیا ہو اور جائداد شوہری بقدر کفالت نان و نفقہ زوجہ کے قبضہ میں ہو یا جب اس نے اس کا معقول انتظام کیا ہو تو تاریخ مفقود الخبری یا قید سے چار سال گذر گئے ہوں۔

لیکن شرط یہ ہے کہ جب عدالت کی رائے میں کوئی دادرسی شوہر کے طویل مدت کے لیے قید ہو جانے کی بنا پر عطا کرنا مہر کی تخفیف کے ساتھ قرین معدلت ہو اور اس پر زوجہ رضامند نہ ہو تو عدالت دادرسی دینے سے انکار کر سکیگی۔

ج۔ جب شوہر کی بدسلوکی زوجہ کے ساتھ ظالمانہ ہو (توضیح۔ شوہر کا زوجہ کے پاس نہ جانا یا عدم ادائی نفقہ یا عدم قابلیت ادائی نفقہ بلحاظ جملہ حالات ایسی بدسلوکی کی حد تک پہونچ سکیگا جو ظالمانہ ہو)

ضابطہ بصورت مفقود الخبری	دفعہ ۳۔ عدالت پر لازم ہوگا کہ مفقود الخبری (حسب دفعہ ۲ ضمن ب) کی بنا پر کسی دادرسی کے عطا کرنے کے قبل جب ممکن ہو شخص مفقود الخبر کے قرابتدار و ورثاء

میں سے اگر ہوں کسی ایک یا زاید کا بیان بغرض انکشاف حالات قلبند کرے۔

بعض صورتوں میں تخفیف مہر	دفعہ ۴۔ جب شوہر کی جانب سے زوجہ کو طلاق دی جائے اور زوجہ کسی مرض مندرجہ دفعہ ۲ ضمن الف ۲ میں قبل نکاح مبتلا تھی اور اس وقت شوہر کو اس کا علم نہ تھا اور نہ وہ اس پر رضامند تھا تو شوہر پر صرف ایک ربع دینار مہر عائد ہوگا۔ اور

بقیہ ساقط ہوگا۔

احکام نسبت خیار بلوغ جب نکاح باپ دادا کے سوا کسی اور نے کیا ہو۔

دفعہ ۵۔ جب نکاح زمانہ نابالغی میں باپ دادا کے سوا کسی اور شخص کی ولایت سے عمل میں لایا گیا ہو تو نکاح اُس وقت تک قابل نفاذ نہ ہوگا جبتک کہ نابالغ سن بلوغ کو پہونچکر نکاح قولاً یا فعلاً تسلیم نہ کرے۔

احکام نسبت تفریق جب نکاح نابالغ کے باپ دادا نے کیا ہو۔

دفعہ ۶۔ جب کسی شخص کی جانب سے جس کا نکاح باپ دادا نے زمانۂ نابالغی میں کیا ہو دعویٰ بغرض فسخ نکاح و تفریق سن بلوغ پر پہونچنے کے بعد بلا غیر ضروری تعویق پیش کیا جائے اور عدالت کی رائے میں ایسا نکاح دعویدار کے حق میں مضر ہے تو عدالت دادرسی فسخ نکاح و تفریق عطا کر سکیگی۔

لیکن شرط یہ ہے کہ ایسی کوئی دادرسی عطا نہ ہوگی۔ اگر دعویدار نے سن بلوغ کو پہونچکر قولاً یا فعلاً نکاح کو تسلیم کر لیا ہو لیکن یہ بھی شرط ہے کہ ایسا دعویٰ زوجہ کی جانب سے پیش ہو تو وہ مہر سے دست بردار ہو جائے

بدنیتی سے انتداد اختیار کرنا

دفعہ ۷۔ ایسا انتداد جو حقوق زن و شوئی سے گریز کرنیکی نیت سے یا انفساخ نکاح یا تفریق کی غرض سے اختیار کیا گیا ہو نا قابل لحاظ ہوگا فقط

خلیل الزماں صدیقی

بیرسٹر ایٹ لا

(رکن مجلس وضع قوانین وغیرہ)

وجوہ و فحواء

جس طرح شوہر کا حق زوجہ پر ہے اسی طرح اُس کا حق شوہر پر ہے اور پھر تاکید ہے کہ شوہر اپنی زوجہ کے ساتھ نیکی۔ شرافت۔ احسان۔ ہمدردی کا سلوک کرے۔ سورہ بقرہ و سورہ طلاق میں بھی ان احکام کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ان آیات کریمہ سے واضح ہے کہ شوہر کے لیے صرف دو صورتیں قرار دی گئی ہیں۔ یا تو اُس کو اپنی زوجیت میں رکھکر اُس کے حقوق ادا کرے یا شریفانہ طور پر اُس کو چھوڑ دے بمقدمہ مبارک النساء بیگم بنام سید اشرف احمد مندرجہ نظائر جوڈیشل کمیٹی صفحہ ۱۳۵۲ نواب صدیق یار جنگ بہادران مسائل پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ ظلم صریح و عظیم اور حکم شریعت سے عدولی ہے" اس وجہ سے ان صورتوں میں قاضی مجاز ہے کہ وہ اس عورت کو مضرت سے بچانے کے لیئے نکاح کو فسخ کردے اور اُس کی راہ کھولدے اور اگر عورت کی زیادتی ہے تو خلع سے اور مرد کی ہے تو تفریق سے علیحدگی کردے۔ اگر شوہر طلاق نہ دے تو یہ ظلم ہوگا پس رفع ظلم کے لیئے قاضی شوہر کا نائب ہوجائیگا۔

حضرت ابو حنیفہ کے سوا بقیہ یعنی جمہور کا مذہب یہی ہے۔ انہوں نے اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے طلاق و تفریق کے معاملات میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے لیکن حنفی مفتی کو اجازت ہے کہ وہ "مصلحت اور ضرورت رفع مضرت" کو محسوس کرتا ہے تو بلا تامل دوسرے امام (مالک۔ شافعی) کی تقلید کرے۔ سب فقہا نے اس کی اجازت دی ہے کہ بوقت ضرورت دوسرے مذہب پر فتوے دیا جا سکتا ہے چنانچہ مفقود الخبر شوہر کے مسئلہ میں امام مالک کی تقلید دوسری جماعتوں نے بھی کی ہے۔ فیصلہ متذکرہ صدر میں قاضی کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ "حاکم وہ شخص ہے جو سلطان کی طرف سے

معین وقائم کیا جاتا ہے کہ وہ مخاصمت اور دعاوی جو لوگوں میں واقع ہوتے ہیں ان کا فیصلہ اور قطع و استیصال کرے احکام مشروعہ کی توفیق کے لیے "

مقدمہ مذکور میں راجہ بہادر پنڈت گرراؤ صاحب نے بحیثیت حاکم ابتدائی مجلس عالیہ عدالت فسخ نکاح وتفریق کی ڈگری بحق زوجہ صادر کی تھی اور مسٹر امیر علی صاحب مرحوم کے تصانیف کا حوالہ دیتے ہوئے یہ رائے ظاہر فرمائی تھی کہ "قاضی کے طلاق پڑنے کا حق ایک حدیث صحیح پر مبنی ہے جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی عورت کے نکاح سے نقصان ہو تو اُس کو فسخ کرنا چاہیئے " بنا براں تجویز صدر شوہر کی جانب سے مجلس عالیہ عدالت میں مرافعہ ہوا اور منظوری مرافعہ دعویٰ مدعیہ مختلف وجوہ سے خارج فرما دیا گیا۔ لیکن جوڈیشل کمیٹی سے تجویز مجلس عالیہ عدالت صیغہ مرافعہ منسوخ اور تجویز ابتدائی بحال رہی۔

جوڈیشل کمیٹی کی رائے پیشگاہ خداوندی سے ذریعہ فرمان مبارک مورخہ ۹ ربیع الاول شریف ۱۳۵۱ھ منظور ہوئی۔ اور مسائل زیر بحث پر جوڈیشل کمیٹی کی مذکورہ تجویز سے کافی روشنی پڑ چکی ہے اور میری دانست میں بھی مسودہ ہذا کی منظوری میں اب کوئی دشواری نہ ہوگی۔ چنانچہ نواب صدیق یار جنگ بہادر نے تجویز فرمایا ہے کہ علمائے مدراس کے فتوے ایک رسالہ کی صورت میں اور مفتی سید عبد اللطیف صاحب و محمد میر صاحب و پروفیسران جامعہ عثمانیہ مولانا عبد القدیر صاحب و مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے فتاوے تائیدی پیش تھے اور چوٹی کے علماء مثلاً ابو الکلام آزاد وغیرہ لفظ بہ لفظ متفق "

مگر اس مقدمہ کے خاص حالات نہ ہوتے یعنی یہ کہ "زوجہ کی فی الواقع ۱۲ سال تک شوہر نے رخصت نہیں کرائی تھی نہ خلوت صحیحہ کا موقع آیا تھا۔ مدعیہ شافعی ہوگئی تھی۔ مہر معجل و نفقہ با وجود ڈگریات عدالت ادا نہیں کیا گیا تھا۔ نہ ادائی کی توقع تھی اور بطور واقعہ عدالت نے یہ قرار دیا تھا کہ شوہر کی خواہش فی الواقع زوجہ کو رکھنے کی نہیں تھی بلکہ مہر معاف کرا کر فسخ نکاح کا خواہشمند تھا وغیرہ۔ اگر

یہ سب خاص حالات اس مقدمہ کے نہوتے تو یہ فیصلہ بطور نظیر ممکن ہے کافی ہوتا۔ منجملہ تین ججوں کے فیصلہ ایک ذی علم جج نے فیصلہ صادر فرمایا اور بقیہ ذی علم کاملان نے نتیجہ سے اتفاق فرمایا ہے۔

ان مسائل پر عوام الناس کو غلط فہمی ہے۔ برٹش انڈیا کے فیصلہ جات اور بعض شارحین کی رائے سے مسئلہ بجائے صاف ہونے کی پیچیدہ ہوگیا ہے نکاح بطور ایک بیع کے تصور کیا گیا ہے۔ مسٹر ملا ہینڈ بک آف محمڈن لا میں صرف دو صورتیں عورت کے جانب سے بذریعہ عدالت فسخ نکاح کرانیکی بتلاتے ہیں یعنی نامردی (عنین) اور لعان۔ یہی کتب عموماً وکلاء و عدالتوں کے استعمال میں رہتی ہیں۔ بلحاظ ان کا دلوں کے بھی جو اس بارے میں ہیں ہر عدالت سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اصلی احکام کے بغور ملاحظہ کے بعد فیصلہ صادر کرے اس مسودہ کا پیش کیا جانا عملی نقطۂ نظر سے اب بے انتہا ضروری ہوگیا ہے۔ چنانچہ ریاست بھوپال میں اس ضرورت کو محسوس کرکے ایک اسی قسم کا قانون نافذ کیا گیا۔

آل انڈیا لیڈیز کانفرنس زیر سرپرستی بیگم صاحبہ بھوپال تھی۔ بیگم صدر یار جنگ بہادر اس کی معتمد ہیں۔ تمام ہندوستان میں اور حیدرآباد میں اس کی شاخیں ہیں۔ اس کو مسلم خواتین ہند کے متحدہ خیالات پیش کرنے کا حق تھا۔ اجلاس یازدہم زیر صدارت لیڈی آسمانجاہ فرخندہ بنیاد میں منعقد ہوا تھا جس میں تمام ہندوستان کے ارکین شریک تھے۔ آبرو بیگم صاحبہ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ خلع کے صاف مسئلہ کو سخت ترین پیچیدہ کر دیا گیا ہے" اور جو قانون ہندوستان کی عدالتوں میں شرع شریف کے نام سے جاری ہے یہ اصلی احکام کے مطابق نہیں ہے" چند سال کی بات ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے انتھک کوشش سے قانون وقف علی الاولاد منظور کرایا تھا" اس کے متعلق دیوبند کے مشہور علامہ اور محدث مولوی انور شاہ صاحب کے خطبۂ صدارت اجلاس جمعیت العلماء سے ایک اقتباس سنا دینا کافی سمجھتی ہوں۔ اگر آج اعداد و شمار سے کام لیا جائے ..... تو ہندوستان میں ایسی عورتوں کی تعداد ..... جو نان شبینہ کو محتاج ہیں ظالم شوہروں نے ان کو معلق بنا کر چھوڑ رکھا ہے لاکھوں تک پہونچی ہے، بیگم صاحبہ موصوفہ نے

ریاست حیدر آباد سے بھی ایک ایسا قانون بنانے کی درخواست کی ہے کہ جس سے خلع طلاق وغیرہ کی مسائل صاف ہو جائیں

کانفرنس مذکور کی تحریک نمبر ۱۳ حسب ذیل ہے:۔

"یہ کانفرنس اس امر کی ضرورت محسوس کرتی ہے کہ خلع جو شرع شریف کا ایک اہم مسئلہ ہے جس سے مستورات ضرورت کے وقت کام لے سکتی ہیں مگر چونکہ وہ مروجہ قانون کا جزو نہیں ہے۔ اس لیئے طبقۂ نسواں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا لہذا اس مسئلہ پر قانون بنانا بہت ضروری ہے۔ یہ کام ممبران کونسل کا ہے ...... ممبران کونسل سے تحریک کی جاتی ہے کہ وہ اس ضروری اور اہم مسئلہ کو قانون میں شامل کرنے کی کوشش فرمادیں" اس مسئلہ کی محرک اور موید ممالک محروسہ سرکار عالی سے دو بیگمات جنابہ مسز امیر حسن صاحبہ وجنابہ مسز ناظر یار جنگ تھیں۔ یہ تحریک باتفاق منظور ہوئی۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجی گئی۔ رپورٹ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ تحریک گورنمنٹ سرکار عالی کو بھیجی گئی یا نہیں

مجھکو اس تحریک کے الفاظ سے بحث نہیں ہے بلکہ اس کے اصلی مقصد سے۔ اور میری دانست میں فی زمانہ کانفرنسوں کی اس قدر کثرت ہے کہ ان بیگمات کے خیالات وعقائد کی طرف توجہ دلانے کا موقع نہو گا جنہوں نے اس میں حصہ لیا۔ چنانچہ تحریک نمبر ۴ باوجود مخالفت بہ تائید ہیرو بیگم صاحبہ کثرت آرا سے منظور ہوئی کہ" اس کانفرنس کی رائے میں پردہ ہر مسلمان اور شریف خاتون کے لیے نہایت ضروری اور موجب عزت ہے" اور اس کانفرنس کی تمام کارروائی میں سنجیدگی اور اعتدال خاص طور پر نمایاں ہے۔

آل انڈیا ومینس کانفرنس منعقدہ دہلی اور بین الاقوامی ومنیس کانفرنس میں جہانتک اخباری اطلاع کی بنا پر خیال پڑتا ہے اسی قسم کی تحریکات زیر بحث رہیں اور پیش ہونے والی ہیں۔

اِن تحریکات مباحث فیصلہ جات وفتاوے سے جن کا حوالہ میں نے ان وجوہ وفحواء میں

دیا ہے۔ اس مسودہ کی ضرورت اور اس تحریک کے مقبول عام ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے مقدمات ان غلط فہمیوں کی وجہ سے عدالتوں میں بہت کم رجوع ہوتے ہیں۔ مرد کا یہ خیال کہ وہ عورت کو نکاح میں یا لحاظ اپنے اعمال کے روک سکتا ہے ملک کے لیے اس قدر خوفناک ہوگیا ہے کہ عورتوں نے اس مشورہ کی بناء پر کہ مظالم شوہری و عدم ادائی نفقہ سے مذہب اسلام میں ان کو خلاصی نہیں۔ تبدیل مذہب کر لیا۔ ایک طلب زوجہ کے مقدمہ میں مجھ سے اس قسم کا مشورہ لیا گیا تھا اتفاق سے زوجہ ایرانی تھی۔ میں نے اس کو ایران چلے جانے کا مشورہ دیا اس نے اس پر عمل کیا۔ فی الواقع تبدیل مذہب کی نیت نہیں ہوتی بلکہ ایک حیلہ نکالا جاتا ہے۔

گذشتہ سال ایک مقدمہ میں دار القضاء بلدہ نے ایسے ارتداد کو جو صرف اس نیت سے کیا گیا ہو حقوق شوہری کے زائل ہونے کے لیے کافی تصور نہیں فرمایا۔ دفعہ (۷) انہیں صورتوں کے لیے مسودہ ہذا میں وضع کی گئی ہے۔ اصول مندرجہ دفعہ مذکور کی تائید شرع شریف و نیز نظائر برٹش انڈیا و عام اصول قانون سے بھی ہوتی ہے کہ کسی شخص کو اپنے ایسے فعل سے دوسرے کے حقوق کے مقابلہ میں فائدہ نہ پہونچنا چاہیئے جو نیک نیتی پر مبنی نہ ہو اور جو صرف بطور حیلہ کیا گیا ہو۔ اور نہ اس صورت میں عدالت ہائے نصفت دادرسی عطا کرتی ہیں۔ دوسری طرف مرد پر بھی اس غلط فہمی کے اچھے اثرات نہیں پڑے۔

قیس بن ثابت کی بیوی سے جبکہ وہ خلع چاہتی تھی آں حضرت صلعم نے فرمایا کہ تم ان کا (شوہر کا) مہر واپس کر دو گی؟ اس نے کہا جی ہاں۔ آپ نے قیس سے فرمایا کہ باغ قبول کرو اور انہیں طلاق دو۔ اس کے متعلق پروفیسر مولانا عبد القدیر صاحب فرماتے ہیں کہ آپ نے ان کو طلاق کا حکم دیا اسی طرح قاضی مناسب سمجھے گا تو شوہر کو خلع کرنے اور مہر کے عوض طلاق دینے کا حکم کریگا اور اس کی تعمیل کرائیگا۔ یہ روایت لعان کی ہے۔ آنحضرت صلعم کے احکام موجود ہیں کہ شوہر پر واجب ہے کہ خرچ دے۔

جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نفقہ دے یا اگر نفقہ دینے کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو تو الگ کر دے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں زن و شوہر جھگڑتے ہوئے آئے ہر ایک کے ساتھ ان کی طرفدار جماعت تھی آپ نے وجوہ معلوم کرکے طرفین کو حکم مقرر کرنے کا حکم دیا اور جب ہر ایک کے حکم مقرر ہو گئے تو ہدایت کی کہ اگر حالات کا اقتضا ہو تو دونوں کو ملا دو اور اگر تفریق بہتر ہو تو تفریق کرا دو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی ایسے احکام ہوئے ہیں۔ جن سے ان احکام کی تائید ہوتی ہے۔

احکام شرع شریف مسلمانوں کے لئے ہمیشہ کے واسطے کافی ہیں۔ ان میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں ہے مگر کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اختلاف کا نوٹ پیدا کرکے اغراض شرع شریف کی تکمیل و تعمیل میں مزاحم ہو۔ یہ مسودہ ان مسودوں کی طرح نہیں ہے جن سے مسلمانوں کو اختلاف ہو اگر کسی ایسے قانون پر جو مسلمانوں کو احکام شریعت کی تاکید کرے اعتراض ہو سکتا ہے تو اس پر بھی۔ سارد اایکٹ جو اس وقت عارضی طور پر ملتوی ہے ایک خاص نقطہ نظر پر مبنی تھا اور صحیح یا غلط طور پر بعض مسلمانوں کو بعد میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اس میں کوئی چیز احکام اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن یہاں اس مسودہ کی غرض ہی صرف تعمیل احکام شرع شریف ہے۔ تفریق اور طلاق اگر ناپسندیدہ ہے تو ظلم حرام ہے۔ اگر نتائج قیام و فسخ ازدواج کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جائے سورۃ مائدہ آیت ۲۸ و ۲۹ متعلق ہے جہاں پر حکم ہے کہ دو شر میں سے خفیف تر شر اختیار کیا جائے۔

اس مسودہ کے منظور ہو جانے سے اس بارے میں دوسرے توانین کے وقت بے وقت نافذ ہو جانیکا اندیشہ نہ رہیگا۔ جو احکام شرع کے مطابق نہ ہوں یا ان کی تعمیل کرنا ان کا مقصود نہ ہو سارد اایکٹ بھی بلحاظ دفعات (۵) و (۶) مسلمانوں کی حد تک غیر متعلق ہو جاتا ہے۔

معاشرتی و تمدنی ترقی کے لئے عورت کا مرد سے ہم خیال رہنا ایک زبردست نشان اولاد کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کی ترقی کا ہو سکتا ہے۔ اگر عورت خواہ کسی مرد سے اولاد رکھتی ہو یا

نہیں مرد کے مظالم سے بے جا پریشان ہے تو یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ اگر وہ صاحب اولاد ہے تو اولاد کی بدبختی بھی اس کے ساتھ لگی رہے گی اور اگر صاحب اولاد ہونے سے پہلے اس ظلم ناروا کا شکار ہوگئی ہے تو اس کی پرالم زندگی دلخراش ہوگی۔ ازدواجی زندگی اور اولاد کا اثر سوسائٹی پر اس قدر زبردست ہے کہ ایسی سوسائٹی کمزور اور بے اثر ہو جاتی ہے۔

مردوں کو اس وجہ سے کہ وہ اس صنف کی حفاظت ناموس وعصمت و آسایش کے ذمہ دار ہیں اور سینیر پارٹنر (SENIOR.PARTNER) کی حیثیت رکھتے ہیں شرع شریف نے ہدایت دی ہے کہ حسن سلوک سے انہیں اپنا بنالیں اور اگر ان میں کسی وقت اسباب ناراضگی کا پیدا ہونا ناقابل اندفاع ہو تو اسباب معقول کے پیش نظر ان کو عقد کی پابندیوں سے آزادی دی جائے۔

میرے خیال میں اہل سنت والجماعت میں تعبیر احکام میں جو طریقہ خیال کیا جاتا ہے اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شرعی قاضی کو ایسے شوہر کا ظلم دور کرنے کا حکم تھا جو زوجہ پر مظالم کرے اور یہ شرعی قوانین تعزیری کی رو سے وہ کر سکتا تھا جو اب باقی نہیں رہا اور نہ وہ صورت اب متعلق ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ شوہر تعزیر سے بچکر اپنے آپ کو ان معاملات میں عقاب کی حد تک آزاد سمجھنے لگا۔

سنت والجماعت کے ائمہ کبار میں ان ائمہ کا اجتہاد جس سے مرد کے مظالم کا انسداد کیا گیا ہو زیادہ پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور یہ بھی ایک اصول ہے کہ بصورت اختلاف فتاوے ایسے فتاوی پر عمل کیا جائے جنسے ظلم دور ہو یا جن سے کمتر مضرت پہونچے (آیات سورۃ مائدہ تذکرۂ صدر)

فقہا نے ایسی بندشوں سے خلاصی کیلئے جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں۔ ظلم ناروا ۔ مرض لاعلاج و بدسلوکی ۔ و مفقود والخبری وغیرہ اشکال میں اس امر کی اجازت دی ہے کہ ان میں طلاق

و خلع و تفریق کی سہولتیں پیدا ہوں

اس مسودہ کے مرتب کرنے میں تفصیلات کو عمداً ترک کیا گیا ہے اور ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ عدالتیں انصاف عملی کر سکیں اور مظالم کا انسداد ہو۔ اس کا موقع نہ رہے کہ حیلے حوالے سے دشواریوں یا لفظی مباحث پر احکام شرع شریف کی تعمیل میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں۔

خیار بلوغ و تبدیل مذہب کے متعلق دفعات بھی اس لحاظ سے رکھے گئے ہیں۔

عدالت کے اختیارات ایسے محدود یا معین نہ ہونا چاہیئے کہ کسی خاص حالت میں جو واضعان قانون کے اس وقت پیش نظر نہ ہوں عدالتیں انصاف نہ کر سکیں۔ بلکہ عدالتوں کو نہایت آزادی کے ساتھ حسب احکام شرع شریف ان امور میں فیصلہ کے ذریعہ انصاف کرنے کا موقع ملنا چاہیئے اور یہ رعایا کا حق اور حکومت اور واضعان قانون کا فرض ہے۔ چنانچہ شرع شریف نے قاضی یا عمل یعنی ایسے قاضی کے جو فی الواقع فصل خصومات کا کام کرتا ہو فتاوی کو زیادہ قابل عمل خیال کیا ہے۔ ایسی بنا پر امام ابو یوسف کے فتاوی مرجح سمجھے گئے۔

اس مسودہ میں کوئی مکمل ضابطہ بنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے اس معنی میں کہ دوسرے اشکال تفریق مثلاً لعان وغیرہ کی صراحت نہیں ہے۔ مہر۔ نفقہ۔ عدت۔ رضاعت۔ ولایت۔ حضانت کے نتائج جو احکام قانون ہذا سے متعلق پیدا ہوں گے ان کی بھی صراحت کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے لیے احکام شرع شریف کافی ہیں۔

دفعہ (۶) یعنی خیار بلوغ کی صورت میں عورت کو حق مہر نہ ہوگا۔ دفعہ ۳ میں اس کی حفاظت کی گئی ہے کہ عدالتیں عورتوں کے یک طرفہ بیانات پر تجاویز صادر نہ کریں۔

ایک خیال یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ چونکہ نکاح کی گرہ کا منقطع کرنا نہایت ناپسندیدہ نظر سے دیکھا جاتا ہے اور زوجین میں بصورت نزاعات صلح احسن ہے۔ اس لیے کافی مواقع اور مدت تصفیہ نزاعات

باہمی کا ملنا چاہیئے جس کی تائید روایت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی ہوتی ہے اور نہ اس سے کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے۔ مسودہ ہذا میں اس کی جملہ حالات کے اعتبار سے کافی گنجائش ہے۔ الفاظ ایسے استعمال کئے گئے ہیں کہ کسی انفرادی واقعہ یا محض چند واقعات سے جب آئندہ بہتری کی توقع قوی ہو ان اختیارات کا نفاذ نہ کیا جائے۔ تعبیر قانون کے اصولوں سے جو واقفیت رکھتے ہیں وہ اس کو محسوس کرینگے یہہ بھی مدنظر رہے کہ موجودہ تنظیم و ضابطۂ عدالتی میں عدالت کا کوئی ذاتی دلچسپی لینا پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا لیکن ضابطہ اور مدالتہائے مرافعہ کی جکڑبندیاں موجود ہیں جو پہلے نہ تھیں۔

عدالتی تجربہ کی بنا پر بلا شبہ کہہ سکتا ہوں کہ ہر مقدمہ میں عدالت ضلع بیرون عدالت کو موجودہ ضابطہ کے تحت نہ صرف پسندیدہ نظر سے دیکھتی ہے بلکہ جب بلا مزید طوالت فیصلہ پر آمادہ ہوجاتی ہے تو اس وقت بھی اس بنا پر کہ فریقین میں مصالحت کا امکان ہے مواقع دینے سے انکار نہیں کیا جاتا موجودہ ضابطہ نے مقدمات کا دوران لازمی طور پر اپیا رکھا ہے اور ایسے مواقع فریقین کو ایک دوسرے کا مقدمہ معلوم کرنے۔ جوابدہی کرنے شہادت پیش کرنے وغیرہ کے دیئے ہیں کہ اس بارے میں شکایات کی گنجائش نہیں ہے۔ ضابطہ مقدمات دیوانی ابتدائی مرافعہ نگرانی تجویز ثانی کے ایسے مختلف مدارج ہیں کہ مقدمہ بازی کو ایک قیمتی شوق بھی کہا گیا ہے جہاں امکان صلح ہو اول تو مقدمہ دائر کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی نوٹس و ترتیب عرضی دعوے کی نوبت ہی پر نزاع ختم ہوجائے گی یا کم سے کم مقدمہ مدارج آخری طے نہ کرسکیگا۔ البتہ جہاں پر درخواست یا استغاثہ گذرتے ہی فوراً کسی کارروائی کے قطعی طور پر طے ہوجانے کا اندیشہ ہو وہاں پر ایسے قیود ضروری ہیں۔ ایسے قیود دیری دانست میں احکام قانونی اضافی یعنی ضابطہ ہیں نہ کہ جزو قانون اصلی۔

بہمہ وجوہ اس مسودہ کے پیش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے فقط ۱۵ مئی ۱۹۳۳ء؟

خلیل الزماں صدیقی بیرسٹر (رکن مجلس وضع قوانین وغیرہ)

بھوپال کا ضابطۂ تحفظ حقوق زوجین

تقریباً دو سال ہوئے کہ سرکار بھوپال نے تحفظ حقوق زوجین کے نام سے ایک قانون اپنی مملکت میں نافذ کیا تھا جس کی نوعیت بھی قریب قریب وہی تھی جو مولوی خلیل الزماں صدیقی صاحب کے پیش کردہ مسودہ کی ہے لہٰذا مناسب ہوگا کہ صدیقی صاحب کے مسودہ پر غور کرتے وقت اس قانون کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

(ایڈیٹر)

ملک میں ایک عرصہ سے اس امر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ جب کبھی نزاع باہمی اختلاف طبائع یا دیگر وجوہ سے مسلمان عورتیں بدرجہ مجبوری رشتۂ نکاح سے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہیں تو اُن کو اس میں ایسی دشواریاں پیش آتی ہیں کہ اُن کے سبب سے بسا اوقات نہ صرف اُن کی بلکہ ایک جماعت کثیر کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ مذہب اسلام نے تمام افراد کے حقوق کا یکساں خیال رکھا ہے اور ہر ایک کی جائز و بجا خواہشات کی مساویانہ و منصفانہ رعایت کی ہے اور کبھی کسی حال میں کسی کی حق تلفی نہیں فرمائی اور اسی اصول کے مطابق فقہائے کرام نے بربنائے ضرورت و مصلحتِ وقت مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک پر عمل کرنے کو جائز رکھا ہے اور اسی لحاظ سے قبل ازیں ریاست محروسہ بھوپال میں ایک حکم نافذ و جاری ہو چکا ہے (حکم نمبر ۹ مورخہ ۱۲ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ ہجری مطابق ۲۵ جولائی ۱۹۰۵ء مطبوعہ ہدایات سلطانی حصہ نمبر ۳) چنانچہ اس سے اس قسم کی مشکلات کا ایک حد تک حل ہوگیا لیکن اس کے سوا اور بہت سی صورتیں ہیں جن کے تدارک مناسب کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔

چونکہ مذہب حنفی میں اس بات کی اجازت دیگئی ہے کہ باقتضائے ضرورت حاکم کے حکم کے مطابق دیگر ائمہ کے مسلک کو اختیار کیا جا سکتا ہے، اس اصول کے تحت میں حالات حاضرہ اور ضروریات موجودہ کی بنا پر بمنظوری اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہ و سلطنتہا احکام شرعیہ مندرجہ ذیل ضابطہ منظور کیا جاتا ہے۔

مختصر نام و تعلق نفاذ مع تاریخ نفاذ | دفعہ (۱) جائز ہے کہ یہ ضابطہ" ازنام تحفظ حقوق زوجین موسوم کیا جائے۔

(الف) یہ ضابطہ محکمات شرعیہ ریاست بھوپال سے متعلق ہوگا اور

(ب) فوراً نفاذ پذیر ہوگا۔

شوہر مفقود الخبر | دفعہ (۲) جب شوہر اپنے مکان سے چلا جائے اور لاپتہ ہو اور اس نے اپنی زوجہ کے نان نفقہ کا کچھ انتظام نہ کیا ہو اور زوجہ بوجہ مفقودی شوہر خود استدعائے تفریق پیش کرے تو محکمۂ قضا ثبوت مفقودی و عدم کفالت نان و نفقہ و عدم نشوز کے متعلق زوجہ مفقود سے حلف لینے کے بعد تین ماہ تک تین اشتہار حسب ذیل مضمون کے شائع کریگا۔

"چونکہ فلاں شخص اتنے عرصہ سے لاپتہ ہے اور اس نے اپنی اہلیہ مسماۃ فلاں کی خبر گیری نہیں کی نہ اُس کے نان و نفقہ کا کچھ انتظام کیا، لہذا وہ جلد سے جلد اپنی جائے قیام و صحیح پتہ سے محکمۂ ہذا کو اطلاع دیکر اپنی زوجہ مسماۃ فلاں کی شکایت کا مناسب انتظام کرے ورنہ حسب مسلک امام مالک اُس کا نکاح فسخ کر دیا جائیگا۔"

توضیح (۱) مسلک امام مالک یہ ہے کہ اگر مفقود نے مال بقدر کفالت نان و نفقہ

---

[1] شامی جلد نمبر ۲ صفحہ ۵۶ [2] شامی جلد ۳ ص ۲۰۷ [3] قاضی خاں جلد نمبر ۱ صفحہ ۱۹۹ [4] قاضی خاں جلد نمبر ۱ صفحہ ۱۹۸ [5] صعیدی حاشیہ کفایت الطالب جلد نمبر ۲ صفحہ ۷۰، ۷۱

چھوڑا ہو تو یوم مرافعہ سے چار سال گذرنے کے بعد نکاح فسخ ہو جائیگا۔ ورنہ فوراً طلاق ہو جائے گی۔

(۲) اعلان مذکورہ بالعموم جریدہ بھوپال میں یا کسی اور طریقہ سے جو محکمۂ قضا بلحاظ حالات متعلقہ مناسب سمجھے شائع کیا جائیگا۔

(۳) حسب طریقۂ بالا جو اعلانات[1] شائع ہوں گے ان کے مصارف بشرط امکان شخص مذکور کی جائداد سے وصول کیے جائیں گے۔ ورنہ عورت بصورت استطاعت ادا کرے[2] گی۔ بصورت دیگر معاملہ گورنمنٹ کے سامنے پیش کرکے جریدہ میں مفت اشاعت کا انتظام کیا جائیگا۔

نمبر ۴۔ اگر یہ ثابت ہوگا کہ مفقود نے مال بقدر کفالت زوجہ چھوڑا ہے۔ تو محکمۂ قضا سے زوجۂ مفقود کو تاریخ درخواست سے چار سال تک انتظار شوہر مفقود کا حکم دیا جائیگا۔

نمبر ۵۔ بصورت عدم ذرائع کفالت تاریخ اشاعت اشتہار آخر سے تین ماہ گذرنے کے بعد اگر پتہ شخص مذکور کا نہ معلوم ہوگا تو محکمۂ قضا سے ان زوجین میں تفریق کرادی جائے گی

نمبر ۶۔ اگر چار سال کے انتظار کے بعد بھی شوہر کا پتہ نہ معلوم ہوگا تو محکمۂ قضا سے حکم فسخ نکاح صادر کیا جائے گا۔

نمبر ۷۔ بعد صدور حکم فسخ نکاح زوجہ چار ماہ دس دن ایام عدت گزار کر نکاح ثانی کر لینے کی مجاز ہوگی

نمبر ۸۔ اگر شخص مذکور بعد فسخ نکاح و مرور ایام عدت واپس آئے اور اس عورت پر دعوے کرے تو ایسی صورت میں اس کا دعویٰ قابل سماعت نہ ہوگا

دفعہ ۳۔ جن مستورات کے شوہران کا نان ونفقہ دینے	تفریق بصورت عدم ادائے نان ونفقہ

[1] سعیدی جلد نمبر ۲ صفحہ ۱۷۰ [2] سعیدی نمبر ۱ صفحہ ۷۰ [3] قاضی خاں جلد نمبر ۱ صفحہ ۱۹۹۔

[4] عبارت سند مندرجۂ دفعہ (۱) توضیح نمبر ۴ و ۵ کے لیے کافی ہے [5] سعیدی جلد ۱ صفحہ ۷۰۔

عاجز ہوں اور بوجہ عدم استطاعت ایسا نہ کرسکتے ہوں یا باوجود[1] مقدرت و استطاعت ایسا نہ کرتے ہوں اور اُس پر اُن کا اصرار ہو تو مستورات آخرالذکر بھی نان و نفقہ سے محروم ہونے کی وجہ سے اہل عسرت شوہروں کی زوجات کے مثل سمجھی جائیں گی اور ان کی ایسی شکایات پیش ہونے پر شوہروں کو حکم ادائے نان و نفقہ میعادی سہ ماہ محکمۂ قضا سے دیا جائے گا اور یہ حکم صادر کیا جائے گا کہ بصورت عدم تعمیل فلاں تاریخ مقررہ کے بعد فیما بین اوس شوہر اور اُس کی زوجہ کے تفریق کردیجائیگی"

توضیح ۔ اس تفریق کے بعد ایسی عورت کا نکاح ثانی حسب قواعد شرعیہ ہوسکیگا ۔

نان و نفقہ کا تعین دفعہ (۴) نان و نفقہ کی مقدار کا تعین ہر صورت میں نفقہ دہندہ کی حیثیت[2] اور ذرائع آمدنی کے لحاظ سے محکمۂ قضا کریگا ، اور آیندہ ذرائع آمدنی کی کمی و بیشی پر بصورت عذرداری مقدار مقررہ میں کمی بیشی ہوسکے گی ۔

تفریق بصورت امراض دفعہ (۵) اگر کسی عورت کی جانب سے اُس کے شوہر کی نسبت یہہ شکایت پیش ہو کہ اُس کا شوہر عنین[3] یا مجذوم یا مبروص ہے اور اس بنا پر استدعا تفریق کی جائے[4] تو حسب قواعد شرعیہ ایک[5] سال کی مہلت علاج کے واسطے شوہر کو دیجائے گی اگر اس مدت میں شوہر صحتیاب نہ ہو تو حسب استدعا زوجہ محکمۂ قضا سے فیما بین تفریق[6] کردی جائےگی ۔

توضیح (۱) بصورت بالا تفریق کے لیے شرط ہے کہ عورت اپنی درخواست میں یہ لکھدے کہ وہ اپنے زرِ مہر اور ایام عدت کے صرفہ سے دست بردار ہوتی ہے اور اُس کا مطالبہ نہ کریگی ۔ بشرطیکہ یہ امراض نکاح کے بعد پیدا ہوئے ہوں اور عورت بھی رتقا و قرنا نہو

---

[1] منہاج مع شرح المحلی صفحہ ۱۷۹ و ۸۷ وصفحہ ۴ سطر ا [2] ہدایہ اولین صفحہ ۴۱۰ ۔ [3] شرح کفایت الطالب جلد نمبر ۲ صفحہ ۶۸ ۔ [4] ہدایہ اولین صفحہ ۴۰۰ [5] ہدایہ اولین صفحہ ۴۰۱ [6] صعیدی جلد نمبر ۲ صفحہ ۶۸ ۔

(۲) اگر امراض مذکورہ مرد میں قبل نکاح تھے اور بوقت نکاح چھپائے گئے تو اس صورت میں عورت تفریق کے ساتھ مہر پانے کی مستحق ہوگی لیکن اگر قبل نکاح مرد کے ان امراض میں مبتلا ہونیکا عورت کو علم تھا تو عورت کو تفریق حاصل کرنے کا حق ہوگا۔

تفریق بصورت نفرت زوجین | دفعہ (۶) اگر کسی عورت کی جانب سے اس کے شوہر[ا] کے مجبوب ہونے کی بنا پر استدعا تفریق پیش ہو اور شوہر نکاح کے بعد مجبوب ہوا ہو، یا قبل نکاح تھا اور عورت کو اس کا علم نہ ہوا تھا تو ثبوت مجبوبیت پر بلا مہلت تفریق کر دی جائے گی، اور مہر بھی بذمہ شوہر واجب الادا ہوگا۔ اس کے علاوہ ہر وہ عیب[ب] جو باعث نفرت زوجین ہو اور اس سے مقصد نکاح حاصل نہ ہوتا ہو۔ اختیار فسخ کو واجب کر دیگا۔

توضیح:۔ اگر باوجود علم کے کہ شوہر مجبوب ہے عورت نکاح پر بیان دے چکی ہو تو عورت کا حق تفریق[ج] باطل ہوگا۔

قاضی کا اختیار تفریق | دفعہ (۷) محکمۂ قضا کو تفریق کرانے کا اختیار ان وجوہ کے علاوہ کہ شوہر زوجہ سے ہمیشہ بدسلوکی کرتا ہے۔ یا اس نے شرائط نکاح کی تکمیل نہیں کی یا زوجین باہمی رحمت ومودت نہیں رکھتے، اس صورت میں بھی ہے کہ قبل نکاح احد الزوجین امراض لاعلاج میں مبتلا تھے۔

عورت کو طلاق مانگنے کا حق | دفعہ (۸) اگر زوجہ اس بنا پر استدعائے تفریق پیش کرے کہ اس کا شوہر چار سال یا اس سے زائد مدت کی سزا پاکر قید ہوگیا ہے اور بوجہ تنگدستی و افلاس شخص مقید اپنی زوجہ کے نان ونفقہ وغیرہ کی کفالت نہیں کرسکتا تو اسکی حالت معسر کی سی سمجھی جائے گی اور اسی کے مطابق تحت احکام شرعیہ محکمۂ قضا سے ایسے زوجین کے مابین تفریق کر دی جائے گی اور زوجہ کو

ا ہدایہ اولین صفحہ ۴۰۱۔

ب کتاب زاد المعاد جلد ثانی صفحہ ۱۲۶،۲۳۔ ج ہدایہ اولین صفحہ ۴۰۱۔

حسب احکام شرعیہ اجازت نکاح ثانی دیدی جائے گی۔

توضیح۔ (۱) صرف مفلسی کے عذر پر کوئی شخص اپنی زوجہ کو نفقہ دینے سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ شخص محنت کر کے معاش حاصل کرسکتا ہے اور ضعیف و نحیف نہیں ہے تو اس پر اپنی زوجہ کے لیے نفقہ مہیا کرنا فرض ہے بصورت دیگر عورت طلاق کی مستحق ہوگی

(۲) حسب ذیل صورتوں میں جو مانع رحمت و مودت[1] ہیں عورت طلاق مانگنے کی مستحق ہو جاتی ہے

(الف) جبکہ شوہر کا شرائط نکاح پورا کرنے سے قولاً و عملاً انکار پایا جائے۔

(ب) جب اس کو معلق کردے اور نفقہ نہ دے۔

(ج) جب اس سے بھیک منگوائے۔

(د) جب کسی طرح اس کے پاس نہ جائے۔

(ہ) جب اس سے ایسی مزدوری کرائے جو اس کی کسر شان یا آبرو ریزی کا باعث ہو۔

(و) جب وہ متعدد زوجات رکھتا ہو اور سب سے برابری و انصاف نہ کرتا ہو۔

(ز) جب وہ ہمیشہ زوجہ پر ظلم و جور کرتا ہو اور مار کر ضرر جسمانی پہنچاتا ہو۔

توضیح نمبر ۳۔ مذکورہ بالا صورتوں میں فیصلہ کنندہ کی رائے یا تجویز پر انحصار ہوگا اور وہ مجاز ہوگا کہ کسی ایک وجہ کو جو حقوق زوجیت کی ادائی میں مانع ہو بلحاظ احکام شرعیہ سبب فسخ قرار دے۔

عورت کا مرد سے طلاق لینا۔ یا مرد کا عورت کو طلاق دینا	دفعہ ۹۔ اگر کسی شخص کی ایسی شکایت پایہ ثبوت کو پہنچ جائے کہ جس عورت سے اس کا نکاح ہوا ہے وہ قبل نکاح مرض جنون یا مرض جذام یا برص

یا مرض اندام نہانی میں مثل قرن یا رتق کے مبتلا تھی اور شوہر کو ایسے کسی مرض کا علم نہ تھا۔ نہ وہ اس پر رضامند تھا۔ تو بصورت طلاق شوہر پر حسب مسلک امام مالکؒ صرف ایک ربع دینار عائد ہوگا

[1] کتاب زاد المعاد جلد ثانی صفحہ ۲۳۴

بقیہ مہر ساقط ہوگا۔

توضیح (۱) امام احمدؒ کے بعض شاگردوں نے زن وشوہر کے چند دیگر امراض کو بھی ان ہی امراض میں شامل کیا ہے، جن کے سبب سے مرد زوجہ کو طلاق دے سکتا ہے یا زوجہ مرد سے طلاق لے سکتی ہے اور وہ امراض حسب ذیل ہیں:-

۱۔ نتن الفرج (اندرونی گندگی)۔

۲۔ نتن الفم۔ (گندہ دہنی)

۳۔ انخراق مجری البول

۴۔ اندام نہانی کے بہنے والے زخم

۵۔ بواسیر۔

۶۔ ناسور

۷۔ استحاضہ

۸۔ استطلاق البول

۹۔ احدالزوجین کا خنثیٰ مشکل ہونا

توضیح (۲) مذکورۂ بالا صورتوں میں طرفین کو بہ تعجیل اختیار تنسیخ نکاح حاصل ہے یعنی جب زوجہ وشوہر کو معلوم[ا] ہو جائے کہ ان میں سے ایک اس قسم کے کسی مرض میں مبتلا ہے تو مرافعہ باستدعا تنسیخ نکاح محکمۂ قضا میں پیش ہوگا، لیکن لازم ہے کہ ایسا مرافعہ بہت جلد عمل میں لایا جائے۔ اگر تاخیر[ع] کیا ہوگی تو گمان غالب ہوگا کہ طرفین نے اس حالت کو قبول کرلیا تھا۔ یا حق تنسیخ سے دست بردار ہو گئے تھے

(۳) مجانب مرد یا زوجہ تبقاضائے حالات استدعائے تفریق پیش کئے جانے پر اگر محکمۂ قضا رک

ا و ع قاضی خاں جلد نمبر ا صفحہ ۱۸۰

رائے میں باتباع تصریحات مذکورہ تفریق ضروری متصور ہو تو محکمۂ مذکور حسب حکم شرعی تحت ضابطہ انفذ الوقت گمنٹ[1] سے حکم[2] حاصل کر کے تنسیخ نکاح کا حکم صادر کرنیکا مجاز ہوگا۔

ضابطہ بصورت عدم حاضری

دفعہ (۱۰) اگر کوئی شخص بضرورت تکمیل اغراض انصاف محکمۂ قضاء کی طلبی پر حاضر نہ ہو یا تعمیل سمن سے گریز کرے یا روپوش ہو تو ایک نوٹس اس مضمون کا رجسٹری شدہ دیا جائیگا کہ تاریخ مقررہ پر حاضر ہو کر جواب دہی کرے، بصورت دیگر یکطرفہ فیصلہ کیا جائیگا۔

محکمۂ قضاء کے فیصلہ کی نظرثانی

دفعہ (۱۱) محکمۂ قضاء کے فیصلہ کی نظرثانی تاریخ فیصلہ سے ساٹھ[3] دن کے اندر محکمۂ قضا میں بمعیت محکمۂ افتا ہو سکے گی۔ قاضی صاحب و مفتی صاحب کے اتفاق رائے کی صورت میں فیصلہ ناطق ہوگا، بصورت اختلاف موصوف الیہم معاملہ مجلس العلماء میں پیش ہو کر کثرت رائے سے اس کا فیصلہ کیا جائیگا۔

تنازعات زوجین کے لیے حکم کے مقرر کرنیکا ضابطہ

دفعہ (۱۲) محولۂ بالا صورتوں کے علاوہ زوجین کے دیگر تنازعات باہمی کے تصفیہ کے لیے ایک ایک حکم ملحوظی احکام شرعیہ اور ایک ثالث محکمۂ قضاء سے مقرر کیا جائے گا، جسکا تصفیہ ناطق اور واجب التعمیل ہوگا اور ضابطہ حسب دفعہ (۱۰) یہ ہوگا کہ نوٹس رجسٹری شدہ دیا جائے گا، کہ فریق ثانی تاریخ مقررہ پر حاضر ہو کر خود جواب دہی کرے بصورت دیگر یکطرفہ فیصلہ کیا جائے گا، اور کوئی عذر قابل سماعت نہ ہوگا۔

---

[1] شامی جلد نمبر ۱ صفحہ ۵۹ [2] بحکم قرآن فابعثوا حکما الخ [3] بیضاوی شریف ص ۱۵۳

کلام القرآن

از

جناب مولوی ابوالرشید محمد عبد اللہ صاحب وکیل ہائیکورٹ۔ ناندیڑ

ماہ رجب ۱۳۵۲ھ کے ترجمان القرآن میں دکن کے مشہور مضمون نگار مولانا ابوالخیر خیراللہ صاحب نے عنوانات بالا کے تحت چند آیات قرآن شریف نمونتاً پیش فرماکر یہہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ ان آیات شریفہ کا استعمال روزمرہ کے طور پر کیا جائے تو ناواقف بھی قرآن شریف کے معانی و مطالب سے واقف ہوجائیں گے۔ فی الحقیقت یہہ ایک عمدہ رائے ہے۔ میں بھی ایک عرصہ سے اس رائے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے قرآن شریف کے بیشتر حصہ سے ایسی آیات کا انتخاب کرلیا ہے۔ اور میرا ارادہ ہے کہ خاص خاص عنوانات کے تحت ان آیات کو ایک رسالہ کی شکل میں ترتیب دوں تاکہ یہہ آیات تبرکہ عوام میں رائج ہوں۔ مولانا ابوالخیر صاحب نے انہی آیات کا انتخاب فرمایا ہے جو روزمرہ کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کو وسعت دیکر اس میں ایسی آیات کا انتخاب بھی کیا جانا مناسب ہوگا جن سے اخلاق کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ میرے انتخاب میں یہہ امر بھی پیش نظر رہا ہے۔ میں اپنی منتخب کردہ چند آیات نمونتاً پیش کرتا ہوں۔ آپ مناسب سمجھتے ہوں تو ترجمان القرآن میں انکو طبع فرمادیجے۔

۱۔ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ

۲۔ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ

۳۔ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ	یہ ایسا وعدہ ہے جو ہرگز جھٹلایا نہیں جائیگا
۴۔ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ	کیا تم میں کوئی عقلمند آدمی نہیں ہے۔
۵۔ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ	ہم جو چاہتے ہیں وہ تم کو معلوم ہے
۶۔ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ	صبر اچھی چیز ہے۔
۷۔ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ	تم نے جو مانگا وہ اُس نے تم کو دیا۔
۸۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ	جس بات کا تم کو علم نہ ہو اُس کے پیچھے مت پڑو
۹۔ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ	جس کو اللہ ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں
۱۰۔ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ	وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔
۱۱۔ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ	تم جو چاہو کرو۔
۱۲۔ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ	اس میں وہ سب کچھ ہے جو دل چاہتا ہے۔
۱۳۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ	اگر تم بھلائی کروگے تو اپنے ہی لیے کروگے۔
۱۴۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا	زمین پر اکڑ کر مت چلو۔
۱۵۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ	فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں۔
۱۶۔ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ	اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔
۱۷۔ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ	اپنی آواز کو پست کرو۔

قواعد و نرخنامۂ اشتہارات

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عـہ	معـہ	میعـہ	لـہ
نصف صفحہ	لے	معـہ	میعـہ	میعـہ
ربع صفحہ	عہ	عـہ	معـہ	معـہ

۔ کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۱۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۱۔ صرف وہی چربے قبول کئے جائیں گے جو اس رسالہ کی وضع و حیثیت کا لحاظ رکھ کر تیار کئے گئے ہوں۔

۴۔ نرخنامہ میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جائے گی۔

۵۔ ٹائٹیل کے صفحات کی اجرت عام نرخنامہ کی نسبت ۵۰ فیصدی زیادہ ہوگی۔

Registered No. M. 2950

رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۲۰)

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کریگا مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی انکو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے۔ لہذا کوئی صاحب رعایت کا مطالبہ نہ کریں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کیلئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شائع کرے

مینجر ترجمان القرآن

(خیریت آباد (حیدرآباد دکن)

طابع و ناشر

ابوالاعلیٰ مودودی

مطبوعۂ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن